گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

اکتوبر 2020ء

بانی
معراج رسول

قیمت 100 روپے

شمیم فضل خالق، غزالہ رشید، روبینہ نوشین خان کی خصوصی تحریریں

کھانا گھر کی منتظم پروین سعید سے متاثر کن گفتگو

PAKISTANIPOINT

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 07

سلسلے وار ناول

میرا سارا رنگ اتار دو — افشاں آفریدی 10

میں عشق ہوں — نایاب جیلانی 106

مکمل ناول

پریوں کا دیس — مدیحہ شاہد 200

ناولٹ

کام ہے کو بیاہی — دُردانہ نوشین خان 142

ایک ہی راہ ہے مسافت کی — فرح بھٹو 183

منی ناول

میں انمول — سعدیہ رئیس 58

عورت کہانی

ع عورت ق قفل — فرحین اظفر 163

افسانے

گڑیا — نفیسہ سعید 41

شباہت — غزالہ رشید 53

نو رحسن آیا — فہمی فردوس 82

بڑے نصیب میرے — شمیم فضل خالق 93

شام ڈھلے — سیما بنت عاصم 131

بے نام مسافتیں — پروین عذرا تشنہ 171

خصوصی مضامین

شمع ہدایت — اختر شجاعت 240

پاکیزہ کے مہمان — شائستہ زریں 247

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

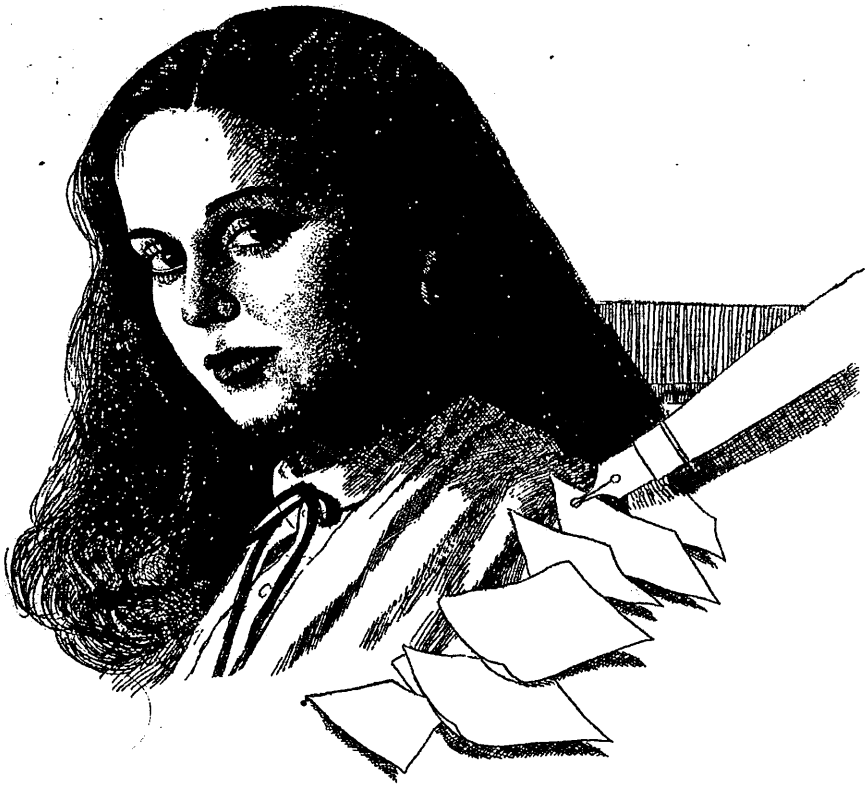

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	08	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین	278
گوشۂ ظرافت	ادارہ	256	بزم پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں	280
بہنوں کی محفل	مدیرہ	258	روحانی مشورے	ادارہ	282
پاکیزہ ڈائری	آمنہ حماد	272	حسن نکھار کے لیے	مہ جبیں	284
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	276	ہومیوکلینک		286

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

ایجنٹ و قارئین متوجہ ہوں

تمام ایجنٹ حضرات/قارئین کرام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی طرف سے اب مندرجہ ذیل تاریخوں میں ڈائجسٹ جاری کیے جائیں گے۔

نئے شمارے اکتوبر 2020ء سے ان تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ہر ماہ کی 20 تاریخ تک

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
ہر ماہ کی 25 تاریخ تک

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
ہر ماہ کی 30 تاریخ تک

ماہنامہ سرگزشت کراچی
ہر ماہ کی 03 تاریخ تک

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200 -(021) , 35895313-(021)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے……!

معزز قارئین……السلام علیکم!

یہ امر مسلّمہ ہے کہ امید پر دنیا قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔ہم سب کا مالکِ حقیقی ہر بچے کی پیدائش کے ساتھ یہی پیغام دیتا نظر آتا ہے کہ "امید پر دنیا قائم ہے"……ایک بیج سے لے کر پودے کی نشوونما اور پھل پھول آنے تک ہمیں یہی خوبصورت پیغام نظر آتا ہے مگر پھر بھی کیا وجہ ہے کہ جا بجا بکھرے مظاہرِ قدرت بھی ہمیں مایوسیوں کے اندھیروں سے نہیں نکال پاتے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ ناامیدی کے سمندر میں غوطہ زن رہنے سے موتی ملے گا نہ کنارہ……

ہم انسان اشرف المخلوقات ہیں۔ہمیں خود اپنی عقل و فہم سے وہ چراغ، وہ قندیلیں روشن کرنا ہوں گی جو کہ آگے بڑھنے کی راہیں تلاش کرنے میں مدد دیتی ہیں اور خیالات کے تاریک غاروں سے نکالنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اُمید دراصل کسی بھی شعبے میں ترقی حاصل کرنے کا پہلا زینہ ہے۔یہ پُرامیدی ہی تو ہے جو ہر تاریک رات کے بعد ایک روشن، چمک دار صبح کی آمد کا اعلان کرتی ہے……اور ہر ذی شعور آس و نراس کی اسی کیفیت سے گزر کر اس میں سے مثبت پہلو تلاش کرتے ہوئے اپنے مقصدِ حیات کی طرف گامزن ہوتا ہے۔جس کے سامنے کوئی واضح مقصد زندگی نہ ہو، کوئی روشن فکری نہ ہو تو وہ ناامیدی کی دلدل میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور وہ صرف خود کو ہی نہیں بلکہ نسلوں کی نسلیں تباہ کر دیتا ہے۔

ناامیدی ایسا زہرِ نادیدہ ہے جو انسان کو لحہ بہ لحہ مارتا جاتا ہے۔آپ اس کا عملی تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ایک ناامید اور انتہائی مایوس شخص کے ساتھ گزارے گئے چند دقیقے آپ کو فکری، ذہنی و اخلاقی طور پر تباہ کرنے کو کافی ہوں گے۔

لہٰذا خوش امیدی کی طرف راغب رہنا اور مثبت اندازِ فکر اختیار کرنا ہی آگے بڑھنے کی ضمانت ہے۔قدرتِ الٰہی انسانی قلب و نظر سیراب کرنے کو ہمہ وقت تیار ہے بشرطیکہ ہم اپنی بصارت و بصیرت کو بیدار رکھیں۔

شاخِ بُریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

مدیرہ

نزہت اصغر

اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے بہت زمانوں والوں کو ہلاک کر دیا۔ جبکہ انہوں نے ظلم کیے۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلیلیں لے کر آئے تھے اور وہ ایسے نہ ہوئے کہ ایمان لے آتے۔ اسی طرح ہم مجرموں کی قوم کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (۱۳) پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں (ان کے) جانشین بنا دیا۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔ (۱۴) اور جب ان پر ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں (تو) وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسے بدل دو۔ (اے رسول) کہہ دو کہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو میں بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (۱۵) (اے رسول) کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو میں اسے تم پر نہ پڑھتا اور نہ تمہیں اس سے آگاہ کرتا پھر میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر رہا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (۱۶) پس اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ موٹ بہتان باندھا۔ یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا۔ یقیناً مجرم فلاح نہیں پاتے۔ (۱۷) اور وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں ضرر پہنچاتی ہے اور نہ انہیں فائدہ دیتی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دو کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو، جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں، اس کی ذات پاک و برتر ہے ان چیزوں سے جنہیں وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ (۱۸) اور لوگ ایک ہی امت تھے پھر انہوں نے اختلاف کیا۔ اور اگر تیرے پروردگار کی طرف ایک بات پہلے سے نہ ہو چکی ہوتی تو جس بات میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں اس میں ان کے درمیان ضرور ہی فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ (۱۹) اور وہ کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں کوئی آیت نہیں نازل کی جاتی۔ پس تم کہہ دو کہ ماسوا اس کے نہیں ہے کہ غیب تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ پس تم انتظار کرو۔ بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (۲۰) اور ہم نے جب لوگوں کو بعد اس کے کہ ان کو کوئی تکلیف پہنچی کسی رحمت کا مزہ چکھایا تو وہ ہماری آیتوں کے بارے میں تدبیریں کرنے لگے۔ (اے رسول) کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے میں بہت جلدی کرنے والا ہے۔ یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) جو تدبیریں تم کرتے ہو لکھتے جاتے ہیں۔ (۲۱) (اللہ) وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوئے اور وہ لوگوں کو ساتھ لے کر اچھی (موافق) ہوا کی مدد سے چلیں۔ اور وہ (لوگ) اس سے خوش ہوئے کہ (اچانک) انہیں تیز و تند ہوا (آندھی) نے آلیا۔ اور انہیں ہر طرف سے (پانی) کی لہروں نے آگھیرا۔ اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یقیناً وہ گھر گئے تو خلوصِ دل سے اس کے مطیع ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگے۔ کہ اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے۔ (۲۲)

(سورۂ یونس ۱۰ پارہ ۱۱ آیات ۱۳ تا ۲۲)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ سَیِّدِ الْقُرَشِیِّ ﷺ

سید کونین ختم المرسلین افضل الانبیا، سرور کائنات رحمۃ العالمین حبیب خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسبی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا قرشی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کے معنی ومفہوم قریشی، خاندان قریش سے تعلق رکھنے والے کے ہیں۔

1۔ **تفصیل مفہوم:** بنو قریش حضرت ابراہیمؑ کے فرزند اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسل میں سے جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھا۔ اس خاندان سے نسبت کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریشی کہلائے۔ قریش کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اختلاف ہے۔

ابن اسحاق نے کہا کہ قریش کو قریش اس لیے کہتے ہیں کہ متفرق ہونے کے بعد پھر ایک جگہ جمع ہوئے اور جمع ہونے کو تقرش کہتے ہیں۔

2۔ **القرآن:** ترجمہ: اور اپنے قریب کے رشتے داروں کو ڈر سناؤ۔
(الشعراء۔214)

3۔ **الحدیث:** ا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ ''یہ خلافت قریش میں رہے گی جب تک دنیا میں ان کے دو آدمی بھی باقی ہیں۔'' (بخاری)

۲۔ ابن عباسؓ الا المودۃ فی القربیٰ کی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں کہ سعید بن جبیر نے کہا کہ قربیٰ سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت ہے اور فرمایا قریش کا کوئی بطن نہیں مگر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے ساتھ قرابت حاصل ہے۔ اس بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ ''میرے اور اپنے درمیان قرابت کا خیال کرو اور صلۂ رحمی کرو۔'' (بخاری)

4۔ **الرائے:** ہم مسلسل دیکھتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ظلم، زیادتی، بے رحمی اور سفاکی کے جذبات کبھی ظاہر نہیں ہوئے۔ اپنی فتح کے لیے انسانی جانوں کی من مانی قربانی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیوہ نہیں رہا۔ جس امید کا چراغ ان کے سینے میں جل رہا تھا وہ یہی تھا کہ کسی طرح قریش آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمنوا ہو جائیں۔ ان کی ہمنوائی ہی وہ واحد بات تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے فتح وشادمانی کا سامان فراہم کر سکتی تھی۔
(سرجان گلب پاشا)

5۔ **الفضائل:** اگر کوئی عزت ومرتبے کا خواہاں ہو تو وہ روزانہ باوضو حالت میں 100 مرتبہ اس اسم پاک ''سیدنا قرشی'' کو پڑھنے کا معمول بنالے۔ ان شاء اللہ اسے مطلوبہ مقصد میں کامیابی ہوگی۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

زندگی کبھی کبھی انسان کو ایسے کربناک حادثے سے دوچار کر دیتی ہے کہ اس کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جا سکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جا سکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا...
مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے ۔۔۔ حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے
عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے ۔۔۔ خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

میرا سارا زنگ اتار دو

سلسلے وار ناول

افشاں آفریدی

Ayisha '86

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ چچی کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھالی تھی۔ عکرمہ دادی سے کہتا ہے کہ چچا جان کو دُرِ مکنون کی تعلیم شروع کروا دینی چاہیے۔ ایک رات دُرِ مکنون کی طبیعت خراب ہونے پر دادی اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ عکرمہ، زوہا، ردا اور دُرِ مکنون کو شاپنگ پر لے کر جاتا ہے تو زوہا بتاتی ہے کہ زارا (مظفر صاحب کی دوسرے نمبر کی بیٹی) کے ساتھ اس کی نند خولہ آ رہی ہے اور شاید وہ دادی کو پسند ہے۔ دُرِ مکنون سوچتی ہے کہ کیا واقعی وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے محسنوں کی خوشی کو دھندلا رہی ہے۔ اسٹڈی میں دُرِ مکنون کو دیکھ کر آنسو بہاتے مظفر شیرازی، عکرمہ کے ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے تھے۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوانی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ خولہ، دُرِ مکنون سے عکرمہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اگر آپ اس گھر میں بہو بن کر آئیں تو بہت خوش رہیں گی، اس جملے کو سن کر عکرمہ ایک انجانے سے احساس سے دوچار ہوا تھا۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کو بھی شام کو گھر پر رہنے کا کہتی ہیں۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آ جاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آ جاتا ہے زاویار کو دیکھ کر دُرِ مکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ دُرِ مکنون کے بے ہوش ہونے پر مظفر صاحب چراغ پا ہو جاتے ہیں اور سائرہ بیگم بھی یہ عہد کر لیتی ہیں کہ کم از کم ردا کی شادی تک وہ اس معاملے کو نہیں چھیڑیں گی۔ دُرِ مکنون سوچ رہی تھی کہ زاویار بنا کسی احساسِ جرم کے کس اطمینان سے نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہے۔ عبید اور ان کی فیملی ردا کی شادی پر نہیں آ رہے تھے اس خبر سے دادی کافی دلگرفتہ تھیں..... دُرِ مکنون کو پتا چلتا ہے کہ دادی نے خولہ کے رشتے سے منع کر دیا ہے تو اسے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ عینی، دُرِ مکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ دُرِ مکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کے بعد عکرمہ اور سیف کی فیملی اس کی ذمے داری نہیں اٹھا سکے گی۔ عکرمہ گھر آتا ہے تو شہرین اسے باہر ملتی ہے جو خولہ کو لینے آئی تھی کیونکہ اس کے بھائی یعنی خولہ کے منگیتر آ رہے ہیں۔ عکرمہ اندر آتا ہے تو دُرِ مکنون بتاتی ہیں کہ کوئی طاہرہ آنٹی آئی ہیں، عکرمہ بہت تیزی سے ان سے ملنے کے لیے جاتا ہے۔ دادی طاہرہ آنٹی کو بتاتی ہیں کہ والدین کے انتقال کے بعد وہ ان کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ردا کے نکاح کی تقریب کے بعد خولہ تھوڑی دیر دُرِ مکنون کے کمرے میں جاتی ہے تو اسے باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عکرمہ نے دُرِ مکنون کی وجہ سے انکار نہیں کیا ہے۔ عکرمہ، دُرِ مکنون کو کہتا ہے جب تک ردا کی شادی ہے وہ دادی کے پاس سوئے۔ رات کو سوتے میں دُرِ مکنون ڈر جاتی ہے تو دادی اس کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ اظہار صاحب اپنی فیملی کے ساتھ اپنے رشتے داروں میں جا رہے ہیں تو دُرِ مکنون کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنی کلاس لے کر آتا ہے تو دادی سے پوچھتا ہے دُرِ مکنون کے بارے میں تو وہ اسے مطمئن کر دیتی ہیں۔ طاہرہ بانو فون کر کے دادی کو بتاتی ہیں کہ وہ دُرِ مکنون کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں تو دادی عکرمہ اور مظفر صاحب کو بتاتی ہیں کہ انہوں نے طاہرہ کو دُرِ مکنون کی میڈیکل فائل زوبا کے ذریعے دے دی ہے۔ طاہرہ بانو، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ عکرمہ کی والدہ شگفتہ ان کی دوست ہی نہیں دودھ شریک بہن بھی تھی، وہ بھی اکلوتی اور یہ خود بھی اکلوتی اور دونوں کو بیٹی کا بہت شوق تھا اور دونوں کے بیٹی نہیں تھی اور دونوں کے والدین کا انتقال ایک ہی سال ہوا۔ اور آشیانے کی زمین بھی ان کو عکرمہ کے والد نصر بھائی نے دلوائی تھی۔ دُرِ مکنون جب طاہرہ بانو کے پاس سے واپس آتی ہے تو عینی کا فون آتا ہے اس کے فون رکھتے ہی دوبارہ بیل ہوتی ہے تو وہ عینی کا ہی سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن وہ زاویار کا فون تھا اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے دُرِ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ دُرِ مکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ طاہرہ آنٹی اپنی بھانجی ڈاکٹر فارینہ سے دُرِ مکنون کو ملواتی ہیں جو اُن کی مدد کے لیے آئی ہے۔ دادی عکرمہ کے لیے فارینہ کا سوچتی ہیں۔ ردا کی شادی میں سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو ایک فیملی سے ملواتی ہیں رخصتی کے بعد آصف اپنی پھپھو کو ائیر پورٹ چھوڑنے جاتا ہے تو واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آصف کا آپریشن تھا تو سب اسپتال میں تھے اظہار صاحب کو اپنی فیملی کے ساتھ واپس جانا تھا عکرمہ ٹکٹ لے کر آتا ہے، تو اظہار اسپتال میں نہیں تھے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور زوہا کے ساتھ گھر آ جاتا ہے، سیڑھیوں پر دُرِ مکنون کا دوپٹا پڑا دیکھ کر وہ دادی

کے کمرے کا دروازہ بجاڈالتا ہے۔شہرین، میمونہ بیگم کو زاویار کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔جلال انصاری (آغا جان)، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کرلیں۔عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔شہریار انصاری، زاویار کو فون کرتے ہیں اور زاویار کے بدتمیزی سے جواب دینے پر فون بند کردیتے ہیں۔میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔زاویار تین سال پہلے کے اس منظر سے کسی طرح نکل نہیں پا رہا تھا۔زاویار، نازیہ سے کہتا ہے کہ وہ دُرِ مکنون سے ملنا چاہتا ہے تو نازیہ ہامی بھر لیتی ہیں۔شیری، عاصمہ لاج پہنچتی ہے تو اسے زاویار کے ایکسیڈنٹ کا پتا چلتا ہے۔وہ مولا بخش کے ساتھ ہی اسپتال جاتی ہے پھر زاویار کی حالت دیکھ کر خولہ کو فون کر کے بلاتی ہے تو زارا بھابی، اظہار بھائی اور خولہ کے ساتھ عکرمہ بھی اسپتال آتا ہے۔عاصمہ، زاویار کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی ہیں۔تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے، ان کے ساتھ شہریار اور عینی بھی تھے۔آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کرلو.....لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔شیری کھانا لے کر آتی ہے تو اس کو بتاتی ہے درمکنون، زارا بھابی کی کزن ہے اور وہ اس کے لیے ہاں کب کر رہا ہے وہ اور عینی جا کر اسے زاویار کے نام سے چھیڑیں گی۔جس پر زاویار غصہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کے معاملات سے دور رہے اور کسی سے کچھ نہ کہے۔آغا جان نے عاصمہ سے کہا کہ وہ زاویار کو شہرین کے لیے راضی کریں اور وہ یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ وہ یہ کیسے کریں گی۔نازیہ انہیں کہتی ہیں اگر انہیں درمکنون پسند ہے تو مہران کے لیے بات کرلیں لیکن یہ بات عاصمہ کو صحیح نہیں لگتی۔خولہ، شہرین کو اسپتال جانے سے روکتی ہے لیکن وہ اس کی بات نہیں سنتی۔شیری، خولہ سے پوچھتی ہے کہ اس نے عکرمہ کے بجائے طارق کے لیے ہامی کیسے بھر لی۔عکرمہ سے دستبردار ہونا خولہ کے لیے تکلیف دہ تھا ضرور لیکن وہ یہ بات کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کرسکتا۔عینی، زاویار کو بتاتی ہے کہ شہرین نے اسے درمکنون سے ملوایا۔عاصمہ صبح صبح اسپتال آجاتی ہیں زاویار کے پوچھنے پر وہ بتاتی ہیں کیونکہ تمہارے پاپا کی فلائٹ ہے اور وہ تم سے ملنے آئیں گے تو میں ان کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں، زاویار کہتا ہے کہ آپ اس انسان کے لیے اچھا کیسے سوچ سکتی ہیں جس نے مجھے، آپ سے جدا کردیا اس پر وہ کہتی ہیں کہ وہ پرانی بات تھی اب تم میرے ساتھ ہو اس لیے جب شہریار انصاری اور آغا جان آئے تو زاویار نے اپنے منفی جذبات پر کسی حد تک قابو پالیا تھا۔وہ لوگ زاویار کو اسپتال سے چھٹی ہونے پر اپنے ساتھ لے جانے آتے ہیں تو وہ انکار کردیتا ہے۔جس پر وہ کہتے ہیں کہ میمونہ نے کل جو تقریب رکھی ہے اس میں ضرور آنا تو وہ ہامی بھر لیتا ہے، گھر آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے جہاں مولا بخش کا فون آتا ہے تو وہ بغیر کسی کو بتائے گاڑی لے کر نکل جاتا ہے۔زاویار، عاصمہ سے کہتا ہے کہ وہ مولا بخش کی مدد کرنے گیا تھا عاصمہ اس پر غصہ ہوتی ہیں کہ ایسے معاملات سے دور رہے اور آئندہ بغیر بتائے نہ جائے۔زاویار کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے عاصمہ ریوالور دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں۔زاویار، طارق اور خولہ کی انگیجمنٹ میں جاتا ہے تو طارق اس کے اور آغا جان کے درمیان ہونے والی ناراضی پر بات کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ان باتوں کو چھوڑو اور اپنی خوشی کو انجوائے کرو۔زاویار سوچتا ہے کہ اس نے فون کر کے انجانے میں درمکنون کو مزید اذیت نہ دی ہو۔عاصمہ، زاویار کو جلال انصاری کا فیصلہ ماننے کے لیے راضی کرنا چاہتی ہیں تو وہ بتاتا ہے کیونکہ طارق اپنی کسی ڈاکٹر کولیگ میں انٹرسٹڈ تھا اس لیے آغا جان نے طارق کو خولہ سے منسوب کردیا حالانکہ شہریار انصاری، طارق سے عینی کا رشتہ کرنا چاہتے تھے یہ انکشاف سن کر وہ حیران رہ جاتی ہیں۔عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔آغا جان، شہرین کے ساتھ زوی سے ملنے آتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ زاویار شادی کرے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں نہ کے سوا کچھ نہیں۔عینی کے کہنے پر زاویار اسے ردا کی شادی میں لے کر جاتا ہے تو وہاں عکرمہ اس کی طبیعت پوچھتا ہے۔شہرین، زاویار سے کہتی ہے کہ اسے زارا بھابی کے بہنوئی کو دیکھنے جانا چاہیے اور اس سے پوچھتی ہے کہ دُرِ مکنون تم سے اتنا ڈرتی کیوں ہے۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 19

اس دوران زوہا بھی اوپر آگئی تھی۔اسے عکرمہ کا انداز حیران کیے دے رہا تھا۔کہاں تو وہ گھر آنے کے لیے

اتاؤلا تھا کہ اس کے کولیگ کو کچھ ہی دیر میں پہنچ جانا تھا اور کہاں سب کچھ بھلائے وہ اوپر آ گیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' اسے کئی بار دستک دیتا دیکھ کر وہ بول پڑی۔

''دُرِمکنون دروازہ نہیں کھول رہیں۔ تم آواز دو زوہا۔''

اس نے بہت فکرمندی سے پلٹ کر جواب دیا تو زوہا متحیر سی آگے بڑھ آئی اور پھر وہ دونوں کئی منٹوں تک دروازہ کھٹکھٹاتے رہے۔ آوازیں دیتے رہے۔ مگر دُرِمکنون کو دروازہ کھولنا تھا نہ اس نے کھولا۔

عکرمہ کوارٹر جا کر نوکروں سے بھی پوچھ آیا۔ ان کے مطابق بھی دُرِمکنون گھر پر ہی تھی۔ طاہرہ آنٹی اور فارینہ سے بھی کانٹیکٹ کیا تو پتا چلا وہ کہیں انوائٹڈ ہیں۔ اس لیے گھر پر نہ ملیں۔

''میرا خیال ہے دروازہ کھولنا چاہیے۔ ماسٹر کی کہاں ہے گھر کی۔'' وہ پلٹ کر اوپر آیا تو دیکھا زوہا بہت پریشان سی دروازہ پیٹے جا رہی تھی۔

''میمی کے کمرے میں ہوتی ہیں۔ تم رکو میں لاتی ہوں۔'' فکرمندی سے کہتے ہوئے زوہا نے نیچے کی راہ لی۔

ذرا دیر بعد ہی وہ چابی سمیت حاضر تھی۔

اور دروازہ کھولنے پر جو منظر دیکھا۔ اس نے دونوں کو دہشت زدہ کر دیا۔

دُرِمکنون کمرے کے انتہائی سرے پر دیوار کے قریب زمین پر اوندھے منہ پڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

پتا نہیں یہ شہرین کی ملامت کا اثر تھا یا کوئی اور بات۔ وہ آصف کی خیریت دریافت کرنے نہ چاہتے ہوئے بھی اسپتال آ گیا تھا۔

راستے سے بکے خریدتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں جنگ چل رہی تھی کہ آیا اسے شیرازی فیملی کا دکھ بانٹنے جانا بھی چاہیے یا نہیں۔

جن دنوں وہ خود اسپتال میں ایڈمٹ تھا۔ وہاں سے تقریباً سب ہی آئے تھے اور یقیناً اسے پہچان بھی چکے تھے۔ یہ وہ ہی تو تھا۔ جس نے ان کی بیٹی دُرِمکنون کے لیے انکار کیا تھا مگر پھر بھی سب کا رویہ کس قدر مہذب اور ہمدردانہ تھا۔

لہٰذا اس نے خود کو سمجھا بجھا کر یہاں آنے پر آمادہ کیا۔

گو کہ دوپہر کا وقت تھا مگر کمرے میں سوائے آصف کے اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ لہٰذا تعارف کراتے ہوئے مصافحہ کیا۔

اسے لمحے بھر کے لیے پچھتاوا ہوا کہ آنے سے پہلے کسی کو انفارم ہی کر دیتا۔ پھر خیال آیا کہ اچھا ہی ہوا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ خاص طور پر وہ سائرہ شیرازی کو فیس کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

آصف کا مزاج دوستانہ تھا۔ لہٰذا زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا اور دونوں کے مابین گفتگو شروع ہو گئی۔

پندرہ منٹ تک جب کوئی نہیں آیا تو اس نے خود ہی سوال کر لیا۔

''شیرازی انکل یا اُن کی فیملی میں سے کوئی نہیں ہے آپ کے پاس؟ کہاں ہیں وہ لوگ؟''

''ان فیکٹ۔ ردا کی کزن دُرِمکنون کی کل اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بھی اسی اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ سب لوگ بہت پریشان ہیں۔ اس لیے ابھی ڈاکٹرز کے بلانے پر اُن کے پاس گئے ہیں۔''

آصف نے بتایا تو اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ یہاں آتے ہوئے دُرِمکنون کا خیال اس کی سوچ کو بار بار جکڑ لیتا تھا مگر یہاں آ کر اس کے بارے میں یہ خبر سننے کو ملے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟'' بہت ضبط کے ساتھ اس نے بظاہر رسانیت سے رسماً پوچھا تھا۔ مگر یہ اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس لمحے دل پر جیسے چھری سی چل گئی تھی۔

''غالباً فوڈ پوائزن ہو گیا ہے۔ کل سے ICU میں ہے وہ۔''

آصف خود پلاسٹر میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر دُرِ مکنون کے لیے ہمدردی سے بولا۔

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟'' اس نے خود کو سرد پڑتا محسوس کیا تھا اس لمحے۔

''پتا نہیں۔ آج یہ لوگ میٹنگ کے لیے گئے ہیں۔ آئیں گے تو پتا چلے گا۔'' آصف نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اجازت طلب کی۔

وہ آصف کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر مصافحہ کر کے باہر نکل آیا۔ کاریڈور میں ہی اسے ڈاکٹر گوہر مل گئے۔ یہ عاصمہ کے قریبی جاننے والوں میں سے تھے۔

وہ غائب دماغی سے کچھ سوچتا جا رہا تھا کہ ان پر نظر پڑتے ہی بلا ارادہ ان کی طرف بڑھتا چلا آیا۔

سلام دعا کے بعد اس نے بلا تمہید دُرِ مکنون کے متعلق پوچھ ڈالا۔ وہ اس وقت ICU کی طرف سے ہی راؤنڈ لگا کر آئے تھے۔ انہوں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو اسے کہنا ہی پڑا۔

''وہ میری شناسا ہیں۔ ان فیکٹ میری سسٹر کی بیسٹ فرینڈ ہیں اور ہماری نیبر (پڑوسی) بھی تھیں۔'' گہری سانس بھر کر اس نے اپنا تعلق بتایا تو ڈاکٹر گوہر نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''سیویئر نروس بریک ڈاؤن کا کیس ہے اور حالت خاصی نازک ہے۔'' اسے اندازہ تھا کہ آصف نے اسے صحیح بات نہیں بتائی ہے۔ اب یاد آتا تو وہ خود لاعلم تھا۔ یا شاید اسے منع کیا گیا تھا۔ کچھ بھی تھا یہ اطلاع اسے اپنے اعصاب کے لیے کسی بم دھماکے سے کم نہ لگی۔

''وجہ کیا ہو سکتی ہے اس کی؟''

اس نے شکستہ لہجے میں یوں دریافت کیا۔ جیسے دُرِ مکنون کی اس حالت کا ذمے دار وہ خود ہو۔

''انتہائی درجے کا خوف۔ کوئی بری خبر۔ یا پھر کوئی شدید صدمہ۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے ینگ مین۔ باقی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ so let's hope for the best''

اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے انہوں نے گویا ہمت بندھائی تھی۔ مگر وہ بس خالی، خالی نظروں سے انہیں جاتا دیکھتا نہ جانے کتنی دیر وہیں کھڑا رہا اور جب خود میں لوٹا تو جیسے شکست و ریخت سے اس کے کندھے شل تھے۔

عاصمہ لاج کے راستے پر گاڑی ڈالتے ہوئے اس کے ذہن میں مہران اور دُرِ مکنون دونوں گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ کتنی ہی دیر سے لان ٹیبل پر رکھی اس چھوٹی سی چیز کو تکے جا رہا تھا۔ جسے وہ بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ چھوٹی سی گولڈن پنسل کی شکل میں ڈھلا دھات کا یہ ٹکڑا درحقیقت ایک لائٹر تھا۔ جو کہ gold plated تھا اور اس کے دستے پر لگے نگینے اسے انتہائی خوب صورت بناتے تھے۔

یہ لائٹر اظہار صاحب کا فیورٹ ترین تھا اور انہیں ان کے کسی عرب دوست سے تحفتاً ملا تھا۔

کوئی گھنٹا بھر پہلے جب وہ اسپتال سے لوٹا تو یہ اسے واچ مین نے لا کر دیا تھا اور اس کے بیان کے مطابق یہ لائٹر اسے کل گیٹ کے پاس گرا نظر آیا تھا۔

کل ہمیشہ کی طرح وہ ملازم عصر کی نماز پڑھنے اپنے کوارٹر میں گیا تھا اور جب واپس آیا تو ادھ کھلے گیٹ کے

پاس گرے اس گولڈن لائٹر نے اسے متوجہ کرلیا تھا۔
عکرمہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ کل دوپہر لنچ ٹیبل پر زارا نے اظہار صاحب کو یہ لائٹر دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ پھر سے اس کو اِدھر، اُدھر رکھ کر بھول نہ جائیں۔ پھر اس کے بعد وہ سب عکرمہ کے ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔ راستے میں بھی کار کے اندر اظہار صاحب نے اسموکنگ کا شغل کیا تھا اور اس وقت بھی یہی لائٹر ان کے پاس موجود تھا۔ پھر یہ واپس یہاں شیرازی ولا کے گیٹ تک کیسے آیا۔ زارا اور ان کا ارادہ اسپتال سے ڈائریکٹ ائرپورٹ جانے کا تھا۔
عکرمہ انہیں وہاں ڈراپ کر کے ٹکٹس کے لیے چلا گیا تھا۔ اور اب وہ بیٹھا گہری سوچ میں مستغرق تھا۔
بات بہت مشکل نہیں تھی، اور نہ ہی یہ کوئی معما تھا کہ وہ اسے حل نہ کرسکتا ہو۔ جوں، جوں وہ سوچتا جارہا تھا۔ توں، توں اس کے ماتھے کی رگیں تن رہی تھیں۔
اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارے سامنے چلے آئے تھے۔ اس نے خود کو انتہائی بے بس محسوس کیا۔ اس کے ہوتے ہوئے اور شیرازی ولا کے مکینوں کی انتہائی کوشش کے باوجود دُرِمکنون کو اس ناخوشگواریت سے گزرنا پڑا تھا۔
اس نے اپنے لاشعور کے سگنل دینے کے باعث خود کو بہت چوکنا رکھا تھا مگر اظہار صاحب خاصے ماہر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے بازی جیتنے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ گوکہ وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ مگر اس ممکنہ حادثے کے خوف سے دُرِمکنون موت کے منہ تک جا پہنچی تھی۔
''عکرمہ..... چائے۔'' اسے خیالات کی بہتی رو جانے کہاں سے کہاں لے گئی تھی... کہ زوہا کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں واپس کھینچ لائی۔
''تھینکس۔'' پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔
عکرمہ کی چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں۔ لہٰذا صبح اسے بہرطور انسٹی ٹیوٹ جانا تھا۔ واپسی پر وہ اسپتال گیا تھا۔ اور اب وہاں سے لوٹا تو یہ لائٹر اس کی کل کی تمام الجھنوں کو سلجھا کے، اس کے گمان کو یقین بخش کے اس کے سوالات کا جواب بن گیا تھا۔
''عکرمہ، تم کیا سوچ رہے ہو اتنی دیر سے... میں نے کچن کی ونڈو سے دیکھا۔ تم کتنی ہی دیر سے گم صم بیٹھے ہو۔ سب ٹھیک ہے ناں؟''
''ہوں۔'' اس نے گہری سانس بھر کر کپ لبوں سے لگالیا اور زوہا اس دوران اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کی سوچ کا عنوان پڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اس کی نظروں کے کاارتکاز ٹیبل کی طرف دیکھ کر اس طرف متوجہ ہوئی۔
''ارے، اجی بھائی کا لائٹر تو یہیں رہ گیا عکرمہ۔''
اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹر اٹھالیا تھا۔ عکرمہ نے سر ہلادیا۔
''تمہیں کہاں سے ملا یہ؟''
''واچ میں نے لاکر دیا۔''
''چچ۔ چچ۔ اجی بھائی ڈھونڈ رہے ہوں گے اسے۔''
زوہا نے لائٹر کو آن آف کرتے ہوئے افسوس سے کہا۔
''کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ میں انہیں کوریئر کردوں گا۔ تم اسے میرے کمرے میں رکھ دینا۔'' ماتھے پر شکنیں لیے اس نے کہا تو زوہا نے غائب دماغی سے سر ہلادیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ جسے زوہا کی فکرمند آواز نے توڑا۔

''مجھے دری کی فکر ہے عکرمہ۔ کیا ہوگیا ہے اسے اچانک۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی شدید صدمہ یا حد درجے کا خوف سبب بنا ہے اس نروس بریک ڈاؤن کا۔'' لائٹر واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ فکرمندی اور افسردگی سے کہنے لگی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وجہ ہوسکتی ہے؟'' زوہا بہت پریشان تھی۔ بے اختیار آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

''کاش کہ میں تمہیں وجہ بتا سکتا۔'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے سوچا اور پھر زوہا کی طرف دلاسہ دینے والے انداز میں دیکھ کر افسردگی سے مسکرا دیا۔

''وہ ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ تم بس دعا کرو۔ چچا جان اور دادی کے لیے یہ دوسرا شاک ہے۔ چچی جان بھی آصف اور ردا کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہیں۔ ایسے میں تم ہی ان سب کی ڈھارس ہو۔ پلیز زوہا ہمت کرو۔'' کپ میز پر رکھ کر وہ ہمت دلانے والے انداز میں بولا تھا۔

''ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم حوصلہ رکھو۔''

اس کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس نے بہت ملائمت سے کہا تھا۔

''سچ!'' زوہا نے سر اٹھا کر اسے بہت امید سے دیکھا تھا۔

بالکل اسی لہجے میں ابھی چند دن پہلے دُرِمکنون نے اس سے یقین مانگا تھا۔ جب اسپتال میں آصف زندگی و موت سے جنگ لڑ رہا تھا اور اب آج یہ ہی یقین زوہا کو دُرِمکنون کی زندگی کے لیے درکار تھا۔

''مایوسی کفر ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ اور پلیز اٹھ کر منہ دھوؤ۔ دادی اور چچا جان کے پاس ایسی شکل لے کر مت جانا۔'' اسے سمجھاتے ہوئے اس نے کہا اور اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں کھانا لے کر اسپتال بھی جانا تھا۔

مگر اظہار صاحب کو وہ معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس نے سوچ رکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

''پیشنٹ کی حالت خطرے سے باہر نہیں۔ ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔ چھتیس گھنٹے گزر جانے کے باوجود بھی ہوش نہیں آیا۔ تو کوما میں جانے کا خدشہ ہے اور یہ کوما دو ہفتوں کا بھی ہوسکتا ہے۔ دو ماہ کا بھی اور اس کو زیادہ لمبا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتے۔''

زاویار انصاری کی اسپتال کے وارڈ بوائے سے دورانِ قیام اچھی سلام علیک ہوگئی تھی۔ اسی کے ذریعے یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی تھی اسے۔ ابھی صبح کے چھ ہی بجے تھے کہ اس نے فون کرلیا تھا۔ کل رات اسی وارڈ بوائے سے وہ اس کی ڈیوٹی کے اوقات معلوم کر کے لوٹا تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں اس کی ڈیوٹی ختم ہوجانی تھی۔ یہ معلومات اس وارڈ بوائے نے آن ڈیوٹی ڈاکٹر سے حاصل کی تھیں۔

اس کے ہاتھ میں پکڑا موبائل یک دم اس کے قدموں میں جا گرا تھا۔ یہ خبر تھی کہ خنجر جو دستے تک سینے میں گھونپ دیا گیا تھا۔ اسے سانس لینے میں شدید دشواری محسوس ہوئی۔

وہ گھبرا کر ٹیرس پر نکل آیا۔

''یا اللہ۔ بہت گناہ گار بندہ ہوں تیرا۔ کل جسے خود موت کے حوالے کر کے آیا تھا۔ آج اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ کل اپنی جان کی فکر تھی تو آج اس کی سانسیں عزیز ہیں۔ اپنی نظر سے دیکھوں تو کچھ ایسی پستی میں جا گرا ہوں کہ نگاہ اٹھانا محال ہے مگر پھر بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہا ہوں۔ اس مظلوم لڑکی کے حال پر رحم فرما۔ اسے

زندگی عطا کر میرے رب۔ نہیں تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔''

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اپنے مالکِ حقیقی سے لو لگاتے لگاتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اونچا لمبا مضبوط مرد دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''میں اس کی حفاظت نہیں کر سکا اماں۔ اسے دکھ، خوف اور خدشوں سے نہیں بچا سکا میں۔ زاہد سے کیا وعدہ پورا نہیں کر سکا میں۔''

دُرِ مکنون کو کوما میں گئے دو ہفتے ہو چکے تھے۔

مظفر شیرازی فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے لوٹے تو سیدھا ماں کے پاس چلے آئے۔ جن کی قربت میں انہیں بڑا سکون ملتا تھا۔

''مایوسی کی باتیں نہیں کرتے مظفر میاں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ دیکھو تو اللہ کے کرم سے آصف میاں گھر آ گئے ہیں۔'' اماں نے جیسے کوئی درد اپنے اندر اتار کر بیٹے کو جواب دیا تھا۔

آصف کو کہ گھر آ گیا تھا مگر وہیل چیئر پر۔

اس کا دکھ ہی کچھ کم نہ تھا۔ اس پر دُرِ مکنون کا کوما میں چلے جانا۔ سائرہ شیرازی کے علاوہ ہر ایک کو اس خبر نے دھچکا پہنچایا تھا۔ خاص طور پر مظفر صاحب کو جنہوں نے مرتے ہوئے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ دُرِ مکنون کو وہ ہر طرح کی خوشی دیں گے اور عکرمہ شیرازی کو۔ جس نے کہیں اندر ہی اپنے لاشعور میں خود سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دُرِ مکنون کو ہر طرح کے حادثے سے بچائے گا۔

شیرازی ولا کے دو مرد اپنے وعدے پورے نہ کر سکے۔ خود اسی خاندان کے ایک ہوس پرست درندہ صفت مرد کی وحشت کے باعث۔

''ان شاء اللہ، دُرِ مکنون بھی جلد گھر آ جائے گی۔ کل بھی ڈاکٹر کتنی امید افزا باتیں بتا رہا تھا۔ دل چھوٹا نہ کرو مظفر بیٹا!'' آنسو پیتے ہوئے اماں نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محبت سے کہا۔ اولاد خواہ کتنی ہی عمر والی کیوں نہ ہو جائے۔ ہوتی اولاد ہی ہے۔ اس کا ذرا سا بھی دکھ، ماں کو اداس کر دیتا ہے۔ جبکہ یہاں وہ اپنے بیٹے کو گویا زخموں سے دکھوں سے چور دیکھ رہی تھیں۔

''یہ سب کیسے ہو گیا اماں۔ میں خود کو کیسے معاف کروں۔''

مظفر شیرازی آنکھوں کو چھلکنے سے نہ بچا سکے۔

''سب تقدیر کا لکھا ہے بیٹا۔ اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ آپ کا کیا قصور ہے آپ نے تو اپنی طرف سے سب اچھا ہی کیا تھا اور دیکھنا کہ ان شاء اللہ میرا رب آپ کو اس کا بہت بڑا اجر دے گا۔''

''وہ ٹھیک ہو جائے گی ناں اماں۔'' وہ جیسے ناامیدی کے دریا میں امید کا، آس کا تنکا تلاش کر رہے تھے۔

''ان شاء اللہ!'' اماں نے حقیقتاً بہت یقین سے کہا۔

''اور آپ دیکھنا مظفر۔ جب وہ ٹھیک ہو کر گھر آئے گی تو ہم اس کا جشنِ صحت بہت خوشی سے منائیں گے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ اسی تقریب میں، میں اسے اپنے پوتے سے منسوب کر دوں گی۔ یہ سارا خوف اسے اکیلے پن کی وجہ سے ہے۔ جو آج اسے موت کے منہ تک لے گیا مگر جب زندگی کا ساتھی ملے گا تو وہ خود کو اس طرح اکیلا نہیں سمجھے گی، باقی رخصتی جب وہ چاہے گی جبھی کروں گی۔ مگر ایک مرد کے نام کی چھاؤں مل جائے گی تو پھر یہ خوف اس کا پیچھا چھوڑ دے گا اور زمانہ بھی۔'' انہوں نے جیسے دل ہی دل میں نہ جانے کیا، کیا سوچ رکھا تھا۔

مظفر صاحب نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔

''آپ کس کی بات کر رہی ہیں اماں؟'' گو کہ انہیں یقین تھا۔ اماں نے عکرمہ کے ساتھ ہی اسے منسوب کرنے کا سوچا ہوگا مگر جیسے دلی اطمینان کے لیے سوال کیا۔

''سیف کی۔''

دھماکا کہیں آس پاس ہی ہوا تھا۔ مظفر شیرازی کی ہستی جیسے لمحوں میں تہ و بالا ہوگئی۔

''دونوں میں عمر کا بھلے سال بھر کا ہی فرق ہے۔ مگر سیف اس سے بڑا ہی لگتا ہے۔ ماشاء اللہ..... قد اور جسامت میں اب وہ عکرمہ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور یوں بھی وہ دُرِ مکنون کا ہم عمر ہے۔ دونوں میں زیادہ اچھی ہم آہنگی ہوسکتی ہے اور پھر دری اس سے مانوس بھی ہے۔''

اماں نے جانے کہاں آگے تک کے خواب بُن رکھے تھے۔

مظفر ابھی ماں کی روشن خیالی اور وسعتِ قلبی سے جہاں متاثر ہوئے۔ اس سے کہیں زیادہ ''سیف'' کا نام ان کی بنیادوں کو ہلا گیا۔

''یہ ممکن نہیں ہے اماں۔'' بے ساختہ ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ لہجے اور انداز میں ایسی تڑپ تھی کہ اماں چند سیکنڈز کے لیے چپ سی رہ گئیں۔

''سائرہ کی وجہ سے؟'' ذرا توقف سے انہوں نے استفسار کر ڈالا تھا۔ مظفر شیرازی نے لب بھینچ کر گویا خود کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ اذیت ان کے چہرے پر صاف پڑھی جا رہی تھی۔

''سائرہ کی فکر مت کرو بیٹا۔ وہ سیف سے بہت محبت کرتی ہے۔ سیف کی ہر بات مانتی ہے۔ سیف کو ہم تیار کرلیں گے تو وہ اپنی ماں کو خود منالے گا۔ آپ خود دیکھنا یہ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ سائرہ سیف کو آج تک کسی بات کے لیے انکار نہیں کرسکی ہے۔''

اماں بیٹے کی اندرونی طور پر زیر و زبر ہوتی ہستی سے بے خبر سادگی سے کہے جا رہی تھیں۔

''نہیں... اماں ایسا کسی صورت نہیں ہوسکتا۔'' مظفر شیرازی نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔

کچھ تھا ان کے چہرے پر اماں کے دل کو جیسے کسی آگہی نے چھوا۔

''مگر کیوں مظفر؟'' ان کا استفسار کڑا تھا۔

مظفر شیرازی کہیں خلاؤں میں تکنے لگے۔ کیا جواب دیں ماں کو۔ وہ جیسے درد کی کسی منزل سے گزر رہے تھے۔

''کیا آپ بھی دنیا سے ڈر گئے ہیں مظفر میاں۔ مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔''

''ایسی بات نہیں ہے اماں!'' وہ جیسے رو دیے۔

''تو پھر انکار کی وجہ؟''

''بس اماں ایسا نہیں ہوسکتا۔ قیامت تک نہیں ہوسکتا۔''

''آخر کیوں..... اگر سائرہ اور سیف راضی ہو جائیں تب بھی نہیں؟''

''ہاں۔ تب بھی نہیں اماں۔ تب بھی نہیں۔ ایسا ہونا بھی ممکن نہیں ہوگا۔''

''مگر کیوں..... مظفر بیٹا؟ آخر کیوں؟ کس وجہ سے۔''

اماں نے جیسے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

''کیونکہ وہ میری بیٹی ہے اماں۔ دُرِ مکنون میری اور سائرہ کی سگی اولاد ہے۔ وہ سیف کی سگی بہن، آپ کی سگی پوتی ہے اماں۔ وہ میرا خون ہے۔'' یک دم وہ ماں کے گھٹنے پر سر رکھ کر رو دیے تھے۔

اماں جیسے اس انکشاف پر ساکت سی بیٹھی رہ گئیں۔
کتنے ہی لمحے گزرے۔ کمرے میں چھائی خاموشی کو مظفر شیرازی کے گریہ کی آواز ضرب لگاتی رہی۔ دُرِ مکنون ان کی پوتی ہے۔ یہ بھیانک انکشاف ان کے اندر اذیت کی کئی میخیں ایک ساتھ گاڑ گیا۔ وہ ان کا خون ہے۔ جو ایسے اندوہ ناک حادثے سے گزری ہے۔ جو اسی گھر میں اپنی سگی ماں کے ہاتھوں تذلیل کا نشانہ بنی رہی..... جو اپنے حق کو بھیک کی طرح وصول کرتی رہی ..... وہ ان کی اپنی اولاد ہے۔ ان کے بیٹے کا خون ہے۔ یہ وہ ''سود'' ہے جو ''اصل'' سے پیارا ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ سود ہی لٹ گیا۔ کس درجے کا خسارہ لکھا تھا رقمِ تقدیر نے ان کے حصے میں اور انہیں خبر بھی نہ تھی۔
''یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟'' ان کی آواز گویا کسی کھائی سے آئی تھی۔ آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح ان کے ضعیف چہرے کی جھریوں پر بہنے لگے تھے۔
''کیا واقعی... یہ سچ ہے مظفر میاں؟'' اماں کرب کی شدت سے بول نہیں پا رہی تھیں۔
مظفر شیرازی نے دکھ سے ماں کی طرف دیکھا اور بے بسی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔
''ہاں اماں، وہ میرا خون ہے۔ وہ میری سگی بیٹی ہے جسے میں نے زاہد اور صوفیہ کے حوالے کیا تھا کہ وہ یہاں سے زیادہ سکھ اور محبت پا سکے گی مگر میری کوئی تدبیر اسے اس تذلیل سے نہ بچا سکی اماں نہ بچا سکی۔'' مظفر شیرازی خود پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار پھوٹ، پھوٹ کر رو دیے۔

☆.....☆.....☆

''ایکسکیوزمی۔''
وہ نیورو سرجن اور برین اسپیشلسٹ سے مل کر دُرِ مکنون کے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ جب کسی کے پکارنے پر چونک کر مڑی۔
''جی.....!''
''آپ زارا بھابی کی سسٹر ہیں؟''
ہلکی سے بڑھی ہوئی شیو۔ آنکھوں میں رتجگے کی سرخی اور چہرے پر تمکنت لیے۔ وہ نوجوان سامنے کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔ زوہا نے اسے سرتا پیر دیکھا۔
بلو جینز اور بلیک پولو شرٹ میں ملبوس زاویار انصاری اسے پہلی ہی نظر میں خاصا متاثر کُن لگا۔ ہاتھ میں کار کی چین کو بے چینی سے گھماتا۔ وہ دراز قد اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''میں زاویار انصاری۔ اِظہار بھائی میرے کزن ہیں اور میری سسٹر عینی۔ اس سے شاید آپ واقف ہوں۔'' اپنا تعارف شائستہ طریقے سے کراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔
زوہا کو اسے پہچاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ردا کی شادی پر دُرِ مکنون کے توسط سے وہ عینی سے متعارف ہوئی تھی۔
''جی، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ کیسے ہیں آپ اور آپ کی فیملی؟'' زوہا کی آنکھوں میں الجھن سی تھی مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔
''سب ٹھیک ہیں۔ آپ سنائیں۔ آپ کی کزن کیسی ہیں؟'' جواباً اس نے بعجلت براہِ راست دُرِ مکنون کے لیے سوال کر ڈالا تھا۔
زوہا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''وہ ان فیکٹ۔ میرے ایک انکل یہاں ڈاکٹر ہیں۔ ان سے کسی کام کی وجہ سے ملنے آیا تھا تو عینی کا اصرار یاد

آ گیا۔ اس نے بطورِ خاص مجھ سے آپ کی کزن سسٹر کی خیریت پتا کروائی ہے۔'' اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال کر معتدل لہجے میں اپنے یہاں آنے کی وجہ بیان کی تو زوہا خوش دلی سے مسکرا دی۔

''وہ بہتر ہے پہلے سے۔ ابھی ابھی میں ڈاکٹرز کے پینل سے مل کر آ رہی ہوں۔ پچھلے دو ویکس کے مقابلے میں کل اس کے برین نے رسپانس دیا ہے۔ دو دن پہلے کی رپورٹس اور آج کی رپورٹس کا اگر موازنہ کریں تو وہ دھیرے، دھیرے ریکور کر رہی ہے۔ ڈاکٹرز آج بہت پُرامید ہیں۔''

اس خوش خبری کو جو ابھی وہ گھر والوں خاص طور پر پاپا سے شیئر کرنے کے لیے موبائل نکالنے ہی والی تھی۔ زاویار انصاری کے استفسار پر اس کو خوشی خوشی بتا گئی۔

امید اور مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

زاویار انصاری کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے اندر طمانیت کی بارش سی کر دی ہو۔ ایک پُرسکون سی مسکراہٹ نے ہلکے سے اس لبوں کو چھوا۔

''الحمدللہ۔'' ایک جذب سے اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''بلاشبہ۔ اللہ کا شکر ہے۔ پچھلے پندرہ دنوں میں پہلی بار ڈاکٹرز نے کچھ پوزیٹو بتایا ہے۔'' زوہا کی دلی مسرت عیاں تھی۔

''ان شاء اللہ۔ آگے بھی سب پازیٹو ہی ہوگا۔ بہت سے لوگوں کی دعائیں ہیں آپ کی کزن کے لیے۔ اطمینان رکھیں۔ وہ جلد صحت یاب ہوگی۔'' رسانیت سے کہتے ہوئے زاویار انصاری کا رواں، رواں جیسے شکر بجا لا رہا تھا۔

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' زوہا نے بے ساختہ کہا تھا۔

پھر زوہا نے اسے بہت روکا مگر وہ رکا نہیں اور ''پھر کبھی'' آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا گیا۔

جاتے ہوئے اس نے دھیان بھی نہیں دیا کہ دائیں کاریڈور سے اسی طرف آتے عکرمہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔ زوہا کے ساتھ اسے باتیں کرتا وہ دیکھ چکا تھا اور اب اس کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

''ارے..... تم آ گئے عکرمہ۔ سچ میں ابھی تم سب کو ہی کال کرنے لگی تھی۔'' زوہا کی نظر اس پر پڑی تو خوشی اور مسرت سے اس کی طرف بڑھتی چلی آئی۔

ڈاکٹرز سے ملنے والی اس چھوٹی سی امید کی کرن نے اس کا چہرہ جگمگا دیا تھا۔ وہ خوش تھی مگر عکرمہ تک قدم بڑھاتے، بڑھاتے جیسے اسے یاد آ گیا تھا کہ اسے بھی تو ڈاکٹرز کے پینل سے ملنا تھا۔

''مگر تم تھے کہاں۔ تمہیں تو پتا تھا ناں کہ آج ہماری ڈاکٹرز کے ساتھ میٹنگ فکسڈ تھی۔'' قریب آنے پر اس نے سنجیدگی اور قدرے خفگی سے عکرمہ کے پُرسوچ چہرے پر نظر ڈالی۔

''ہوں، آئی ایم سوری۔ میں وقت پر نہیں پہنچ سکا۔''

''حالانکہ تمہیں پہنچنا چاہیے تھا۔''

''ہوں۔'' وہ کسی سوچ سے باہر آیا تھا گویا۔ ''ویل تم بتاؤ ڈاکٹرز نے کیا کہا؟'' اس کا ذہن اپنی الجھن کے ساتھ ساتھ اب زاویار کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

''ڈاکٹرز نے پچھلے ویک کی رپورٹ کے مقابلے میں آج بہت پوزیٹو باتیں بتائی ہیں۔ دُرّی کا برین پھر سے رسپانس دینے لگا ہے۔ اسے جو اعصابی شاک لگا ہے۔ اس کا اثر ہے کہ وہ اب تک آنکھ نہیں کھول سکی ہے۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرے گا۔ وہ ری کور کرے گی ان شاءاللہ۔ ممکن ہے چند ہفتوں میں وہ اپنے کوما سے باہر آ جائے۔''

زوہا کی مسرت سے چمکتی آنکھیں عکرمہ کے چہرے کا حصار کیے ہوئے تھیں۔ اسے لگا جیسے اس خبر نے عکرمہ کو کسی بھاری بوجھ سے چھٹکارا دلایا ہو۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ہلکورے لیتا اضطراب جیسے قدرے کم ہوا تھا۔ مگر ختم نہیں ہوا تھا۔ زوہا کو کسی فکر نے آگھیرا۔

''کیا بات ہے عکرمہ..... گھر پر سب ٹھیک تو ہے؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے۔ بس دادی کا بی پی یک دم بہت لو ہو گیا تھا۔ میں ان کے پاس تھا۔ اس لیے ذرا دیر ہو گئی۔'' اس نے کاریڈور کے آخری سرے پر نظر ڈالتے ہوئے سرسری سا بتایا تو زوہا فکرمندی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اب کیسی ہیں دادی۔ زیادہ لو تو نہیں ہے بی پی؟'' آج کل تو یوں بھی دل سہما ہی رہتا تھا۔ وہ کسی نئی آزمائش کے لیے خود کو تیار نہیں پا رہی تھی۔

''ڈونٹ وری، وہ ٹھیک ہیں۔ انکل سردار نے آکر چیک کر لیا تھا انہیں۔ دوا وغیرہ دے دی ہے۔ تم ٹینشن مت لو۔'' وہ اسے تسلی دینے کو بعجلت بولا مگر زوہا نے دیکھا وہ خود بڑا اپ سیٹ تھا۔

''ابھی تمہارے پاس کون آیا تھا؟'' اس نے زوہا کی جائزہ لیتی نظروں سے بچنے کے لیے خود ہی موضوع بدلا تو زوہا نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

وہ جانتی تھی عکرمہ اپنی پریشانی کسی سے کم ہی شیئر کرتا ہے اور بالخصوص اس وقت تو وہ زوہا کو ایک لفظ بھی نہیں بتائے گا۔

''زاویار انصاری تھا۔ اجی بھائی کا کزن۔'' اس نے زاویار کے ساتھ ہونے والی بات چیت دُہرا دی۔

''وہ کیا دُرِ مکنون کی خیریت پوچھنے آیا تھا؟'' اس نے استفسار کیا۔

''نہیں۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں کسی سے کام تھا اسے۔ البتہ اس کی سسٹر ہے ناں عینی.....'' زوہا نے ذرا رک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ سر ہلا گیا۔

''اس نے خیریت پتا کرائی تھی دُرّی کی۔''

وہ دونوں چلتے ہوئے اب دُرِ مکنون کے کمرے تک آ گئے تھے۔

''کیا تم جانتی ہو کہ زاویار کا پروپوزل دُرِ مکنون کے لیے آیا تھا؟'' کمرے میں داخل ہونے سے پہلے عکرمہ نے پوچھا تھا۔

''ہوں۔ میمی نے بتایا تھا بعد میں اور یہ بھی کہ زاویار نے خود اس رشتے سے انکار کیا تھا مگر بڑی حیرت کی بات ہے ناں عکرمہ۔ زاویار انصاری کو دُرّی کے ماضی کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا پھر بھی اس نے انکار کر دیا۔ کوئی کیسے اتنی حسین لڑکی کے لیے انکار کر سکتا ہے۔ جسے چاندنی سے بنایا گیا ہو۔''

زوہا اندر آ چکی تھی۔ کمبل اوڑھے مشینوں کے تاروں سے جڑی دُرِ مکنون کو اس نے بہت سوگواری سے دیکھا۔

عکرمہ نے گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی۔

''کبھی، کبھی انسان دوسرے کی خوب صورتی سے خوفزدہ بھی ہو جاتا ہے۔ شاید اپنی بدصورتی آئینہ جو دکھا دیتی ہے۔'' بلا ارادہ اس کے لبوں سے فقرہ پھسلا تھا پھر یک دم احساس ہونے پر اس نے مبہم سی مسکراہٹ سمیت زوہا کو دیکھا۔ جو اس کے جملے پر چونک گئی تھی۔

''یوں بھی انسان اپنے پارٹنر میں ہمیشہ خوب صورتی ہی نہیں ڈھونڈتا اور کیا معلوم کہ یہ حضرت کہیں اور انٹرسٹڈ ہوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی عکرمہ نے سنجیدگی اور گہرائی سے کہا تو وہ جیسے لاجواب سی رہ گئی۔

عکرمہ نے دُرِ مکنون کے نقاہت زدہ کمزور اور زرد چہرے کو بغور دیکھا۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ اس نے دُرِ مکنون کو کہیں دیکھا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ ایسا کیوں محسوس کرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

غم عمر کے خواہ کسی بھی حصے میں ملے۔ انسان کو کمزور ہی بناتا ہے۔ خاص طور پر بڑھاپے میں ملنے والا صدمہ کبھی کبھی زندگی سے ہی بیزار کر جاتا ہے۔ صدمہ اچانک تھا اور شدید بھی۔ اماں کی قوتِ برداشت اس کی متحمل نہ تھی۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا کے زیرِ اثر وہ سوئی ہوئی تھیں۔ عصر کے بعد کہیں جا کے دوا کا اثر ختم ہوا تو آنکھوں اور دل پر بڑا بوجھ سا محسوس ہوا۔ یہ خبر سننے کے بعد جاگنے اور سوچنے کی خواہش ان کے اندر سے ختم ہوگئی تھی مگر یہ بھی جانتی تھیں کہ بیٹے کی طاقت اور ڈھارس وہ ہی ہیں۔ اس لیے بادلِ ناخواستہ آنکھ کھول کر دیکھا۔

کمرے کے وسط میں رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھے مظفر شیرازی درد اور کرب سے چور تھے۔ ان کا دل اولاد کے دکھ پر رنج سے بھر گیا۔

''مظفر۔'' انہوں نے نحیف و نزار آواز میں پکارا۔

''جی اماں۔ کیسی طبیعت ہے آپ کی اب؟'' وہ لپک کر ماں کے پاس آئے تھے جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا۔'' وہ تھکی تھکی سی بولیں اور تھوڑا ٹیک لگا کر لیٹ گئیں۔

مظفر صاحب کا سر پشیمانی سے جھک گیا۔

''مجھے معاف کر دیں اماں۔ میں نے یہ سب بتا کر بڑا دل دکھایا ہے آپ کا۔'' وہ افسردگی سے کہہ رہے تھے۔

اماں نے دیکھا ان کا بیٹا جو خود کئی سالوں سے اس درد کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ انہیں دکھی کر کے کس قدر

اکتوبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک صفدر حیات کی تفتیش

زنداں

آخری صفحات پر **کبیر عباسی** کے قلم سے

محبت کی زنجیروں میں ایک خوب صورت رشتے کی عبرت اثر کی داستان

بے منزل مسافر

گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر.....ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کا جادو

شہ زوز

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان..... **عمر عبداللہ** کے قلم کا شاہکار

اس کے علاوہ

تنویر ریاض، غلام قادر، مظہر سلیم ہاشمی، ڈاکٹر شیر شاہ سید، منظر امام، صبا مغل، آصفہ ضیا احمد اور فہمی فردوس کی خوب صورت تحریریں

غمزدہ تھا۔انہوں نے گہری سانس بھر کر بیٹے کے تھکے ہوئے وجود پر نظر دوڑائی۔
پچھلے ڈھائی تین سالوں میں مظفر کس قدر ٹوٹ گئے تھے۔ان کے لہجے سے پژمردگی اور افسردگی ٹپکتی تھی۔
وہ ماں تھیں۔اب سمجھ سکتی تھیں کہ وہ کس شکست وریخت کا شکار تھے۔اکیلے اپنا دکھ اور غم اٹھا رہے تھے۔
گزرے برسوں میں انہوں نے کبھی کسی کو احساس بھی نہ ہونے دیا کہ وہ اندر ہی اندر اپنی بیٹی کو زندہ درگور دیکھ کر کس طرح ٹوٹ چکے ہیں۔
''نہیں بیٹا۔ایسی بات نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
''ایسا ہی ہے اماں۔آپ مجھے معاف کردیں۔'' انہوں نے ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگالیا۔آنسو پنار کے ان کے چہرے پر پھسلنے لگے تھے۔
''وہ مجھے ہمیشہ اپنی، اپنی سی لگتی تھی مظفر۔اس کی تکلیف اس کی اذیت مجھے شروع سے ہی دکھ دیتی تھی۔میرا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ میری ہے مگر یہ واقعی سچ ہوگا میں نے.....'' آنسوؤں نے ان کا بقیہ جملہ مکمل نہ ہونے دیا تھا۔
دُرِمکنون کے علاوہ ردا کا دکھ بھی سب کو جکڑے ہوئے تھا۔اماں کے لیے اس عمر میں بیک وقت اتنے تفکرات کا برداشت کرنا آسان نہ تھا۔مظفر لمحے بھر کے لیے بھی ماں کے پاس سے ہٹے نہیں تھے۔
عکرمہ، زوہا کو لے کر اسپتال سے گھر واپس آیا تاکہ وہ گھر پر تھوڑا آرام کرسکے۔ردا، آصف کی وجہ سے دُرِمکنون کے پاس رک نہیں سکتی تھی اور سائرہ بیگم تو رکنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔
پچھلے دو ہفتوں میں دادی اور زوہا ہی اسپتال میں اٹینڈنٹ کے طور پر رکی تھیں۔
سعد ابھی ملائشیا سے واپس نہیں آیا تھا۔اس لیے زوہا یہ ذمے داری انجام دے رہی تھی۔اس کے بعد کیا ہوگا یہ سوچ کر سائرہ بیگم کا غصہ چھت کو چھونے لگتا۔
وہ اس لڑکی کو.....جس کے سبز قدموں کی وجہ سے مصیبتوں نے ان کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا (ان کے اپنے تئیں۔) اس کی خدمت کے لیے ایک رات تو کیا وہ ایک گھنٹا وہاں گزارنے کو تیار نہ تھیں بلکہ اس کا کومے میں چلے جانا۔ان کے زخموں کے لیے پھائے کا کام دے گیا تھا۔کوئی ان کے دل میں جھانکتا تو پتا چلتا کہ دُرِمکنون کا شیرازی ولا سے چلے جانا۔ان کے لیے کس قدر سکون کا باعث تھا۔
عکرمہ گھر میں داخل ہوا تو بیرونی دروازے کی طرف سے باہر گیٹ کی سمت جاتے فزیوتھراپسٹ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔
''ہیلو سر۔''
''ہیلو۔آپ اتنی جلدی جارہے ہیں؟'' عکرمہ نے تھراپسٹ کی شکل سے عیاں بیزاری محسوس کرکے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔اصولاً تو اسے ابھی ایک گھنٹا آصف کی تھراپی کرنی تھی۔
''میں جانہیں رہا۔بھیجا جارہا ہوں۔مسٹر آصف آج تھراپی کرانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔'' فزیوتھراپسٹ نے گویا موقع ملتے ہی رونا رو دیا تھا۔
''مگر کیوں؟'' عکرمہ کے تھکان زدہ چہرے پر تفکر کے بادل چھا گئے۔
''اب اس کیوں کا جواب تو آپ کو مسٹر آصف ہی دے سکتے ہیں۔'' تھراپسٹ نے کندھے اچکائے۔اس کی اکتاہٹ عیاں تھی۔
''پھر بھی...بات کیا ہے۔آپ بتائیں پلیز۔'' عکرمہ نے تحمل سے استفسار کیا۔
''مسئلہ یہ ہے سر کہ یہ تھراپی کوئی میجک نہیں کہ مسٹر آصف پانچ ہفتوں کے اندر چلنے پھرنے لگیں گے۔یہ ایک تھراپی ہے۔'' عکرمہ کے استفسار پر وہ بتانے لگا۔

''مسٹر آصف کو صبر رکھنا ہوگا اور ہمارے ساتھ کو آپریٹ کرنا۔ اپنی ول پاور کو استعمال کر کے جب وہ ٹریٹمنٹ فالو کریں گے۔ تبھی رزلٹ ملے گا۔ یہ اوور نائٹ حل ہونے والا مسئلہ نہیں۔''

''ہوں۔'' عکرمہ نے بغور سن کر سر ہلایا۔

''مگر مسٹر آصف آج کل کو آپریٹ نہیں کر رہے۔ پچھلے دو دنوں میں انہوں نے مختلف ایکسر سائز میں سے جو کہ ضروری ہیں صرف چند ایک ہی کروائیں۔ جبکہ آج تو سرے سے تھراپی کے لیے ہی انکار کر دیا۔'' تھراپسٹ کے بتانے پر عکرمہ کے چہرے پر تفکر کے بادل چھا گئے۔

''آئی ایم سوری۔ آصف کی طرف سے میں معذرت کرتا ہوں کہ آپ کو زحمت ہوئی۔''

''بات صرف میرے وقت کی نہیں ہے سر۔ مجھے تو آپ پے کر ہی دیں گے۔ اصل مسئلہ میرے پیشنٹ آصف صاحب کا ہے۔ اگر ابھی انہوں نے اس طرف بے پروائی برتی اور بے توجہی کی تو سمجھیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا کیس مشکل ہو جائے گا۔'' تھراپسٹ خلوص سے بول رہا تھا۔

عکرمہ مسئلے کی نوعیت سمجھ رہا تھا۔

عکرمہ نے گہری سانس بھر کر شیرازی ولا کے داخلی دروازے کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر اندر چلا آیا۔ تھراپسٹ جا چکا تھا۔

وہ دادی کی طرف سے فکر مند تھا۔ ان کے پاس جانا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت جنید (فزیو تھراپسٹ) کی باتیں سن کر اس کا سارا دھیان آصف کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آصف ناامیدی کے صحرا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے میں انسان سب سے پہلے علاج ہی سے بے رخی برتتا ہے۔ گو کہ اس کی پھوپی نے امریکا میں اس کی رپورٹس منگوا کر وہاں ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا تھا۔ خود عبید بھائی نے بھی آسٹریلیا میں ڈاکٹرز کی رائے لی تھی۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ آصف کی معذوری کا صرف اور صرف وقت اور اس کی اپنی ول پاور (مضبوط قوتِ ارادی) ہی علاج ہے۔ اس کا آپریشن بالکل ٹھیک ہوا تھا۔ اب جو بھی ہونا تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ ہی ہونا تھا۔

دو دن پہلے ہی امریکا کے بعد آسٹریلیا سے بھی یہی خبر آ گئی تھی۔ طاہرہ آنٹی نے بھی اپنے بیٹے نادر کے پاس رپورٹس بھجوا رکھی تھیں۔ ان سب کے بس میں جو تھا وہ سب کر رہے تھے۔

مگر آصف کے لیے صبر اور حوصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ اس نے اپنی چلنے کی صلاحیت کھوئی تھی۔ خواہ عارضی طور پر ہی سہی۔ مگر اسے سہنا سہل نہ تھا۔

دوسری طرف ردا تھی۔ جسے شادی کے بعد سے ابھی تک کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جو وقت ان کی ازدواجی زندگی کا سب سے خوب صورت وقت ہونا تھا۔ وہ دواؤں، آپریشن اور اسپتال کی نذر ہو گیا تھا۔

سائرہ بیگم اور دادی ردا کو دیکھ، دیکھ کر ہولا کرتیں۔ جہیز اور بری کے خوب صورت ملبوسات اس نے الماری میں بند کر دیے تھے۔ وہ سارا سارا دن آصف کی خدمت میں گزار دیتی۔ جس کے چڑچڑے پن کے باعث اب وہ بھی جیسے تھکنے لگی تھی۔ آصف کے ساتھ ہونے والے حادثے سے زیادہ اسے آصف کے مزاج میں پیدا ہونے والے منفی تغیر نے پریشان کر ڈالا تھا۔

دوسری طرف سائرہ شیرازی تھیں۔ جو اٹھتے بیٹھتے اس وقت کو کوسا کرتیں۔ جب آصف شادی والی رات اپنی پھوپی کو ائرپورٹ چھوڑنے گیا تھا اور حادثہ وقوع پزیر ہوا۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے زوی۔ تم نے اس قدر ایمرجنسی میں مجھے فون کرنے کو کیوں کہا۔ سب ٹھیک تو ہے؟'' شہریار

انصاری کا فکر مند لہجہ زاویار کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔
آدھے گھنٹے قبل جب اس نے ان کے آفس کے نمبر پر کال کی تھی۔ وہ سیٹ پر نہیں تھے۔ لہٰذا پی اے کو اس نے مختصراً ایمرجنسی کا کہہ کر کال بیک کرنے کو کہا تھا۔ اور اب وہ شہریار انصاری کو فون پر سن رہا تھا۔
''جی۔ سب ٹھیک ہے۔''
''تو پھر تم کو ایسی کیا ایمرجنسی تھی؟''
''ایمرجنسی ہی سمجھیے۔''
''کیا ہوا ہے، میمونہ کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے ناں؟'' بہن کے لیے اُن کا لہجہ تردد بھرا تھا۔
''جی، وہاں بظاہر سب ٹھیک ہے۔ مگر کب تک؟'' زاویار کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
''کیا مطلب؟'' شہریار صاحب کی سمجھ خاک نہ آیا۔ ''زوی کھل کے بات کرو۔''
اس کے لہجے سے کچھ پالیا تھا اُنہوں نے۔ زاویار نے گہری سانس لے کر کچھ سوچا۔ اور جب بولا تو رُکا نہیں۔
''ٹھیک ہے تو میں کھل کر بات کرتا ہوں۔ میرا اشارہ شہرین کی طرف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے میرے نام کے طوق سے رہائی دے دی جائے۔ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔'' اس کا انداز فیصلہ کُن تھا۔ اُس نے براہ راست کہہ دیا تھا۔
''مگر کیوں؟'' دوسری طرف اس کے باپ تھے۔ غصہ تو اُنہیں بہت آیا مگر وہ برداشت کر گئے کہ آغا جان کی آج کل یہی ہدایت تھی۔
''آخر کیا برائی ہے شہرین میں؟''
''سوال اچھائی یا برائی کا نہیں۔ میرے فیصلے کا ہے۔ اور یہ فیصلہ میں کروں گا کہ مجھے کس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔''
''آغا جان خاندان کے بڑے ہیں۔ یہ فیصلے آج تک اُنہوں نے ہی کیے ہیں۔'' شہریار صاحب کا لہجہ اس کے دوٹوک انداز پر قدرے سخت ہوا۔
''جانتا ہوں۔ مگر ضروری نہیں کہ ان کا ہر فیصلہ درست ہو یا قابلِ قبول ہو۔ میں آپ کی طرح ایک بار فرمانبرداری کر کے کسی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا اور پھر آپ نے بھی تو اپنی مرضی کا ساتھی چُنا تو پھر یہ حق مجھے کیوں نہ حاصل ہو۔'' اس کا انداز بڑا اپنا تلا تھا۔ وہ بڑے ہموار لہجے میں بول رہا تھا۔ جیسے سب کچھ پہلے سے سوچ رکھا ہو۔ محض اُنہیں اطلاع دینا مقصود ہو۔ شہریار صاحب کے لیے غصہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔
''تو یہ حق تمہیں دیا گیا تو تھا ناں۔ خولہ اور شہرین میں سے کسی کا بھی ہاتھ دے دیتے تمہارے ہاتھ میں مگر اس وقت کی تمہاری خاموشی کے باعث آغا جان نے خولہ کی طارق سے نسبت طے کر دی۔''
''تو کیا یہ ضروری ہے کہ میں آغا جان کی پسند کے مطابق ہی زندگی گزاروں اور خاندان میں ہی شادی کروں۔ اور کیا یہ بھی کسی حکیم کا مشورہ ہے کہ اس خاندان کی ہر لڑکی اسی خاندان میں کھپائی جائے۔ وہ بھی جبراً۔'' وہ بھی اُن ہی کا خون تھا۔ اُن ہی کے انداز میں بولا تھا۔
''اس میں جبر کی کیا بات ہے۔ خولہ اچھی لڑکی ہے۔ طارق خوش ہے۔''
''آپ کے پاس ایسا کون سا آلہ ہے جس سے آپ کسی کی خوشی کی پیمائش کر لیتے ہیں؟''
''انسان کے چہرے سے پتا لگتا ہے۔ اس کی خوشی ناخوشی کا۔''
''تو پھر میرے چہرے سے آپ لوگوں کو کیوں کچھ پتا نہیں لگتا۔ شہرین کے چہرے سے اس کی ناپسندیدگی

کیوں دکھائی نہیں دیتی۔'' وہ دوبدو جواب دے رہا تھا۔

شہریار صاحب لمحہ بھر کے لیے لاجواب سے ہو گئے۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔

''تمہارا مسئلہ کیا ہے زوی۔ تم کس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' اس بار اُن کا لہجہ نرم تھا۔

''اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اور فی الحال تو بالکل بھی نہیں۔ شہرین کی رائٹ ایج ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کو میرے نام پر بٹھا کر بوڑھا کر دیا جائے۔ میں اپنا انکار آغا جان اور آپ دونوں تک پہنچا چکا ہوں۔ سوچ لیجیے، کل کو مجھے الزام نہ دیجیے گا کہ آپ کی بھانجی کی زندگی برباد کر ڈالی ہے میں نے۔ اس سے زیادہ خلوص کا مظاہرہ میں کر نہیں سکتا۔ شیری میری بچپن کی دوست ہے۔ اس سے ہمدردی نہ ہوتی تو کبھی آپ سے کچھ نہ کہتا۔ اسے اپنے نام پر بٹھا کر... آغا جان کے کیے کا اچھا بدلہ لے سکتا تھا میں اُن سے۔ آخر کو لاڈلی نواسی ہے وہ اُن کی۔ مگر میں صرف ان کا پوتا نہیں۔ عاصمہ عثمان کا بیٹا بھی ہوں۔ انسانوں سے ہمدردی اور اُن کے حقوق کا خیال رکھنا شاید اُن ہی سے وراثت میں ملا ہے مجھے۔'' وہ سخت زہر خند ہوا۔

''گویا تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' شہریار صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''یہی سمجھ لیجیے۔''

''تو پھر اس کا نام بتا دو۔ جسے تم بیاہنا چاہتے ہو۔''

''جسے بیاہنا چاہتا تھا۔ اُسے تو قبر میں اُتار دیا ہے میں نے۔''

''تو کیا ساری زندگی اس کی قبر کا مجاور بن کر گزار دو گے۔'' اُن کا لہجہ خاصا طنزیہ اور تضحیک آمیز تھا۔

زاویار نے فرطِ ضبط سے لمحے بھر کے لیے لب بھینچے۔

''کاش ایسا کر پاتا۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے بعد تم سے شادی تو دور کی بات وہ تمہارے منہ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔ تم ہو کس گمان میں۔'' اُنہوں نے بے دردی سے اس کا زخم کھرچ ڈالا۔

''جانتا ہوں، قابلِ نفرین ہوں، دھتکارے جانے کے لائق ہوں۔ لہٰذا ایسے رذیل شخص سے اپنی بھانجی کو بچا لیں آپ۔ میری طرف سے دِس چیپٹر اِز کلوزڈ ناؤ۔'' کلک کی آواز کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی۔

شہریار صاحب نے آج جیسے اس کے دل پر ہاتھ مارا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اندر تک زخمی ہو گیا ہے۔ اپنے درد کے سامنے اسے اپنے والدین کے دکھ کا ذرا احساس نہیں تھا۔ جو اس کے رویوں سے ٹوٹ رہے تھے۔

☆......☆......☆

''پچھلے چھ دن سے پیشنٹ کی حالت میں بہت بہتری آ رہی ہے اور آج فزیکل ریسپانس بھی آیا ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ اگلے ایک آدھ دن میں ممکن ہے کہ مس علی کوما سے جاگ جائیں۔'' ڈاکٹر گوہر کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تھے یا مژدۂ حیات۔

مظفر شیرازی پر گویا شادیٔ مرگ طاری ہو گیا تھا۔

''کک...... کیا۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟'' بے یقینی اور حد سے زیادہ خوشی نے اُنہیں گویا بے اوسان کر دیا تھا۔ ڈاکٹر گوہر پروفیشنل انداز میں مسکرا دیے۔

''آف کورس مسٹر شیرازی۔ میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ ایسے نروس بریک ڈاؤن کے بعد کوما میں چلے جانا اتنا ہوپ لیس نہیں ہوتا۔ اللہ کی رضا، والدین کی دعائیں اور پیشنٹ کی ول پاور ہو تو ایسے پیشنٹ باؤنس بیک کرتے ہیں۔'' اُنہوں نے کہا تو مظفر شیرازی کا گویا رواں رواں سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ جو اس سے بھی بدتر کی اُمید

کر رہے تھے مالکِ حقیقی نے اُنہیں کیسی خوش خبری عطا کی تھی۔ وہ باہر نکلے تو سیدھے دُرِ مکنون کے پاس آئے۔
حسبِ معمول وہ سفید کمبل اوڑھے لیٹی تھی۔ مگر آج ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ محض پلکیں موندے ہوئے ہے۔ جیسے وہ کسی بھی لمحے آنکھ کھول دے گی۔
پچھلے دنوں کی طرح درِ مکنون کے چہرے پر گہری نیند سونے والا تاثر نہیں تھا۔ یا جانے اُنہیں ہی ایسا محسوس ہوا۔ اس کے ماتھے کو شفقتِ پدری سے چومتے ہوئے اُن کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو دُرِ مکنون کے گھنے بالوں میں کہیں جذب ہو گئے تھے۔
''مجھے معاف کر دینا بیٹا۔ تمہارا یہ مجرم باپ تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ تمہیں تحفظ اور رشتے کا مان نہ دے سکا۔'' اندر داخل ہوتے ہوئے عکرمہ نے اُن کے الفاظ سُنے تھے۔ ان میں کس قدر درد اور کرب بسا ہوا تھا۔
ابھی وہ گھر سے آ رہا تھا۔ وہاں دادی کا یہی حال تھا۔
وہ مظفر صاحب سے چھپ، چھپ کر روتی تھیں۔ عکرمہ سب دیکھ سکتا تھا مگر دادی کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ لیکن آج قسمت ایسے مقام پر لے آئی تھی کہ اُسے اُن کا رونا دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ دل کی بات اُس سے کہہ دیتی تھیں جس سے اُس کے دل کا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ بے بسی کے تکلیف دہ احساس نے اُسے جکڑ رکھا ہوتا۔ مگر وہ اُنہیں تسلی دینے کی کوشش کرتا۔
''سب ٹھیک ہو جائے گا دادی۔ آپ تسلی رکھیں۔''
''کیسے تسلی رکھوں عکرمہ بچے۔ میرے دل پر ہاتھ پڑا ہے۔ وہ میرا خون ہے۔ میرے بیٹے کی اولاد۔ میں کہاں سے حوصلہ لاؤں۔'' وہ پھر سے رو دیں۔
''ایسا شدید دکھ تو میں نے تمہارے بابا، تمہارے دادا کے جدا ہونے پر بھی محسوس نہیں کیا تھا بچے۔ دُرِ مکنون کا غم تو جیسے مجھے منوں مٹی تلے لیے جا رہا ہے عکرمہ..... میں ٹوٹ گئی ہوں بیٹا۔''
روتے، روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ جو مظفر صاحب کے سامنے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتی تھیں، خود اُنہیں تسلیاں دیتیں۔ عکرمہ کے سامنے کسی بچے کی طرح بکھر گئی تھیں۔ عکرمہ لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا تھا۔ ان کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے اُنہیں تسلی دی تھی۔ جس پر دادی اسے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئی تھیں اور اب یہاں اسپتال میں چچا جان احساسِ ندامت سے چور کھڑے تھے۔
''مجرم کون ہے اور پشیمان کون۔'' اس نے سوچا لمحے بھر کے لیے زاویار اور اظہار بھائی کے چہرے اُس کی آنکھوں کے آگے گھوم گئے۔
اُسے دادی اور مظفر صاحب کی تکلیف کا بخوبی احساس تھا۔ جب سے اُسے دُرِ مکنون سے اپنے رشتے کا پتا چلا تھا۔ اس کے اندر جیسے کوئی میخ گہرائی تک گاڑ دی گئی تھی۔ پہلے محض انسانیت کے ناتے وہ اس سے ہمدردی رکھتا تھا۔ مگر آج یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے گھر کو نقب لگائی ہو۔ وہ اس کی چچا زاد تھی اور اس کے اپنے گھر میں اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نہ یہ جرم قابلِ معافی تھا نہ یہ دکھ بھلانے لائق۔ اس کی غیرت پر ڈاکا پڑا تھا۔
مرے پر سو درے چچا جان اور دادی کی قابلِ رحم حالتیں تھیں۔
زندگی میں پہلی بار اسے پتا چلا کہ قسمت کا شکنجہ کس قدر تنگ اور گرفت کتنی مضبوط ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆

''تھینکس زوی۔ جو کچھ تم نے کیا ٹھیک کیا۔ اتنا حقِ دوستی تو نبھانا ہی چاہیے تھا۔ وِش یو گڈ لک۔'' مختصر سا

فلیٹ اُسے آفس جاتے ہوئے راستے میں ملا تھا۔

شہرین کا اشارہ کس طرف تھا اُسے اندازہ تھا۔

اس نے خود کو یک بیک ہلکا محسوس کیا۔

دل پر پڑا گویا ایک بوجھ تھا جو سرک گیا تھا۔

''چلو کسی کے کام تو آیا یہ بے مصرف وجود۔'' وہ خود پر ہنس دیا تھا۔

☆......☆......☆

اسے گئے تین دن ہو چکے تھے۔ شکار کا کہہ کر گیا تھا وہ۔ عاصمہ پریشان تھیں۔ اُن کے حساب سے تو اسے اب لوٹ آنا چاہیے تھا۔

''شہرین تمہیں پتا ہے۔ زوی کہاں ہے؟'' شہرین کو ٹیکسٹ (Text) کر کے پتا کیا تھا۔

''پتا نہیں مامی۔ گوگل کر کے دیکھتی ہوں۔''

چند سیکنڈز بعد ہی اس کا میسج آ گیا تھا۔ جو اس پریشانی میں بھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اُنہوں نے لاہور فون کرنے کا سوچا مگر ہاتھ فون اٹھاتے، اٹھاتے رُک گئے۔ ایک جھجک سی مانع تھی۔

مگر وہ جو کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ۔ اسی کے مصداق خود لاہور سے فون آ گیا۔ صنوبر اُن کی سابقہ نند تھیں۔ درحقیقت اُن کی اور عاصمہ کی دوستی ہی تو عاصمہ کو آغا جان کی نظر میں لانے کا باعث بنی تھی۔

وہ شہر یار انصاری سے چھوٹی تھیں۔ عاصمہ کی شادی سے دو سال پہلے ہی بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ صنوبر کو اللہ نے کوئی اولاد نہیں دی تھی۔ زاویار ہی ان کی محبت اور ممتا کا محور اور مرکز تھا۔ وہ جب میکے آتیں اُسے لے کر بیٹھی رہتیں۔

آج کئی سالوں بعد عاصمہ نے اُن کی آواز سُنی تو جیسے بیچ کا تمام عرصہ اور تلخیاں ہوا میں تحلیل ہوتی محسوس ہوئیں۔ مگر جو خبر اُن سے سُننے کو ملی وہ اُنہیں متحیر کر گئی۔

زاویار نے اپنے پاپا سے صاف لفظوں میں شہرین کے لیے انکار کر دیا تھا۔ گو کہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ مگر اس طرح اچانک اور وہ بھی اُنہیں بِنا بتائے۔ اُنہیں حقیقتاً شاک لگا تھا۔

وہ صنوبر کو کوئی جواب نہ دے سکیں۔

''پلیز عاصمہ، زوی کو سمجھاؤ کہ ابھی وہ آغا جان سے ایسی کوئی بات نہ کرے۔ جب سے وہ کراچی سے لوٹے ہیں اُن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ ہم سب اُن کے لیے بہت پریشان ہیں۔'' صنوبر بیٹی تھیں۔ باپ کی فکر نے اُنہیں دکھی کر رکھا تھا۔ ان کے لہجے میں لجاجت سی تھی۔

وقت کتنی جلد بدل جاتا ہے۔ کچھ سال پہلے عاصمہ، صنوبر سے کہا کرتی تھیں کہ پلیز شہر یار کو سمجھاؤ۔ دوسری شادی نہ کریں۔ اس وقت عاصمہ کے لہجے میں لجاجت ہوا کرتی تھی اور صنوبر بے بس۔

آج صنوبر درخواست کر رہی تھیں اور عاصمہ بے بس تھیں۔

''کیا ہوا ہے انکل کو؟'' عاصمہ نے مروتاً ہی نہیں درحقیقت خلوص سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں۔ شاید زوی نے لاہور آنے سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے یا پھر عمر کا تقاضا ہے۔ آغا جان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ زاویار کی فکر نے اُنہیں ادھ موا کر دیا ہے۔'' صنوبر بہت اداس تھیں۔

عاصمہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُنہیں کیسے تسلی دیں۔ زاویار کے معاملے میں تو وہ خود بے اختیار تھیں۔

کچھ دیر اور ان کے مابین اسی موضوع پر بات ہوتی رہی اور پھر فون بند ہو گیا عاصمہ فون بند کر کے کچھ دیر وہیں بیٹھی رہیں۔

اُن کا ذہن جیسے الجھ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ جو زندگی کی کتاب ہے
یہ کتاب بھی کیا کتاب ہے
کہیں اِک حسین سا خواب ہے
کہیں جان لیوا عذاب ہے

.....

کہیں آنسوؤں کی ہے داستاں
کہیں مسکراہٹوں کا ہے بیاں
کہیں برکتوں کی ہیں بارشیں
کہیں تشنگی بے حساب ہے

.....

سرفراز کی گاڑی میں ڈیک آن تھا۔ گو کہ وہ اس وقت میوزک سُننے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ مگر اس گانے کے بولوں نے اسے متوجہ کرلیا تھا۔ سرفراز کو گئے کئی منٹ گزر چکے تھے۔ اور ہنوز اس کے واپس آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

کہیں چھاؤں ہے کہیں دھوپ ہے
کہیں اور ہی کوئی روپ ہے
کئی چہرے اس میں چھپے ہوئے
اِک عجیب سی یہ نقاب ہے

.....

کہیں کھودیا کہیں پالیا!
کہیں رو لیا کہیں گا لیا!
کہیں چھین لیتی ہے ہر خوشی
کہیں مہرباں بے حساب ہے

.....

کہیں اِک حسین سا خواب ہے
کہیں جان لیوا عذاب ہے
یہ جو زندگی کی کتاب ہے
یہ کتاب بھی کیا کتاب ہے

.....

شاعر کے یہ خیالات اس کی زندگی کی مکمل ترجمانی تھے۔ زاویار کے اندر جیسے جمی ہوئی برف پگھلنے لگی تھی۔ آنکھوں میں دھندلاہٹ اُترنے لگی۔
گو کہ آج اُسے کسی نہ کسی درجے میں خوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہر بار کی طرح آج بھی دل پر پڑا نامعلوم سا

بوجھ جیسے بڑھ گیا تھا۔ وہ آج بھی اپنے مشن میں کامیاب ہوئے تھے۔ نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ وہ لوگ وقت پر پہنچ گئے تھے۔ کسی نقصان کے پہنچنے سے پہلے اُنہوں نے ''اُسے'' بازیاب کرالیا تھا مگر پھر بھی ایک سوگ کی سی کیفیت نے اُسے جکڑ رکھا تھا۔ جسے گیت کے بولوں نے کچھ اور مہمیز کیا۔ اس نے آنکھیں موند کر سر سیٹ کی پشت سے لگالیا۔

دُرِّمکنون کی ریکوری سے متعلق رپورٹ اسے مل ہی رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی قدر یکسوئی سے اس مشن میں حصہ لے سکا تھا۔

گیت ریوائنڈ کر کے سننے کے بعد اس نے ایک بار پھر سننا چاہا تو دیکھا کہ سرفراز سامنے والے مکان سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ لوئر مڈل کلاس لوگوں کا علاقہ تھا۔ یہاں کے مکینوں کی مالی حیثیت اسی گز سے بھی کم رقبے پر بنے چھوٹے چھوٹے گھروں کی کی بیرونی حالت دیکھ کر بخوبی ہوتا تھا۔ گلی کافی تنگ اور گندی تھی۔ جگہ جگہ گڑھے تھے جن میں گندا پانی بھرا تھا۔ ایک مخصوص بُو نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

گلی میں کھیلتے بچے بڑے شوق سے سرفراز کی کار کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے جو سرفراز کو آتا دیکھ کر بھاگ گئے تھے۔

''کیا رہا؟'' گو کہ اسے سرفراز کے چہرے سے ناکامی جھلکتی نظر آ گئی تھی پھر بھی اس نے پوچھ لیا تھا۔ جس کے جواب میں سرفراز نے سر کو نفی میں ہلایا تھا۔

''نہیں یار..... یہ لوگ نہیں مانتے۔''

''مگر کیوں؟''

''دُنیا کا خوف اُنہیں جکڑے ہوئے ہے۔''

''پر وہ ان کی بیٹی ہے؟''

''پانچ بیٹیوں کے والدین ہیں وہ۔ اُن کا تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ جو ایک آدھ کم ہو جائے گی۔'' سرفراز نے زہر خند لہجے میں کہہ کر تیزی سے کار موڑی۔

''مگر یہ ظلم ہے۔ ایسے وقت میں تو اس لڑکی کو اپنی فیملی اور اس کی ڈھارس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔''

''ہوں۔'' جواباً سرفراز نے گہری سانس بھری اور گلی سے کار کو باہر نکال لایا۔

''تم نے بتایا نہیں کہ اُن کی بیٹی کی عزت محفوظ رہی۔ ہم نے صحیح وقت پر اُسے بازیاب کرالیا تھا۔''

''بتایا تھا۔ مگر کالج کے سامنے سے اُسے کئی لڑکیوں بشمول اس کی کلاس فیلوز اور دوستوں کی موجودگی میں اغوا کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ سب نے دیکھا تھا۔ چند گھنٹوں میں ہی یہ خبر اس چھوٹے سے علاقے کے گھر، گھر میں پھیل چکی تھی۔ وہ لوگ اتنی بدنامی کے بعد بیٹی کو گھر واپس آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ بقول اُن کے آگے چار بیٹیاں اور ہیں اُنہیں بھی تو بیاہنا ہے۔'' سرفراز نے بیزاری سے اُن کی گفتگو کا لب لباب دُہرایا تو زاویار جیسے چپ سا رہ گیا۔

''حیرت ہے۔ کوئی ایسا کیسے کر سکتا ہے زاویار کہ محبت کا دعویٰ بھی کرے اور جب امتحان کا وقت آئے تو اپنی محبوب ہستی کو اس طرح بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلتا بنے۔ لعنت ہے ایسی محبت پر اور ایسے لوگوں پر۔'' سرفراز کا لہجہ دہک رہا تھا۔

زاویار کو لمحے بھر کے لیے یوں لگا جیسے سرفراز نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی ہو۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں رتجگوں کی چغلی کھا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''اے ارحم الراحمین، رحم فرما۔ رحمت عطا کر۔ تُو تو اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ مجھ

جیسے مجبور باپ کی حالت پر نظرِ کرم کر مالک۔ آج تک اپنی بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے یہ نہیں بتا سکا کہ وہ میرا خون ہے۔ اُسے صحت عطا کر مالک۔ وہ کوما سے جاگ جائے تو اُسے سینے سے لگا کر اپنی ہر خطا کی معافی مانگ لوں اس سے۔ مجھے اس سعادت سے محروم نہ کر میرے مالک۔ میری دو بچیاں تیرے پاس چلی گئیں۔ مگر دُرِ مکنون کو مجھ سے واپس نہ لے میرے مالک۔ میں جانتا ہوں میرا سب کچھ..... میری زندگی، سب تیرا ہے۔ تُو مالک ہے، آقا ہے۔ میں غلام ہوں۔ میری اولاد تیری امانت ہے۔ مگر ابھی نہیں میرے رب..... ابھی نہیں۔ مجھ بوڑھے باپ پر رحم کر۔'' جامع مسجد سے لوگ کب کے جمعہ پڑھ کر جا چکے تھے۔ مگر مظفر شیرازی کا دل سجدے سے اُٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ تواتر سے گرتے آنسو اور ان کی سسکیوں کا مسجد کی خاموشی کے علاوہ کوئی گواہ نہ تھا۔

آج پھر وہ ٹوٹ کر گڑگڑا کر دعا کر رہے تھے۔ مناجات کر رہے تھے۔ اور جانے واقعی یہ جمعے کے دن کی قبولیت کی وہ گھڑی تھی جس کا ذکر حدیث نبوی ﷺ میں ہے یا پھر کسی اور وقت کی مانگی ہوئی دعا کی قبولیت کا طے شدہ وقت تھا۔ اسی لمحے موبائل کی رنگ ٹون نے اُنہیں سجدے سے سر اُٹھانے پر مجبور کیا۔

''پاپا۔ دُرِ مکنون کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ کوما سے جاگ گئی۔ پاپا وہ اُٹھ گئی ہے۔'' خوشی اور مسرت سے لبریز زوہا کی آواز اُن کے اندر جیسے زندگی دوڑا گئی۔

''کیا..... سچ زوہا۔ بیٹا کیا واقعی میں یہ سچ سُن رہا ہوں۔'' بے یقینی سے بے اختیار وہ استفسار کر بیٹھے تھے۔

''جی پاپا..... بالکل سچ۔ دُرّی میرے ساتھ ہے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔'' زوہا نے اُنہیں یقین دلایا۔ ''بس آپ فوراً یہاں پہنچیں۔ میں نے عکرمہ کو کال کر دی ہے۔ وہ گھر سے ردا اور دادی کو لے کر آ رہا ہے۔'' اُس نے کہہ کر فون بند کیا تو مظفر صاحب سجدے میں گر پڑے اور پھر ان کے تشکر کے گواہ مسجد کے در و دیوار تھے۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

رات بہت دیر سے واپسی ہوئی تھی۔ وہ دن چڑھے سویا رہا۔ اور جب آنکھ کھلی تو ظہر کا وقت ہو چلا تھا۔ بہت عجلت میں وہ گھر سے نکلا۔ مگر جمعے کا خطبہ اس کے پہنچنے تک ہو چکا تھا۔ قدرے بے دلی سے نماز پڑھ کر وہ جامع مسجد سے نکلا تو سیل پر آنے والے ٹیکسٹ نے اس کے جسم و جاں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

''آپ کی عزیزہ کوما سے جاگ گئی ہیں سر۔ کانگریجولیشن۔'' اسپتال وارڈ بوائے کا میسج اس کی ساری کسلمندی اور کثافت دھو گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے لبوں پر آتی جاتی ہر سانس میں بس یہی دعا تھی اور آج اُسے لگا جیسے اس کا دامن پھولوں سے بھر گیا ہو۔

''تھینکس آلاٹ۔'' جواباً ٹیکسٹ کر کے وہ دل ہی دل میں نہ جانے کتنا شکر کرتا گھر میں داخل ہوا تھا۔

''ہوگئی ٹارزن کی واپسی۔'' باہر باؤنڈری میں کھلنے والے کچن کے دروازے سے اندر آنے کا خیال تھا۔ لہٰذا وہ اس طرف سے آیا تو اندر سے آتی آوازیں کان میں پڑیں۔ شہرین ہمیشہ کی طرح چہکتی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

''ہوں..... ماشاء اللہ آ گیا ہے وہ۔'' اُسے عاصمہ کی ہنسی بھی سُنائی دی۔

''بائی داوے یہ موصوف کیا واقعی شکار پر گئے تھے؟ جہاں تک میری انفارمیشن ہے۔ پاکستان کے کل رقبے پر 2.2 فیصد جنگلات تھے۔ جس میں سے 50 پرسنٹ تو ویسے ہی کاٹ دیے گئے ہیں۔ یہ آئے دن کے سیلاب اسی لیے تو ہماری زندگی اجیرن بنائے ہوئے ہیں۔ رہ گئے 50 فیصد تو ان میں بھی اکثر میں شکار کرنا منع ہے۔ یہ اپنے زاویار انصاری کیا چھانگا مانگا کے جنگلات کی طرف نکل گئے تھے۔'' وہ مزے سے کہے جا رہی تھی۔

زاویار کے قدم کچن سے باہر ہی رک گئے۔ گو کہ اسے اب شہرین کے کسی بھی اقدام پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ مگر شہریار صاحب سے جو کچھ اس نے کہا۔ اس کا براہِ راست تعلق شہرین سے ہی تھا۔ لہٰذا آج پھر سے اس کا یہاں آنا تھوڑا بہت حیران ضرور کر گیا۔

''اصل میں وہ اپنے کولیگ سرفراز کے ساتھ گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے تھے بس۔''

''السلام علیکم!'' عاصمہ کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ جالی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

اس کے بہ آوازِ بلند سلام کرنے پر عاصمہ اس کی طرف مڑی تھیں۔ جبکہ سامنے سلیب پر چڑھ کر بیٹھی شہرین دونوں ہاتھوں سے تھامے مگ کو لبوں سے لگائے محض اُسے دیکھنے لگی۔

''وعلیکم اسلام۔'' عاصمہ نے ہی جواب دیا تھا۔

''کیا حال ہیں۔ تم یہاں کیسے؟'' شہرین کی خاموشی پر اس نے ہی سوال کر لیا تھا۔ لاؤنج میں فون بج رہا تھا۔ عاصمہ کچن سے نکل کر گئیں تو شہرین سلیب سے اُتر آئی۔

''تم سے ملنے آئی ہوں۔''

''خیریت، مجھ سے ملنے..... کیوں؟''

''کیوں کا کیا مطلب۔ تم سے ملنے کے لیے کیا تمہاری متوقع مسز ہونا ضروری ہے؟'' وہ شہرین ہی کیا جس نے بولنے سے پہلے سوچنا ضروری سمجھا ہو۔

زاویار نے انتہائی سخت نظروں سے اُسے دیکھا جو اپنی بات کہہ کر مزے سے کیبنٹ کھولے... اس میں سے کوکیز برآمد کر چکی تھی۔ ایک اس کی طرف بھی بڑھائی تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور لاؤنج میں چلا آیا۔ پیچھے، پیچھے وہ بھی نکل آئی۔ عاصمہ فون لے کر کمرے میں جا چکی تھیں۔

''ویسے تم تھے کہاں۔ آج کل تو لوگ انسانوں کا شکار زیادہ شوق سے کر رہے ہیں۔ یہ تم کن مہمات میں جتے ہوئے ہو؟''

''میری فکر چھوڑو۔ تم سناؤ تم کہاں تھیں؟'' اس کا موڈ خوشگوار تھا اور اس وقت اُسے کچھ بھی برا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ورنہ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ شہرین پر برس پڑتا۔

''میں ذرا لاہور تک گئی تھی۔ تمہارے لیے کچھ بھیجا ہے۔ صنوبر خالہ نے..... یہ لو۔'' اس نے دور سے ہی میز پر پڑا پیکٹ اُٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔

جسے اس نے آرام سے کیچ کر لیا تھا۔ ساتھ میں شہرین کو گھوری سے بھی نوازا۔

''بلیک کشمیری شال بھی تھی اس میں جو میں نے رکھ لی ہے۔ ہے تو جینٹس مگر گھر میں کون دیکھ رہا ہوتا ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ پیکٹ کھولتا۔ شہرین نے بڑے مزے سے بتایا تھا۔

''شرم کرو۔'' وہ ہنس دیا۔

''لو اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ پوسٹل خرچہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے کہ نہیں۔''

''ڈھیٹ ہو ایک نمبر کی تم۔''

''وہ تو ہے۔ بائی دا وے۔ تم یہ بتاؤ۔ کیا شکار کیا اس بار.....؟'' دونوں پاؤں صوفے پر چڑھا کر بیٹھتے ہوئے اس کی تفتیش شروع ہو چکی تھی۔

''چہ..... بچے ایسے سوال نہیں پوچھا کرتے۔ پیاری شیری۔'' وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ شہرین نے اب کے بغور اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی جیسے جلتے صحرا میں نخلستان نظر آ گیا ہو اُسے۔

''کیا بات ہے بڑے اچھے موڈ میں ہو۔ کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے کیا؟''

''یہی سمجھ لو۔'' پیکٹ ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے کمر صوفے کی بیک سے لگائی اور دونوں ہاتھوں کا تکیہ سا بنا کر سر کے پیچھے رکھتے ہوئے سرشاری سے بولا۔ کچھ تھا اس کے انداز میں۔ وہ آنکھیں موندے مسکرا رہا تھا۔

شہرین کے لب یک دم وا ہوئے۔

''زوی۔ آر یو اِن لو۔ زوی کیا تمہیں کسی سے محبت ہوگئی ہے؟''

سوال تھا کہ کسی مشاق تیرانداز کا تیر۔ سیدھا ہدف پر لگا تھا۔

زاویار نے پٹ سے آنکھیں کھول کر سامنے بیٹھی اُس پُرکشش لڑکی کی طرف دیکھا۔ جسے ابھی کچھ دنوں پہلے ہی اُس نے ٹھکرایا تھا۔ جس کی خوب صورت مسکراتی آنکھوں میں اشکوں کے دیپ جلتے دیکھنے کا وہم ہوا تھا اُسے۔

شہرین کے چہرے پر ناگفتہ بہ سا تاثر تھا۔ جیسے زاویار کے جواب پر اس کی رکی ہوئی سانس نکلی ہو۔ اس بار بھی زاویار کو اس کی آنکھوں کی تہ میں نمی چمکتی دکھی تھی، جو شہرین کے پلکیں جھپکنے پر یک دم غائب ہوگئی۔ یکلخت اسے احساس ہوا کہ شہرین کیا سوال کر گئی ہے۔

''اِٹس ٹو پرسنل۔''

''کمال ہے زوی۔ ہماری بچپن کی دوستی میں یہ ''Personals'' کہاں سے آگئے۔ یوں کہو کہ تم بتانا نہیں چاہتے۔''

''یونہی سمجھ لو۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''گویا تم کہیں انوالوڈ ہو۔ اور یقین کرو یہ بات میں پہلے سے جانتی تھی۔ بلکہ تم کہاں انوالوڈ ہو میں تو یہ بھی بتا سکتی ہوں۔'' شہرین سنجیدہ سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سینے پر بازو لپیٹے ہوئے وہ رسانیت سے بولی تھی۔

زاویار اس کی بات پر یک دم ہنس پڑا۔

''اوہ..... رئیلی۔'' طنز سے پوچھا۔

''یس زوی۔ وہ لڑکی کون ہے میں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ بس منتظر ہوں کہ کسی دن تم خود بتاؤ گے۔''

''ہونہہ۔'' جواباً زاویار نے جیسے کان کے پاس سے مکھی اُڑائی ہو۔ ''تو پھر منتظر ہی رہو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔'' اگلے لمحے وہ ڈگ بھرتا لاؤنج چھوڑ گیا تھا۔

اور عقب میں کھڑی لب کچلتی شہرین کو یک دم اپنے اردگرد سناٹا سنائی دینے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی خلا میں کھڑی ہے۔ ہر طرف خاموشی سی چھائی ہے۔

☆.....☆.....☆

اُسے زندہ، اپنے سامنے بستر پر دراز دیکھنے کے باوجود مظفر صاحب کو گویا یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اس کا سر سہلا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے تھے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے کہ وہ پھر سے موت کو شکست دے کر اُن کی زندگی میں لوٹ آئی تھی۔ اور غم کے آنسو بھی تھے کہ اُسے اس حال تک پہنچنے سے وہ بچا نہ سکے تھے۔ دادی کی حالت بھی اُن سے کم مختلف نہ تھی۔ سائرہ بیگم کا دل جل کر رہ گیا۔

''اُف دونوں ماں بیٹا ایسے رو رہے تھے جیسے کسی اپنے کو کھو دینے کے بعد پایا ہو۔''

دُرِ مکنون کتنے ہی لمحے اُنہیں ساکت نظروں اور جامد تاثرات کے ساتھ دیکھتی رہی۔ اور پھر یک دم نہ جانے کیا کچھ یاد آنے پر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں نمی ابھری۔ اور پھر پلکوں کی باڑ پھلانگ کر تکیہ میں جذب ہوگئی۔

''بس کریں پاپا۔ دادی۔ پلیز خود کو سنبھالیں۔ دُرّی کے لیے ابھی اتنا اسٹریس ٹھیک نہیں ہے۔'' زوہا اور ردا

نے اُن دونوں کو پانی لا کر دیا اور سمجھایا بھی۔ عکرمہ اور سیف البتہ ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔

دُرِ مکنون خود کو کسی سے نظر ملانے کے لائق محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ کئی ہفتوں کے کومانے اسے بہت کمزور اور نحیف کر دیا تھا۔

شیرازی ولا کے مکینوں کو ایک بار پھر اس نے آزمائش میں ڈال دیا۔ اِک بار پھر وہ پشیمان تھی۔ نادم تھی۔ اپنے ناکردہ گناہ اور اپنے زندہ ہونے پر شرمندہ۔

''اب بھی سانس لے رہی ہوں میں اے رب۔ کس مٹی سے بنایا ہے تو نے میرا وجود میرے مالک..... کہ اس درجہ تذلیل سہہ کر بڑے سے بڑے سانحے سے گزر کر بھی زندہ ہوں میں۔ اب تو تجھ سے موت مانگتے بھی شرم آنے لگی ہے۔ مجھ جیسوں کو تو موت بھی قبول نہیں کرتی۔'' اس نے نظر پھیر کر پلکیں موند لی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''کیا تمہارے اندر ذرا سی بھی خودداری نہیں بچی شہرین؟'' viber پر آنے والے اس آڈیو میسج کو شہرین نے خاصی دلچسپی سے سُنا تھا۔

''خیریت، یہ میرے اندرونِ خانہ ہونے والی خودداری کی قلت کا تمہیں کیسے پتا چلا؟'' اس نے وائبر پر ہی کال ملالی تھی۔

''بکومت۔'' خولہ حقیقتاً غصے میں تھی۔

''آخر تمہیں ضرورت کیا تھی زوی سے ملنے کی؟'' جھلا کر پوچھا۔

''کمال ہے۔ یہ بڑا عجیب سوال کیا تم نے خولہ۔ بھئی وہ میرا کزن ہے، دوست ہے میرا۔ پھر اس کا شکریہ ادا کرنا بھی تو ضروری تھا۔''

''کس بات کا شکریہ؟''

''ارے میرے کہنے پر ہی تو اس نے دوٹوک انکار کیا۔ میری جان خلاصی کرائی اس نے..... تو کیا اب بھی شکریہ کرنا نہیں بنتا تھا میرا۔'' وہ چمک کر بولی تھی۔ چند سیکنڈز کے لیے خولہ جیسے لاجواب سی ہوگئی۔

''کیا مطلب۔ کیا واقعی تم نے زوی کو انکار کرنے کے لیے کہا تھا۔'' اب کے خولہ کا لہجہ قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

''اور نہیں تو کیا۔'' اس نے بڑے مزے سے کہا۔

''مگر۔''

''اگر مگر کچھ نہیں خولہ، آخر میں کیوں کسی کے نام پر بیٹھی رہوں۔ یوں بھی جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس کیا گننے۔'' اب کے وہ بھی قدرے سنجیدگی سے بولی تھی۔

''ہوں۔'' خولہ کا انداز سوچتا ہوا سا تھا۔ ''مگر شاید تمہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا شیری۔ زوی اچھا ہے۔ کم از کم اس کے ماضی سے ہم سب آشنا ہیں۔ وہ اسٹیبلشڈ ہے، ایجوکیٹڈ ہے۔ گڈ لکنگ ہے۔'' خلافِ توقع خولہ اس کی خوبیاں گنوا رہی تھی۔

''اور سب سے بڑھ کر سنگل ہے اور ابھی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ تم چاہو تو اب بھی طارق بھائی کو انکار کر کے زوی کو شریکِ سفر بنا سکتی ہو۔ بندہ اچھا ہے۔ اور پھر گڈ لکنگ بھی۔'' شہرین شوخی سے اس کی بات کو لے اُڑی تھی۔

''بکومت۔ شرم کرو۔ تمہارے بھائی کی منگ ہوں میں۔''

''منگ ہوا بھی سنگ نہیں ہوا اُن کے۔ اور یہ کیا تم نے ٹپیکل بھابیوں والے خیالات پال لیے ہیں کہ سسرال

آنے سے پہلے ہی نندوں کو پیا دیس سدھارنے بلکہ ٹھکانے لگانے کی کوشش کی جائے۔ تمہارے آنے تک میں کہیں نہیں جانے والی۔ کان کھول کر سن لو۔''

''دفع ہو تم۔ میری بلا سے صحرا کی خاک چھانو۔ ٹوہیل ود یو۔'' کلک کی آواز کے ساتھ ہی لائن بے جان ہو گئی تھی۔ شہرین بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ خولہ یقیناً خفا ہو گئی تھی اس سے۔

''ٹھیک کہتی ہو خولہ، زوی واقعی اچھا ہے۔ بلکہ شاید دُنیا میں سب سے اچھا...... مگر ہر اچھی چیز ضروری تو نہیں شہرین مرزا کا نصیب بنے۔'' کشن گود میں رکھتے ہوئے اس نے سیل فون بستر پر اچھال دیا تھا۔ بے تحاشا ہنسنے سے اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ صرف نمی نہیں بلکہ جھرنے بہنے لگے۔

زاویار کے لیے دل میں پلنے والے اس احساس نے بہت دیر بعد اپنا آپ منوایا تھا۔ وہ جو ہمیشہ سب کو یقین دلاتی آئی تھی کہ زاویار سے اس کا لگاؤ محض دوستی کی بنا پر ہے وہ اس کے بچپن کا ساتھی ہے اس کے لیے دل میں کوئی خاص جذبے نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ، آج اپنے دل کے ہاتھوں اسے شکستِ فاش ہوئی تھی۔

خود سے کب تک چھپاتی، آج اسے ماننا ہی پڑا کہ زاویار کو اس کے دل میں وہ خاص مقام حاصل ہے جو شاید کسی اور کو دینا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔

☆......☆......☆

وہ پورے ڈھائی ماہ بعد اسپتال سے ڈسچارج ہوئی تھی۔ شیرازی صاحب کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے واضح طور پر اُن کی خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ یوں مسرور نظر آ رہے تھے۔ جیسے زندگی کی نوید ملی ہو۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عکرمہ سے خوشگوار انداز میں بات کرتے ہوئے کئی بار شفقت سے اس پر نظر ڈال چکے تھے۔ زوہا بھی ساتھ تھی۔

''کوئی تکلیف تو نہیں بیٹا۔ تھکن تو نہیں ہو رہی۔ کچھ چاہیے تو نہیں۔'' بار، بار پوچھتے۔

ان کے ہر سوال کے جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بمشکل مسکرا دیتی۔

''اب تو دُرِّ مکنون ماشاء اللہ گھر جا رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں آصف اور دُرِّ مکنون کے صحت یاب ہو جانے کی خوشی میں گھر میں ایک بڑا سا فنکشن رکھا جائے۔ کیا خیال ہے بچوں؟'' اب کی بار انہوں نے زوہا اور عکرمہ دونوں کو مخاطب کیا۔

''آف کورس پاپا۔ پارٹی تو بنتی ہے۔'' زوہا نے خوشی سے چہک کر والد کا ساتھ دیا۔

''بالکل۔'' عکرمہ بھی متفق تھا۔

البتہ یہ سب کہتے ہوئے اِن تینوں اور بالخصوص دُرِّ مکنون کا دھیان سائرہ کی طرف مڑ گیا تھا۔ جو ان چند ہفتوں میں محض ایک بار۔ وہ بھی جس دن وہ کوما سے جاگی تھی۔ اُسے دیکھنے آئی تھیں۔

اور یہ تو ان کے چہرے پر درج تھا کہ اُنہیں درمکنون کی زندگی اور صحت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے بچ جانے کی کوئی خوشی ہے مگر ان تمام تر تلخ حقائق کا علم رکھنے کے باوجود اسے شیرازی ولا لوٹ کر آنا ہی پڑا تھا اور اس بار اُسے لگا کہ اس کے تمام تر احساسات اور غیرت و انا پر جیسے بے حسی کی ہلکی سی تہہ جم گئی ہو۔

گھر پر ردا، دادی اور سیف کے ساتھ ساتھ طاہرہ آنٹی اور فارینہ بھی موجود تھیں۔ سب نے ہی انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

آصف اب بھی وہیل چیئر پر تھا۔

ردا اور آصف کو دیکھ کر اُسے حقیقتاً بہت تکلیف محسوس ہوئی تھی۔ ردا گھر کے سادہ سے حلیے میں بہت اداس،

اداس سی تھی۔ جبکہ آصف بھی بجھا بجھا تھا۔

پچھلے چند مہینوں میں کیا، کیا تغیر آ گئے تھے۔ اُسے پتا بھی نہیں چلا۔ کسی نے اُسے بتایا۔ نہ اُس نے ہی پوچھا مگر ان دونوں کو دیکھ کر اسے آصف کے ساتھ ہونے والے حادثے کی سنگینی کا ادراک ہوا تھا۔

''اُف اللہ۔'' اس کے دل سے ہوک سی اُٹھی۔ ''آصف بھائی کو ٹھیک کر دے۔ اور ردا آپی کی خوشیاں واپس لا دے۔ تو کر سکتا ہے۔ تُو قادرِ مطلق ہے۔'' اس ہنستی کھلکھلاتی ردا کی جگہ یہ سوگوار سی ردا اس کا دل دکھا گئی تھی۔

''مبارک ہو دُرِ مکنون۔ زندگی بھی اور صحت و تندرستی بھی۔''

تھکی تھکی سی مسکراہٹ سمیت جب آصف نے اس سے کہا تو وہ بھیگی پلکوں سے مسکرا دی۔ پھر بمشکل بولی۔

''آپ کو بھی زندگی مبارک ہو۔''

''ہونہہ، یہ لنگڑی لولی زندگی۔ آدھی ادھوری زندگی۔'' وہ تلخی سے ہنس دیا تھا۔ دُرِ مکنون پشیمانی سے نظر جھکا گئی۔ جیسے آصف کی معذوری میں سارا قصور خود اس کا اپنا ہو۔

''زندگی تو وہ ہے جو تمہیں ملی ہے درمکنون۔ مکمل وجود کے ساتھ۔ بھرپور طاقت و قوت کے ساتھ۔ ایک اپاہج کی زندگی میں ادھوری موت ہوتی ہے۔ بندہ جیتا بھی ہے اور روز مرتا بھی ہے۔'' آصف کے اندر تلخی نے یک دم باہر کا رستہ دیکھا تھا۔

''بس کریں آصف۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ دیکھیں تو دُری پریشان ہو رہی ہے۔''

ردا کی نظر دُرِ مکنون کے سفید ہوتے چہرے پر پڑی تو تڑپ کر شوہر کو ٹوکا۔

''دیکھا تم نے دُرِ مکنون۔ معذور آدمی کی تو بات بھی بھلی نہیں لگتی۔'' ردا کی طرف دیکھے بغیر آصف طنز سے ہنس کر بولا تو درمکنون کے گالوں پر نمی بہنے لگی۔

''پلیز...... آصف بھائی ایسے مت کہیے۔'' وہ یک دم رو پڑی تھی۔

آصف اور ردا دونوں درمکنون کے اس ردِعمل کے لیے تیار نہیں تھے۔ بری طرح سٹپٹا گئے۔

''ارے، ارے...... کم آن دُری۔ آصف تو مذاق کر رہے تھے۔ تم نے سیریس لے لیا۔''

''بالکل، بالکل...... میں تو محض چیک کر رہا تھا کہ دیکھوں تو ذرا کتنا مضبوط دل ہے۔'' وہ دونوں ہی اسے بہلانے لگے تھے۔ مگر وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔

''پلیز دری۔ مت کیرو ایسے۔ دیکھو اگر تم چپ نہیں ہوئیں تو پاپا اور دادی سے مجھے اور آصف کو بری طرح ڈانٹ پڑ جائے گی۔ پلیز۔ اچھی بہن نہیں ہو میری۔'' ردا نے اس کا چہرہ اونچا کر کے آنسو صاف کیے۔

اس کے لہجے کی لجاجت نے دُرِ مکنون کو جیسے ہوش دلایا۔ اتنی جلدی خود پر قابو پانا تو مشکل تھا۔ لہٰذا وہ وہاں سے اُٹھ کر اوپر چلی آئی تھی۔ ابھی سیڑھیاں چڑھنے میں اسے قدرے تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے تسلی دی تھی کہ مسلسل فزیوتھراپی اور اچھی غذا سے وہ جلد اس کمزوری پر قابو پا لے گی۔

☆......☆......☆

''کہاں کی تیاری ہے؟''

''ایدھی ہومز کی طرف جا رہا ہوں۔ تم چلو گے؟'' سرفراز نے جواب دینے کے ساتھ، ساتھ سوال بھی کر لیا تھا۔

''ہوں۔ چلتا ہوں۔ مگر تمہیں کام کیا ہے وہاں؟'' وہ ساتھ ہو لیا تھا۔

''وہی لڑکی کلثوم ہے وہاں۔ اس کے والدین کو بلایا ہے وہاں میں نے۔ کچھ بات کرنی ہے اُن سے۔''

''کیا فائدہ۔ تمہیں انکار کر تو چکے ہیں وہ لوگ۔''

”ہوں ...مگر کل فون آیا تھا اس کی والدہ کا۔ وہ لوگ ملنا چاہ رہے تھے اس لیے میں نے آج ایدھی ہوم ہی بلالیا اُن کو۔ دیکھو شاید وہ اُسے گھر لے جانے پر تیار ہو جائیں۔“ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے سرفراز نے پُر امیدی سے کہا۔

”تمہیں لگتا ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے؟“

”ہوں، ان فیکٹ.... اس کی والدہ کے لہجے سے جھلکتی بے تابی مجھے حوصلہ دے رہی ہے۔“ وہ مطمئن تھا۔

جواباً زاویار سر ہلا کر کھڑکی سے باہر دوڑتی بھاگتی ٹریفک کو دیکھنے لگا تھا مگر اب اس کا ذہن ذرا دیر پہلے کی طرح نارمل نہیں تھا۔ کلثوم کے ذکر پر ایک اغوا شدہ لڑکی کے ساتھ بیتنے والے مظالم کا ان دیکھا خاکہ تصور کے پردے پر کھنچ گیا تھا۔

جو لڑکی باعصمت بازیاب ہوئی تھی جب وہ اس طرح زندہ درگور تھی تو وہ جو اپنی عصمت، اپنی فیملی سب کچھ اس طوفان کی نذر کر چکی ہو۔ زندگی اور خوشی کے راستے اس پر کس طرح تنگ ہوں گے یہ احساس ہی آسے کچو کے لگائے جا رہا تھا۔

اس کے پردۂ تصور پر جانے کیا کچھ اُبھر رہا تھا مٹ رہا تھا کہ کار کے جھٹکے سے رکنے کی آواز پر وہ خود میں لوٹا۔ سرفراز کار سے اُتر گیا تھا۔ جبکہ وہ اپنی جگہ جما بیٹھا تھا۔

”چلیں۔“ سرفراز نے اُسے اسی طرح بیٹھا دیکھ کر سوال کیا۔ تو وہ نفی میں سر ہلا گیا۔

”نہیں، تم جاؤ۔ میں اس وقت خود کو ٹھیک محسوس نہیں کر رہا۔“

”خیریت کیا ہوا۔ ذرا دیر پہلے تو تم اچھے بھلے تھے۔“ سرفراز نے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں کو فکرمندی سے دیکھا تھا۔

”بس یہ مائیگرین...... ایسے ہی اچانک شروع ہو جاتا ہے۔ تم میری فکر مت کرو اور اندر جاؤ۔ میں یہاں سے کیب پکڑ کر گھر چلا جاتا ہوں۔“

اس نے متردد سے سرفراز کا کندھا تھپک کر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔ پھر سرفراز نے لاکھ اس کے ساتھ جانا چاہا۔ اس نے منع کر دیا اور وہ ایدھی ہوم کے باہر سے ہی کیب پکڑ کر وہاں سے چلا آیا۔

☆......☆☆......☆

وہ شیرازی ولا واپس آئی تو یوں لگ رہا تھا جیسے نئی زندگی میں داخل ہوتی ہو۔ دادی اور مظفر صاحب کے رویے میں اسے اپنائیت کا ایک نیا احساس ملا تھا۔ گھر میں سب کا رویہ ہمیشہ کی طرح اچھا اور مہربانہ تھا۔

سوائے سائرہ بیگم کے۔ اور ان کے منفی سلوک کی تو وہ جیسے عادی ہو چکی تھی۔ کسی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ نہ اُس نے بتایا کہ آخر اس روز کیا ہوا تھا۔ غالباً ”سب اُس کے ڈر“ کو وجہ سمجھ رہے تھے۔ اگر ایسا تھا تو پھر ٹھیک ہی تھا۔

شب و روز خاصی تیزی سے گزر رہے تھے۔ تاہم اب اُسے روز طاہرہ آنٹی کے پاس جانا ہوتا تھا۔ گزرے عرصے میں اسے علم ہو چکا تھا کہ وہ ایک ماہرِ نفسیات ہیں اور درحقیقت وہ خود بھی اپنی ذہنی اور اعصابی کمزوری سے تنگ آ چکی تھی۔

کچھ دادی اور مظفر انکل کے کہنے کی مروت اور باقی طاہرہ آنٹی کا محبت بھرا مشفق رویہ تھا۔ جس نے اُسے اُن سے علاج کرانے پر آمادہ کیا۔

اور یوں وہ ان کے ساتھ وقت گزارنے لگی۔ حتیٰ کہ تین مہینے گزرنے کا پتا تک نہ چلا۔ طاہرہ کا طریقہ علاج

یوں بھی روایتی نہ تھا۔ وہ اسے کاؤچ پر لٹا کر صرف تحلیلِ نفسی ہی نہ کرتیں بلکہ اسے کسی نہ کسی صحت مند ایکٹویٹی میں بھی لگائے رکھتیں۔

خاص طور پر گارڈننگ یا پھر پوٹ پینٹنگ اور یہ سچ ہے کہ اسے زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ ہندسوں اور فارمولوں کی دُنیا میں رنگ، خوشبو اور جمالیاتی ذوق بھی کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

''عبید نے آنے کا بتا دیا ہے۔ اگلے ماہ کی تیس کو پہنچ رہا ہے وہ۔'' مظفر صاحب نے صبح صبح ناشتے کی میز پر بڑی اچھی خبر سُنائی تھی۔

''سچ.....اس بار واقعی آ رہے ہیں ناں کہ پھر سے گپ ماری ہے عبید بھائی نے۔''

سب ہی بیک وقت کچھ نہ کچھ بولے تھے۔ مظفر صاحب بردباری سے مسکرا دیے۔

''نہیں بھئی۔ اس بار واقعی پکا پروگرام بنا ہے اس کا۔ کل رات ٹیکسٹ میسج آیا تھا اُس کا۔ صبح فون پر بھی بات ہوئی مجھ سے'' اُنہوں نے سب کو یقین دلایا۔

''شکر ہے اللہ کا۔ بالآخر عبید نے بھی آنے کی حامی بھری۔'' دادی بہت خوش تھیں۔

''ہوں۔ آج صبح کال کی تھی میں نے اُسے۔ کہہ رہا تھا کہ عکرمہ کی شادی کی تاریخ طے کر دیں۔ بس اس بار چھوہارے کھا کر ہی جاؤں گا۔'' مظفر صاحب نے عکرمہ کو متبسم نظروں سے دیکھتے ہوئے عبید کی خواہش من وعن دُہرا دی۔

''لو اب ایسے اچانک کیسے تاریخ طے کر دیں۔ پہلے رشتہ تو پکا ہو کہیں۔'' اب کے سائرہ بیگم نے بھی باتوں میں حصہ لیا۔

''کیوں، کیا فارینہ باجی کے لیے بھی انکار کر دیا گیا ہے۔'' سیف کے منہ سے اچانک اور بے ساختہ نکلا تھا۔

سب ہی کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹیں دوڑ گئی تھیں۔

''ناؤ کم آن سیریس عکرمہ۔ اب تمہیں واقعی کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے۔'' آج حسنِ اتفاق سے زوہا بھی ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھی۔ وہ کل رات ہی آئی ہوئی تھی میکے۔ سنجیدگی سے بولی۔

''بالکل۔''

''آف کورس۔'' آصف اور ردا نے بھی ساتھ دیا تھا۔

''میرا خیال ہے یہ کام بڑوں کا ہے۔ جو آپ لوگوں کو ٹھیک لگے وہ کر لیں۔'' ناشتا ختم کرتے ہوئے عکرمہ نے بات بھی ختم کی۔

''نہیں بیٹا، زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ اس لیے فیصلہ بھی تم ہی کرو۔ ہمیں تمہاری خوشی ہر صورت منظور ہے۔'' مظفر صاحب نے اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر چلا جاتا۔ براہِ راست ہی اس سے کہہ دیا تھا۔

''بول دیں عکرمہ بھائی، اچھا موقع ہے۔'' سیف نے اُسے بک اپ کیا تو وہ اس کے کندھے کو تھپتھپا کر مسکرا دیا اور دادی کی جانب دیکھا۔

''ہاں عکرمہ۔ تم اپنی پسند بتا دو۔ ویسے فارینہ اچھی بچی ہے۔ اور گھر میں سب کو پسند بھی ہے۔'' دادی نے لگے ہاتھوں سارے کا سارا اختیار اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اور اگر کوئی اور لڑکی ہو تو؟ آپ لوگ تو یوں کہہ رہے ہیں... عکرمہ کو فارینہ ہی پسند ہے جیسے۔'' آصف نے عکرمہ کے سنجیدگی سے مزین چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ جس کی مسکراہٹ بھی سنجیدہ سی تھی۔

''کوئی بھی ہو۔ ہمیں عکرمہ کی پسند پر یقین ہے۔'' مظفر صاحب نے اعتماد سے کہا تو عکرمہ نے نظر اُٹھا کر اُن

کی طرف دیکھا۔ مظفر صاحب کے چہرے پر پدرانہ شفقت دھری تھی۔

''او کے..... تو پھر جلد ہی میں سوچ کر آپ سب کو بتا دوں گا۔ اب جبکہ آپ سب نے فیصلہ مجھ پر چھوڑا ہے تو پھر مجھے یقین ہے کہ میری خواہش کو مانا بھی جائے گا۔'' عکرمہ کے چہرے پر گہری سوچ کا تاثر تھا۔

''ویل آف کورس۔'' سب نے بیک وقت کہا تھا۔

فارینہ کا مسکراتا چہرہ اور دلفریب شخصیت سب کے ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''مجھے یقین ہے عکرمہ کہ مظفر تمہارا بہت خیال رکھیں گے، میں نہ بھی رہوں تو وہ تم دونوں بھائیوں کو کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیں گے۔'' بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا گو کہ زندگی بچ گئی تھی اُن کی مگر ان کا وجدان انہیں بتا گیا تھا کہ اب زیادہ وقت نہیں ہے ان کے پاس۔ مما جان کی جدائی نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا۔

عکرمہ کو وہ اکثر سمجھاتے رہتے تھے۔ اس روز بھی انہوں نے اسے پاس بٹھا کر بہت سی باتیں کرنے کے بعد کہا تو وہ سر ہلا کر ان کے سینے سے لگ گیا۔

''وعدہ کرو عکرمہ کہ اگر کبھی زندگی میں تمہارے چچا جان کو تمہاری ضرورت پڑی تو تم انہیں مایوس نہیں کرو گے۔ ہمیشہ ان کا ساتھ دو گے۔'' بابا کے لہجے اور لمس میں کچھ تھا جو دس سالہ عکرمہ کے دل میں اتر گیا تھا۔ جواب میں اس کی زبان سے بے اختیار نکلا تھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں بابا۔ میں چچا جان کو کبھی دکھی نہیں ہونے دوں گا۔'' اس نے کچھ اور بھی خود کو بابا کے قریب کرتے ہوئے کہا تھا۔ نہیں معلوم تھا کہ یہ اس کے اور بابا کے درمیان ہونے والی آخری گفتگو ہوگی۔

بابا چلے گئے مگر ان سے آخری وقت میں کیا وعدہ وہ کبھی نہیں بھولا۔ انہوں نے صحیح کہا تھا، مظفر صاحب نے ان دونوں بھائیوں کو اپنے بچوں کی طرح بہت محبت سے پالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مظفر صاحب اس کے لیے بابا سے کم نہیں تھے ان دن کے بعد سے لے کر آج تک اس نے ہمیشہ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہا مگر اسٹیٹس سے واپسی پر اس نے انہیں جس کرب میں مبتلا دیکھا وہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ انہیں اس اذیت سے نکالنے کے معاملے میں وہ خود کو بے بس پاتا۔ اور اب تو دادی کا دکھ بھی اس کے لیے رنج کا باعث تھا۔

ایسے میں جب اس کی دو محبوب ہستیاں اتنی تکلیف میں تھیں وہ ان کے لیے کیا کرے، یہ اس نے سوچ لیا تھا۔ جب بھی کسی کے لیے کچھ کرنا ہو تو دل کی رغبت اور پوری آمادگی سے کرنا چاہیے، ورنہ بے دلی سے کی گئی کوشش بارآور ہو بھی جائے تو بھی خوشی کا باعث نہیں ہوتی۔

☆.....☆.....☆

''دُرِ مکنون..... دُرِ مکنون ہے میرا انتخاب۔'' یہ دوسرے دن کی شام تھی۔ جب دادی اور مظفر صاحب نے اُسے اپنے پاس بلایا تھا۔

دادی نے عکرمہ کے ننھیال سے دو لڑکیاں پسند کی تھیں۔ ردا کی شادی پر کئی سال بعد ان سے ملنا ہوا تھا۔ گزرے سالوں میں اچھا قد کاٹ نکالا تھا لڑکیوں نے۔ جبکہ فارینہ کے لیے سب حامی تھے۔ گھر کے باقی افراد اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔ موقع اچھا تھا۔ عکرمہ نے ان دونوں کی بات سننے کے بعد کئی دنوں کی سوچ بچار اور اپنے دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کو اپنے بزرگوں کے سامنے لا رکھا۔

وہ دونوں یقیناً اس خبر کے لیے تیار نہ تھے۔ یک دم ساکت رہ گئے۔

(جاری ہے)

گڑیا

نشیہ سعید

آئمہ نے حسرت سے اپنے سامنے موجود شوکیس میں سجی اس خوب صورت گڑیا کو دیکھا جس کی کشش روز اسے اپنی جانب بلاتی تھی اور کہتی تھی کہ مجھے یہاں سے لے جاؤ اپنے ساتھ، اپنے گھر..... مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے مگر آئمہ جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہے، یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی ناتمام حسرتیں ہر روز قطرہ، قطرہ بن کر اس کی آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی شکل میں بہہ رہی تھیں۔ اب بھی اس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا گیلی

ہتھیلی میں ایک سنہری سکہ دبا ہوا تھا اور ایسے ہی کئی سکے وہ پچھلے کچھ ماہ سے جمع کر رہی تھی مگر جانتی تھی کہ اب بھی یہ رقم ناکافی ہے۔ اب بھی جانے اسے کتنے زمانے لگتے یوں پائی پائی جوڑنے میں مگر پھر بھی شاید وہ یہ گڑیا حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اب بے اختیار ہی آئمہ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر سامنے رکھے شوکیس پر پھیرنا چاہا تاکہ وہ اس کے اندر رکھی گڑیا کے لمس کو محسوس کر سکے کہ اچانک اس کے کانوں نے ایک کرخت آواز ٹکرائی۔

''اے کیا کر رہی ہے' پرے ہٹ.....'' آئمہ نے ڈر کر آواز کی سمت دیکھا موٹی سی توند نکالے مرد جو غالباً اس دکان کا ملازم تھا اور ہاتھ میں پکڑی جھاڑن لیے تمام شوکیس صاف کر رہا تھا۔ جب اس کی نظر اس چھوٹی سی بچی پر پڑی جس کی آنکھوں میں خوب صورت گڑیا کے حصول کی بھوک مچلتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ غصے میں چلایا۔

''چل نکل یہاں سے، جانے روز کہاں سے آجاتی ہے اپنے گندے ہاتھوں سے سارا شوکیس گندا کر دیا۔'' زبان کے ساتھ موٹے مرد نے ہاتھ بھی چلایا اور آئمہ کو بازو سے پکڑ کر پرے دھکیل دیا۔ وہ گرتے گرتے بچی اور منہ سے کوئی آواز نکالے بنا سسکتی ہوئی اپنے گھر جانے والے راستے پر ہو لی۔

☆☆☆

دس سالہ آئمہ قریبی گورنمنٹ اسکول میں پانچویں کلاس کی طالبہ تھی اس کا بابا عبدالباسط ایک مزدور تھا جو دو سال قبل ایک حادثے کا شکار ہو کر معذور ہو گیا تھا، اس کی ماں شاہینہ لوگوں کے گھر جھاڑو پوچا کرتی تھی۔ جس سے ان کے گھر کا خرچہ چلتا۔ آئمہ سے چھوٹے تین بھائی تھے۔ ایک اس کے ساتھ ہی لڑکوں کے اسکول جاتا جبکہ دوسرے دو ابھی چھوٹے تھے۔ یہ دکان آئمہ کے اسکول کے راستے میں آتی تھی جہاں سے وہ پچھلے کئی سالوں سے گزر رہی تھی مگر پتا نہیں کیسے کچھ ماہ قبل ہی باہر شوکیس میں رکھی اس خوب صورت اور قیمتی گڑیا نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی اور وہ روزانہ اسکول سے واپسی میں کئی، کئی گھنٹے اس شوکیس کے سامنے کھڑی ہو کر گڑیا سے باتیں کرنے لگی جو آئمہ کے ہر سوال کا جواب دیتی اور خوب ہنستی بولتی جبکہ اس کا چھوٹا بھائی ابرار چھٹ سے گھر پہنچ جاتا کیونکہ شاہینہ کام پر ہوتی تو کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ آئمہ ایک بجے کے بجائے تین بجے کیوں گھر آنے لگی ہے۔ ابرار تو گھر جاتے ہی کھانا کھا کر باہر چلا جاتا جبکہ عبدالباسط دونوں بچوں کو کھانا کھلا کر خود چارپائی پر اونگھنے لگتا کیونکہ اسے شاہینہ کی واپسی کا انتظار ہوتا جو گھر آتے سے روزانہ مختلف گھروں سے رنگ برنگا کھانا لاتی تھی جو... عبدالباسط کو بہت پسند آتا اور وہ کبھی گھر کے بنے آلو یا دال کھاتا جو رات میں شاہینہ ان کے لیے بنا کر رکھ جاتی ایسے میں اسے کبھی خیال نہ آیا کہ آئمہ گھر دیر سے کیوں آتی ہے چونکہ شاہینہ کے گھر واپسی سے پہلے ہی آئمہ بھی آجاتی لہٰذا شاہینہ اس کی اس سرگرمی سے قطعی لاعلم تھی ورنہ وہ ضرور استفسار کرتی مگر فی الحال وہ یہ سمجھتی رہی کہ آئمہ بھی ابرار کے ساتھ روزانہ وقت پر ہی گھر آجاتی ہے۔

☆☆☆

آج شاہینہ کی طبیعت خراب تھی تو وہ جلدی گھر آگئی۔ عبدالباسط کو کھانا دے کر پہلے دونوں بچوں کو کھلایا جو گھر پر تھے پھر ابرار اور آئمہ کے انتظار میں پورے گھر کی صفائی کر ڈالی اسی دوران ایک بج گیا ابرار تو آگیا مگر آئمہ نہ آئی۔ اب جیسے، جیسے وقت گزرتا گیا شاہینہ بے چین ہوتے لگی اور ابرار کو کھانا دے کر باہر گلی کے دروازے میں جا کھڑی ہوئی جہاں دور، دور تک آئمہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اسی بے قراری میں وہ واپس پلٹی اور ابرار کے پاس پہنچی۔

''گڈی کہاں ہے؟'' شاہینہ ہمیشہ سے آئمہ کو گڈی ہی کہتی تھی۔

''پتا نہیں.....'' ابرار نے بے پروائی سے دال، چاول سے لتھڑی اپنی انگلیاں چاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ روز دیر سے گھر آتی ہے۔''

"ہیں...... وہ کیوں؟" یہ انکشاف شاہینہ کے لیے بالکل نیا تھا۔

"مجھے کیا پتا۔" جواب دینے کو آٹھ سالہ ابرار اپنی کھانے کی پلیٹ پرے سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا جب سفید دوپٹے کی بکل مارے خاکی یونیفارم میں ملبوس تھکی ماندی آئمہ گھر میں داخل ہوئی جس پر نظر پڑتے ہی شاہینہ کی کئی دیر سے رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

"اتنی لیٹ؟" شاہینہ نے بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"اب تو تین بجنے والے ہیں اور تیرے اسکول کی چھٹی تو ایک بجے ہوتی ہے۔"

"اماں بھوک لگی ہے کھانا دے دے۔" شاہینہ کے سارے سوالوں کو قطعی نظر انداز کرتی آئمہ نلکے سے ہاتھ دھو کر اس کے سامنے آن بیٹھی۔ جب ماں نے کھانے کی پلیٹ اس کے قریب لا رکھی۔

"کہاں تھی تو جانتی ہے کتنی پریشان تھی میں۔" ماں نے پیار سے اس کے بال سہلائے۔ آئمہ کو حیرت ہوئی کتنا فرق تھا باپ اور ماں کی محبت میں، ماں تھی پہلے ہی دن اس کے دیر سے گھر آنے پر پریشان ہو اٹھی اور ایک بابا تھا جس نے اتنے دنوں میں بھی اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ چھٹی کے بعد دو گھنٹے کا وقت کہاں گزارتی ہے۔

"آئمہ تو ٹھیک تو ہے ناں میری دھی۔" پریشانی میں شاہینہ نے اس کو اصل نام لے کے پکارا۔ "جب سے آئی ہے اتنی خاموش کیوں ہے سب خیر تو ہے ناں؟"

"اماں......!" آئمہ نے ماں کی جانب دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میں کل اسکول نہیں جاؤں گی، مجھے اپنے ساتھ پنکی کے گھر لے جانا۔ میں نے اس کی گڈی دیکھنی ہے۔" شاہینہ چونک گئی اسے بیٹی کے لہجے میں چھپی حسرت محسوس ہوئی جو اس کی نا تمام خواہشوں کی ترجمان تھی۔ اب اسے دکھ کے ساتھ افسوس ہوا کہ وہ اسے کچھ ماہ قبل اپنے ساتھ سمیرا باجی کے گھر کیوں لے کر گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ سمیرا باجی کی اکلوتی بیٹی پنکی کے کمرے میں سجی ڈھیروں ڈھیر گڑیائیں اور ان کے استعمال کے آرائشی سامان نے آئمہ کے دل میں بھی گڑیا کے حصول کی خواہش بھر دی ہے، یہ ہی وجہ تھی کہ بیٹی نے اسکول سے چھٹی کر کے پنکی کے گھر جانے کی فرمائش کی تھی جس سے اب انکار ممکن نہ تھا اس لیے کچھ سوچ کر بولی۔

"لے تو جاؤں گی لیکن ایک شرط پر کہ تو اس کی کسی گڑیا کو ہاتھ نہیں لگائے گی...... جانتی ہے ناں کہ پچھلی دفعہ تیرے چھونے سے اس کی قیمتی گڑیا میلی ہو گئی تھی، سمیرا باجی نے کتنا واویلا ڈالا تھا۔" آئمہ نے...... بے اختیار اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا جو بظاہر صاف ستھرے دکھائی دے رہے تھے مگر سمیرا باجی اور موٹی توند والا دکان دار اسے گڑیا کو چھونے بھی نہ دیتا تھا اور دونوں کہتے تھے کہ اس کے ہاتھ گندے ہیں کچھ سوچتے ہوئے بے اختیار ہی آئمہ نے اپنے دوپٹے سے اچھی طرح ہاتھ پونچھ ڈالے اور نتیجے میں تیل کے کچھ دھبے سفید دوپٹے پر بھی نظر آنے لگے۔ جنہیں قطعی طور پر نظر انداز کرتی وہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

"اماں، مجھے بھی گڑیا لے دے ناں۔"

"لا کر تو دی تھی تجھے گڑیا پھر کہاں ہے وہ؟" شاہینہ کو یاد آیا کچھ ماہ قبل جب وہ پنکی جیسی قیمتی اور خوب صورت گڑیا کی فرمائش کر رہی تھی تو شاہینہ نے گلی کے نکڑ والی دکان سے اسے ایک پلاسٹک کی گڑیا لے دی تھی جو آئمہ کو بالکل پسند نہیں آئی تھی تب اس نے پہلی بار ضد کی تھی۔

"مجھے پنکی جیسی نرم والی گڑیا چاہیے جو آنکھیں کھولتی اور بند کرتی ہے جو اپنے کپڑے چھوٹی الماری میں رکھتی ہے اور رات سب کے سونے کے بعد اپنے کچن میں کھانا تیار کرتی ہے۔" یہ وہ سب باتیں تھیں جو اسے پنکی نے خود بتائی تھیں۔

"جانتی ہے ماں اس کی گڑیا سرخی پاؤڈر بھی لگاتی ہے۔"

"لو بھلا ہم ویسی گڑیا کہاں سے لا سکتے ہیں؟" ہنستی ہوئی شاہینہ نے بیٹی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔

''جانتی نہیں تو پنکی بی بی کی ساری گڑیاں کتنی قیمتی ہیں، میں اگر اپنی ایک ماہ کی تنخواہ کا کوئی روپیہ ڈھیلا گھر میں خرچ نہ کروں تو شاید صرف ایک گڑیا خرید سکوں باقی سامان تو ہم لینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔'' شاہینہ نے صاف لفظوں میں بیٹی کو سمجھانا چاہا۔

''اتنے پیسوں والی گڑیا؟'' آئمہ کو حیرانی ہوئی پھر اس نے ذہن میں ایک نیا اور اچھوتا خیال آیا اور وہ ماں کے قریب ہو کر دھیرے سے بولی۔

''اماں ایسا کر تو وہاں سے ایک گڑیا چھپا کر لے آ، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی اور پنکی کے پاس تو ڈھیر ہیں اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔'' لاحاصل خواہش نے چور راستہ ڈھونڈنا چاہا۔

''لے جھلی نہ ہو تو...... بھلا میں ایک گڑیا کے لیے اپنی آخرت خراب کرلوں، نہ میری دھی چوری کرنا سخت گناہ ہے۔ جس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں میں دیتا ہے۔'' بیٹی کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہوئے شاہینہ نے سمجھانا چاہا۔

''پھر ایسا کر سمیرا باجی سے ایک گڑیا مانگ لے، کہنا میری آئمہ کو چاہیے، اسے گڑیا بہت پسند ہے۔'' بچی تھی سمجھی کہ یہ سب بہت آسان ہے اس لیے ماں کو بھی سمجھانا چاہا۔ وہ دو سالوں سے سمیرا کے گھر کام کر رہی تھی اور اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے آئمہ کو پیار کرتے ہوئے بولی۔

''ہم بھلا کسی سے کچھ کیوں مانگیں پیسے جمع کر کے خود خرید لیں گے...... مانگنا اچھی عادت نہیں ہے۔''

ماں کے اس جملے کے آئمہ کو حیران کر دیا وہ ماں جو روز کھانا مانگ کر لاتی جو اپنے پہننے...... کے لیے پرانے کپڑے مانگ کر لیتی، جس کے پاؤں میں جوتی سے لے کر سر پر لیا ہوا دوپٹا تک سب مانگے کا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ مانگنا اچھی عادت نہیں ہے جواباً آئمہ خاموش رہی اور اس کی خاموشی سے شاہینہ مطمئن ہوگئی کہ شاید بیٹی کو قائل کر لیا ہے مگر آج اتنے ماہ بعد آئمہ کی زبان سے نکلنے والی اس کی پرانی اور دبی ہوئی خواہش نے اسے احساس دلایا کہ آئمہ ابھی تک پنکی کی گڑیوں کے حصار سے باہر نہیں نکلی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ پنکی کے خوب صورت کمرے میں موجود قیمتی گڑیا کے ساتھ، ساتھ وہ اب ٹوائے شاپ کے بیرونی شوکیس میں سجی خوب صورت اور قیمتی گڑیا کے حصول کو بھی اپنے دل میں بسا چکی ہے جو قدرے خطرناک تھا کیونکہ کبھی، کبھی انسان لاعلمی میں کسی بھی ایسی شے کے حصول کی خواہش کرنے لگتا ہے جو گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ اسے پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے اور شاید آئمہ بھی آہستہ، آہستہ ان ہی گہرائیوں کی جانب بڑھ رہی تھی جن کی خطرناک وجود سے وہ قطعی ناآشنا تھی اور اسی.... بے خبری میں وہ اپنے کل ہونے والے نقصان سے بھی غافل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

جلال الدین نے کھانا کھا کر برتن پرے سرکائے اور دانتوں میں خلال کے لیے قریبی موجود شیشے کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اندر سے خوب صورت لکڑی کا تنکا نکالا اور اپنے دانتوں میں پھیرنے لگا جب باہر عمران کی غصیلی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

''چل نکل یہاں سے...... روز آ جاتی ہے یہاں شیشہ صاف کرنے وہاں اپنے میلے ہاتھوں سے گندا کرنے آ پہنچتی ہے۔'' وہ کسی پر بری طرح ناراض ہو رہا تھا۔ جلال الدین نے کاؤنٹر سے ذرا آگے ہو کر دیکھا تو سفید دوپٹے کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی یعنی باہر کوئی لڑکی تھی وہ اٹھ کر دروازے کی سمت آیا دیکھا ایک چھوٹی سی بچی سرکاری اسکول کا یونیفارم پہنے کندھے پر کپڑے کا بیگ ڈالے شوکیس سے کچھ دور کھڑی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے کیوں اس طرح چلا رہے ہو؟'' بچی پر نظر ڈال کر وہ ملازم سے مخاطب ہوا جس کے چہرے پر انتہائی بیزاریت چھائی ہوئی تھی جو جلال دین کو دیکھ کر بھی کم نہ ہوئی اس لیے ہاتھ میں پکڑے ڈسٹر کی مدد سے اس نے پہلے تو شوکیس کو اچھی طرح صاف کیا پھر

پلٹ کر اپنے قریب کھڑے مالک پر نظر ڈالی جو سامنے کھڑی غریب بچی کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''چل اب جا یہاں سے کیوں کھڑی ہے؟''

عمران احمد نے آگے بڑھ کر اپنا ڈسٹر کا کپڑا آئمہ کے سر پر دے مارا جو اس افتاد سے گھبرا کر تیزی سے اپنے گھر جانے والے راستے کی جانب بڑھ گئی...... جبھی عمران نے پلٹ کر جلال دین کو مخاطب کیا۔

''پتا نہیں کون ہے، روز آجاتی ہے اس شوکیس کے سامنے کھڑی ہو کر گڑیا سے باتیں کرتی ہے اور اپنے گندے میلے ہاتھوں سے صاف ستھرے شوکیس کا شیشہ دھبا آلود کر دیتی ہے۔''

''پھر بھی خیال کیا کرو، بچوں سے اتنی سخت زبان میں بات نہیں کرتے۔'' جلال دین، اسے سمجھاتا ہوا واپس دکان کے اندر چلا گیا۔ جبکہ پیچھے کھڑا ملازم عمران اب بھی مسلسل بڑبڑا رہا تھا جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے جلال دین کی اس طرح دخل اندازی بالکل پسند نہیں آئی۔

☆☆☆

شاہینہ کب سے صفائی کر رہی تھی، کام تھا کہ آج ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وجہ شاید گڑیوں کا وہ شوکیس تھا جو پنکی کے کمرے میں سجی تھیں۔ لہٰذا شاہینہ کوئی تین بار پنکی کے کمرے میں گئی بلا ضرورت یہاں کی چیزیں اٹھا کر وہاں رکھیں، بار بار شوکیس پر کپڑا مارا اور ہر بار دل چاہا کہ کچھ نہ سہی تو کم از کم شوکیس کے باہر دراز پر اوندھے منہ پڑی اس گڑیا کو ہی اٹھا کر چھپا لے جس کی نیلی فراک پھٹ گئی تھی اور دیکھنے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پنکی کو اب اس گڑیا سے انسیت نہیں رہی تھی، یہ ہی وجہ تھی کہ وہ کافی دنوں سے یوں ہی اوندھے منہ دراز پر دھری تھی مگر چاہتے ہوئے بھی باجود کوشش کے وہ گڑیا کو اٹھا کر اپنی کپڑے کی پوٹلی میں نہ چھپا سکی۔ جسے وہ روزانہ گھر سے لاکر باہر صحن میں رکھی واشنگ مشین پر چھوڑ دیتی تھی اور واپسی میں گھر کا بچا ہوا سالن، روٹی کا شاپر کپڑے کی تھیلی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

سرما کی ابتدائی نرمیاں
اکتوبر کی خمار آلود کہانیاں

اولین صفحات

پیمانۂ محبت کے جام میں ڈوبی کہانی کے نشیب و فراز...... بہکتے قدموں، لرزتے ہاتھوں زندگی کو تمام کر دینے والے کرداروں کی داستان عشق......
زویا اعجاز کے قلم سے

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان ...... امجد جاوید کے زور آور قلم کا امتحان......

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل۔ زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جارہی تھی ...... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

ساز پر خوشی کے نغمے گونجتے ہیں..... مگر وہ ساز مرگ تھا...... چشم تر میں بھیگی کہانی

دوسرا رنگ

اغوا ہو جانے والے خاندان کی سنسنی خیز کہانی کے حیرت انگیز موڑ

چیلی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے..... مشورے ..... محبتیں..... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں ..... کتھائیں

میں ڈال کر لے جاتی تھی۔ اب بھی وہ تیسری بار پنکی کے کمرے میں آئی اور پنکی کی نظر بچا کر ہلکے سے چھوا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھوں میں آئمہ کی ساری خواہشات سمٹ گئی ہوں اور اس احساس کے ساتھ ہی ایک دم ہی گڑیا کو پانے اور اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش شدید ترین ہوگئی۔ جس کے زیرِ اثر اس نے خاموشی سے گڑیا کو اپنے ہاتھ میں اٹھالیا جب اسی دم پنکی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہ گندی گڑیا ہے، اسے ہاتھ مت لگاؤ......''

آواز کے ساتھ ہی وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کر شاہینہ کے قریب آئی۔

''دیکھو اس کی فراک کالی ہے، گندی فراک والی گندی گڑیا باہر پھینک دو۔'' شاہینہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''مگر بیٹا یہ تو آپ کی گڑیا ہے؟'' دل کی شدید خواہش تھی کہ پنکی اپنی سابقہ بات پر قائم رہتے ہوئے یہ گڑیا پھینک دے۔

''ہاں لیکن اب یہ گندی ہوگئی اور مجھے پاپا نے دوسری گڑیا لادی۔'' بات کے اختتام پر پنکی نے شوکیس کی بند دراز کا لاک کھول کر ایک بڑا سا ڈبا نکالا اور اس میں موجود خوب صورت گڑیا شاہینہ کے سامنے کردی جسے دیکھتے ہی بے اختیار اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور اسے حیرت ہوئی قدرت کی اس تقسیم پر...... کہاں اس کی بچی تھی جو ایک معمولی سی گڑیا کے لیے ترس رہی تھی اور کہاں یہ پنکی تھی جس کے منہ سے کوئی بات نکلنے سے قبل ہی اس کی خواہش پوری کردی جاتی تھی شاید اسے ہی قسمت کہتے ہیں کوئی ترستا ہے اور کوئی ترسے بنا وہ سب پالیتا ہے جو اس کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ اسی سوچ میں گم تھی کہ جب یک دم پنکی نے اس کے ہاتھ میں موجود گڑیا کھینچی اور اپنے کمرے کی ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ اس کے اس عمل نے جیسے ایک پل کو شاہینہ کا دم نکال دیا اسے ایسا محسوس ہوا کہ پنکی گڑیا کھڑکی سے باہر ہی نہ پھینک دے مگر ڈسٹ بن میں موجود گڑیا نے اسے خاصی تسکین پہنچائی اور پھر کام ختم کرنے کے دوران اس کا سارا دھیان پنکی کے ڈسٹ بن میں رہا جہاں موجود گڑیا اسے حوصلہ دیتی رہی کہ آج وہ اپنی بیٹی کی ایک معصوم خواہش کو ضرور پورا کرسکے گی لہٰذا جیسے ہی کام ختم ہوا سارے کمرے سے ڈسٹ بن اٹھا کر کچرا باہر موجود بڑے ڈسٹ بن میں ڈال کر گیٹ کے باہر رکھتے ہوئے وہ گڑیا اپنے کپڑے کے تھیلے میں چھپانا نہ بھولی مبادا امیرا باجی کی نظر اس پر پڑ جائے اور وہ شاہینہ کے ہاتھ میں موجود گڑیا واپس نہ لے لیں۔

اسی احساس کے ساتھ وہ جب تک گھر نہ پہنچی اس کی جان سولی پر اٹکی رہی مگر گھر پہنچ کر ایک نئی خبر اس کی منتظر تھی جس نے گڑیا کے حصول کی خوشی کو پل بھر میں ختم کردیا۔ آئمہ ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔ آئمہ کی غیر حاضری نے گڑیا کی خوشی بھی ختم کردی ظاہر ہے وہ جس کے لیے گڑیا لائی تھی وہ گھر نہ تھی تو گڑیا کی حیثیت صفر ہوگئی اب جب تک آئمہ گھر نہ آتی گڑیا کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جسے شاہینہ نے کچن میں موجود لکڑی کی الماری پر رکھ دیا تھا اور خود وہ آئمہ کی تلاش میں باہر نکل گئی تاکہ اس کی کسی دوست کے گھر جا کر پوچھے کہ آئمہ کہاں ہے مگر شام سے رات ہوگئی آئمہ کہیں نہ ملی تو شاہینہ اور... عبدالباسط سارا دن اپنی بیٹی کی تلاش میں ہلکان ہوگئے۔ دوبار محلے کی مسجد میں اعلان بھی کروایا اور پنچایت کمیٹی کے ممبر جلال الدین کے کہنے پر قریبی تھانے جا کر تلاشِ گمشدہ کا پرچہ بھی کٹوادیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا رات سے دن چڑھ آیا شاہینہ کی گڈی نہ ملی اور شام چار بجے جب وہ تھک ہار کر صحن کے فرش پر گری گڑگڑا کر اپنی بیٹی کی سلامتی کی التجا اپنے پروردگار سے کررہی تھی اچانک محلے میں شور ابھرا اور کسی نے اس کے صحن کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑا کر پکارا۔

''گڈی مل گئی۔''

''گڈی مل گئی ہے۔'' سجدے سے سر اٹھاتی شاہینہ اندھا دھند گھر سے باہر بھاگی جبکہ باسط بھی اپنی بے ساکھیاں بجاتا اس کے پیچھے، پیچھے تھا اور تھوڑی دیر

بعد ہی وہ دونوں وہاں پہنچے جہاں سے گڈی ملی تھی۔ قبرستان کی ایک کچی قبر جس پر کسی شقی القلب نے اسے مار کر پھینک دیا تھا مگر اللہ کی قدرت کہ وہ زندہ تھی اور وہاں چرس پینے کے لیے جمع ہونے والوں میں سے کسی آدمی نے قبر میں موجود کرلاتی بچی کو دیکھ کر پہلے گورکن کو بتایا اور پھر محلے میں اطلاع دی جس کے ساتھ ہی وہاں محلے کے مختلف افراد جمع ہو گئے اور اس طرح گڈی کی شناخت کے ساتھ شاہینہ کو اطلاع دے دی گئی جو اپنی بچی کو اس حال میں دیکھ کر ہوش وحواس ہی کھو بیٹھی۔ کچھ ہی دیر بعد جلال الدین کی قیادت میں قریبی تھانے کی پولیس بھی وہاں پہنچ گئی جہاں سے پہلے گڈی کو اسپتال لے جایا گیا اور پھر میڈیکل چیک اپ کے بعد اس کے گھر والوں کے حوالے کر دیا گیا۔

☆☆☆

آج دو دن بعد آئمہ سرکاری اسپتال سے گھر آئی تھی میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس کے جسم پر تشدد کے نشان علاوہ اسے زیادتی کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا جس کے بعد گردن دبا کر مارنے کی کوشش کی۔ شاہینہ کو دکھ اور حیرت اس بات پر تھی کہ ایسا کون حیوان تھا جس نے دس سالہ بچی پر اتنا بہیمانہ تشدد کے بعد اس کا گلا دبا کر مارنے کی کوشش بھی کی۔ آخر کسی کو آئمہ یا اس کے خاندان سے کیا دشمنی تھی، کون تھا آخر یہ سب کرنے والا شخص......اور اس سوال کا جواب صرف آئمہ دے سکتی تھی جو کہ بالکل گم صم تھی یہاں تک کہ اس کی حالت نے شاہینہ کو الماری میں رکھی گڑیا بھی بھلا دی اور اب وہ جب کام پر جاتی تو گڈی کو عبدالباسط کے حوالے کر کے جاتی۔ اس کی بیٹی کی پڑھائی، اسکول سب ختم ہو گیا تھا بلکہ اب تو خوف زدہ آئمہ گھر سے باہر ہی نہ نکلتی تھی۔ اس نے خود کو محض ایک کمرے تک محدود کر لیا تھا اور اس کی اس حالت نے شاہینہ کو اتنا پریشان کیا کہ وہ سارا دن اس ان دیکھے شخص کو بد دعائیں دیتی جس کی بدولت اس کی معصوم بیٹی اس حال کو پہنچی۔

☆☆☆

گزرتا وقت ہر زخم بھر دیتا ہے لہٰذا شاہینہ کا دکھ بھی وقت کے ساتھ، ساتھ مندمل ہوتا گیا مگر آئمہ کو حالات نے بالکل بدل دیا، اسکول جانا تو وہ چھوڑ ہی چکی تھی۔ گھر سے باہر بھی وہ نہیں نکلتی تھی۔ جبکہ کچن کی الماری میں رکھی وہ خوب صورت گڑیا بد صورت ہو کر دھوئیں سے کالی ہو گئی......لیکن آئمہ کے دل سے گڑیا کی خواہش بالکل ختم ہو گئی تھی یہاں تک کہ الماری میں رکھی گڑیا کو آئمہ نے ایک دن بھی چھو کر نہیں دیکھا بلکہ وہ تو شاید اب گڑیا سے ہی نفرت کرنے لگی تھی کہیں بھی کوئی گڑیا دیکھ لیتی تو نظر نہ اٹھاتی بلکہ گڑیا کا وجود آئمہ کے لیے خوف کی علامت بن گیا۔ اسی طرح ایک دن شاہینہ کسی طرح سمجھا بجھا کر اسے سمیرا باجی کے گھر لے گئی شاید وہاں جا پنکی کی گڑیا دیکھ کر آئمہ کا دل بہل جائے مگر ایسا نہ ہوا بلکہ وہ تو وہاں جا کر مزید پریشان ہو گئی باوجود شاہینہ کی کوشش کے آئمہ نے سارا وقت صحن میں بیٹھ کر گزار دیا اور ایک بار بھی پنکی کے کمرے میں نہ گئی البتہ شاہینہ نے ایک نئی بات نوٹ کی کہ وہ تمام وقت جب تک آئمہ، سمیرا باجی کے گھر رہی، ان کے صحن میں موجود نلکے سے بار، بار ہاتھ دھوتی رہی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے ہاتھوں پر کوئی شاید ایسا گند لگا ہو جو صرف آئمہ ہی دیکھ سکتی ہے۔ اس دن کے بعد شاہینہ نے بیٹی پر نظر رکھنا شروع کی تو اس کے علم میں آیا کہ آئمہ وہم کی مریض ہو چکی تھی وہ بار، بار اپنے ہاتھ دھوتی اور کتنی دیر انہیں دوپٹے سے رگڑا کرتی مگر شاید پھر بھی اسے تسکین نہ ملتی اور اسی سبب رگڑ، رگڑ کر اس نے اپنے ہاتھوں کی کھال بھی اتار دی تھی مگر جانے ایسا کیا تھا اس کے دل میں کہ اس کی تسلی ہی نہیں ہوتی تھی۔

شاہینہ نے لاکھ چاہا کہ وہ اپنے دل کی بات ماں کو بھی بتا دے مگر باوجود کوشش کہ وہ آئمہ کے ہونٹوں پر لگا قفل نہ کھلوا سکی اور آئمہ چپ کی بکل اوڑھے اندر ہی اندر گھلتی رہی۔ کبھی، کبھی شاہینہ کو یہ سوچ کر حیرت ہوتی کہ دنیا کیسے، کیسے ظالم لوگوں سے بھری ہوئی ہے کہ محض اپنی تسکین کے لیے کسی بدذات شخص نے اس کی

بیٹی کو چوبیس گھنٹے جس بے جا میں رکھا اور یہ سوچ کر اس کا دل کانپ جاتا کہ جانے کس ہتھیار سے اس کی معصوم بچی کے جسم کو داغا گیا؟ شاید وہ کوئی نفسیاتی طور پر بیمار شخص تھا جس کی تسکین کے لیے یہ ایک معمولی عمل تھا مگر اس عمل کے نقصانات کتنے سنگین تھے۔ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ آئمہ کی حالت نے شاہینہ کو پریشان کر دیا وہ چاہتی تھی کہ آئمہ دوبارہ اپنی پڑھائی شروع کرے مگر ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کو تیار نہ تھی۔ ایسے میں کئی بار سمیرا باجی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ آئمہ کو کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھائے مگر شاہینہ کا دل تو یہ سوچ کر ہی گھبرانے لگتا کہ اس طرح لوگ اس کی بیٹی کو پاگل سمجھنے لگیں گے کیونکہ ناخواندہ طبقے میں نفسیاتی بیمار کا مطلب ہمیشہ پاگل کے الفاظ میں ہی لیا جاتا ہے بس یہ ہی وہ خوف تھا کہ وہ آئمہ کی حالت کا ذکر بھی کسی کے سامنے نہیں کرتی تھی۔

☆☆☆

وقت کا پہیا کچھ سال آگے سرک گیا جب شاہینہ کے محلے میں ایک این جی او نے کام شروع کیا۔ جس کے تحت انہوں نے بڑی سڑک پر پیلا اسکول تعمیر کیا اور پھر گھر گھر جا کر وہ بچے اکٹھے کیے جو معاشی تنگی کے سبب علم حاصل کرنے سے محروم تھے..... اور اسی دوران رخشندہ نامی ایک خوب صورت سی لڑکی، شاہینہ کے گھر بھی آن پہنچی جو چاہتی تھی کہ آئمہ اپنی ٹوٹی پھوٹی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ سے جوڑ لے اور پھر رخشندہ کی محبت اور کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ آئمہ نے ایک بار پھر سے اسکول جانا شروع کر دیا..... اب صبح اپنے کام پر جاتی ہوئی شاہینہ اسے اسکول چھوڑ دیتی جبکہ واپسی کی ذمے داری رخشندہ باجی نے اٹھالی اور وہ اپنے گھر جاتے ہوئے آئمہ کو بھی گھر چھوڑ دیا کرتی۔ اس طرح آئمہ آہستہ، آہستہ زندگی کی طرف واپس آنے لگی اور اس کی زندگی پر چھایا ہوا جمود دھیرے، دھیرے چھٹنے لگا۔ بظاہر ایسا لگتا کہ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والا اندوہناک واقعہ بھول چکی ہے اور اسے اس طرح زندگی کی طرف واپس آتا دیکھ کر جو خوشی شاہینہ کو ہوئی اس کا اندازہ صرف ایک ماں ہی لگا سکتی ہے۔

☆☆☆

آج آئمہ کا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا اور وہ فرسٹ کلاس پوزیشن لے کر پاس ہوئی جس کی خوشی شاہینہ نے تو اپنی حیثیت کے مطابق منائی مگر رخشندہ نے اسے دل کھول کر داد دی اور اسی خوشی میں این جی او کی طرف سے نہ صرف مٹھائی تقسیم کی گئی بلکہ آئمہ کو قیمتی تحائف سے بھی نوازا گیا اور رواں ہفتے میں ایک مقامی ہوٹل میں آئمہ کے اعزاز میں تقریب منعقد کی گئی جس کے مہمانِ خصوصی پنچایت کمیٹی کے معزز ممبر جلال الدین صاحب تھے جو تجارتی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھنے کے ساتھ، ساتھ کئی غریب اور بے کس خاندانوں کے کفیل بھی تھے۔ این جی او جس کے تحت یہ اسکول چلایا جا رہا تھا اس کی گورننگ باڈی میں بھی شامل تھے اور یہ یقیناً شاہینہ اور عبدالباسط جیسے غریب ماں، باپ کے لیے اعزاز تھا کہ انہیں اپنی بیٹی کی بدولت علاقے میں اتنی عزت ملی جس پر وہ اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتے کم تھے اور ایسے میں شاہینہ کو رہ، رہ کر خیال آیا کہ اسے بھی اپنی بیٹی کو کوئی تحفہ دینا چاہیے۔ اس احساس کے تحت آج کئی سالوں بعد اس نے کچن کی الماری کے کونے میں دھری وہ کالی گڑیا نکالی جس کی حالت ہی بدل گئی تھی اب آئمہ کی غیر موجودگی میں شاہینہ نے نہایت محبت سے اس گڑیا کو دھو کر سکھایا کہ وہ ایک دم ہی نکھر گئی۔ شاہینہ نے پرانے کپڑے نکال کر گڑیا کی فراک سی اور پھر اسے سجا سنوار کر ایک جوتے کے ڈبے میں رکھ دیا اور اب اسے انتظار تھا اس دن کا جب آئمہ کو مقامی تقریب میں سند اور جلال الدین کی جانب سے نقد انعام ملے شاید جلال الدین، آئمہ کی پڑھائی کا وظیفہ بھی باندھنے والا تھا۔ ان تمام خوش کن خیالات کے ساتھ وہ دن بھی آن پہنچا جس نے ایک ہی دم میں سب کچھ بدل دیا اور اس تبدیلی نے آئمہ کے ہونٹوں پر لگے قفل کو کچھ اس طرح توڑا کہ

ہر فرد ہق دق رہ گیا۔

☆☆☆

آج دو جنوری تھی اور آئمہ کو اسکول سے ہی مس رخشندہ دیگر اساتذہ کے ہمراہ اس ہوٹل جانا تھا جس کے ہال میں تقسیم اسناد کی تقریب رکھی گئی تھی شاہینہ بھی صبح سے اس کے ساتھ تھی اور اس طرح تقریباً دو بجے وہ سب اسکول کی گاڑی میں ہوٹل جا پہنچے۔ شاہینہ نے دیکھا آج آئمہ بہت خوش تھی، مارے خوشی اس کے چہرے پر ایک نور سا بکھرا ہوا تھا جسے دیکھ کر شاہینہ نے اپنی بیٹی کی زندگی کے لیے ابدی خوشیوں کی دعا کی اور وہ دونوں ماں، بیٹی اسکول انتظامیہ کے ہمراہ جوں ہی ہال میں داخل ہوئیں جانے آئمہ کو کیا ہوا کہ ایک دم ہی خوف زدہ ہو کر وہ دروازے پر رک گئی۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ شاہینہ نے دیکھا خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ کپکپا رہی تھی تمام لوگ ہال میں داخل ہو چکے تھے مگر آئمہ کو اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر شاہینہ بھی رک گئی، وہ ماں تھی بیٹی کی بگڑتی حالت ایک لمحے میں ہی بھانپ گئی اور پلٹ کر اس کے قریب آئی۔ آئمہ کے ہونٹ سفید پڑ چکے تھے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ شاہینہ گھبرا گئی اور جلدی سے بیٹی کے کندھے کو چھو کر پکارا۔

''آئمہ..... آئمہ کیا ہوا میری بچی؟'' ماں کے ہاتھ کو اپنے کندھے پر محسوس کرتے ہی آئمہ کو جیسے کرنٹ لگا اور وہ گھبرا کر دیوار سے جا لگی اور روتی ہوئی بولی۔

''یہاں سے چلو اماں..... مجھے اندر نہیں جانا۔''

دیوار کے ساتھ رگڑتے ہوئے وہ زمین پر ہی بیٹھ گئی اور دونوں ٹانگیں سکوڑتے ہوئے اپنا منہ گھٹنوں میں دے لیا۔ اب شاہینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے جب اسی پل مس رخشندہ ان کی تلاش میں اندر سے باہر نکل آئی اور باہر کی صورتِ حال دیکھتے ہی ایک پل کو وہ بھی گھبرا گئی۔

''کیا ہوا اسے؟'' شاہینہ کو دیکھتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل آئمہ کے پاس نیچے ہی بیٹھ گئی کہ ہال

آنکھیں

پھر سے ہو جاتی ہیں پُرنور اندھیری آنکھیں
رنگ بھر دیتی ہیں آنکھوں میں کسی کی آنکھیں
اس کو ڈھونڈیں گی میرے بعد بھی میری آنکھیں
سونپ جاؤں گا کسی اور کو اپنی آنکھیں
دریچے میں لگتا ہے کہ بیٹھا ہے کوئی
نقش ہیں ذہن میں وہ جھانکنے والی آنکھیں
جب بچھڑتا ہے کوئی شخص تو سارے تن میں
نہیں رہتا ہے رہ جاتی ہیں خالی آنکھیں
بن پیے ہی میری آنکھوں میں نشہ رہتا ہے
جب سے دیکھی ہیں ذکی اس کی نشیلی آنکھیں

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کے داخلی دروازے پر کھڑا کسی نیوز چینل کا رپورٹر بھی ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا چونکہ رخشندہ کے سوال کا جواب شاہینہ کے پاس نہیں تھا اس لیے اسے انکار میں سر ہلاتا دیکھ کر رخشندہ نے آئمہ کے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو چھوا اور دھیرے سے پکاری۔

''آئمہ..... کیا ہوا بیٹا، کیوں اس طرح رو رہی ہو؟''

''مجھے گھر جانا ہے۔'' رخشندہ کے ہاتھ پرے ہٹاتی وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے اندر نہیں جانا.....'' خوف زدہ آئمہ نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں کو رگڑا، شاہینہ کے مقابلے میں رخشندہ سمجھدار تھی اس لیے شاہینہ کو خاموشی کا اشارہ کرتی رخشندہ نے آئمہ کا بازو تھام لیا اور دھیرے سے بولی۔

''کیا تم نے ہال کے اندر کسی کو دیکھا ہے۔''

آئمہ کے بازو کو سختی سے تھامے وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ ''کون ہے وہ آئمہ..... ہمیں اس کا نام بتاؤ..... دیکھو اگر آج تم ڈر کر خاموش ہو گئیں تو کل تمہاری جگہ جانے کتنی اور بچیوں کو یوں ہی برباد کر دیا جائے گا..... پلیز کون ہے وہ درندہ ہمیں اس کا نام بتاؤ..... آئمہ مجھے بتاؤ تم نے کسے دیکھا ہے۔''

جیسے، جیسے رخشندہ سوال کر رہی تھی ویسے، ویسے شاہینہ کا دل کانپ رہا تھا۔ کئی سال پرانا درد آج جیسے سوا ہو گیا اسے محسوس ہوا کہ اگر اس وقت واقعی وہ شخص اندر ہال میں موجود ہے تو شاید وہ اسے زندہ نہ چھوڑے گی جبکہ کانپتی خوف زدہ آئمہ کو بازو سے تھام کر رخشندہ نے ایک بار پھر ہال کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔

''بتاؤ..... آئمہ کون ہے وہ؟'' آنکھیں موندے آئمہ، گردن جھکائے تھر، تھر کانپ رہی تھی جبکہ ان کے گرد کچھ اور لوگ بھی جمع ہو چکے تھے جب رخشندہ سختی سے اس کا بازو تھامے ہال کے اندر داخل ہوئی۔

''دیکھو آئمہ آج زندگی نے تمہیں پہلا اور آخری موقع دیا ہے۔ وہ شاید اس کے بعد دوبارہ نہ مل سکے اس لیے ہمیں بتاؤ کہ وہ شخص کون ہے۔'' اب آئمہ نے آنکھیں کھول اسٹیج کی جانب دیکھا جہاں کرسیِ صدارت کے پاس جلال الدین کھڑا اسکول کی پرنسپل سے باتیں کر رہا تھا آئمہ کی نظروں کے تعاقب میں رخشندہ نے دیکھا اسٹیج پر اس وقت دو ہی مرد تھے باقی ساری خواتین تھیں۔ جلال الدین کے علاوہ اسکول ٹیچر صادق صاحب تھے جو پچھلے دو سالوں سے آئمہ کو انگلش پڑھا رہے تھے اس کا مطلب ہوا'' جلال الدین'' رخشندہ کے لیے یقین کرنا مشکل ہو گیا اس نے پلٹ کر شاہینہ کو دیکھا جو زیرِ لب بڑبڑائی۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے مس جی..... جلال صاحب کی ہمارے علاقے میں کھلونوں کی بہت بڑی دکان ہے..... میں جانے انہیں کیسے بھول گئی۔'' شاہینہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا..... ''یہ روز اسکول واپسی پر اس کی دکان کے سامنے کئی گھنٹے کھڑی ہو کر گڑیا دیکھا کرتی تھی..... ہائے ربا ہم اسے فرشتہ سمجھتے رہے اور یہ شیطان نکلا.....'' ایک پل میں ہی شاہینہ نے واویلا ڈال دیا جبکہ رخشندہ سے ہاتھ چھڑاتی آئمہ ہال سے باہر بھاگ گئی تھی۔ شاہینہ بھی اس کے تعاقب میں دوڑی اور رخشندہ میڈیا والوں کی ہمراہی میں اسٹیج پر جا پہنچی۔

☆☆☆

جلال الدین گرفتار ہو گیا مگر وہ اپنے جرم سے قطعی انکاری تھا اور آئمہ وہ تو اس دن سے واپس آ کر ایک بار پھر گھر کے واحد کمرے تک محدود ہو گئی تھی یعنی زندگی جہاں سے چلی تھی وہاں ہی پہنچ کر واپس رک گئی تھی..... جلال الدین پر مقدمہ تو درج کر لیا گیا مگر ابھی تک کوئی بھی ایسا ثبوت نہیں مل سکا تھا جو اسے مجرم ثابت کرتا۔ پولیس اس کی دکان، آفس اور گھر غرض ہر جگہ کی تلاشی لے چکی تھی مگر وہاں سے کچھ بھی ایسا نہ ملا جسے جلال الدین کے خلاف استعمال کیا جا سکتا..... نہ ہی کوئی ایسا شخص سامنے آیا جس کی گواہی جلال الدین کی اصلیت کھولتی..... اب لازم تھا کہ آئمہ کو عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ وہ اصل حقیقت بتا سکے کیونکہ عدالت کا فیصلہ ثبوت اور گواہان کی موجودگی میں ہوتا ہے ورنہ درحقیقت قانون اندھا ہی تصور کیا جاتا ہے۔ آئمہ کو بند کمرے سے نکال کر عدالت تک لے کر جانا ایک مشکل کام تھا مگر لازمی تھا کیونکہ دوسری صورت میں جلال الدین نہ صرف باعزت بری ہو جاتا بلکہ شاید وہ شاہینہ اور اس کی بیٹی کے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ بھی کر سکتا تھا بہ صورت دیگر آئمہ کو اس پر الزام تراشی کے جرم میں سزا بھی ہو سکتی تھی یا پھر معافی نامہ جمع کروانا پڑتا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جلال الدین کی عدالت پیشی پر آئمہ کو بھی لے کر جایا جائے جس کے لیے دو دفعہ علاقے کی لیڈی پولیس کانسٹیبل ان کے گھر آ چکی تھی۔ یہاں تک کہ رخشندہ روز آ رہی تھی کیونکہ اس پر بھی اسکول انتظامیہ کی طرف سے کافی زور تھا جس کی وجہ محض یہ تھی کہ جلال الدین ان کے ٹرسٹ کو ہر ماہ اچھی خاصی رقم بطور امداد فراہم کرتا تھا اور پھر ان سب کی کوششوں کے نتیجے میں آئمہ عدالت جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن اس کی پیشی سے قبل ہی ایک ایسا واقعہ ہو جس نے اصل مجرم کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا۔

☆☆☆

وہ جنوری کی ایک سرد رات تھی شاید اٹھارہ تاریخ تھی اور بیس جنوری کو عدالت نے جلال الدین کے

مقدمے کے فیصلے کے لیے آئمہ کو کورٹ میں طلب کیا تھا اور تقریباً ہر شخص جاننا چاہتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے جبکہ جلال الدین کی دکان اور آفس اسی دن سے بند پڑے تھے جب سے یہ مقدمہ شروع ہوا تھا اور ابھی تو ویسے بھی رات کے دو بج چکے تھے لہٰذا بند دکان کے شٹر پر موجود بڑا سا تالا دور سے ہی دکھائی دے رہا تھا جبکہ دکان کے باہر موجود بلب بھی شاید فیوز ہونے کے باعث بند پڑا تھا اور مارکیٹ کی یہ گلی نسبتاً اندھیری پڑی تھی۔

ہر طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا جب اچانک گلی میں ایک سایہ نمودار ہوا جس نے اپنا چہرہ مفلر سے مکمل طور پر چھپا رکھا تھا سوائے آنکھوں کے..... جبکہ اس کے ہاتھوں پر بھی دستانے موجود تھے اور لمبا سا کالا گرم کوٹ پہنے وہ شخص اندھیرے کا ہی ایک حصہ لگ رہا تھا .....اب آہستہ، آہستہ چلتا وہ جلال الدین کی دکان کے سامنے آ گیا پھر اس نے یہاں وہاں ایک نظر دوڑائی۔ دور، دور تک طاری سناٹے نے جیسے اسے مطمئن کر دیا اس نے اپنے کندھے پر موجود بیگ کو اتار کر زپ کھولی اور اندر جھانکا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا برآمد کیا جسے ہاتھ میں لیے وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور اگلے ہی پل اس نے یہ گچھا واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بیگ کی زپ بند کی اور گلی کے دوسرے سرے کی جانب بڑھ گیا۔ اب اس کے قدم اسی طرف رواں دواں تھے جہاں غریب لوگوں کی بستی آباد تھی اور جس میں ایک گھر عبدالباسط کا بھی تھا جہاں ایک ایسی لڑکی موجود تھی جس کی زبان بند رکھنے کے لیے وہ پچھلے کئی سالوں سے ہلکان تھا مگر کچھ دن قبل ایک دم ہی ساری کایا پلٹ گئی اور حالات اس کے قابو سے باہر ہو گئے اب ضروری تھا اس زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دیا جاتا ورنہ شاید وہ سب ہو جاتا جس کے نتیجے میں موت کا پھندا اس کے گلے کا ہار بن جاتا۔ جبکہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب شاہینہ کی ایک دم آنکھ کھل گئی اس کا دل گھبرا رہا تھا اس نے جلدی سے تکیے پر رکھا اپنا سر اٹھا کر یہاں وہاں نظر دوڑائی اس کے ساتھ والی چارپائی پر آئمہ بے سدھ سو رہی تھی جبکہ ابرار باہر صحن میں عبدالباسط کے ساتھ سو رہا تھا۔ ابرار سے چھوٹا حماد اس کے ساتھ ہی لیٹا ہوا تھا اور سب سے چھوٹا شان، آئمہ کی چارپائی پر تھا اپنے تمام لوگوں کو رات کے اس سے اپنے آس پاس دیکھ کر شاہینہ نے ایک طمانیت بھری سانس لی اور اپنا سر دوبارہ تکیے پر رکھا ہی تھا کہ جب ایک سایہ سا رینگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ شاہینہ چونک گئی کیونکہ آنے والا عبدالباسط نہیں تھا بلکہ کوئی اجنبی شخص تھا جس نے اپنا چہرہ مفلر سے چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاید خنجر تھا جس کی تیز دھار اندھیرے میں بھی چمک رہی تھی۔ وہ ایک دم ہی ڈر گئی اور اس نے گھبرا کر آئمہ کی چارپائی کی طرف دیکھا کیونکہ جانتی تھی کہ ان کے گھر سوائے بیٹی کے کوئی اتنی قیمتی شے نہ تھی جس کے لیے کوئی یوں رات کے اندھیرے میں اندر داخل ہوتا اور وہ سمجھ سکتی تھی کہ آنے والے کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے جلال الدین کے ساتھ تھا۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی وہ بری طرح خوف زدہ ہو گئی اور اسے سمجھ نہیں آیا کہ اکیلی عورت ذات اس سے ایک مرد سے کیسے مقابلہ کرے جبکہ آنے والا شاہینہ سے بے خبر آہستہ، آہستہ چلتا آئمہ کے سرہانے پہنچ چکا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے خنجر کا وار آئمہ پر کر کے اسے نقصان پہنچاتا یک شاہینہ کی ممتا نے اسے اتنی طاقت بخشی کہ وہ بستر سے چھلانگ مار کر اجنبی کے سر پر جا پہنچی اور ایک دم ہی اس کی پشت پر جا کر زوردار دھکا دیا..... اجنبی جو کہ اس افتاد کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اوندھے منہ بستر پر جا گرا اور اس شور شرابے سے آئمہ کی آنکھ کھل گئی جو یہ سب دیکھ کر اتنا گھبرائی کہ ایک زوردار چیخ اس کے حلق سے برآمد ہو کر رات کے سناٹے میں دور، دور تک پھیل گئی۔ پیشتر اس کے کہ اجنبی سنبھل سکتا اور خود کو سنبھال کر ایک بار پھر سے آئمہ پر وار کرتا اچانک ہی کمرے کے دروازے سے

کچھ لوگوں کا ایک مجمع اندر داخل ہوا جن میں سب سے آگے ایک پولیس والا تھا جو جلال الدین کی دکان کے سامنے سے ہی اس اجنبی کا پیچھا کرتا یہاں تک آیا تھا اور یہ یقیناً ابراہیم کانسٹیبل کی فرض شناسی اور بروقت کارروائی تھی کہ آدھی رات کو اپنی موبائل میں اونگھتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر عمران پر پڑی جو مشکوک انداز میں چلتا ہوا جلال الدین کی دکان کے سامنے پہنچا اور پھر وہاں سے آئمہ کے گھر، جس کی چھوٹی سی دیوار پھلانگنا عمران کے لیے قطعی مشکل نہ تھا اور وہ جیسے ہی دیوار کود کر اندر گیا اس کے پیچھے ہی ابراہیم بھی گھر میں داخل ہوگیا اور آئمہ کی چیخ کی آواز سنتے ہی اس نے فوری کارروائی کرتے ہوئے عمران کو گرفتار کرلیا اور اگر اس وقت ابراہیم کی شکل میں امداد غیبی ان تک نہ پہنچتی تو یقیناً آج کی رات آئمہ اور شاہینہ کے لیے آخری رات ثابت ہوتی۔

☆☆☆

کمرا ہائے عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جبکہ آئمہ کا بیان ریکارڈ کیا جاچکا تھا جس کے بعد عمران نے خود پر لگایا گیا جرم قبول کرلیا تھا جس کے مطابق وہ بلیک ویب کا سرکردہ رکن تھا اس کی نشاندہی پر جلال الدین کی دکان میں موجود ایک خفیہ خانے سے بہت ساری تصاویر اور فلموں کی سی ڈیز بھی برآمد ہوئیں جنہیں وہ اپنے خودکار کیمرے کی مدد سے خود بناتا تھا اور پھر یہ سب مواد بھاری قیمت کے عوض بیرون ملک فروخت کردیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے جلال الدین کے آفس کے میز نائن فلور پر ایک کمرا بنایا گیا تھا جہاں جلال الدین دوپہر میں آرام کرتا اور بے خبر تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں یہ کمرا عمران اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

آئمہ کو گڑیا دینے کے بہانے بہلا پھسلا کر عمران اسی کمرے تک لایا پھر زیادتی اور تشدد کی نہ صرف وڈیو بنائی گئی بلکہ تصاویر بھی جس کے بعد اس نے اپنی طرف سے آئمہ کو جان سے مار کر قبرستان میں پھینک دیا مگر شومئی قسمت وہ بچ گئی۔ عمران چاہتا تو اسے دوبارہ فوراً مار دیتا لیکن آئمہ کی حالت دیکھ کر وہ مطمئن رہا کہ شاید وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکی تھی اور اسی دوران اسے سمندر پار جاب مل گئی اور وہ یہاں سے چلا گیا جبکہ اپنا دھندا اب بھی اس نے بند نہیں کیا تھا بلکہ اب اس کا دائرۂ کار مزید وسیع ہوگیا تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ کھلونوں کی دکان پر ہی نوکری کرتا کہ اس بہانے مختلف بچوں کو اپنے جال میں پھنسانا نہایت آسان عمل تھا اور یہ گھناؤنا دھندا جانے وہ کب سے کررہا تھا اور آج تک پکڑا نہیں گیا تھا۔

اب بھی وہ بہت مطمئن تھا کہ اچانک جلال الدین کی گرفتاری نے اسے کئی سال پیچھے دھکیل دیا جبکہ دبئی آنے سے قبل وہ ایک بار آئمہ سے ملا بھی تھا اور اسے دھمکا چکا تھا کہ اگر اس سلسلے میں اپنی زبان کھولنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو اس کی تصاویر اور وڈیو پوری کالونی میں تقسیم کردی جائیں گی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ آئمہ ہمیشہ اس قدر خوف زدہ رہتی مگر کب تک آخر ایک دن تو سچائی دنیا کے سامنے آنا ہی تھی اور آخر کار آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے آئمہ کے ذریعے عمران کا اصلی چہرہ دنیا کو دکھادیا جو اپنا گناہ چھپانے کے لیے اسے مارنے کے ارادے سے... عبدالباسط کے گھر گیا تھا۔ یہ تھی عمران کی حکمتِ عملی جو اسے موت کے منہ میں لے گئی۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طے کردہ حکمتِ عملی تھی جو آئمہ کے ذریعے اصل مجرم کو بے نقاب کرگئی۔ جلال الدین ضمانت پر رہا کردیا گیا۔ اس لیے کہ وہ کسی نہ کسی حوالے سے ملوث سمجھا گیا تھا جبکہ عمران کے خلاف مقامی عدالت میں مقدمہ درج کرکے کارروائی شروع کردی گئی جس کا فیصلہ ابھی تک سامنے نہیں آیا لیکن ہر باشعور اور حساس فرد کی متفقہ رائے کے مطابق ایسے مجرم کی صرف ایک ہی سزا ہے اور وہ ہے سزائے موت..... وہ شخص جو جیتے جی کئی گھرانے اجاڑ دے، بچوں سے ان کی معصومیت چھین لے یقیناً اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے قارئین.....!

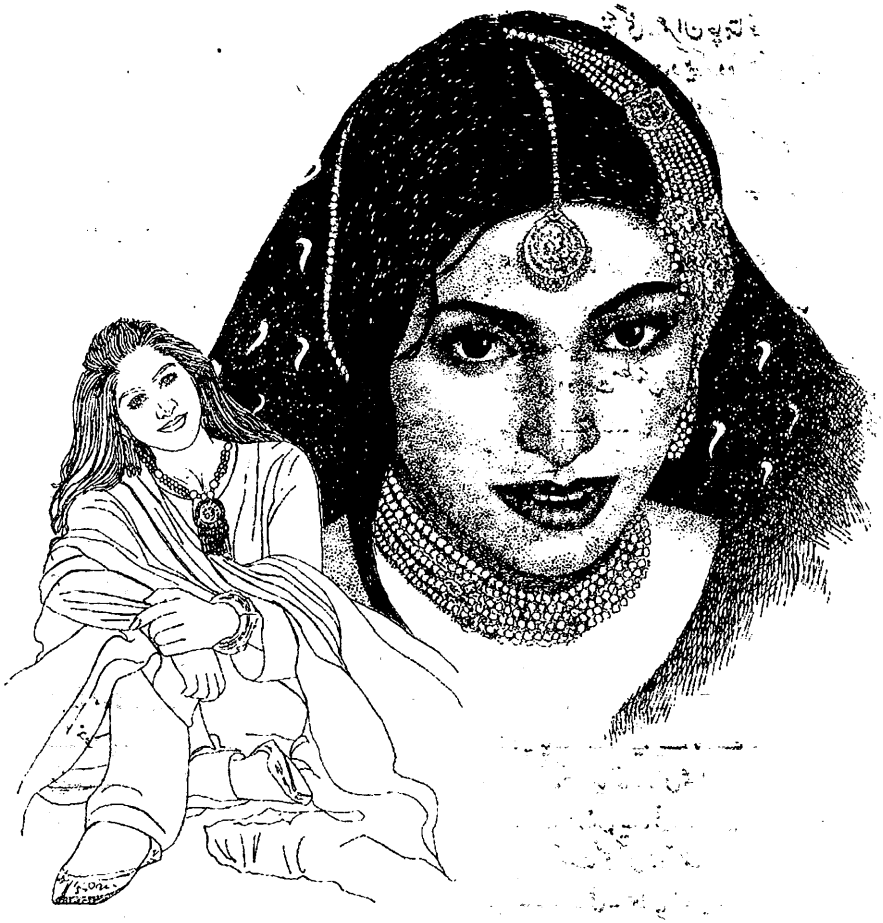

شباہت

غزالہ رشید

ہجر کی زد میں پھر بدن اپنا
اِک مکاں تھا کہ ہل گیا پھر سے

عشرت خانم ''الزریں'' کی رونق تھیں، ماتھے پر رخ زردوزی کے کام کا گھونگٹ نکالے، ماتھے پر ٹیکا جھومر سجائے، جب ظہیر بیگ کے گھر آنگن میں قدم رکھا تو لگا چودھویں کا چاند اتر آیا ہے۔ فریدہ بیگم کے منہ بولے بھائی ندیم احمد خان جو کہ پرکھوں سے، ان کے گھرانے کے ہم قدم تھے۔ بھلا اپنی

بہن کو کیسے انکار کرتے جبکہ گھرانا بھی ان ہی جیسا اور بیٹا بھی ان کی اکلوتی...... بیٹی کے ساتھ، چاند سورج کی جوڑی دکھتا تھا۔

خاندان بھر میں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ خوشی غمی کا موقع ہو اور فریدہ بیگم کے گھر سے کوئی خالی ہاتھ جائے، ممکن ہی نہ تھا۔ ایسے ہی سالوں گزر گئے۔ دونوں بیٹوں کی پیدائش پر بھی جی بھر کے جشن منائے گئے۔ پھوپیاں، چچا، ماموں کسی طرح بھی پیچھے نہ رہے۔ اسی تقریب میں فریدہ بیگم نے اعلان کیا۔

''آج میں اپنے بچوں سے وعدہ لے رہی ہوں خاندان میں، میرے بچے بھی ایسے ہی رشتے نبھائیں گے۔'' سب ہی نے اماں کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ظہیر بیگ نہ جانے کب خاموشی سے محفل سے نکل گئے۔ عشرت خانم کا دل حلق میں آ گیا۔ انہوں نے پاس کھڑی اماں سرداراں سے پانی کا گلاس مانگا اور کسی انجانے خوف سے ساس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

''کیا ہوا بہو؟'' وہ بے خبر تھیں کہ ان ہاتھوں میں وہ ہاتھ شامل نہ تھا جس کے سر پر سہرا، انہوں نے سب سے زیادہ مان سے سجایا تھا۔ دل رکھنے، دل ٹوٹنے کے قصے... بہت خاموشی سے سفر کرتے ہیں۔

☆......☆......☆

موسم بہار اپنے عروج پر تھا۔ موتیا کی مہک نے ماحول کو معطر کیا ہوا تھا، رات کی رانی کی کمی کو موتیا نے دھیرے، دھیرے بھلا دیا۔ ان ہی دنوں فیملی ڈاکٹر مدیحہ نے نوید دی کہ عشرت خانم کے آنگن میں پھر سے پھول کھلنے والا ہے۔ دادی کو اب پوتی کی خواہش بھی تھی۔ لہٰذا دونوں ساس بہو چھوٹی، چھوٹی فراکیں اور غرارے تک سی، سی کے رکھنے لگیں۔

ظہیر بیگ آج کل کارخانے میں بے حد مصروف تھے۔ کشیدہ کاری، زردوزی کا کام اب پھر سے بوتیک کی رونقیں بڑھانے لگا تھا۔

''دعا کریں اماں! کچھ نئے پلانز ہیں۔ ان پر کام کرنا شروع کر دوں۔'' وہ کچھ زیادہ ہی انگریزی خوشبو اور لفظوں کا استعمال کرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

''یہ تصویر تمہارے سرہانے رکھ رہا ہوں، مجھے معاف کر دینا، میں اپنے بچوں سے بھی شرمندہ ہوں۔ نفیسہ رحمان، میری زندگی میں تم سے شادی سے پہلے ہی شامل تھیں۔ اب وہ بھی مسز ظہیر بیگ ہیں۔ نیا گھر، نیا بوتیک ان ہی کے لیے بنا رہا ہوں۔ تم سے وعدہ کرتا ہوں کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ پلیز...... پلیز...... معاف کر دینا... پلیز اماں کو منانا تمہارا کام ہے، میں جانتا ہوں...... اماں تم مجھ سے زیادہ عزیز ہو۔''

واٹس ایپ کا میسج تصویر کے ساتھ، ان کے سرہانے موجود تھا۔ روح میں زلزلہ سا آ گیا تھا۔ مہربان کی نامہربانی، وہ بھی ان دنوں میں، ابھی تو وہ ڈاکٹر کی دی ہوئی خوشخبری انہیں بتا بھی نہ سکی تھیں۔ عشرت خانم نہ جانے کیسے سہہ گئیں اور ان کے وجود میں پلتی ننھی کونپل کو بھی کچھ نہ ہوا۔ درد کبھی، کبھی مستقبل کے اندیشوں کو جان کر بھی روح کھینچ لیتے ہیں۔ لگتا ہے عمر اور طویل ہو جاتی ہے۔ آزمائش اللہ کے نزدیک لے جاتی ہے۔ سجدے میں پڑی عشرت خانم کو فریدہ بیگم نے دیکھا، پوچھا، بتایا...... لیکن وقت کی ڈور، ہاتھ سے نکل چکی تھی... پرواز...... پتنگ کی طرح اوپر بہت اوپر تھی۔

☆......☆......☆

ظہیر بیگ کے اب دو گھر تھے، کتنی شکایتیں کرتیں وہ... گھر میں جو دلچسپی تھی، وہ بھی ختم ہو جاتی... ان پر خزاں آ ہی جاتی اگر اماں جان اور فیضی، سیفی ان کے پاس نہ ہوتے۔ ان کے تو اسکول کے رزلٹ ہی، اب ان کا غم اور خوشی تھے۔ سائبان سے دھوپ کا تصور ہی ان کے پاس نہ تھا۔ وہ بھلا کیسے چھوٹی سی عمر میں ان کو یہ دکھ دیتیں۔ یہ سمجھداری تو انہوں نے فریدہ بیگم سے ہی سیکھی تھی۔ والدین کی دہلیز پر بھلا کس سے شکوہ کرتیں۔ پیار بے رشتے، ویسے ہی بیماریوں کی زد میں تھے جب آنسوؤں سے دل

بھاری ہونے لگتا۔ ان کے بجائے طویل ہو جاتے۔

☆......☆......☆

ایسے میں ظہیر بیگ نے ان کی قربانی کے بدلے، ان کی صلاحیتوں کا استعمال کچھ اس طرح کرنا شروع کیا کہ وہ ان سے روایتی ڈریسز کے ڈیزائن کے لیے انہیں خوب صورت سی اسکیچ بک گفٹ میں دینے لگے۔

دل کو اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے صبر آنے لگا اور اس کام کے ساتھ، ساتھ اپنی آنے والی ننھی گڑیا کے کپڑے بھی اسی اسکیچ بک میں ڈیزائن کرنے لگیں۔

فریدہ بیگم نے ظہیر بیگ سے شکوے کے ساتھ، ساتھ ایک فرمان بھی جاری کیا۔

"اپنی محبت، اپنی پسند، اپنی خواہش کو کبھی اس دہلیز پر لائے تو...... دیکھنا ظہیر بیگ، تمہاری ماں اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی...... ساری دنیا، میری موت کا الزام تمہیں دے گی...... تمہیں۔" ظہیر بیگ سہم گئے محتاط ہو گئے۔

"وہ بہت اچھی ہے عشرت، اس نے کبھی تمہیں چھوڑنے کی خواہش نہیں کی، اور نہ ہی اس نے میری طرف قدم بڑھائے تھے۔" وہ ان کی تصویریں دکھانے لگے، تقریبات میں اپنی لکھی ہم قدم انٹرنیشنل ٹور پر اس کے ساتھ، ساتھ کامیابیوں کے سفر میں، اس کے ہنر کو سراہتے ہوئے، شاید اسے جتاتے بھی تھے کہ وقت بہت تیز ہے اور روایت کی پاسداری کرنے والے لوگ بہت پیچھے...... عشرت خانم کو بھی سوال در سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ دامنِ دل کو وسیع رکھنے کی ساری دعائیں، انہوں نے یاد کرلی تھیں...... آنسو جب بے اثر ہوں تو دل میں ہی روک لینے چاہئیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ کا خیال مرد کے دل میں تکبر کے بیج کی کونپل...... اس لیے مقدر پر صبر کرنے کا ہنر بھی سیکھتی جا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ثانیہ کی پیدائش پر پہلی بار انہیں شکوہ ہوا۔ اماں جان سے بھی، ظہیر بیگ سے بھی اور خود سے بھی۔ سوچا

کورونا وائرس کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال

بہت ہی برا سال چل رہا ہے اس بیماری کی وجہ سے بہت سے چاہنے والے گئے، بہت سے لوگ تو ہر طرح سے مجبور ہو گئے۔ اپنوں سے مل سکتے ہیں نہ ان کے پاس جا سکتے ہیں۔ کئی مثالیں جو لوگ اپنوں سے دور اس دنیا سے چلے گئے ان کا آخری دیدار بھی نہ ہو سکا۔ بہت ہی برا وقت چل رہا ہے۔ ہم سب چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد یہ بیماری ختم ہو۔ کوئی نہ کوئی ایسا اس کا نتیجہ نکلے یا ایسا کوئی علاج نکلے۔ جس کی وجہ سے ہم لوگ پھر سے اپنوں کے ساتھ ایک حسین اور خوب صورت زندگی بتا سکیں۔ اپنے، اپنے گھروں میں قید ہونا بہت مشکل بات ہے۔ حالانکہ آپ کے گھر میں سب ہیں اور گھر میں تو کوئی بے بھی نہیں۔ باہر نکلیں تو اپنوں اور دوستوں سے درد بانٹ لیتے ہیں۔ اگر میں خود کو دیکھوں تو میں ایک خوش مزاج، دوستوں اور خاندان کے ساتھ رہنے والی عورت ہوں...... اب تھوڑا مشکل ہو رہا ہے۔ لاک ڈاؤن میں، میں نے کافی چیزیں سیکھیں۔ کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا۔ کچھ تخلیقی کام کرنے کا شوق ہوا۔ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کی۔ کچھ وقت اپنی فیملی میں گزارا۔ کچھ وقت اچھا گزرا، کچھ مشکل میں گزرا۔ امید ہے کہ آنے والے وقت میں کورونا کا علاج نکلنا چاہیے تاکہ ہم آزاد پنچھی کی طرح گھوم پھر سکیں۔ کوشش کروں گی کہ اس دوران میں اپنی زندگی میں جو تبدیلی لائی ہوں اس کو برقرار رکھوں۔ میری کوشش رہے گی کہ اللہ سے اور قریب ہو جاؤں تاکہ سچ کو جان سکوں جتنا ہم سچ کو جانیں گے اتنی ہی تکلیف کم ہو گی۔ اور سچ یہی ہے کہ ہم سب دنیا میں چند دنوں کے مہمان ہیں، سب کو جانا ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ جانے سے پہلے ایسا کوئی کام کر جائیں جو اللہ کو بھی بہت پیارا لگے۔ اور اللہ ہمیں اپنے مقربین میں شامل کرلے۔ ہم سب کو کورونا سے بچائے اور اپنے عزیزوں سے ملوائے اور کبھی ان سے دور نہ کرے۔ اور ہم سب انسانیت کا چولا پہنیں جو سب سے بڑی چیز ہے، آمین...... اس مشکل وقت میں اپنوں سے دور رہنے والوں کے لیے ہمیں کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ ان کی یہ تکلیفیں دور ہوں۔

کورونا میں تو حالات بہت خراب گزر رہے ہیں، اس وبا کی وجہ سے باہر جا سکتے ہیں نہ کسی اپنے سے مل سکتے ہیں۔ معاشی مسائل بھی بہت پریشان کن رہے، میں نے یہی سیکھا اس وبا سے کہ never take any thing for granted

ایمان ذوالفقار، دبئی

ہی اتنا سوتن کو کہ تصویر بن گئی خود ہی.....!

''اے دیکھو! سرداروں یہ تو بالکل ہی میری بہو عشرت خانم پر نہیں، نہ ظہیر پر۔'' وہ اکثر ہی بیزاری سے احتجاج کرتیں۔

ظہیر بیگ تو اپنی گڑیا کو چومتے نہ تھکتے، یوں اماں جان نے وہ راز بھی خود ہی پالیا..... اور آہِ سرد کی تپش عشرت خانم کو کبھی کبھی تو جھنجلا ہی دیتی، وہ روتی جاتیں اور اس کی بھوک کو اپنے لہو سے سینچتی بھی جاتیں۔ یہ تو قدرت کا کرشمہ تھا۔

دونوں بھائیوں سیفی اور فیضی کو تو کھلونا مل گیا تھا۔ وہ بھی اتنی صابر بچی کہ نفرتوں محبتوں کے کھیل میں ہنستی کھیلتی مسکراتی بڑی ہوتی گئی۔ دبے لفظوں میں شہلا آپی نے بھی، ماں کے خدشات کی تصدیق کردی تو اس شام انہوں نے ظہیر بیگ کو پھر سے لیکچر دے ڈالا۔

''واہ بھئی! ظہیر بیگ اس کے تو اولاد نہ ہوئی، تم نے سوچا، اس بہانے ہی وہ ''الزریں'' میں سب کے دلوں پر راج کرے۔'' وہ غصے میں ایسے ہی بدلحاظ ہوجایا کرتیں۔

''اماں آپ بھی حد کرتی ہیں، پہلے آپ اس سے ایک بار تو مل لیں۔'' وہ بھی ان ہی کے بیٹے تھے۔

''بھائی آپ اماں کو ایسے مجبور نہ کریں، وہ عشرت بھابی سے زیادہ دکھی ہیں۔'' شہلا آپی نے بالکل نئی منطق نکالی۔

کمرے میں آتی عشرت کو لگا، انہیں واپس اپنے کمرے میں ہی چلے جانا چاہیے۔ درد کو بھی اپنا، اپنا حق چاہیے۔ شہلا آپی، نہ جانے کیوں عشرت خانم کو نادان دوست کی تفسیر نظر آتیں، جس دن وہ اماں کے ساتھ دن گزارتیں، اماں کی شوگر، بلڈ پریشر کے ساتھ، ساتھ زبان میں بھی زمانے بھر کی تلخی اتر آتی۔ ایسے میں وہ جس انداز میں ثانیہ کو کمرے سے نکالتی، عشرت کا دل دہل جاتا۔ وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتیں۔ لیکن پھر اماں جب ان کو گلے لگا کے روتیں تو اس بہانے وہ بھی، دل کے درد کو سہنے کا واسطہ دے ڈالتیں، ورنہ اب تو انہیں آنسوؤں پر بھی اور دل کے درد کو سنبھالنے کا ہنر آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک شام فہمیدہ بیگم نے کچھ کہا نہ سنا اور بڑی رازداری سے، خود کو اس سفر پر آمادہ کرلیا۔ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ ہر کام کو اہتمام سے کرنے کی عادی تھیں ناں۔ رخصتی کا بھی ویسا ہی سب نے انتظام کیا۔ مسز ظہیر بیگ فیشن شو کے سلسلے میں، بیرونِ ملک میں تھیں، ہوتیں بھی تو ماں سے کیے گئے وعدے کا احترام کرتے یوں ''الزریں'' میں، عشرت خانم کا عزت و وقار اسی طرح قائم رہا اور حکمرانی بھی اسی انداز میں جو ''الزریں'' کا خاصہ تھی۔

☆.....☆.....☆

وقت کی رفتار کو بھلا کون کم کرسکتا ہے۔ جو کوئی یہ جسارت کرتا، خود ہی اس تیزی سے گزرا کہ بچے جوان ہوکے، عشرت خانم کے ساتھ، ساتھ ظہیر بیگ کا بھی ساتھ دینے لگے۔ کئی ممالک میں کام پھیل گیا تھا۔ لہٰذا سیفی اور فیضی کو اکثر ہی ماں کو تنہا چھوڑنا پڑتا۔ لہٰذا سوال و جواب نے برسوں کے بھید کو پالیا۔ لیکن ماں کی طرح سہنے پر مجبور تھے۔

عشرت خانم کی سمجھداری نے گھر کو جہنم نہ بننے دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے ہاتھ ہی خالی رہ جائیں گے۔ خاندان بھر میں ان کی قربانی سے سب ہی واقف تھے۔ لہٰذا انہیں بھی سازشوں کی، منافقتوں کی خبریں ملنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

ظہیر بیگ نے بچوں کو ان کی دوسری ماں سے ملوانا شروع کیا تو عشرت خانم نے ایک وعدہ ضرور لیا ان سے... اسی انداز میں جو کہ انہوں نے ماں کی خاطر نبھایا تھا کہ اس وعدے کا مان اسی طرح رکھیں، ورنہ مقابل آنے پر وہ بھی وہی کریں گی جو کہ اماں جان کہہ گئی ہیں۔

ان ہی دنوں شہلا آپی نے اپنے بیٹے کے لیے

ثانیہ کا رشتہ مانگا تو انہوں نے بیٹی سے بات کی اور اس وقت انہیں ثانیہ نے جو کچھ بتایا وہ آج کے دور، ان کے لیے، آگہی کے نئے در کھولتا گیا۔ وہ ۲۰۲۰ء میں جو دیکھ رہی تھیں، سن رہی تھیں، انہیں محسوس ہوا، سمجھ میں مشکل سے آرہا تھا لیکن ان کے وجود میں کسی درویش کی سنی ہوئی بات جیسے ان کی سوچ کے نئے در وا کرتی جارہی تھی۔

''عالم و عارف کو تلاش کروگے تو ہمیشہ پریشان رہوگے۔ اپنے اندر ہی علم و حقیقت کے چشمے جاری کرتے رہو، منزل مل ہی جائے گی۔''

''آپ کو پتا ہے۔ دادی اماں جب مجھ سے ہر وقت کہتی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس پر گئی ہے شکل یا تو میں بہت روتی تھی۔ ابو سے کہا تو، آپ کو نہ بتانے کا وعدہ لے کر، وہ مجھے آپ کی سوتن سے ملانے لے گئے۔'' اس نے خود اعتمادی سے بتاتے ہوئے، ماں کی شکل دیکھی، جو دھواں ہورہی تھیں۔ ''پریشان کیوں ہورہی ہیں۔ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں لیکن مجھے بھی تو اپنی تلاش تھی ناں...! کیا میں ڈپریشن کی مریضہ بن جاتی۔ آپ رشتے سے انکار کریں گی کیونکہ میں نے ان سے مل کے جانا کہ ان کے بوتیک سے میری پھپھو بھی کپڑے لیتی ہیں۔ اور چچی جان بھی... کیوں؟ اس کا تو آپ جواب جانتی ہیں ناں۔ میں نے ان کے بوتیک سے کوئی سوٹ نہیں لیا لیکن انہوں نے پاس بٹھا کے، بہت پیار سے درخواست کی۔ ''امی سے کہنا، مجھے پلیز معاف کردیں۔ ہمارا تعلق تمہارے بابا کی شادی طے ہونے سے پہلے کا تھا۔ تمہارے بابا، باغی تھے۔ فیصلوں سے اختلاف کرکے، گھر چھوڑنے کی باتیں بھی کرتے تھے۔ وہ شاید مجھ سے شادی نہ کرتے تو کسی اور سے ضرور کرتے۔ لہٰذا مجھے معاف کردیں۔ تم میں میری شباہت ضرور ہے لیکن امی کی تربیت ہی ہے کہ تم اتنے صبر سے میری پوری بات سن رہی ہو۔ جو آج پہلی بار..... صرف تم سے ہی میں نے کی ہے۔ میری دعا ہے۔ تم خوش رہو، آباد رہو۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور تھے لیکن لہجے میں منافقت نہ تھی، اب یہ فیصلہ آپ کریں گی... کیونکہ میں یہ آپ ہی پر چھوڑتی ہوں کیونکہ مجھ سے زیادہ، آپ کا تجربہ ہے۔ آپ بتائیں۔ مجھے پھپھو کے بیٹے سے روایتی انداز میں شادی کرنی چاہیے یا پھر عمر بھر کے سفر میں، آپ میری رائے کو اہمیت دیں گی۔'' ثانیہ نے ایک گہری لمبی سانس لی۔

''کیا تم آگے تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہو؟'' عشرت خانم نے پوچھا۔

''جی..... امی مجھے ابھی پڑھنا ہے، بابا سے بھی بات کرلی ہے میں نے۔''

''وعدہ کرو۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد تو شادی سے انکار نہیں کروگی ناں۔'' عشرت خانم نے مسکرا کے کہا۔

''آپ اپنی تربیت پر تو بھروسا رکھیں۔'' ثانیہ نے ماں کا ہاتھ اپنے خوب صورت ہاتھوں میں لیا۔ ''تیار ہونے، سجنے سنورنے کا شوق بھی تو آپ ہی کی طرح ہے ناں مجھ میں۔'' اس نے ماں کے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے بالکل دادی کی طرح ماتھے پر پیار کیا۔

''ویسے بھی اب آپ ''عہدِ عتیق'' سے نکل آئیں۔ ماضی سے سبق لینا چاہیے۔ اس کے اندر نہیں رہنا چاہیے۔ آپ بھی نکل آئیں، اپنے اس ماضی سے، جس میں لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں سے آپ نے بابا جان کا مجسمہ بنالیا ہے اور ہر روز اس پر آنسوؤں سے نفرت سے گندھے ہار پہناتی ہیں۔'' اس نے پھر سے عشرت خانم کے آنسو صاف کیے۔

''وہی آپ کے ہم سفر ہیں، مجازی خدا ہیں، آپ نے عرصہ ہوا ان پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پھر سے جتائیں ہمارے ساتھ، ہم پر بھروسا کرتے ہوئے، ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ کبھی نہیں۔''

ثانیہ نے آج ایک عمر کے بعد، امید کے دیے، پرانے گھر کے دروازوں پر روشن کردیے تھے۔

منی ناول

چھٹا حصہ

میں انمول

سعدیہ رئیس

انمول نے پہلی بار ماما کے چہرے پر یہ انوکھے رنگ دیکھے تھے، ممتا کی چمک نے اُن کے چہرے کو کچھ اور بھی پُرنور کر دیا تھا باوجود اس کے کہ وہ پہلے کی نسبت جھک گئی تھیں۔ وہ بے اختیار ان کو دیکھتی چلی گئی۔

''جویریہ کی ممانی ٹھیک کر رہی ہیں۔ وہ ان کی ذمّے داری ہے اب...... ان کا فرض ہے کہ اس کو گھریلو امور میں طاق کریں۔'' انہوں نے دھیرے سے اس کا گال چھو کر کہا۔ پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''جی ماما......'' کہہ کر اس نے دھیرے سے رضامندی دی اور صغریٰ بوا کے پاس کچن میں آ گئی۔

''بیٹی میں نے چولھے پر دودھ ابلنے رکھ دیا ہے۔ آپ جب تک یہ انڈے پھینٹ لو...... میں مرتبان سے چینی نکال لیتی ہوں۔'' اس کے جاتے ہی بوا نے اسے ڈش سے متعلق معلومات دیں۔

یعنی اس سے پہلے ماما صغریٰ بوا کو ہدایات دے چکی تھیں۔ اگرچہ وہ بے دلی سے ہی سویٹ ڈش بنانے پر تیار...ہوئی تھی مگر پھر صغریٰ بوا کے ساتھ مل کر پڈنگ بنانے میں مزہ آ گیا۔ اس نے اپنی پسند کے کرسٹل باؤل میں پڈنگ نکالی اور ایک اضافی چھوٹے پیالے میں نکالنا نہ بھولی۔ جب پڈنگ تیار ہونے کے قریب تھی اس نے جب ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یوسف کو اپنے ہاتھ کی پڈنگ ضرور چکھائے گی۔

''کتنی آسان ڈش ہے یہ۔'' اس نے پڈنگ باؤل میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''بیٹا...... مشکل کچھ نہ ہوئے...... سب آسان ہوتا ہے۔ انسان میں لگن ہوتی ہے اس کے لیے سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ اصل میں تو انسان خود اپنی زندگی مشکل بناتا ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگنے سے

اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد زندگی سنور جاتی ہے۔ بس اس کے اندر صبر، رب کی اطاعت اور شکر گزاری ہونی چاہیے۔'' صغریٰ بوا کی فلسفیانہ باتیں سر سے گزر گئیں۔

''بھلا پڈنگ کا انسان کی مشکلوں سے کیا تعلق.....؟'' وہ سوچتی زیرِ لب مسکرائی اور دل میں ہنستی، سر جھٹکتی کچن سے نکل گئی۔

کمرے میں آکر اس نے کچھ دیر آرام کیا۔ وقت دیکھا تو پانچ بج رہے تھے۔ دو دن سے یوسف سے رابطہ نہیں تھا۔ سوائے میسج کے اس کی شکل اسے نظر نہیں آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ چھ بجے گھر سے نکلتا ہے سو اسی لیے وہ جلدی، جلدی سرسری سا حلیہ ٹھیک کر کے بال سنوارنے لگی۔ ایمل نے بغور اسے دیکھا۔

''کہیں جارہی ہو؟'' اس نے کتاب پر سے نظر ہٹا کر ایک نظر اسے دیکھا۔

''ہوں..... ماما نے کہا ہے کہ مہر آنٹی کو پڈنگ دے آؤ۔'' اس نے اپنی خواہش پر ماما کی مرضی کا رنگ چڑھا کر اُن کا نام استعمال کرلیا۔ اور ایمل اکثر اس کی باتوں میں آجاتی تھی۔

''چلتی ہو؟'' اس نے آئینے میں نظر آتی ایمل کو پیشکش کی۔ وہ پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ جیسے کسی الجھن میں ہو۔

''ہوں..... آدھے گھنٹے بعد چلیں گے میرا یہ سوال تھوڑا سا رہ گیا اسے مکمل کرلوں.....'' ایمل نے رضامندی تو دے دی مگر آدھا گھنٹا وہ انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ کیا فائدہ جس کے لیے جارہی تھی وہ ہی نہ ملتا تو.....

''مگر میں تیار ہوچکی ہوں اور میرا موڈ بھی بن گیا ہے اب..... پلیز جلدی اٹھ جاؤ فوراً۔'' اس نے حکم دیا۔

اور ایمل کو اس کے اس لاڈلے سے تحکم بھرے انداز سے چڑ ہوتی تھی ویسے بھی آج کل اسے انمول کے انداز بہت بدلے، بدلے لگ رہے تھے۔ کبھی اکتائی اکتائی سی پھرتی..... کبھی موڈ آف ہوتا..... کبھی سر میں درد اور بلاوجہ کی چڑچڑاہٹ اور کبھی بے حد خوش اور مگن سی..... کبھی، کبھی تو وہ اکیلے میں بھی مسکراتی نظر آتی تھی..... یا پھر کھلی آنکھوں نہ جانے کون سے سپنوں کے دیس جا پہنچتی تھی۔

''تم میرے لیے رک نہیں سکتیں۔'' ایمل نے چڑ کر کہا۔

''نہیں ناں..... ابھی چلو فوراً۔'' اس نے اصرار کیا۔

''آدھے گھنٹے میں کیا ہوجائے گا اور ایسی کیا تیاری وہاں جانے کے لیے۔'' ایمل حجت کرنے لگی۔

''ہاں، ہاں، قیامت آجائے گی آدھے گھنٹے میں۔'' انمول کا موڈ خراب ہوگیا۔

''واہ..... قیامت اتنی چپ چاپ نہیں آئے گی۔'' ایمل ہنس کر بولی۔

''بوا تو یہ کہتی ہیں کہ ایک پل میں زندگی بھی بدل جاتی ہے۔'' انمول کو صغریٰ بوا کا فلسفہ یاد آگیا۔

''بوا کی باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پتا نہیں کیا بولتی رہتی ہیں..... چلتی ہوں بھئی..... چلو اب۔'' وہ مارے باندھے اٹھی تھی ساتھ جانے کے لیے..... جب تک ایمل نے بال درست کیے وہ ماما کو بھی بتا کر آگئی۔

مہر آنٹی کے گھر میں حسبِ معمول سناٹے کا راج تھا۔ چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کھڑکیاں سب بند تھے ہمیشہ کی طرح..... اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ پورچ سے ملحقہ لاؤنج میں داخل ہوگئیں۔ انمول نے متلاشی نظروں سے یوسف کو دیکھا وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا معاً اندرونی کمرے سے کسی پرچھائیں کی طرح شمع جی آتی نظر آئیں وہ اسٹک کے سہارے چلتی آرہی تھیں۔ ان دونوں کو یوں سامنے کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔

''تم..... لوگ..... خیریت ہے؟'' انہوں نے اچنبھے سے پوچھا۔ ایک نظر سرتاپا انمول کو دیکھا پھر اس کے ہاتھ میں تھامے باؤل پر نظر جم گئی۔

''وہ شمع جی..... یہ پڈنگ لائی تھی..... مہر آنٹی کہاں ہیں؟'' انمول اُن کی چبھتی نظروں سے گھبرا کر

جلدی، جلدی بولنے لگی۔

''اوہو..... پڈنگ..... رکھ دو میز پر.....'' انہوں نے سینٹر ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

''بلکہ اسے فریج میں رکھ دو لے جانے تک.....'' وہ رکھنے ہی لگی تھی کہ انہوں نے ایمل سے کہا۔ ایمل پڈنگ لے کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''امی تو یوسف کے ساتھ تایا جی کی طرف گئی ہیں۔ کیا ان سے بھی کوئی کام تھا۔'' شمع جی نے اس سے پوچھا۔

''جی..... نہیں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' اس کی نظروں سے خائف ہو کر اس نے گھبرا کر کہا۔

''یوسف تو اب رات گیارہ بجے سے پہلے نہیں آئے گا، وہ امی کو چھوڑ کر جاب پر چلا گیا ہوگا اب وہ جاب کر رہا ہے۔ واپسی میں امی، پاپا کے ساتھ آجائیں گی۔'' انہوں نے کافی تفصیل سے اسے خاص طور پر یوسف کے بارے میں آگاہ کیا۔

''جی..... جج..... جی اچھا۔ پھر میں چلتی ہوں۔'' اس نے پرتولے۔

''ارے کہاں..... بیٹھو کچھ دیر.....'' شمع جی کو آداب میزبانی یاد آگئے۔

''نہیں..... وہ چلتی ہوں..... وہ ایمل کو پڑھنا ہے اپنا۔'' وہ بلاوجہ ہی وضاحت دیتے الجھنے لگی۔

''اچھا، میں سمجھی کہ یوسف سے کچھ پوچھنا تھا تمہیں..... ایک تو تم وقت بے وقت اسے بلا لیتی ہو، وہ یہاں کیریئر بنانے آیا ہے اور تم فضول میں اسے پریشان کرتی رہتی ہو، کوئی اچھا ٹیوٹر رکھ لو اپنے لیے۔'' اسے خاصی باتیں سنانے کے بعد انہوں نے مفت مشورہ بھی دے دیا۔ ان کے طنزیہ انداز اور ذومعنی سے لہجے نے اسے اور بھی خائف کر دیا۔ اس کے چہرے پر خفت کے رنگ بکھر گئے۔ شمع جی کی گھورتی نظروں میں خاصی تضحیک سی تھی۔

''تمہاری ماما بیمار ہیں ان کا خیال رکھا کرو، ہر وقت سہیلیوں کے ہاں آنا جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔ گھر کے کام کاج میں حصہ لیا کرو اور اگر پڑھنے میں مدد درکار ہے تو مجھ سے پوچھ لیا کرو..... یوسف کا وقت کیوں ضائع کرتی ہو۔ وہ پہلے ہی پڑھائی سے جی چراتا ہے، کاموں سے گھبراتا ہے۔'' مہر آنٹی کی غیر موجودگی میں انہیں دل کی بھڑاس نکالنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ ان کے ہر لفظ پر وہ پانی، پانی ہوتی رہی۔ ایمل بھی باؤل رکھ کر آگئی تھی اور ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

''چلو انمول گھر چلتے ہیں.....'' ایمل کے چہرے پر خفگی کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے انمول کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

''ارے، کہاں چلیں..... بیٹھو تو کچھ دیر..... کبھی، کبھی تو آتی ہو دونوں۔ ارے بھئی میرے پاس بھی تو دو گھڑی بیٹھ جاؤ.....'' شمع جی کی بات ان سنی کرتے ہوئے وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ دو گھڑی بیٹھنا دردسری کو دعوت دینا تھا۔ انہیں غصے کی زیادتی سے دورہ بھی پڑ سکتا تھا اور ویسے بھی ان کا رویہ بہت برا تھا۔ ان کی تلخ مزاجی کی وجہ سے وہ دونوں ہی ان سے کتراتی تھیں۔

''شاباش ہے یوسف بھائی پر پتا نہیں کیسے برداشت کر لیتے ہیں ان کی بدمزاجی اور فضول باتیں۔'' ایمل نے گیٹ عبور کرتے ہی خیال آرائی کی۔

''اونہہ..... پتا نہیں کیا سمجھتی ہیں خود کو..... جیسے یوسف پر صرف انہی کا حق ہے۔ ٹھیک کہہ رہا تھا یوسف..... جلتی ہیں وہ جب یوسف کسی سے بات کرتا ہے تو..... چچ چچ بیچارہ..... کبھی ڈرائیور بنا دیتی ہیں کبھی مالی، کبھی نوکر اور کبھی اسٹوڈنٹ اس کی اپنی مرضی تو کوئی ہے ہی نہیں.....'' انمول نے بہ آواز بلند افسوس کیا۔

''ہم..... تعلیم کا مسئلہ نہ ہوتا تو یوسف بھائی رہتے ہی کیوں یہاں..... اس سے تو واپس چلے جائیں۔ روز کی بے عزتی ہے یہاں پر تو.....'' ایمل نے روانی میں کہا۔

''گاؤں کیوں جائے..... یہیں پر کچھ کر لے اپنے لیے..... لیکن کیسے کر لے اس کے سرپرست تو حامد انکل ہیں۔'' انمول کو کوئی حل نظر نہیں آیا۔

''اور مہر آنٹی کہتی ہیں یوسف میرے بیٹے کی طرح ہے..... اور شمع جی کا بی ہیویئر نظر نہیں آتا

انہیں......'' دونوں کا تاسف ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔

انمول کا موڈ تو اتنا خراب ہوا کہ رات کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ صرف پڈنگ کھالی ذرا سی۔ ماما کی خوشی کے لیے ورنہ تو پڈنگ کھاتے ہوئے اسے یوسف بہت یاد آیا تھا۔ اس نے یوسف کو کئی میسیجز بھی کیے مگر جواب نہ آیا۔

''شاید مصروف ہوگا وہ۔'' اس نے دل کو تسلی دی۔

رات دیر تک جواب کا انتظار کیا مگر موبائل خاموش پڑا منہ چڑاتا رہا۔ وہ تکیے میں منہ دے کر لیٹی رہی۔ شمع جی کا رویہ یاد کر کے کڑھتی رہی۔ یوسف پر غصہ آتا رہا۔ آنسو بھی خود بخود ہی تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

صبح اٹھی تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ دل کا غبار آنسوؤں کے رستے نکل تو گیا تھا مگر طبیعت میں بوجھل پن ہوگیا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ آج چھٹی تھی۔ اس لیے ایمل نے بھی اسے ایک دو آوازیں دینے کے بعد نہیں اٹھایا۔ وہ خاصی دیر سے اٹھی اور بلاوجہ ہی بستر پر پڑی رہی۔ کمرے سے باہر نئے دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ صغریٰ بوا کی کھانسی کے ساتھ بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ماما بھی ان سے وقتاً فوقتاً دو چار باتیں کر رہی تھیں۔ اسی درمیان بابا کی آواز بھی آئی وہ بھی شاید کسی سے بول رہے تھے۔ اسے باہر کچھ غیر معمولی سا لگا۔ جیسے کوئی آیا ہوا ہو یا کچھ اور ہو رہا ہو...... وہ فریش ہو کر باہر آئی تو جیسے کائنات جھوم اٹھی...... دل خوشی سے پاگل ہوگیا۔ اس کے عین سامنے یوسف اس کے بابا کی برابر والی کرسی پر بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ساری بیزاری اُڑنچھو ہوگئی۔ یوں لگا کہ دل و ذہن پر چھائی پژمردگی ایک آن میں غائب ہوگئی۔

''یوسف......'' اس نے زیرِ لب پکارا تھا اور اس نے فوراً نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

ایک سرخوشی سی انمول کے من میں دوڑ گئی گویا اس کی محبت سچی تھی اس نے دل میں پکارا اور وہ پکار یوسف تک پہنچ گئی تھی۔

''بس میں کچھ دیر میں کپڑے بدل کر آتا ہوں تب تک تم بیٹھو......'' بابا نے یوسف سے خاص طور پر کہا۔

وہ ناسمجھی سے ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ خفیف سے ابرو اچکا کر یوسف سے بھی پوچھا جب تک وقار آفندی اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔

''یہ ہوگئی صبح ہماری شہزادی کی۔'' انہوں نے لاڈ سے اس کے سر کے بال بگاڑے۔

''کہاں جا رہے ہیں بابا آپ......؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ایک ضروری کام ہے بیٹا......'' وہ عجلت میں جواب دیتے اندر بڑھ گئے۔ وہ یوسف کی طرف بڑھ گئی۔

''خیریت...... صبح صبح کیسے ٹپک گئے......'' اس نے شرارت سے پوچھا۔ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ دھپ سے اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک انوکھی سی سرشاری اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔

''تم نے یاد کیا اور میں حاضر ہوگیا'' وہ شرارت سے بولا۔

اسے اچانک ہی کل والی خواری کے ساتھ یہ بھی یاد آگیا کہ یوسف نے رات اس کے ایک بھی میسج کا جواب نہیں دیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے مسکراتے چہرے پر غصے کی سرخی جھلکنے لگی۔

''کل کہاں غائب تھے؟ اتنے میسج کیے، ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔'' اس نے جارحانہ سے انداز میں پوچھا۔

''صبح اٹھ کر موبائل چیک کر لیتیں تو یہ سوال نہ پوچھتیں۔'' اس کے غصے سے حظ اٹھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ اس جواب پر وہ لاجواب ہوگئی کیونکہ واقعی اس نے صبح اٹھ کر موبائل نہیں دیکھا تھا۔

''انمول بیٹا...... آجائیں ناشتا کر لیں۔'' صغریٰ بوا نے کچن سے باہر نکل کر آواز لگائی۔ اس وقت ان کی پکار اسے بہت بری لگی۔ وہی ہمیشہ کی طرح بلاوجہ کی مداخلت......

''یہیں لے آئیں بوا...... اور چائے نئے مہمان کے لیے بھی۔'' اس نے یوسف کو دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

اس سے اس کے شفاف چہرے پر شرارت اور بالوں کی ایک آوارہ سی لٹ چمکتی پیشانی پر سر سرا رہی تھی۔

''نہیں بوا...... میرے لیے مت لائیے گا......

میں انکل کے ساتھ پی چکا ہوں چائے۔'' اس سے پہلے یوسف نے خود بوا کو منع کر دیا۔

''آخر تم کب کے آئے ہو اور کیوں آئے ہو؟'' اس کے جواب سے اسے پھر خیال آ گیا کہ یوسف کی آمد کی وجہ معلوم کرلے۔

''اگر برا لگ رہا ہوں تو چلا جاتا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

''فضول باتیں بند کرو، تمہاری وجہ سے کل ان جلتی ہوئی شمع کی اتنی فضول باتیں سنی ہیں۔ سیدھی طرح بتاؤ جو پوچھا ہے۔'' وہ دھونس جما کر بولی۔

''بابا نے بلایا ہے..... انہیں کہیں کام سے جانا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا..... تو تم بابا کے کام سے آئے ہو۔'' وہ کچھ جتاتے ہوئے بولی۔

''چندا..... آجاؤ یہیں آکر ناشتا کرلو..... ورنہ پھر مجھے اتنا لمبا چل کر لانا پڑے گا ناشتے کا سارا سامان.....'' صغریٰ بوا اب لاؤنج کی چوکھٹ تھامے اسے بلا رہی تھیں۔ وہ جھنجلا گئی۔ سر پر ہی سوار ہو گئی تھیں وہ۔

''آتی ہوں بوا۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''جلدی آجاؤ بیٹا، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' وہ کہتی ہوئی پلٹ گئیں۔ وقار آفندی کی کھنکھار پر اس نے بے تابی سے یوسف کو دیکھا۔

''پھر کب ملو گے.....؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''بتا دوں گا میسج کر کے..... چلتا ہوں اب.....'' وقار آفندی کی جھلک نظر آتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

''چلو بیٹا..... جلدی آؤ..... پہلے ہی لیٹ ہو گیا میں۔'' وہ تیز قدموں سے باہر نکلتے چلے گئے۔ یوسف ان کی تقلید میں ان کے پیچھے ہی گیا۔ انمول کچھ دیر بیٹھی ہاتھ ملتی رہی۔ اس مختصر سی ملاقات سے تشنگی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کی بروکھی پھیکی سی بے رنگ زندگی میں یوسف کی شخصیت بہت اہم ہو گئی تھی، وہ اپنی ہر پریشانی بلا جھجک اسی سے کہا کرتی تھی۔ وہ یوسف کا انتظار کرتی رہی اور وہ دوبارہ ملنے نہ آیا۔

چند دن تو اپنی انا کو لے کر اس نے صبر کر ہی لیا مگر پھر صبر کی حد ختم ہونے لگی۔ زندگی میں عجیب سا جمود اور یکسانیت چھا گئی تھی۔ جویریہ سے ملنا بھی آسان نہیں رہا تھا۔ اسکول میں آخری سال تھا میٹرک کے بعد کالج شروع ہونا تھا اور اسے اب مشکل لگ رہا تھا کہ جویریہ اور وہ ایک کالج میں داخلہ لے پائیں گی۔ چوتھے دن اس نے ٹیرس سے تانک جھانک کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ یوسف تو نظر نہ آیا البتہ کچھ غیر معمولی ہلچل سی محسوس ہوئی۔ شاید کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس نے ساری انا بالائے طاق رکھ دی اور میسج کیا۔

''کہاں غائب ہو تم.....؟'' آگے ناراض فیس بنا دیا۔

''سوری، دو دن سے شمع جی کا عتاب جھیل رہا تھا اور آج گاؤں سے چاچا لوگ آگئے۔'' توقع کے... برخلاف یوسف کا فوراً ہی جواب آگیا۔ وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی۔ امتحان نزدیک تھے اس سے کوفت کے مارے پڑھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

آج وہ ماما سے پڑھنے کا بہانہ بنا کر اُن کی طرف چلی آئی تھی۔ وہ عجیب مسرور سی کیفیت میں آگے بڑھی ہی تھی کہ شمع جی وہیل چیئر چلاتی اُدھر آگئیں۔

''ارے انمول! آؤ وہاں کیوں کھڑی ہو؟'' ان کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ خلاف توقع ان کے نرم دوستانہ لہجے پر حیران ہوتی وہ اندر آئی۔

''کیسے آنا ہوا انمول؟'' شمع جی نے پوچھا۔ وہ ایک لحظہ کو ٹپٹا سی گئی۔ یوسف کا نام لیتی تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا۔

''وہ..... میں پوچھنے آئی تھی کہ..... کہ اس دن پڈنگ کیسی بنی تھی؟'' اس کو بالآخر مناسب سا جواز سوجھ ہی گیا۔

''پڈنگ..... اچھی تھی مزے دار.....'' انہوں نے یاد کرتے ہوئے تعریفی کلمات کہے..... اس وقت ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

''میں نے بچا کر رکھ دی تھی اور یوسف نے بھی کھائی تھی وہ پڈنگ۔'' آج وہ خوامخواہ یوسف کا ذکر

خود لے کر آ رہی تھیں۔
"جی...... وہ میں نے خود بنائی تھی، آپ نے کہا تھا ناں کہ گھر کے کام سیکھا کرو۔" اس نے بات بنائی۔
"گڈ ...... اچھی بات ہے یہ تو...... لڑکیوں کو ایسے ہی کاموں میں دل لگانا چاہیے نہ کہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنی چاہئیں۔" وہ بلاوجہ ہنسیں۔
انمول کو ان کے لگاوٹ بھرے انداز سے گھبراہٹ ہونے لگی .... نہ جانے کیسی عجیب سی لپک تھی ان کے چہرے پر...... جیسے ٹوٹے پھوٹے خوابوں اور روندے ہوئے جذبوں کی آنچ سے ان کا چہرہ سرخ سا پڑتا جا رہا تھا۔
"مگر اب تو تمہارے انگزام ہونے والے ہیں ناں...... آج کل پڑھائی پر ہی توجہ دو تو بہتر ہے۔ ویسے کچھ پوچھنا تو نہیں تھا یوسف سے؟" اچانک ہی انہوں نے سوال کیا۔
انمول کو اندازہ ہوا کہ وہ بہت گہری نظر رکھتی ہیں اور دل کی بات جان لیتی ہیں۔
"نن نہیں تو...... میں تو ایسے ہی آئی تھی۔" اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔
شمع جی محظوظ سی مسکراہٹ سے اسے دیکھتی رہیں جیسے اس کے دل کا بھید پا چکی ہوں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی مگر نظریں بے حد سرد تھیں۔ انمول کے پورے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ جیسے کوئی انہونی سی ہونے والی ہو...... اس نے خوفزدہ نظروں سے شمع جی کو دیکھا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔
"یوسف تو...... گاؤں چلا گیا۔" اگلے پل شمع جی کے انکشاف نے اس کے سر پر دھماکا کیا۔
وہ صدمے اور حیرت سے ان کے مسکراتے چہرے کو تکتی رہ گئی۔ پورے وجود میں اندر ہی اندر ایسی تباہی مچی کہ جان ہلکان سی ہو گئی...... یوسف اسے بتائے بغیر گاؤں چلا گیا...... کب گیا، کب آئے گا، واپس بھی آئے گا یا نہیں......؟ پے در پے سوالات خدشات بن کر اس کے ذہن میں دوڑنے لگے وہ کئی ثانیے تک کچھ بولنے اور ہلنے جلنے کے لائق نہ رہی۔
"ارے انمول کب آئی...... شکر ہے شکل تو دکھائی اپنی ورنہ یہاں تو ایسی خاموشی ہوگئی کہ دل گھبرا رہا تھا۔ جب سے یوسف کو اس کے چاچا گاؤں لے کر گئے ہیں، یہاں سناٹا ہو گیا...... چائے لوگی انمول......" مہر آنٹی ناشتے کی ٹرالی سجائے بے تکان بولتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔
"شکریہ آنٹی...... میں چلتی ہوں اب۔" اس کا دل یک دم اچاٹ ہو گیا۔ اب تو مہر آنٹی نے بھی شمع جی کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔
"ارے بیٹھو تو...... زیب کیسی ہے...... بہت دن ہو گئے اس سے ملے ہوئے اس سے کہنا کہ چکر لگائے شام کو...... آنٹی یاد کر رہی ہیں۔" انہوں نے خاص طور پر اس سے کہا۔
"ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ناں......" وہ بمشکل جواب دے پائی۔
"ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر اس طرح بیماری کو خود پر طاری کرنے سے بندہ اور بیمار ہو جاتا ہے۔ بھیجنا ضرور زیب کو......" مہر آنٹی نے دوبارہ سے خاص تاکید کی۔
"جی......" وہ اسی قدر کہہ سکی۔ اس نے بمشکل پلکیں جھپکا کر آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ اس کی آخری نظر شمع جی پر پڑی تو اُن کے چہرے پر پھیلی دھندلی سی تمسخرانہ مسکراہٹ نے اس کے دل کے کئی ٹکڑے کر دیے۔
وہ اس سہ پہر عقبی حصے میں بادام کے درخت کے سرخ و سبز امتزاج کے پتوں کے اسرار میں الجھی زندگی کی حقیقتوں کو کھوجتی رہی۔ کسی ننھی چڑیا کی طرح وہ تنکا، تنکا کر کے بکھرے خوابوں کے گھونسلے کا غم منا رہی تھی۔ موسم معتدل تھا، ہوا کے ہلکے جھونکے ماحول میں رچ بس کر سب طرف مستقبل کی نئی امیدوں کا پیغام پھیلا رہے تھے۔ مگر وہ جیسے محبت کے سفر میں جنوں کی سیڑھیاں تیزی سے طے کرتی اب حیران و ششدر سی تنہائی کی دہلیز پر زخم خوردہ سی کھڑی ہر سو پھیلی اداسی میں یوسف کی یاد کے بنتے بگڑتے نقش دیکھ رہی تھی۔

یوسف اس کی زندگی میں محبت کے چند سکے ڈال کر اسے خرید چکا تھا، وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی۔

"یوسف ملے بغیر کیسے چلا گیا؟" یہ سوال اس کے منتشر ذہن میں بار، بار آرہا تھا۔ وہ بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتی جا رہی تھی زرد ہولے کے پتھریلے ہونکے اس کے وجود کو گھائل کر رہے تھے اور وقت کی کڑی دھوپ کے سائبان تلے وہ جھلس رہی تھی۔ اسے اپنی ہی دھڑکنیں اپنے وجود کے تہ خانوں میں مدھم ہوتی سنائی دے رہی تھیں۔ زندگی اچانک ایسا موڑ لے گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

"انمول...... انمول......" کمرے کی کھڑکی سے ایمل کی آواز واضح سنائی دے اس نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔

"جویریہ آئی ہے انمول......" ایمل کی اطلاع نے اس کے مردہ تن میں روح سی پھونک دی۔ بڑے دنوں بعد جویریہ کی آمد ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آستین سے رگڑ کر منہ صاف کیا۔ مگر اس کی شکل دیکھ کر جویریہ تو کیا کوئی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے رونے کے شغل میں مصروف تھی۔

"تمہیں کیا ہوا......؟" اس کی سرخ ناک اور متورم آنکھیں دیکھ کر جویریہ حیران ہوگئی۔ ایمل بھی احمقوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ رونے کی وجہ تو اسے معلوم نہیں تھیں۔

"ماما بھی تمہارا پوچھ رہی تھیں...... کیا ہوا تمہیں؟" ایمل نے فکرمندی سے پوچھا۔

"تمہیں یاد کر رہی تھی...... بے وفا...... تم تو ماموں کے گھر جا کر بھول ہی گئیں۔" اس نے جبراً لہجے کو بشاش بنانے کی کوشش کی۔

"تمہیں ہوا کیا ہے آخر...... یہ کیا حال بنا رکھا اپنا؟" جویریہ سخت پریشانی سے بولی۔

"شکر ہے ماما نہیں ہیں، ورنہ ماما بھی پریشان ہو جائیں...... پہلے ہی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں......"

ایمل کی حیرت بھی کم نہیں ہو رہی تھی۔ ان چند گھنٹوں میں اس پر زمانوں کی تھکن چھا گئی تھی اور وہ کسی شکستہ، ناکام اور مایوس انسان کی طرح نظر آ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے...... بس ایسے ہی...... یونہی...... بلاوجہ دل اداس ہو رہا تھا۔" دونوں سے نظریں ملائے بغیر اس نے جواب دیا۔

"ماما ڈاکٹر کے ہاں گئی ہیں کیا؟" اچانک خیال آیا تو ایمل سے پوچھا۔

"ماما تو مہر آنٹی کی طرف گئی ہیں۔ ان کا فون آیا تھا ماما کے پاس...... ماما تم کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں مگر تم پتا نہیں کہاں تھیں۔" ایمل نے تفصیل سے بتایا۔

"اوہ......" اس نے سر پر ہلکے سے ہاتھ مار کر اپنی یادداشت کو تھپکا۔ اپنے غم میں وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ مہر آنٹی نے ماما کو بلایا تھا۔

"میری جدائی میں تم نے اپنا اتنا برا حال کر لیا...... انمول...... کیا ہو گیا تم کو......" جویریہ خود کو قصوروار سمجھتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

"سچ میں مجھے بھی تم اتنی یاد آ رہی تھیں مگر کیا کروں وہاں مصروفیت ہی اتنی ہے۔ ماموں کی شادی شدہ بیٹیاں آ جاتی ہیں اور پھر وقت ہی نہیں ملتا۔ میں تو اسٹڈی کا ٹائم بھی مشکل سے نکال پاتی ہوں۔ آج بھی کاشف بھائی کی منت سماجت کر کے آئی ہوں۔" اس نے اپنا احوال سنایا تو انمول کچھ اور بھی افسردہ ہو گئی بلکہ کچھ دیر کے لیے وہ اپنا غم بھی بھول سی گئی۔

"انکل نے اچھا نہیں کیا...... تمہیں اکیلا چھوڑ دیا۔" وہ بس یہی کہہ سکی۔

"ہاں...... مگر کیا کروں...... میں کچھ بھی نہیں کر سکتی...... میرے اختیار میں کچھ نہیں۔" جویریہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"میرا خیال ہے آج ہم اکٹھے ہوئے ہیں تو کچھ اچھی باتیں کر لیں تاکہ وقت اچھا گزرے۔" ایمل نے دونوں کو احساس دلایا۔

"ہوں...... یہ تو ٹھیک کہا تم نے...... جاؤ انمول

تم پہلے حلیہ درست کر کے آؤ اور ایمل پلیز اچھی سی چائے تو پلواؤ..... ساتھ میں پیٹ پوجا کا سامان بھی ہونا چاہیے۔'' جویریہ نے ایمل کو آرڈر کیا۔ اور خود پاؤں پسار کر بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹ گئی۔

''میں صغریٰ بوا سے کہتی ہوں۔'' ایمل بھی چلی گئی۔

انمول منہ دھو کر باہر آئی اور بالوں میں برش کرنے لگی۔

''ہوں..... اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ.....'' جویریہ نے ستر سالہ تجربے کار عورت کی طرح انمول کا گہری نظر سے جائزہ لے کر سوال کیا۔

''کیا ہوا ہے..... کچھ نہیں.....'' انمول کا دل جواب دیتے، دیتے بھر آیا۔

''وہ تمہارے یوسف صاحب نظر نہیں آرہے؟'' جویریہ کا بس یہی پوچھنا تھا کہ انمول کا سارا ضبط ٹوٹ گیا۔

''وہ مجھ سے ملے بغیر ہی چلا گیا..... دھوکے باز.....'' اس کے انداز میں شکوہ بھی تھا اور غم بھی۔

''تو تم فون کر لو ناں اسے.....'' جویریہ نے راہ دکھائی۔

''جب اس نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا تو پھر میں کیوں اس کے پیچھے بھاگوں.....'' وہ غصے سے بولی۔

''تو پھر رو کیوں رہی تھیں؟'' جویریہ نے پوچھا۔

انمول لاجواب سی ہوگئی اور کندھے اچکا کر پتا نہیں کا اشارہ دیا۔

''مان لو کہ تم بری طرح انوالو ہوگئی ہو اس میں..... اور بی کیئر فل..... سنبھل جاؤ انمول، یہ راستہ بہت پُرخار ہوتا ہے۔ لڑکوں کا کچھ نہیں ہوتا..... لڑکیوں کی بدنامی ہوتی ہے۔'' جویریہ نے سمجھایا۔

''مگر میرا دل نہیں مانتا..... وہ بہت فرینڈلی نیچر کا ہے..... بہت کیئرنگ اور..... لونگ ہے۔'' اس نے سادگی سے اعتراف کیا۔

''اچھا..... تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔'' جویریہ پوری طرح اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم دونوں میں صرف فرینڈ شپ ہے۔'' اس نے اپنا خیال بتایا۔

''میں فرینڈ شپ کو اچھا نہیں سمجھتی.....'' اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

''بات تو ایک ہی ہے فرینڈ شپ کہو یا محبت، نام کتنے ہی دے لو۔'' جویریہ نے کشن گود میں رکھ کر مزہ لے کر کہا۔

''وہ میرے ساتھ سیریس ہے جویریہ..... پتا ہے وہ میری ہر مشکل منٹوں میں حل کر دیتا ہے۔ میرا ہر کام یوں چٹکیوں میں کر دیتا ہے۔ مجھے کبھی اس کی موجودگی میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی..... یوں جیسے وہ میرے وجود کا ایک حصہ ہے۔'' وہ ایک جذب میں بولتی چلی گئی۔

جویریہ نے حیرت سے اسے بولتے سنا..... اس نے سنا تھا کہ محبت بہادر بنا دیتی ہے مگر آج دیکھ رہی تھی کہ محبت بولنا بھی سکھا دیتی ہے۔ محبت کے سفر میں وہ اندھا دھند آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ اسے آگے کھیلا دھندلا سا غبار بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

''یہ سب وقت گزاری کے کھیل ہیں انمول..... خدا کے لیے آنکھیں کھولو، لڑکیاں تو کانچ سی ہوتی ہیں، ان کی زندگی میں مان اور بھروسا سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔'' جویریہ دیکھ رہی تھی کہ وہ کسی مست ملنگ جوگن کی طرح دیوانہ وار محبت کی شاہراہ پر جھومتی چلی جا رہی ہے۔ وہ اسے اس راستے سے واپس بلانا چاہتی تھی۔

''وہ فلرٹ نہیں ہے انمول..... وہ سب سے مختلف ہے..... مجھے خود سے زیادہ اس پر بھروسا ہے۔ وہ وقاص نہیں ہے، جو لڑکیوں کو کھیل سمجھتا ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔ اسے دھیان ہی نہیں رہا کہ انجانے میں اس نے پیاری سی دوست کو بھائی کا طعنہ دے کر ٹھیس پہنچا دی لیکن پھر اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر شرمندہ ہوگئی۔

''آئم سوری جویریہ.....'' اس نے فوراً معذرت کی۔

جویریہ کچھ نہ بولی۔

''وقاص ٹھیک تو ہے ناں..... کیسا ہے وہ.....؟'' اس نے اپنائیت سے پوچھا۔

''وہ تو اب ایسا ٹھیک ہوگا کہ بھول جائے گا یہ سب

خرافات..... کرنل انکل بہت اصول پسند اور سخت انسان ہیں، اسی لیے ابو نے اسے ان کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ سیدھا ہو جائے گا۔'' جویریہ نے کہا۔

''یوسف ایسا نہیں ہے جویریہ.....'' انمول نے یقین دلایا۔

''تو پھر اب کہاں غائب ہو گیا وہ.....؟ کہاں گئی سو کالڈ محبت..... کہیں اس قابل بھی نہ سمجھا کہ آگاہ کر دیتا۔'' جویریہ نے طنزیہ کہا۔

انمول کا دل ڈوب سا گیا اور چہرے پر مایوسی اور دکھ کے سائے پھیل گئے۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''اگر وہ سچا ہے تو ملاؤ اس کو فون اور کرو بات..... دیکھو کیا کہتا ہے۔'' جویریہ نے اسے چیلنج کیا۔

اس نے فوراً ہی یوسف کا نمبر ملا دیا۔ اس سے اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ پہلے بیل جاتی رہی پھر آواز آنی بند ہو گئی۔ اس نے کئی بار کوشش کی۔

''کیا ہوا..... ریسیو نہیں کر رہا فون؟'' جویریہ نے پوچھا۔

''ہاں پتا نہیں شاید..... سگنل نہیں آ رہے..... ہو سکتا ہے چارجنگ ختم ہو گئی ہو۔'' اس نے مری، مری آواز میں کہا۔

''ہونہہ..... دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے..... ایسے تو ہزاروں جواز بنا سکتا ہے تمہارا دل..... کیا تم سب پر یقین کر لوگی؟'' جویریہ سفاکی سے اس کے دل کے بخیے ادھیڑ رہی تھی..... اس کا نازک سا دل بیٹھنے لگا۔

''تم لوگ کیا یہیں پر چپک گئیں..... ارے آ کر تو دیکھو بوا نے کتنے مزیدار سموسے بنائے ہیں..... خوشبو نہیں آ رہی تم لوگوں کو.....'' ایمل نے اچانک ہی وہاں آ کر مداخلت کی۔

دونوں کی طرف سے کوئی خاص ردِعمل نہ پا کر وہ چڑ سی گئی۔

''واہ..... خود بیٹھی باتیں بنا رہی ہیں..... اور میں نے بوا کے ساتھ مل کر سموسے بنانے بھی سیکھ لیے..... جھوٹی تعریف ہی کر دو.....'' وہ بناوٹی ناراضی سے بولی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں..... سموسے بنانے تو مجھے بھی آ گئے بس ابھی اس کی پٹیاں بیلنے میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔'' جویریہ نے جھٹ تعریف کی۔

ایمل کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی مگر انمول کسی سنگی مورتی کی طرح گہری سوچ اور شدید دکھ میں مبتلا گم صم سی بیٹھی تھی۔

''انمول..... آؤ ناں.....'' جویریہ نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

صغریٰ بوا نے ایمل کی رضا پر باہر لان میں کرسیاں لگا کر چھوٹی میز سیٹ کر دی تھی۔ ایمل اور جویریہ ناشتے کے لوازمات سے بھرپور انصاف کر رہی تھیں جبکہ انمول کا دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا وہ صرف ان کا برائے نام ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے دل میں محبت کی جوتی، نئی کونپل پھوٹی تھی وہ اس بے دردی سے کچل گئی تھی کہ اس کا درد اس کی نس نس میں پھیل گیا تھا۔

جویریہ کے جانے کے بعد وہ تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی۔ ماما کب گھر لوٹیں اسے پتا نہیں چلا کیونکہ سر درد کا بہانہ کر کے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ پلکوں میں تارے پروئے یوسف کا غم مناتے ہوئے جانے کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆☆☆

صبح عجیب ویران اور اجاڑ سی تھی جیسے ہر سو اداسی کی ردا تنی ہو..... وہ تو جیسے خود سے بھی خفا، خفا سی تھی۔ خلافِ معمول ماما کی آواز کچن سے آ رہی تھی۔ آج وہ صبح اٹھتے ہی کچن میں چلی گئی تھیں اور صغریٰ بوا کو ہدایات دے رہی تھیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر فروٹ باسکٹ سرخ مالٹوں سے بھری ہوئی رکھی تھی۔

''یہ مالٹے کب آئے؟'' اس نے سوچا۔

ماما اسی وقت کچن سے ایک بیضوی خوب صورت سی ڈش لے کر برآمد ہوئیں۔

''لو بھئی..... آج سب ناشتے میں ہوم میڈ گاجر کا

حلوا بھی کھائیں گے۔'' مامانے کہا۔

''گاجر کا حلوا..... صبح، صبح بنالیا آپ نے؟'' انمول نے حیرت سے کہا۔

''نہیں بھئی..... میں کہاں بناؤں گی۔ کل رات یوسف گاؤں سے واپس آگیا ناں..... جب میں وہاں تھی اسی وقت پہنچا تھا وہ..... وہ لے کر آیا ہے یہ سوغات اس کی اماں نے خاص طور پر بنا کر دیا ہے اس کو مالٹے بھی وہی لے کر آیا ہے۔ اور بہت سارا سامان دے کر بھیجا ہے۔ ناراض تھا ناں وہ اپنی ماں سے، انہوں نے زبردستی ماموں کے گھر جو بھجوا دیا تھا اور پھر لاکھ بلانے پر بھی ملنے نہیں گیا ان سے..... تب اس کے چاچا کو بھیج کر زبردستی بلوایا اسے اس کی اماں نے۔'' مامانے اپنی دُھن میں تفصیل سے ساری بات بتائی۔

اور ان کی بقیہ تفصیل تو جیسے اس نے سنی ہی نہیں اس کے دل کے تاروں میں بڑی البیلی سی ردھم شروع ہوگئی تھی۔ اس کے جذبات و احساسات ایک ہی تال میل میں سرخوشی سے رقص کررہے تھے۔

''یوسف آگیا.....'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔

''مزے دار ہے..... لو تم بھی ٹیسٹ کرو.....'' مامانے جیسے سنا ہی نہیں اور حلوے کی ڈش اس کی جانب سرکادی۔

''دیسی گھی بھی بھیجا ہے گاؤں سے، مہر کہہ رہی تھی کہ مجھے بھی بھجوائے گی دیسی گھی۔'' مامانے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ مگر وہ تو جیسے ماما کی دیگر باتوں کو سن ہی نہیں رہی تھی اس کے من میں بڑی دلفریب سی آتش بازی ہورہی تھی جس نے اس کے چہرے پر خوب صورت رنگ بکھیر دیے تھے۔

''ہاں..... یوسف میرا ہے..... وہ مجھ سے دور نہیں ہوسکتا۔'' وہ بار، بار دل میں دُہرا رہی تھی۔

نہ جانے کتنا منوں بوجھ اس کے سر پر تھا جو خبر سن کر اتر گیا۔ وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی لیکن یوسف کو سبق بھی تو سکھانا تھا۔

یوں بتائے بغیر جانے پر اسے سزا بھی تو دینی تھی ناں..... اس نے وہیں بیٹھے، بیٹھے دل میں ارادہ کرلیا اور کمرے میں جاتے ہی موبائل آف کردیا۔ ان چند دنوں میں وہ جتنا تڑپی تھی اب اسی حساب سے یوسف کو بھی ستانا تھا۔ ویسے بھی امتحان قریب تھے اسے تیاری بھی کرنی تھی۔

وہ خود اپنی کیفیت سے پریشان تھی۔ اس کا دل پڑھائی میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ زبردستی نوٹس لے کر بیٹھی رہی تھی۔

ہر چند کہ یوسف کی واپسی کی اطلاع پا کر وہ پُرسکون ہوگئی تھی مگر دو روز سے اس سے رابطہ نہ کرکے وہ خود بھی بے سکون سی ہوگئی تھی۔ سزا تو وہ یوسف کو دے رہی تھی مگر تکلیف اسے خود بھی ہورہی تھی۔ وہ اپنی کیفیت کو خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ ہاں بس اسے یہ معلوم تھا کہ یوسف کے بنا جینا محال ہے۔

وہ تیسرا دن تھا جب یوسف اچانک چلا آیا اور وہ اسے یوں سامنے پا کر خوشی اور حیرانی کے ساتھ، ساتھ کچھ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ پہلے سے کہیں زیادہ اسمارٹ اور خود اعتماد لگ رہا تھا۔ وہ کریم کلر کے عوامی سوٹ میں ملبوس تھا۔ جس میں اس کا مردانہ وقار کچھ اور بھی نکھر رہا تھا۔

''کہاں غائب ہو.....؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''آپ کون؟'' انمول نے انجان بننے کی حد کردی۔

''اوہ.....'' اس نے سیٹی کے سے انداز میں خفیف سی سرگوشی کی۔ صرف ایک نظر میں ہی اس کی خفگی بھانپ گیا۔ اپنے تئیں تو وہ اس کی لاتعلقی پر اس کی خبر لینے آیا تھا۔

''اچھا تو ناراض ہو۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔

''میں کیوں ناراض ہوں گی..... میرا اور تمہارا بھلا کیا رشتہ.....'' وہ بپھرے سے انداز میں بولی۔

''اچھا تو غصہ رشتہ نہ ہونے پر ہے..... یعنی میری طرف سے کسی اقدام کی منتظر ہو.....'' وہ شوخی سے بولا۔

''خواہ مخواہ کی خوش فہمی پالی ہوئی ہے۔'' اس نے ناک چڑھا کر نخوت سے کہا۔

''اچھا ہوا مجھے تمہارے خیالات کا علم ہوگیا۔

اماں سے وعدہ کر کے آیا تھا بہت جلد اپنی پسند ان کو بتادوں گا..... ورنہ گاؤں میں کئی لڑکیاں ہیں ان کی نظر میں.....'' وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہوا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ سنجیدگی اور رکھائی آگئی اور انمول کے چہرے کے ایک پل میں ہی کئی رنگ بدل گئے۔ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''میں نے کب منع کیا ہے؟'' وہ بے اختیار کہہ بیٹھی۔

جواب میں اس کے قہقہے نے سرتاپیر کلسا دیا..... اپنی بے اختیاری اور گھبراہٹ میں وہ کھلا اعتراف کر گئی تھی۔

''سچ، تم بہت معصوم ہو..... اور مجھے تمہاری یہی معصومیت اٹریکٹ کرتی ہے۔ مجھے معلوم ہے تم مجھ سے ناراض ہو مگر سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ میں انفارم نہیں کر سکا۔ جلدی میں موبائل بھی چارج نہیں کیا۔ چارجر بھی یہیں رہ گیا۔ دراصل اماں مجھے بہت یاد کر رہی تھیں اور میں ان سے بلاوجہ ہی ناراض تھا۔ میں گاؤں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا..... اماں سے دور ہونا نہیں چاہتا مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اماں کا وہ قدم بالکل ٹھیک تھا یہاں آکر میں کچھ بن گیا۔ بی ایے کے ایگزام کے بعد میں کوئی اچھی جاب ڈھونڈ لوں گا اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مزید تعلیم جاری رکھوں گا۔ اب ہمارے درمیان فاصلے سمٹنے میں کم وقت رہ گیا ہے انمول۔'' اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ ناراض ہوتی یا تخریے کرتی اس نے جلدی، جلدی تمام تفصیل کہہ سنائی۔

''کون آیا ہے؟ یوسف ہے.....'' ماما کی آواز سنائی دی تو وہ سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔ یوسف بھی مؤدب طریقے سے کھڑا ہوگیا۔

''ارے یوسف آیا ہے..... ہاں مجھے کچن میں آواز تو آرہی تھی مگر اس وقت میں روٹی پکا رہی تھی۔'' پسینے سے بے حال صغریٰ بوا بھی کچن سے برآمد ہوئیں۔ ماما اور صغریٰ بوا آگے پیچھے ہی وہاں پہنچیں۔

''جی آنٹی..... انمول کو اپنی دوست سے نوٹس لینے ہیں اسی لیے بلایا تھا انمول نے۔'' یوسف نے کمال صفائی سے بات بنائی کہ انمول بھی دیکھتی رہ گئی۔

''ارے تو مجھے بتا دیتیں بیٹا..... میں خود لے جاتی آپ کے پاپا کے ساتھ آپ کو.....'' ماما نے مڑ کر انمول سے کہا۔

ایک لمحے کو تو وہ گڑبڑا سی گئی مگر پھر سنبھل گئی..... محبت کی اس پُرکیف شاہراہ پر وہ لڑکھڑاتی، سنبھلتی، جھومتی اور گرتی، اٹھتی چلے جارہی تھی بنا سوچے اور سمجھے.....

''ماما، پاپا تو شام کو یا رات کو لے کر جاتے مگر اس وقت وہ گھر پر نہیں ہوتی اسے کہیں جانا ہے آج..... اس لیے میں سہ پہر کو جا کر لے آؤں گی نوٹس۔'' اس نے بات بنائی تھی۔

☆☆☆

ماما کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی اور وہ صغریٰ بوا کی طرف سے بھی مطمئن ہوگئی تھیں۔ ان کی ٹریننگ بے شک بہت دقت طلب تھی مگر ماما نے ان کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا تھا اب وہ کوئی کام بھی خراب نہیں کرتی تھیں۔ ماما کے اوپر کچن کی ذمے داری بالکل نہیں رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ تھکی تھکی لگیں۔ اکثر چیزیں رکھ کر بھول جاتیں۔ اس دن رات کو ان کو پاپا کے ساتھ شادی کی تقریب میں جانا تھا اور ان کا سوٹ وہ ڈرائی کلین کے لیے دے کر بھول گئیں۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب جب وہ لباس منتخب کرنے کھڑی ہوئی تو یاد آگیا۔

''میں تو بھول ہی گئی ڈرائی کلین پر دے کر..... تاریخ بھی گزر گئی۔ دو دن پہلے کی تاریخ ہے۔'' وہ رسید پکڑ کر صغریٰ بوا کے پاس چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی تھی کیونکہ وقار صاحب خاص طور پر وہی سوٹ ان سے کہہ کر گئے تھے۔

''آپ کوئی دوسرا سوٹ نکال دیں۔ اب تو کل ہی آسکتا ہے سوٹ..... میں ابھی کھانا پکا رہی ہوں اور رات سے میرے گھٹنوں میں بہت درد ہے۔'' صغریٰ بوا نے لاچاری ظاہر کر دی۔

''مگر تمہارے صاحب کو وہی سوٹ پہننا ہے۔

کیا فائدہ ہے میرا جب میں ان کی چھوٹی سی بات پوری نہ کرسکوں۔'' ماما کے لہجے میں آزردگی تھی..... رخساروں پر ابھرتی... زردی نے ان کے چہرے پر مایوسی اور افسردگی کی چھاپ گہری کردی تھی۔ وہ اپنی بیماری سے لڑتے، لڑتے نڈھال سی ہوگئی تھیں اور شاید اب ان کی امید مرنے لگی تھی۔

''ماما..... میں لے آتی ہوں جا کر.....'' انمول نے پیشکش کی۔

''ہاں..... ایسا کرو کہ بوا کے ساتھ جا کر لے آؤ..... زیادہ دور بھی نہیں ہے بس یہیں آگے سپر مارکیٹ کے پاس ہی تو ہے.....'' ذرا سی خوشی سے ان کا مدقوق کا چہرہ کھل اٹھا۔

''میں یوسف کو دیکھتی ہوں..... وہ بچہ ہر کام بھاگ کر کر دیتا ہے۔'' بوا کو ہی خیال آیا۔

چونکہ وہ خود نہیں جانا چاہتی تھیں اس لیے یوسف کا خیال آگیا اور یوسف ایک بار بلانے پر ہی آگیا۔ اور کوئی موقع ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب اسے کسی کام کے لیے بلایا جائے اور وہ نہ آئے یا انکار کردے۔ دن کا آغاز خوب صورت اور دلفریب سا تھا۔ انمول نے ماما کے ہاتھ سے رسید لے کر یوسف کو دے دی۔

صبح صبح اس کے دیدار نے من میں سرور سا بھر دیا۔

''رات کو جلدی آجاؤں گا۔ میسج کردوں گا چھت پر آجانا۔'' چلتے وقت یوسف نے جاں فزا مژدہ سنا کر روح کو سرشار کردیا۔

جب کافی دن گزر جاتے تھے تو پھر ملاقات یوں ہی ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں موسم کی دلفریبی کے ساتھ، ساتھ اس کے من کا موسم بھی جوبن پر تھا۔ جویریہ کی غیر متوقع آمد نے بھی اسے حیران کردیا۔

''وقاص آیا ہوا تھا اس لیے ممانی نے رعایت دے دی۔'' جویریہ نے اصل بات بتائی۔

''اوہ..... کیسا ہے وقاص..... اور کہاں گیا تمہیں چھوڑ کر.....؟'' اسے سن کر خوشی ہوئی۔

''باہر ہی کھڑا ہے۔'' جویریہ کی اطلاع پر وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔

''اسے باہر کیوں چھوڑا..... بلاؤ اندر.....'' اس نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا۔

''مگر اس کے سامنے ہم اپنی باتیں کیسے کریں گے۔'' آج جویریہ کی چھب ہی نرالی تھی۔ انمول نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ کوئی خاص اور نئی سی بات اس کے چہرے پر نظر آئی۔

''اچھا..... تو کوئی پرائیویٹ بات ہے؟ تو پھر میں اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دوں گی کچھ دیر.....'' جویریہ کے حامی بھرنے پر وہ صغریٰ بوا کو آواز دیتی باہر نکل گئی۔

جویریہ دھپ سے اس کے بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے اندر کی کشمکش اور بے چینی چہرے پر اضطراب بن کر پھیلی ہوئی تھی۔

''جویریہ، خیریت تو ہے ناں سب؟'' انمول نے پاس آکر پوچھا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول لیں۔

''ہوں، ہاں..... خیریت بھی ہے اور نہیں بھی.....'' وہ مبہم سا بولی۔

''کیا وقاص کا کوئی مسئلہ ہے؟'' اسے تشویش ہوئی۔

''اونہوں..... وقاص تو پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر لگ رہا ہے۔ بس ذرا میری ہی پرابلم تھی ایک۔'' وہ روانی سے بتاتے، بتاتے ایک دم اٹک سی گئی۔

''کیا ممانی نے کچھ کہا ہے؟'' وہ یہی کچھ سمجھی۔

''نہیں یار..... کاشف بھائی..... بلکہ کاشف.....'' وہ پھر جھجک گئی۔

''ہوں..... تو..... کیا ہوا کاشف بھائی کو..... اوہ نہیں پہلے کاشف بھائی پھر کاشف.....'' بولتے، بولتے انمول کو الہام سا ہوا۔

''کوئی چکر ہے کیا؟'' اس کے درست انداز نے پر جویریہ نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔

''سو واٹ..... یہ تو اچھی بات ہے کہ تم اپنی ممانی کی بہو بن جاؤ.....'' اس نے آرام سے کہا۔

''مسئلہ تو ممانی ہی ہیں..... کاشف نے اپنے طور پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ابھی ممانی کو اس کا علم

نہیں اور اگر وہاں رہتے، رہتے...... ممانی نے کچھ بھانپ لیا یا مجھ پر کوئی الزام لگ گیا تو کیا ہوگا......'' اس نے اصل پریشانی بتائی۔

''تم یہ بتاؤ کہ کیا تم بھی کاشف میں انوالوڈ ہو...... کیا تم کو اچھا لگتا ہے وہ۔'' انمول نے پوچھا۔ اس کے سوال پر جویریہ کا چہرہ گلابی پڑ گیا یعنی معاملہ دونوں طرف ہی ایک تھا۔

''مجھے کہہ رہی تھیں اور خود محبت کے سنہرے جال میں پھنس گئی ناں......'' انمول شرارت سے بولی۔

''مگر یار میں ایسا نہیں چاہتی...... میں چاہتی ہوں کہ اگر کاشف کی خواہش ہے تو اس کو ایک رشتے میں بدل دیا جائے کیونکہ میں بہت ڈرتی ہوں سب سے...... مجھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ بدنامی سے ڈر لگتا ہے۔ برے وقت سے ڈر لگتا ہے۔ امی بھی نہیں ہیں میری تو......'' ضبط سے اس کی آنکھوں میں پانی جھلکنے لگا تھا۔

''تم فکر نہیں کرو...... سب بہتر ہو جائے گا...... بس خیال کرو کہ ایسی بات نہ ہو کوئی جو تمہاری ممانی کو کھٹکے......'' اس نے تسلی دی۔

''مگر انمول...... ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ ناممکن ہے۔ میں لاکھ احتیاط کرلوں مگر کاشف تو بے پروا ہے، وہ ہم لڑکیوں کی ناموس، مان، حیا کے تقاضوں کے لیے کوئی احتیاط نہیں برت سکتا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی قندیلیں سب راز فاش کردیں گی۔ ممانی بہت ہوشیار ہیں اور سخت گیر بھی۔ ان کو ایسی لڑکیاں سخت ناپسند ہیں جو لڑکوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھاتی ہیں۔ اگر ممانی کی نظروں میں میرا امیج خراب ہو گیا تو بہت برا ہوگا...... پر کاشف اس بات کو سمجھ ہی نہیں رہا۔'' بات کے آخر میں جویریہ روہانسی سی ہوگئی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

انمول نے اس کا درد اپنے دل میں اترتا محسوس کیا کیونکہ وہ خود کو بھی بے پتوار کی ناؤ میں بیچ منجدھار میں ڈگمگا رہی تھی۔ ابھی دور تک بھی ایسے کوئی آثار نہ تھے کہ وہ اور یوسف ایک ہو جاتے اور نہ ہی ایسے کچھ امکانات نظر آتے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

شمارہ ستمبر 2020ء کی جھلکیاں

ارض، فرض، قرض
ایک جری جواں کی داستاں

ترانے کا سفر
ملی نغموں پر ایک پُرمغز تحریر

قیدی شہنشاہ
مغلیہ سلطنت کی بے کسی کا بیان

ایک تھی حسینہ
ایک معصوم سی مظلوم دوشیزہ کی سچ بیانی

اس کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ''سفر پہلا پہلا''
فلم نگر کی روداد ''کراچی سینما''
اور بھی بہت سی سچ بیانیاں،
سچے واقعات، دلچسپ روداد،
ایسی تحریریں جو سرگزشت کا خاصہ ہیں۔

ہر صاحبِ علم کے لیے تحفہ،
سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ

تھے مگر اسے اپنے سچے جذبوں پر پورا بھروسا تھا۔

لیکن وہ اس بات کو فراموش کر گئی تھی کہ انسان کی زندگی کا بھروسا ہوتا ہے اور نہ تقدیر کا..... اور یہ تقدیر تو کسی طوطا چشم کی طرح ایسے آنکھیں بدلتی ہے کہ بندہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

''تم کاشف سے کہو کہ وہ اپنے والدین سے بات کرلے..... اسے سمجھاؤ کہ اس طرح تمہارا کردار مشکوک ہوجائے گا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''مجھے تمہاری مدد کی بہت ضرورت ہے انمول..... میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہوں..... اگر ضرورت پڑی تو آنٹی کو اس معاملے میں ڈالنا پڑے گا کیونکہ ممانی سے کچھ بعید نہیں کہ پھر وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔'' وہ کافی خوفزدہ تھی۔

''ہاں جویریہ اگر کچھ گڑبڑ کریں گی تمہاری ممانی تو پھر ماما، بابا تمہارے ابو سے فون پر بات کرلیں گے۔'' اس نے تسلی دی۔

''تمہاری محبت تو بڑی کمزور نکلی..... تم تو پہلے ہی قدم پر ڈر رہی ہو.....'' اس نے شانہ تھپک کر لتاڑا۔

''انمول..... مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا بس نصیب سے ڈر لگتا ہے..... ہم لڑکیاں کانچ کے برتنوں کی طرح نازک ہوتی ہیں ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں اور پھر ان بکھرے موتیوں کو سمیٹنے والا، اپنانے والا کوئی نہیں ہوتا۔'' جویریہ نے سہمی، سہمی آواز میں کہا۔

''اُف، جویریہ کتنی بڑی باتیں کررہی ہو تم۔'' انمول نے اس کی گہری باتوں پر چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے بھی سمجھدار اور محتاط لگ رہی تھی۔

''جن بچوں کے والدین سر پر نہ ہوں ناں وہ گرم ہواؤں سے جھلس جاتے ہیں۔ امی تو رہی نہیں اور پاپا بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے..... سچ انمول کبھی، کبھی بڑی یاد آتی ہے..... وقاص بھی مجھ سے دور ہوگیا..... میرا تو پورا گھر ہی بکھر گیا۔ میں ڈروں گی نہیں تو اور کیا کروں گی..... تم خوش قسمت ہو کہ انکل، آنٹی تمہارے سر پر موجود ہیں۔ کوئی تم پر انگلی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ وہ تمہارا دفاع کریں گے۔'' اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

انمول کو وہ بہت بدلی، بدلی سی اور بہت اداس سی لگی۔ وقت نے اسے وقت سے پہلے ہی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

''تم لوگ یہاں اکیلی بیٹھی سر جوڑے کیا راز و نیاز کررہی ہو۔ وقاص بلا رہا ہے تم دونوں کو.....'' ایمل، وقاص کو کمپنی دیتے، دیتے اکتا کر وہیں چلی آئی۔

''ہوں..... آرہے ہیں ہم دونوں.....'' انمول نے فوری جواب دیا جبکہ جویریہ نے رخ موڑ کر اپنی بھیگی پلکیں دوپٹے کے پلو سے صاف کرلیں۔ زندگی کا یہ پہلو بالکل انجانا سا تھا اس کے لیے بھی اور نمول کے لیے بھی..... وہ دونوں اپنی عمر سے کہیں آگے بڑھ کر چل رہی تھیں اور بھٹکنے کا خطرہ زیادہ تھا۔

''بہت خوب..... تو مجھے بور کرنے کے لیے لائی تھیں تم.....'' اُن کے جاتے ہی وقاص بولنا شروع ہوگیا۔

انمول نے دیکھا اس کی صحت پہلے سے کہیں بہتر ہوگئی تھی اور وہ جو ایک بے پروا سے حلیے میں رہتا تھا اس میں بھی نمایاں فرق تھا سب سے بڑھ کر اس کے بال فوجی کٹ بنے ہوئے تھے۔ اسے وہ اس انداز میں اچھا لگا مگر بدلی ہوئی جون دیکھ کر ہنسی آگئی۔

''ہاں جی..... ہنس لیں..... ہنس لیں..... اب یہی وقت دیکھنا تھا مجھے۔'' وہ برا مانے بغیر شگفتگی سے بولا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ کافی چینج آگیا تم میں۔'' انمول نے ہلکی دبا کر تعریف کی۔

''ظاہری چینج پر نہ جائیں، میں اب بھی ویسے کا ویسا ہی ہوں۔'' اس نے اکڑ کر کہا۔

''ہاں..... کرنل انکل کے ڈنڈے تلے.....'' جویریہ نے لقمہ دیا۔

''ارے ہاں..... بہت دیکھے ہیں ایسے..... مشکل وقت سب پر آتا ہے اور مشکل وقت ہمیشہ بھی نہیں رہتا.....'' وہ اپنے ازلی شوخ انداز میں بولا۔

''ویسے تمہارا فطری انداز، شوخی و مذاق تو ویسا ہی ہے۔'' انمول نے اعتراف کیا۔

''جی..... بندہ یہی سمجھا رہا ہے کہ عادت بدل سکتی ہے مگر فطرت نہیں۔'' اس نے سر کو خم دے کر اپنی ڈھٹائی کا کھلا اعتراف کیا۔

صغریٰ بوا نے مزے دار ناشتے کے ساتھ سب کو ملک شیک بنا کر پلایا۔ وہ شام بہت خوب صورت گزری۔

آنے والے اگلے دن بہت ہی خوشگوار تھے انمول کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ وقاص کی آمد کی رعایت میں ممانی کی اجازت سے وہ دونوں مل کر شاپنگ پر بھی گئیں اور اس شاپنگ میں یوسف بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔ وقاص نے اپنی مفت کی خدمات پیش کرتے ہوئے یوسف اور انمول کو زبردست سرپرائز دیا۔ اسی نے دونوں کے لیے ٹیبل ریزرو کرائی تھی اور خود جویریہ کو لے کر شاپنگ مال چلا گیا۔

''یہ کیا بھئی.....؟'' انمول حیرت سے چیخی۔

''ان کاموں کا بہت تجربہ ہے میرا..... ڈیئر سسٹر انجوائے اٹ.....'' اس نے دو انگلیاں ہلا کر وش کیا اور جویریہ کو لے کر چل دیا۔

اسے وقاص کی یہ حرکت عجیب تو لگی مگر وہ شام اس کے لیے بے حد یادگار اور خوب صورت شام رہی۔ دل کے دروازے محبت کی سُر تال پر دھیرے، دھیرے کھلتے چلے گئے اس کے چمکتے عارضوں پر پھوٹتی روشنی نے اسے خوب صورت تر بنا دیا تھا۔

ان دنوں ماما بھی بہت خوش تھیں۔ ان کی بڑی بہن جاپان سے آرہی تھیں اور بڑے طویل کے بعد ان کی آمد ہو رہی تھی۔ ماما اپنی سب بیماری بھول بھال کر بہن کے استقبال کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ماحول پر چھائی یکسانیت یکسر چھٹ گئی تھی۔ اس کی جگہ سب طرف ہلچل اور خوشگواریت سی پھیل گئی تھی۔ ماما کے چہرے پر ہمہ وقت رہنے والی نقاہت اور اداسی غائب ہو گئی تھی۔ وہ کسی چنچل لڑکی کی طرح سب طرف بہت پھرتی اور چستی سے پھر رہی تھیں۔ طبیعت کی وجہ سے وہ کچھ دبلی ضرور ہو گئی تھیں مگر ان کی ہمت اور... مسرت خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

گھر کے ماحول میں شگفتگی بھر گئی تھی۔ ماما نے ڈرائنگ روم میں نئے پردے ڈالے اور گھر میں جہاں بھی ممکن تھا تبدیلیاں کیں۔ بابا ان کے ایک اشارے پر والٹ خالی کرنے والے تھے۔ سب طرف خوشی رقص کر رہی تھی۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب ان دونوں کی جانی اور ماما کی بہن حمنیٰ آ گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی۔ جینز اور ٹاپ میں ملبوس ان سب سے یکسر اجنبی بنی کچھ روٹھی خفا، خفا سی۔

''وفا کو میں زبردستی لائی ہوں، یہ تو کبھی پاکستان آئی ہی نہیں اور ہمایوں تو ایک بار پہلے آ بھی چکا ہے۔'' حمنیٰ نے بیٹی کو زبردستی اپنے پاس بٹھا کر سب کو اس کے بارے میں بتایا۔

''کیوں وفا جانی..... خالہ سے ملنے کا دل نہیں تھا آپ کا کیا.....؟'' ماما نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔

''ہمایوں کو بھی لے آتیں..... میں اس سے بھی مل لیتی۔ بھائی جان سے بھی عرصہ ہوا ملے ہوئے..... بس فون پر ہی بات ہو جاتی ہے۔'' ماما نے بدستور وفا کا ہاتھ پکڑے، پکڑے حمنیٰ سے کہا۔

''شاید وہ مجھے لینے آئے..... ہو سکتا ہے دو چار دن کے لیے آئے..... دراصل ابھی تو وہ کام میں لگا ہے ناں..... چھوڑ کر نہیں آ سکتا.....'' حمنیٰ نے سہولت سے جواب دیا۔

''وفا بیٹا یہاں سب تمہارے اپنے ہیں..... جاؤ ان کے ساتھ بیٹھو جا کر..... انمول، ایمل، وفا کو کمپنی دو بیٹا۔'' ماما نے دونوں کو تاکید کی۔

اگرچہ وہ عمر میں ان دونوں سے چھوٹی تھی مگر بہت کم عمر نہ تھی، امید تھی کہ وہ ان میں گھل مل جائے گی۔ حمنیٰ اور خود ان... میں تین سال کا فرق تھا مگر دونوں برابر کی لگتی تھیں۔ پہلے حمنیٰ کی شادی ہوئی تھی اس کے دو، تین سال بعد زیب کی۔ زیب کے ہاں دو سال کے فرق سے انمول اور ایمل کی پیدائش ہوئی جبکہ حمنیٰ نے پانچ چھ سال کی منصوبہ بندی کے بعد وفا کو جنم دیا تھا اور اب وہ بارہ، تیرہ سال بعد پاکستان آئی تھیں۔

وہ دن ہلچل بھرے اور خوشگوار سے تھے۔ حانی (جمنی خالہ) کی آمد نے ان کی بے رونق اور سادہ سی زندگی بدل کر رکھ دی۔ ماما کی بیماری کا سن کر وہ خاص طور پر اسی لیے ماما سے ملنے آئی تھیں۔ ان دنوں ماما کی آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے۔ کیسے عجیب سے رشتے ہوتے ہیں..... یہ خون کے رشتے..... ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے وابستہ..... ایک دوسرے کے بچپن کی حماقتوں اور خواہشوں کے جگنوؤں سے واقف، ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ..... اور ایک دوسرے سے بے حد دور ہوجاتے ہیں۔ اپنی زندگیوں میں مگن..... اپنے کنبوں میں مصروف اور اپنے مسائل میں گم..... ان محبتوں کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔ یہ رشتے، یہ محبتیں ایک دوسرے سے تو وابستہ رہتے ہیں مگر درمیان میں فاصلے آجاتے ہیں..... اور یہ فاصلے اگر رستوں میں ہوں تو گوارا ہوتے ہیں لیکن اگر دلوں میں ہوں تو..... انسان جیتے جی مرجاتا ہے۔

اور ماما ان دنوں نئی زندگی جی رہی تھیں۔ پورا، پورا دن گزر جاتا مگر ان کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔ وہ سب مل کر گھومنے پھرنے جارہے تھے اور انمول تو ان دنوں سرخوشی کے عجب عالم میں تھی۔ یوسف روز ہی ان کے درمیان موجود ہوتا۔

بابا نے یوسف کو یہ ذمے داری دی تھی کہ وہ شام کے اوقات میں ان لوگوں کو خاص مقامات پر گھمانے پھرانے لے جائے۔ ایک دو جگہوں پر وہ خاص طور پر جویریہ کو بھی ساتھ لے کر گئی تھی..... اس کے لیے بابا نے اس کے ماموں سے اجازت لی تھی۔ یوسف نے خاص طور پر چھٹیاں لے لی تھیں۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ یوسف کے سنگ گزرا ہر لمحہ اس کے لیے امر تھا۔

ساحل سمندر کی سیر کا پروگرام بنا تو جویریہ نے خاص طور پر وقاص کو بھی بلالیا۔ مہر آنٹی نے بھی چلنے کی حامی بھری تھی مگر عین وقت پر شمع جی نے چلنے سے صاف انکار کردیا۔ یوں مہر آنٹی بھی نہ گئیں اور شمع جی کے نہ جانے پر اس نے سکون کی سانس لی کیونکہ ان کی خالی نظروں میں بسی سختی اور نادیدہ سا شک اس کو سولی پر لٹکا کر رکھتا تھا۔

سب تیاری ایک دن پہلے ہی کرلی گئی تھی۔ جویریہ اور وقاص کو صبح ہی ان کے ماموں خود چھوڑ کر گئے تھے۔

''واؤ.....'' وفا کو دیکھ کر وقاص نے ہلکے سُروں میں سیٹی بجائی۔

''یہ کیا چیز ہے بھئی..... لائن سیٹ کرنے پڑے گی.....'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''باز آجاؤ..... سدھر جاؤ..... ذرا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا ورنہ بابا سے پٹوگے کیونکہ یہ میری کزن ہے سمجھے۔'' انمول نے پہلے ہی مرحلے پر کڑک کر تنبیہہ کی۔

''اوہ..... میری نیکی کا یہ صلہ دیا؟ میں نے آپ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا..... اس روز اگر میں موقع نہ دیتا تو.....'' وہ سرگوشیانہ بولنا شروع ہوا۔

''چپ کرو..... شش.....'' انمول نے گھبرا کر اسے ٹوکا۔

وہ کوچ میں اس کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور بارہ بار اس کے کان میں کھسر پھسر کررہا تھا۔

''اے مسٹر..... ذرا ادھر آؤ..... اور ڈرائیور کو راستہ بتاؤ۔'' یوسف نے اس کی مشکل سمجھ کر وقاص کو آواز دے کر بلالیا۔ وہ منہ بناتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔

''یہ نہیں بدلے گا.....'' انمول نے ہنس کر کہا۔

''دعا کرو کہ بدل جائے..... ورنہ نہ جانے کس مظلوم کی بددعا لگ جائے۔'' جویریہ نے التجا کی۔

''ہوں..... ہاں یہ تو ہے..... مگر وہ خود سمجھدار ہے..... ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کی حد ہی نہیں آرہی.....'' انمول نے تبصرہ کیا۔

''تم بھی سمجھانا اسے یار! نہ جاتے اس کی خصلت کب بدلے گی۔'' جویریہ بیزاری سے بولی۔ وہ سفر اور وہ سارا دن بے حد خوب صورت گزرا۔

وہ یوسف کے ساتھ کئی بار آنکھ بچا کر ساحل

سمندر پر دور تک چہل قدمی کرنے کے آئی۔ اسے یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یوسف اس کے ساتھ ہے۔ اسے پوری امید ہوگئی تھی کہ قدرت نے اس پر اپنے مہربان پر پھیلا دیے ہیں اور جلد ہی وہ یوسف کو پالے گی۔

لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کبھی، کبھی نخلستان دکھائی دینے والی شبیہہ سراب ہوتی ہے۔ بظاہر خوب صورت..... زندگی سے بھرپور مگر درحقیقت ویران اور اجاڑ.....

شامیں خوب صورت اور دل آویز سی تھیں۔ ماما تو بہن کی رفاقت میں جیسے سب فراموش کیے ہوئی تھیں اور اِدھر یوسف، وقار صاحب کی خصوصی ہدایت پر ہمہ وقت خدمت کے لیے حاضر رہتا۔ شاپنگ پر جانا ہو یا آؤٹنگ پر یوسف ہمراہ ہوتا۔ ماما کی خاص ہدایت پر وہ وفا کو گھومنے پھرنے کی ہر جگہ پر لے کر جارہی تھی۔ حامد انکل سے وقار صاحب نے خاص اجازت لے لی تھی سو یوسف ہر وقت دستیاب تھا۔ وہ سہانے دن جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یوسف کی سحر انگیز سنگت شمع جی کی گھورتی نظروں کے بغیر بہت اچھی لگ رہی تھی اِدھر یوسف پر بھی کیف و سرشاری کا عجب ہی عالم طاری تھا۔

اگرچہ روز ہی انمول کا میسج آجاتا تھا۔ اس صبح بھی وہ مگن انداز میں تازہ، تازہ شیو بنا کر کمرے سے باہر نکلا..... موبائل چونکہ خاموش تھا اس لیے اندر ہی اندر بے چینی سی ہو رہی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے خاص طور پر ٹیرس میں آکر باہر جھانکا..... وقار صاحب کے گھر پر صبح کا نورانی سا اجالا ایسے چھایا ہوا تھا جیسے فرشتے پر پھیلائے وہاں اللہ کی رحمت برسائے رہے ہوں۔

اس روز اس کا انتظار ختم ہی نہیں ہوا۔ انمول کا بلاوا نہ آیا..... اسے تعجب ہوا اگلا دن بھی خاموش سا گزر گیا۔ تیسرے دن وہ رہ نہ سکا خود ہی وہاں پہنچ گیا مگر گھر میں صرف صغریٰ بوا ملیں۔

''اے بیٹا وہ سب تو آج کسی رشتے دار سے ملنے گئے ہیں.....'' انہوں نے اطلاع دی۔

''بہت خود غرض ہے یہ انمول..... مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔'' اسے دل ہی دل میں غصہ آیا۔

''آں..... آ..... اچھا..... مجھ سے تو انمول نے آنے کے لیے کہا تھا۔'' اس نے بات بنائی۔

''خدا معلوم بیٹا..... خود پوچھ لینا اس سے..... میں تو اس آئے روز کی مہمانداری سے تھک گئی..... ابھی، ابھی کمر ٹکائی تھی جو تم آگئے.....'' وہ جمائی لے کر بیزاری سے بولیں۔

''چار دن میں ہی تھک گئیں آپ تو..... دو ہی مہمان تو ہیں صرف..... اور مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اب وہ تیسرا بھی تو آگیا..... جمی بی بی کا بیٹا ہمایوں، پرسوں ہی تو آیا ہے۔ اس کے بعد سے تو کچھ اور بھی ہلچل مچی ہے، ایک آرہا ہے، ایک جارہا ہے۔ کچن کا کام بھی ڈبل ہوگیا۔ اب میری بوڑھی ہڈیاں اس قابل تھوڑی ہیں کہ برداشت سے بڑھ کر کام کروں۔'' صغریٰ بوا اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگیں اور یوسف ان کی بات سنے بغیر ہی ہمایوں کے نام پر اٹک گیا۔

''ہمایوں..... کون.....؟'' سب کچھ سن کر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''ارے ہوش کہاں ہیں تمہارے..... وہی تو بتا رہی ہوں کہ جمی بی بی کا لڑکا آیا ہے باہر سے۔'' تھکن سے اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے صغریٰ بوا جھنجلا کر بولیں۔

''لینے آیا ہے ماں، بہن کو تو بس اب وہ مہمانداریاں چل رہی ہیں۔'' وہ ازخود ہی بولے گئیں۔

''بہت بری ہے انمول..... مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔'' اسے افسوس ہوا۔

گھر واپس جا کر موبائل کھولا تو انمول کا میسج آیا ہوا تھا۔

''کل آجانا..... کسی سے ملوانا ہے تم کو..... سرپرائز ہے.....'' اس نے دو تین دفعہ میسج پڑھا۔

''اونہہ سرپرائز..... اب ہوش آیا ہے مجھے

بتانے کا.....'' وہ اس سے ناراض ہو چکا تھا۔ اس نے انمول کو کوئی بھی جوابی میسج نہ دیا۔

صبح اٹھا تو اس کے دو تین میسج اور آئے ہوئے تھے۔

''رپلائی می.....''

''کہاں ہو..... بزی ہو کیا؟''

اس نے دونوں میسج پڑھ لیے مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی اس کا جانے کا کوئی ارادہ تھا مگر پھر وقار صاحب نے فون کر کے بطورِ خاص رات کے کھانے پر بلایا تو منع نہ کر سکا۔

ہمایوں کے اعزاز میں ایک شاندار سے ڈنر کا انتظام کیا گیا تھا جس میں بطورِ خاص وقار صاحب نے یوسف کو بھی بلایا تھا۔

''ان سے ملو بھئی، یہ زیب کے بھانجے ہمایوں ہیں، کینیڈا سے آئے ہیں۔'' وقار صاحب نے بطورِ خاص تعارف کرایا۔

اسے سامنے بیٹھے شاندار شخصیت کے مالک گورے چٹے ہمایوں سے بلاوجہ ہی حسد محسوس ہوا۔ تعارف کا یہ مرحلہ اس نے سرسری طور پر ہی لیا وہ صرف اور صرف انمول کو ڈھونڈ رہا تھا جو وہاں کہیں بھی نہیں تھی۔ اسے انمول کا یہ گریز کھٹکنے لگا..... وہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ اس نے سامنے بیٹھے ہمایوں کو کئی بار نظروں میں تولا۔ بے حد عمدہ ڈیزائنر وئیر کے عوامی سوٹ میں وہ بہت پُرکشش لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر موجود گھڑی اپنی مالیت کا پتا دے رہی تھی۔ دل میں کہیں خطرے کی گھنٹی سی بجی۔

''کہیں..... انمول کی لاتعلقی کی وجہ..... یہ شخص تو نہیں.....'' کئی خدشوں نے کوڑیالے سانپ کی طرح اسے کئی ڈنک مارے۔ فشارِ خون اچانک بلند ہوا اور چہرہ تپنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ انمول سامنے آجائے اور وہ اسے جھنجوڑ ڈالے..... اسی بے چینی میں وہ رہ نہ سکا اور غیر محسوس طریقے سے لاؤنج کے دروازے سے جھانکنے لگا۔ اسے صغریٰ بوا کی جھلک نظر آئی تو ذہن نے فوراً ہی کام کیا۔ وہ تیر کی طرح ان کی طرف بڑھا۔

''سلام صغریٰ بوا..... اور کچھ کام وغیرہ تو نہیں ہے مجھ سے؟'' کچن کے دوراہے پر استادہ صغریٰ بوا کے پاس کھڑے ہو کر اس نے پوچھا۔ مگر نظریں کچن کے اندر کھڑی انمول پر رہی تھیں۔ وہ مخاطب تو صغریٰ بوا سے تھا مگر دھیان انمول میں اٹکا ہوا تھا۔

''نہیں بیٹا..... کیا کام ہوگا..... بس تم ایسا کرو کہ ایمل کو میرے پاس بھیجتے جاؤ۔'' صغریٰ بوا نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا، آنٹی آپ کو بلا رہی ہیں۔'' انہیں نہ ٹلتے دیکھ کر اسے بروقت بہانہ سوجھ گیا۔

صغریٰ بوا فوراً اندر کی طرف لپکیں اور اگلے ہی پل وہ کچن کے اندر تھا انمول کے پاس مگر اسے حیرانی ہوئی کہ اسے دیکھ کر انمول نے رخ پھیر لیا۔ اس کے اس عمل سے اسے بے حد تکلیف ہوئی۔

''تو کیا وہ جو سمجھ رہا ہے وہ سچ ہے؟ انمول بدل گئی؟ انمول اس سے راہِ فرار کیوں اختیار کر رہی ہے۔'' کئی سوچیں اس کے اندر کلبلانے لگیں۔

''انمول..... یہ سب کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں وحشت بھی تھی اور اوہام بھی.....

''تم جاؤ پلیز ابھی یہاں سے...'' وہ بدستور رخ موڑے رہی۔

اس کا یہ نیا انداز اور بے گانگی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

''تمہیں بتانا ہی پڑے گا مجھے..... آخر تم کیا چاہتی ہوں۔'' وہ آواز دبا کر غرا کر بولا۔ اور جارحانہ طریقے سے اس کا بازو تھام کر اسے بہ زور اپنی طرف موڑ لیا۔ مگر پھر اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ اس کی جگہ حیرانی و پریشانی نے لے لی۔

''انمول..... کیا ہوا؟'' بے قراری اس کے لہجے میں عیاں تھی۔

انمول کے سوجے پپوٹے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ روتی رہی ہے۔

''ان..... موول.....'' اس نے کوئی جواب نہ دیا

تو اس نے دوبارہ پوچھا۔

''سب کچھ بگڑ گیا یوسف..... خالہ نے ہمایوں کا رشتہ دیا ہے میرے لیے۔'' اس کی آواز شدتِ غم سے لرزسی گئی۔

اس وقت یوسف کو لگا کہ جیسے آس پاس دھما کے سے ہو رہے ہوں۔ یہ اس کے جذبوں، شدتوں کا تصادم تھا جس نے وقتی طور پر اس کی قوتِ سماعت میں ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔

''کل سے تم کو میسج کر رہی ہوں مگر تم ریپلائی نہیں کر رہے تھے۔'' اس کیانداز میں شکوہ تھا۔

ایمل اور وفا کی تیز آواز اور آہٹوں پر وہ کچھ چوکنا سا ہو کر دروازے کی طرف آ کھڑا ہوا۔

''ارے یوسف بھائی آپ یہاں.....؟ کیا کھانا وانا پکانا ہے آپ کو۔'' ایمل کھلکھلا کر بولی۔

''ہم..... بہت زبان لگ گئی ہے تمہیں..... مجھے تو بابا نے بھیجا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ کھانا تیار ہے یا نہیں.....'' اس نے بدذقت مسکرا کر جواب دیا۔ مگر اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور لہجہ بھی چغلی کھا رہا تھا۔

''آہا..... تو انمول آپی یہاں ہیں آپ..... ارے سچ آج میری خاص تعریف کے بعد ہمایوں بھائی نے خاص طور پر آپ کے ہاتھ کے اسپیشل کی فرمائش کی ہے۔'' وفا چہک کر بولی۔

یوسف کو لگا وفا نے اس کے دل پر پیر رکھ کر اس کی خوشیوں کو کچل سا دیا اس کے لہجے میں مان تھا۔ ناز بھرا استحقاق تھا..... ہمایوں کے حوالے سے وہ کس قدر بے ساختگی سے اپنائیت کا اظہار کر گئی تھی اس پل یوسف کی پوری ذات ہل سی گئی تھی۔ اسے اپنے قدموں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ نہ جانے وہ کس طرح ضبط کیے پارٹی میں شریک رہا مگر تمام وقت ہمایوں کو سامنے دیکھ کر اس کا پارہ چڑھتا رہا۔ اس کا بس چلتا تو جادو کی چھڑی گھما کر اس کو غائب کر دیتا مگر یہ کوئی ہیری پوٹر کی کہانی نہیں تھی، یہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت تھی اور بے حد سنگین تھی۔

''یہ کیا مسئلہ ہے آخر.....؟ ہمایوں بیچ میں کہاں سے آ گیا؟'' اس نے وہیں بیٹھے، بیٹھے انمول کو میسج کیا۔

انمول نے میسج پڑھ کر دور سے ہی اسے دیکھا اس کی نظروں میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ یوسف کے اپنے چہرے پر راکھ سی اڑ رہی تھی اور ہمایوں ہشاش بشاش سا ہنستا مسکراتا دونوں کو ہی زہر لگ رہا تھا۔

''کچھ کرو یوسف..... میں دو دن سے سخت عذاب میں مبتلا ہوں..... دن کو چین اور نہ رات کو.....'' اس نے فوراً ہی جواب بھیجا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں..... یہ معاملہ تم خود ختم کرو..... صاف انکار کر دو.....'' اس نے قطعی طور پر سارا بوجھ اس کے کاندھے پر لا دیا۔

انمول نے غصے سے اسے دیکھا۔ اس کی گلابی آنکھوں سے لپکتے شعلوں سے یوسف کو اپنا آپ جھلستا محسوس ہوا۔

''پھر تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟ اس مشکل سے نکلنے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے مجھے..... تم اپنی اماں کو رشتہ لے کر فوراً بھیجو.....'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے یوسف کی طرف نہیں دیکھا، یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا۔

یوسف نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ابھی تو اس نے اماں سے سرسری سا بھی ذکر نہیں کیا تھا اور پھر حامد ماموں کی سپورٹ ملنا بھی ناممکن تھی کیونکہ انہوں نے شروع میں ہی اسے باور کرا دیا تھا کہ پہلے اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، یہ اس کا ایک کمزور پہلو تھا۔

''اماں سے بات کرنے میں ٹائم لگے گا۔ مجھے گاؤں جانا پڑے گا تم ابھی تو اس طوفان کو روکو کسی طرح.....'' اس نے دوبارہ میسج لکھ کر بھیج دیا۔ مگر انمول نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اس نے اپنا موبائل آف کر دیا تھا اور اس کا میسج پڑھا ہی نہیں تھا۔

وہ دن اور اس سے اگلا دن وہ پوری رات اس نے کانٹوں بھرے بستر پر گزاری۔ اندر ہی اندر

جلتے کھولتے..... انگاروں پر لوٹتے وہ بخار کی شدت میں جلنے لگا۔

''اُف لڑکے..... یہ کیسا بخار تھا۔ چار سو ڈگری..... میرے تو ہوش اڑ گئے۔'' مہر آنٹی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ دو دن وہ بخار میں بے سدھ غشی کے عالم میں رہا۔

''شکر ہے کہ تم ٹھیک ہوگئے..... ورنہ آج کر کری ہو جاتی ہماری..... اچھی بھلی دعوت کینسل کرنی پڑتی۔'' شمع جی بھی کہیں پاس سے ہی بولیں۔

اس نے چونک کر اس طرف دیکھا، وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھیں۔ ان کی بات پر اس کی رنگت زردی پڑ گئی۔

''دعوت..... کیسی دعوت.....؟'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''ارے بھئی منگنی کی اور کس کی..... تمہاری بھی دعوت ہے مگر میرا خیال ہے کہ ابھی تم آرام کرو بہت کمزوری ہوگئی ہے تمہیں۔ شکل دیکھو پیلی ٹھیک ہو رہی ہے۔'' مہر آنٹی کے لہجے میں شفقت تھی مگر انجانے میں وہ اس کے دل پر وار کر رہی تھیں۔

''کس کی منگنی..... کہاں جانا ہے؟'' وحشت سے اس کا عجیب عالم ہوگیا۔ دھڑکتے دل اور تیز تنفس کو قابو کرنا مشکل ہوگیا۔ اس نے تیزی سے اٹھنا چاہا مگر نقاہت اور چکروں سے ڈھے گیا۔

''آرام سے..... آرام سے..... کیا ہوگیا کیوں پریشان ہو رہے ہو..... کہیں دور تھوڑی جانا ہے برابر میں ہی تو جانا ہے۔'' مہر آنٹی نے اس کا بازو تھام کر اسے دوبارہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹنے پر مجبور کر دیا۔

''ب..... برا..... بر میں..... آہ.....'' سر میں تیز ٹیس اٹھی اور دل ڈوبنے لگا۔

''ارے..... لڑکے کیا ہوا..... شمع جلدی سے پانی لاؤ..... کیا ہوگیا اس کو.....'' مہر آنٹی نے گھبرا کر اس کے ساتھ، ساتھ شمع کو بھی آوازیں دیں۔

''یوسف کیا ہو رہا ہے؟'' مہر آنٹی نے گال تھپتھپائے۔

''اٹھو..... وہاں چلو کھڑکی کے پاس..... تازہ ہوا آ رہی ہے وہاں سے..... زیب آنٹی کے گھر کے لان میں بڑی اچھی سجاوٹ کی گئی ہے منگنی کی۔ تم بھی دیکھو.....'' شمع جی زبردستی کھینچتی اٹھنے پر مجبور کر گئیں۔

اس نے چندھی آنکھوں سے برابر کے گھر پر نظر ڈالی۔ تمام فینسی لائٹیں کھول دی گئی تھیں۔ خوب صورت کرسیاں اور جھالر والی میزیں سب طرف رکھی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر ایک برقی چراغ جل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''انمول..... انمول..... انمول.....'' دل دہائیاں دینے لگا۔ مگر انمول وہاں کہیں نظر نہیں آئی بلکہ اب وہ اس کی پہنچ سے کہیں بہت دور ہوگئی تھی۔ اجڑے کھنڈروں کی سی ویرانی اس کے چہرے پر برسنے لگی۔

اگر وہ مجھے خوش ہے بھول کر تو یوں ہی سہی
خدا کرے نہ میری یاد اس کو آئے کبھی

اس نے ٹوٹے دل کے ساتھ دل ہی دل میں شعر دُہرایا۔ اس کے ہاتھ سے بازی نکل چکی تھی۔ دو دن کی غفلت میں وہ جیتی ہوئی بازی ہار گیا۔ انمول اس آسانی سے اس کی زندگی سے نکل جائے گی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''لو..... یہ اسکواش پی لو..... شاید تمہارا بی پی لو ہو رہا ہے۔'' شمع جی نے اسے گلاس تھما دیا۔

اس نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اسے اپنے تمام جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

''اگر میں آج صبح خود آ کر نہ دیکھتی تو جانے کب تک پڑے رہتے بخار میں۔'' مہر آنٹی کیا بول رہی تھیں اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بس سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

''اگر تم ٹھیک محسوس نہیں کر رہے ہو تو میں نہیں جاتی منگنی میں۔'' مہر آنٹی نے نرمی سے کہا۔

''ہیں..... آپ چلی جائیں۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

اس وقت وہ بالکل اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ اکیلے بیٹھ

کر محبت کا ماتم کرنا چاہ رہا تھا۔

''تمہیں تو پسینے آرہے ہیں۔'' شمع جی نے بغور اس کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں..... اچھی بات ہے..... بخار اتر رہا ہے۔ اب تم کمبل لے کر لیٹ جاؤ۔ میں نے تمہارے لیے سوپ بنایا ہے۔ وہی پینا ہوگا اب رات کو.....'' مہر آنٹی نے اسے تاکید کی۔

''ہم..... میں اب لیٹ رہا ہوں۔'' وہ بستر پر دراز ہوگیا۔

''وقار انکل بہت برا مانیں گے تمہارے منگنی پر نہ آنے کا۔'' شمع جی کو اچانک خیال آیا۔

''ہاں تو وہ اس حالت میں نہیں جاسکتا ناں۔ تمہارے ابو خود معذرت کرلیں گے ان سے۔'' اس کے بجائے مہر آنٹی نے جواب دیا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ساکت لیٹا رہا جیسے اس کے تنِ مردہ میں جان نہ ہو۔ وہ چاہنے کے باوجود بہتے آنسوؤں کو روک نہیں پا رہا تھا۔ اسے شدید قسم کی گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور بے بسی کے عالم میں ہاتھ ملتے، ملتے اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں بال جکڑ لیے ایک ہلکی سی چیخ کے بعد اس نے جنونی سے انداز میں تکیے پر مکے مارنا شروع کردیے۔ نہ جانے وہ کب تک تکیے کو مارتا رہا پھر نیم جان ہوکر وہیں ڈھے گیا۔ آڑا ترچھا، اوندھا سیدھا..... اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر تک ایسے لیٹا رہا اسے کچھ علم نہیں تھا۔ باہر کہیں تیز انار چھوڑے گئے۔ اسے کھڑکی سے فضاؤں میں اڑتی رنگین چنگاریاں نظر آئیں۔ پٹاخوں کی تیز آوازوں کا شور بلند ہوا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی تک پہنچا۔ لان کا منظر واضح نظر آرہا تھا۔ سرخ مخملی صوفے پر کامدار غالیچے تلے سر جھکائے وہ بے وفا بیٹھی تھی اور اس کے برابر میں ہی ہمایوں بیٹھا نہ جانے کیا سرگوشی کررہا تھا اس سے۔

''اُف.....'' اس نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔

''تو کیا میری محبت اتنی کمزور تھی..... انمول نے میرے لیے ذرا بھی کوشش نہ کی۔'' وہ زیرِلب بڑبڑایا۔

''تم خود بزدل ہو..... بزدلوں، بیماروں کی طرح ایک طرف پڑ گئے اور سارا بوجھ اس نازک لڑکی کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ تمہارے اندر جرأت نہیں ہے۔'' ضمیر نے اسے لتاڑا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر گہری، گہری سانس بھرنے لگا۔ قصور وار تو وہ خود ہی تھا کہ ناموافق حالات دیکھ کر خود ہی پتوار چھوڑ دیے۔

''ایسی بھی کیا نزاکت..... مجھے حالات سے مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔'' اس نے خود کو ہی ملامت کی۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا..... منگنی ایک کمزور رشتہ ہے..... ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتا ہے۔'' اس کے دل نے نیا راستہ دکھایا۔

''ہاں..... ہاں..... ایسا ہوسکتا ہے۔'' اس نے فوراً دل کی بات کی تائید کی۔ اسی وقت موبائل پر میسج آیا..... اس نے چونک کر دیکھا۔ دو دن سے موبائل کا بھی پتا نہیں تھا۔ اسے تو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ موبائل اس نے کہاں رکھا ہے۔ ایک ننھی سی آس نے اس کے اندر توانائی سی بھر دی تھی۔ اس نے تکیے کے نیچے موبائل تلاش کیا۔ اپنی قمیص کی جیب میں دیکھا..... سائڈ ٹیبل کی دراز میں بھی نہیں تھا۔ اب موبائل پر کال آرہی تھی۔ اس نے آواز کی سمت میں ڈھونڈا۔ موبائل بیڈ کے نیچے پڑا تھا۔ وہاں کیسے گیا اسے معلوم نہیں تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا تو کال بند ہوچکی تھی۔ اس نے میسج کھولا۔

''منگنی میں کیوں نہیں آئے؟'' انمول کا میسج تھا۔

''اُف.....'' اس نے کرب سے ہونٹ کچلے۔

''یہ بے وفا لڑکی..... کیسی جرأت ہے اس میں کہ مجھ سے ہی پوچھ رہی ہے۔'' اسے شدید غصہ آیا۔

اس نے دیکھا کہ دو دن میں اس کے کافی میسجز آئے ہوئے تھے۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''یوسف فوراً مجھ سے ملو۔''

''جواب دو یوسف۔''

''کہاں ہوتم......؟''
''یوسف تمہاری خاموشی کا کیا مطلب ہے آخر؟''
''یوسف کیا تم نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا؟''
''یوسف، مجھ سے رابطہ کرو......فوراً۔''
''پلیز......سیریس بات ہے......''

اور ایسے ہی مزید کئی میسجز اور بھی تھے جنہیں وہ اب پڑھ رہا تھا۔

''آہ......'' ایک گہری سانس اس کے وجود سے خارج ہوئی۔

دو دن کے بخار اور مدہوشی میں سب کچھ بدل گیا تھا۔

''اسی لیے اب وہ مجھے چڑا رہی ہے......میں کیا کروں اب......مجھے معاف کر دو انمول......مگر میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں......یہ منگنی ختم بھی ہو سکتی ہے۔ٹوٹ بھی سکتی ہے......صرف تم کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' وہ انمول سے مخاطب تھا اور اپنے ٹوٹے دل کو ڈھارس دے رہا تھا۔

''منگنی کر کے مجھے چڑا رہی ہو؟ ایک تو منگنی کر لی اور اب معصوم بن کر مجھ پر نیر برسا رہی ہو؟ دو دن سے بخار میں بے سدھ ہوں۔خبر بھی نہ لی میری اور خود منگنی رچا کر بیٹھ گئیں۔ کیا اتنی کمزور تھی ہماری محبت......؟'' فون پر بات کرنے کی تو ہمت نہیں تھی۔ اس نے ایک لمبا چوڑا شکوے شکایات سے بھرپور میسج اسے بھیج دیا۔ اس نے جان بوجھ کر اس پر غصہ ظاہر کیا تھا کہیں وہ یہ سمجھے کہ وہ بزدلوں کی طرح پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انمول تڑپ کر فوراً اس کو فون کرے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انمول نے پُر اسرار سی چپ سادھ لی۔ چند منٹ کے کوفت بھرے انتظار کے بعد اس نے پھر میسج بھیجا۔

''ابھی کچھ نہیں بگڑا انمول......منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔تم فکر نہیں کرو......میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا......''اس نے تسلی بھرا میسج بھیجا۔

انمول کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''انمول......؟''اس نے پھر میسج بھیجا۔

لمبی، لمبی مسڈ کالز دیں......اس دوران اس کا دل بے طرح دھڑکتا رہا۔

''اب بہت دیر ہو چکی۔'' کافی دیر بعد انمول نے سنگدلی کی انتہا کرتے ہوئے ایک مختصر سا میسج بھیج دیا۔

اور وہ کتنی دیر پتھرائی نظروں سے وہ میسج پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میسج انمول نے بھیجا ہے۔

اسے اس بات پر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ انمول کسی اور کی ہو گئی ہے۔ قیامت کیا ہوتی ہے اسے اب معلوم ہوا......مگر اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ قیامت گزرنے کے باوجود وہ صحیح و سالم بیٹھا تھا اور سانس لے رہا تھا لیکن اسے خود اپنی سانسوں کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جسم و روح میں جان نہ رہی اور شل وجود کسی مردے کی طرح بے حرکت ہو گیا۔

اسے کمرے میں گھٹن ہونے لگی۔ گھبراہٹ حد سے سوا ہوئی تو وہ باہر چلا آیا۔ ٹیرس سے برابر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی ہلچل ختم ہو چکی تھی۔ اسٹیج خالی تھا، مہمان جا چکے تھے۔ اب ملازم پھیلاوا سمیٹنے میں مصروف تھے۔ اس کے پیچھے ماموں کب آ کر کھڑے ہوئے اسے معلوم ہی نہ ہوا بلکہ اسے تو یہی پتا نہ چل سکا کہ وہ لوگ کب واپس آئے تھے۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟ مہر بتا رہی تھی کہ بے حد تیز بخار ہو رہا تھا تم کو؟'' ماموں حامد نے اپنائیت سے پوچھا۔

''ارے تم یہاں اٹھ کر کیوں آ گئے؟ پہلے ہی بیمار ہو کر ڈرا دیا مجھ کو......آپا جی کو کیا جواب دوں گی میں؟'' مہر بھی بولتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئیں۔

''کچھ نہیں......وہ بس ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔'' وہ بمشکل بول پایا۔

''اُف......دیکھو تو کتنے پسینے آ رہے ہیں تمہیں......ساری شرٹ بھیگ رہی ہے تمہاری اور تم ہوا میں کھڑے ہو گئے آ کر......پھر ہو جائے گا بخار تم کو......اندر چلو فوراً دو ہی دن میں اتنی سی شکل نکل

آئی۔'' انہوں نے ڈپٹتے ہوئے اس کا بازو تھام کر زبردستی اندر چلنے پر مجبور کردیا۔

''جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ..... تمہارا حصہ بھی بھجوایا ہے وقار صاحب نے..... بہت افسوس ہورہا تھا انہیں تمہارے نہ آنے پر.....'' حامد ماموں نے انجانے میں کچوکا سا دیا۔ وہ ان دونوں کی باتوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

''کیسی سفید رنگت ہورہی ہے تمہاری.....؟ کچھ کھایا پیا نہیں؟'' مہر آنٹی نے اسے بیڈ پر بٹھا کر تشویش سے پوچھا۔

''مجھے پتا تھا یہ خود سے کچھ نہیں کریں گے جناب..... اسی لیے آتے ہی سوپ گرم کیا ہے۔'' شمع بھی اس کی خیریت معلوم کرنے عذر لنگ کے باوجود آگئیں۔

''ٹھیک ہے میں لے کر آتی ہوں سوپ اوپر۔'' مہر جلدی سے نیچے چلی گئیں۔

''دو دن میں برسوں کے مریض لگ رہے ہو۔ اماں سے ملنے اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ آنے کے بعد گود کے بچوں کی طرح ہڑکا کرو۔'' شمع جی نے اپنائیت بھری ڈانٹ پلائی۔ وہ منہ بسورے، بیزاری سے بیٹھا رہا۔ اسے ان سب کا وجود برا لگ رہا تھا۔ وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔

''اُف توبہ..... ایسی بھی کیا آفت آگئی تم پر..... اب ٹھیک ہوجاؤ جلدی سے۔'' اس کی خاموشی کو محسوس کرکے شمع نے دوبارہ اسے ٹوکا۔

''یوسف بیٹا..... آر یو او کے..... کہو تو ڈاکٹر کو بلالوں۔'' ماموں حامد نے شانہ تھپکا اس کا دل تو پہلے ہی بھرا ہوا تھا کچھ اور بھی دقیق ہوگیا..... وہ اپنی محبت سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ وہ تہی داماں رہ گیا تھا۔ کسی لٹے ہوئے ہارے ہوئے موالی جواری کی طرح محبت کا زخم کھا کر شکست خوردہ سا بیٹھا تھا اور اس کے شکستہ وجود کو تھامنے والے بہت سے ہاتھ محبت سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جو محبت اسے مطلوب تھی وہ چھن گئی تھی اور جس طرف اس کا خیال بھی نہ تھا وہ لوگ اس پر جان نچھاور کررہے تھے۔ اسے آج معلوم ہوا کہ ماموں، ممانی اور شمع جی تینوں ہی اس کا خیال رکھنے والے اور اس کے چاہنے والے ہیں اور اس کو ٹھیک کرنے کے لیے شمع جیسی تند خو شخصیت آج اس سے کھل کر باتیں کررہی تھی۔

''سب کو تمہاری کمی بے حد محسوس ہوئی۔'' شمع نے اطلاع دی۔

''ہوں..... وقار صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ بھی خیریت پوچھنے آئیں گے۔'' ماموں حامد وہیں بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئے تھے۔

شمع بھی سنگل صوفے پر آرام سے بیٹھی تھی۔ اس نے واپس آکر کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے وہ اسی طرح تیار فینسی کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔

''میرے حساب سے تو بڑی اچھی تقریب رہی۔ انتظام بھی کافی اچھا کیا تھا۔'' مہر سوپ کا پیالہ چھوٹی ٹرے میں رکھے چلی آئیں۔ اس کے برابر میں بیٹھ کر زبردستی اپنے ہاتھوں سے اسے سوپ پلانے لگیں۔ انہوں نے انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی سوپ پینا پڑا۔ اور ان سب کی باتوں کو بھی سننا پڑا۔

''سب سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی انمول..... مجھے تو اس کا ڈریس بہت ہی پسند آیا۔'' اگلے پل شمع نے نادانستگی میں اس کے زخم پر نمک چھڑک دیا۔

اس کے گلے میں سوپ کا پھندا سا لگ گیا اور وہ کھانسی کی شدت سے نڈھال ہوگیا۔

''ارے، خیال سے..... دھیان سے ذرا.....'' مہر نے کمر تھپکی۔

''نہیں جی چاہ رہا تو مت پیو..... دودھ کا ایک گلاس دے دو بس کافی ہے۔ صبح میرے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلنا۔'' ماموں حامد نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے فوراً ہی فیصلہ کیا تھا اور مہر کو تاکید کی۔

وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہ تھا بس نڈھال سا تکیے پر سر رکھ کر ڈھے گیا۔

(باقی آئندہ)

فوجن آپا

فہمی فردوس

فوجن آپا کی سوکھی چرخ لکڑیوں جیسی ٹانگوں کو دباتے، دباتے میرے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ مگر ان کی تھکاوٹ تھی کہ اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''توبہ! آپا سوتے میں کتنی ڈراؤنی دکھائی دیتی ہیں۔'' میری بیزار سی نظر بے ساختہ آپا کے جھریوں بھرے سوکھے سڑے چہرے پر جا پڑی۔ وہاں سے پھسلی تو کھچڑی رنگ بالوں میں جا اٹکی۔ ویسے تو ستر سالہ آپا کے سر کے تمام بال کب کے سفید ہو چکے تھے۔ مگر وہ سستے اور لوکل ڈارک بلیک کلر سے اس سفیدی کو چھپائے رکھتی تھیں اور جھریوں بھرے عمر رسیدہ چہرے پر گہری سیاہ رنگت کے بال بالکل مصنوعی تاثر دیتے تھے۔

بالوں سے نظر ہٹی تو بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے شیشے کے گلاس میں پڑی ہوئی ان کی مصنوعی بتیسی پر پڑی، جو شاید میری طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

بتیسی سے ہوتی ہوئی نظر پھر سے واپس اُن کے دانتوں سے عاری پوپلے ادھ کھلے منہ پر آ ٹھہری۔

ٹانگوں کے نام پر ان سوکھی لکڑیوں کو دباتے، دباتے نہ جانے کب اونگھ آ گئی۔ جونہی میرے ہاتھوں کی اسپیڈ میں کچھ فرق پڑا۔ فوجن آپا کی لال ڈراؤنی

بڑی، بڑی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ پہلے گردن اٹھا کر انہوں نے میری غفلت ملاحظہ کی پھر اپنی ایک سوکھی لکڑی (ٹانگ) اٹھائی اور میرے پہلو میں دے ماری۔

پسلیوں پر اس استخوانی پاؤں کی چبھن، کسی نیزے کی انی سے بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہوئی۔

ہڑبڑا کر آپا کی طرف دیکھنے لگی۔

''اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟ ٹھیک سے ٹانگیں دباؤ۔'' یہ کہہ کر آپا پھر سے کسی مرے ہوئے اژدھے کی طرح بے حس و حرکت لیٹ گئیں۔

''مگر آپا! میں تھک چکی ہوں۔'' میں نے صدائے احتجاج بلند کی۔

''ناں میں پوچھتی ہوں ایسی کون سی مشقت کر ڈالی تم نے کہ جس نے تمہیں تھکا دیا۔ کیا چکی چلاتی رہی ہو؟'' فوجن آپا پھنکاریں تو جی میں آیا کہ صاف کہہ دوں کہ چکی چلانا ان سوکھی لکڑیوں کو دبانے سے نسبتاً آسان ہے۔

مگر پھر مزید کسی ''ووڈن وار'' کے ڈر سے چپ ہو رہی۔

بالآخر جب آپا کی نحیف و نزار ٹانگیں اس زبردستی کی خدمت پر احتجاج کرنے لگیں تو آپا نے ایک شان بے نیازی سے مجھے ''رک جانے'' کا اشارہ کیا۔

اور میں نے اس بیگار سے چھٹکارا پانے پر سکون کی سانس لی اور بیڈ کے اس حصے پر لم لیٹ ہو گئی، جو میرے سونے کے لیے مختص تھا۔

☆☆☆

میں ننھی ہوں۔ دیکھنے میں بے شک اب ننھی نہیں رہی۔ پندرہ سال کی الھڑ دوشیزہ کا روپ دھار چکی ہوں مگر میرا نام ننھی ہے بلکہ میرا اصل نام تو ''ثمین'' ہے۔ جو صرف اسکول کے ریکارڈ تک زندہ و موجود ہے۔ ورنہ تو جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ ننھی کے نام سے پکاری جاتی رہی ہوں۔

میں اپنی نانی کے پاس رہتی ہوں۔ جنہیں مجھ سمیت سارا زمانہ ''فوجن آپا'' کے نام سے پکارتا ہے۔

فوجن آپا کے فوجن ہونے میں ان کا اپنا کوئی ہاتھ یا کردار نہیں۔ چونکہ میرے نانا مرحوم فوج میں ملازمت کرتے تھے۔ اور ہمارے ''دیسی پس منظر'' کے لحاظ سے فوجی کی بیوی فوجن کہلاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح..... جیسے ٹھیکیدار کی بیوی ٹھیکیدارنی اور نمبردار کی بیوی نمبردارنی کہلاتی ہے۔ مگر آپا کے آپا کہلوانے میں سراسر آپا کا اپنا ہاتھ اور محنت پوشیدہ ہے۔

آپا کو بڑھاپے سے سخت چڑ تھی۔ (یہ الگ بات کہ وہ کمبخت آ کر ہی رہا۔)

اماں، آنٹی، خالہ، ماسی جیسے الفاظ سے تو آپا کی ابھی تک جان جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے اپنے بچوں نے اپنے چچاؤں اور ماموؤں کی طرف دیکھتے ہوئے آپا کو اماں کے بجائے آپا کہنا شروع کیا تو آپا نے سکھ کی سانس لی۔

انہوں نے کبھی بھی اپنی اولاد کو اس بات پر ٹوکنے کی کوشش نہیں کی کہ مجھے امی یا اماں کہہ کر پکارا جائے۔

فوجن آپا رشتے میں میری نانی ہیں۔ یعنی میری سگی نانی کی سگی بہن۔

شومئی قسمت کہ ہوش سنبھالنے کے بعد فوجن آپا کو ہی اپنے سرپرست کے روپ میں دیکھا۔ ایک ایسا سرپرست، جو گارڈین کم اور جیلر زیادہ لگتا ہے۔

ان کی ذات میرے لیے کسی بھوت سے کم ہرگز نہیں۔ ''کہاں جا رہی ہو؟ یہ مت کھاؤ، ایسے مت کھاؤ۔ کھاتے وقت منہ سے چپڑ، چپڑ کی آوازیں مت نکالو۔ اب سو جاؤ، سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور صبح فجر کے وقت جگا دینا.....'' وغیرہ، وغیرہ۔ فوجن آپا کا عفریت مجھے خوابوں میں بھی اکثر ڈراتا رہتا ہے۔

اس قدر جابرانہ اور سفاکانہ رویے کے باوجود بھی وہ مجھے بری نہیں لگتیں۔ کیونکہ ان کے علاوہ میرا اس دنیا میں کوئی قریبی عزیز نہیں۔

اگر وہ مجھے ڈانٹتی ہیں، ٹوکتی ہیں، روک ٹوک کرتی ہیں... تو یقیناً اس کے پیچھے بھی میری بھلائی مدِنظر ہو گی۔

نانی یعنی فوجن آپا کے تین بیٹے ہیں۔ بیٹی کوئی نہیں۔ تینوں بیٹے ماں سے بہت دب کر رہتے ہیں۔ نانا یعنی فوجن آپا کے شوہر میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی پرلوک سدھار چکے تھے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ نانا یقیناً ایک بہت اچھے انسان رہے ہوں گے۔ کیونکہ ہمیشہ فوجن آپا کے منہ سے نانا کی تعریفیں ہی سنی ہیں۔ وہ نانا کی شان میں تعریفوں کے ایسے پل باندھتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جبکہ کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ وہ ایک زن مرید شوہر اور عام سے مریل قسم کے فوجی تھے۔

آن ڈیوٹی افسران بالا کی جھڑکیاں کھاتے رہتے تھے اور جب گھر آتے تو فوجن آپا کے عتاب کا نشانہ بنے رہتے۔ اسی کسمپرسی اور گھور غلامی میں عمر بتا کر چلتے بنے۔

نانا کے گزرنے کے بعد فوجن آپا کو ان کی پینشن ملتی رہی۔

آبائی گاؤں سے، پٹے پر جو زمین دی ہوئی تھی اس سے بھی کچھ نہ کچھ آجاتا تھا۔ سو آپا کے مالی حالات تسلی بخش ہی رہے۔

تینوں ماموں کی ٹھیک ٹھاک پرورش کی۔ بڑے ماموں کو کریانے کی ایک دکان کھول دی۔ بڑے ماموں اپنے باپ کی طرح بہت شریف النفس اور دبو قسم کے تھے۔ آپا نے ان کے برسرروزگار ہونے کے بعد ان کے سر پر سہرا سجایا۔ اور بڑی ممانی بیاہ کر آپا کے آنگن میں آاتریں۔

پھولوں جیسا حسن اور نزاکت رکھنے والی بڑی ممانی، فوجن آپا کا جاہ وجلال سہار نہ سکیں۔ جلد ہی مرجھا کر رہ گئیں۔

بڑی ممانی کو فوجن آپا بے شک بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائیں تھیں۔ مگر آپا کے زیر عتاب آنے کے بعد ریت کی دیوار ثابت ہوئیں۔

آپا کا جب جی چاہتا۔ معمولی، معمولی باتوں پر چمچہ، گھرچا، کفگیر کچھ بھی اٹھاتیں اور انہیں دھنک کر رکھ دیتیں۔ ماموں چاہے جتنے بھی دبو اور ماں کے فرمانبردار تھے۔ بیوی کی ماں کے ہاتھوں یہ درگت برداشت نہ کر پائے۔ آئے روز کی چخ، چخ سے تنگ آکر انہوں نے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

جونہی ماموں نے الگ ہونے کا نام لیا۔ آپا نے پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔ ماموں کو سامنے بٹھا کر اپنی بیوگی بھری قربانیاں جتلا کر، ان کی غیرت اور جوشِ ایمانی کو جگانے کی بھرپور کوشش کر ڈالی۔

مگر ماموں ممانی کی محبت میں اندھے دل کڑا کر کے سنتے رہے۔ اور ماں کے اتنا واویلا کرنے کے باوجود اوپر والے پورشن میں دو کمرے مزید کھڑے کر لیے اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اوپر چلے گئے۔

اب فوجن آپا کو کوسنے دینے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے پھر سے کوئی تازہ دم وجود درکار تھا۔

تب انہوں نے منجھلے ماموں کی شادی کا فیصلہ کر لیا اور ان کے لیے زور شور سے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

اور آخر کار نظرِ انتخاب ''فائزہ'' پر جا ٹھہری۔

حالانکہ منجھلے ماموں ابھی شادی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تازہ، تازہ ملی ہوئی سرکاری نوکری سے اچھی طرح لطف اندوز ہونا چاہتے تھے مگر ماں نے رضامند کر کے ہی چھوڑا۔

☆☆☆

مجھے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب منجھلے ماموں کی منگنی کرنے کے لیے ہم فائزہ ممانی کے گھر گئے تھے۔

آپا نے اس دن باریک شیفون کا آف وائٹ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس ہلکے رنگ کے باریک سوٹ میں ان کی سوکھی چمرخ ٹانگیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جھریوں بھرے چہرے پر جی بھر کے میک اپ تھوپ رکھا تھا۔ بالوں کو خضاب سے کالا کر رکھا تھا۔

فوجن آپا نے فائزہ ممانی کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہناتے ہوئے ان کی پیشانی چوم کر بہ آواز بلند یہ اعلان کیا تھا کہ فائزہ کا نام آج سے میں ''خوشبو'' رکھ رہی ہوں۔ ''یہ خوشبو میرے آنگن کو اپنی دلفریب مہک سے مہکا دے گی۔'' آپا کی یہ محبت اور وارفتگی دیکھ کر

فائزہ کے ماں باپ کا ڈھیروں خون بڑھ گیا تھا۔ ان کے چہرے بیٹی کی اس شاندار قسمت پر چمکنے لگے تھے۔

آپا کا یہ اعلان سن کر میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی بڑی ممانی زینت نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیا اور کان میں سرگوشی کی۔ ''جب بڑی بی نے مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی تو اس وقت میری پیشانی چوم کر میرا نام شبانہ سے بدل کر ''زینت'' رکھنے کا اعلان کیا تھا اور ساتھ فرمایا تھا۔ 'یہ میرے گھر کی زینت کو چار چاند لگا دے گی۔ میرے والدین بھی اسی طرح خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے۔ اور پھر کیا ہوا ساری صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ چھچوں سے آئے دن میری ایسی ٹھکائی کی کہ زینت گئی تیل لینے۔''

زینت ممانی کے ریمارکس سن کر میرے لیے اپنی ہنسی کو دبانا مشکل ہو گیا۔

اور پھر چند ماہ کے اندر، اندر ہی خوب صورت اور نازک اندام ''فائزہ'' دلہن بنی، اپنے نئے نام کے ساتھ منجھلے ماموں کے من مندر کو مہکانے آ گئی۔

خوشبو کی مہک سے ابھی پورا گھر مہکنے بھی نہ پایا تھا کہ آپا اپنی اوقات پر آ گئیں۔

انہوں نے اپنی کڑوی زبان سے زہریلے لفظوں کا کچھ ایسا اسپرے مارنا شروع کر دیا کہ خوشبو کی خوشبو کہیں اڑ سی گئی۔

بات، بات پر تنقید، تند، و ترش طعنے تشنے، جنہیں سن کر فائزہ عرف خوشبو کا چہرہ اتر سا جاتا اور میں ان کے خوب صورت اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی۔

نہ جانے دوسروں کے جذبات اور عزتِ نفس کو کچل کر فوجن آپا کے کس جذبے کو تسکین ملتی تھی۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آپا کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے بیٹیوں کے دکھ، درد اور جذبات کو سمجھنا ان کے بس کا نہیں تھا۔

آپا کی اپنی چونکہ کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے (اپنے فائدے کے لیے) ایک امیر گھر کی عورت کو اپنی منہ بولی بیٹی بنا رکھا تھا۔

اسے کب اور کیسے پھنسایا یہ ایک الگ داستان ہے۔

امتل آپی مزاجاً بہت اچھی خاتون تھیں۔ بہت نرم دل اور حساس طبیعت۔ مجھے ان کے خوب صورت چہرے پر ہر وقت کی رقص کرتی مہربان مسکراہٹ بہت پسند تھی۔

انہوں نے تین سال کی عمر میں اپنی ماں کو کھو دیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب فوجن آپا نے اپنا بیٹی نہ ہونے کا دکھ ان کے سامنے رویا تو وہ فٹ سے آپا کی منہ بولی بیٹی بننے کے لیے تیار ہو گئیں۔

آپا، امتل آپی سے مصنوعی لاڈ پیار جتا کر اب تک کافی کچھ اینٹھ چکی تھیں۔

ایک دو دفعہ میں بھی آپا کے ان کے گھر جا چکی تھی اور ان کے گھر جانا مجھے ہمیشہ سے بہت پسند رہا تھا۔ وہ بہت مہمان نواز اور عاجزانہ طبیعت کی مالک تھیں۔

فوجن آپا کو حقیقتاً اپنی ماں کا مرتبہ دے رکھا تھا۔

اب کی بار امتل آپی کے ہاں جانے کا موڈ بنا تو آپا مجھے بھی ساتھ لے گئیں۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں کے مصداق میں آپا کے ساتھ بخوشی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

آپا رکشے میں بیٹھنے سے پہلے ایک فروٹ کی دکان سے ایک درجن کیلے اور ایک درجن کینو لینا نا بھولیں۔ مگر اس فروٹ کا خریدنا باعثِ عزت نہیں بلکہ باعثِ شرمندگی تھا۔ کیلوں کا سائز آپا کی انگلیوں سے کچھ ہی بڑا تھا جبکہ کینو بڑے سائز کے لیموں کے برابر تھے۔

''آپا اگر فروٹ لینا ہی ہے تو کچھ اچھا ہی لے لیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''تم منہ بند ہی رکھا کرو۔ اونٹ کی طرح منہ اٹھا کے کچھ بھی بک دیتی ہو۔'' آپا نے مجھے رکشے میں دھکیلتے ہوئے اپنا من پسند فقرہ دُہرایا۔ جو وہ ایک دن میں پتا نہیں کتنی بار دُہراتی تھیں۔

''تمہیں کیا پتا! امتل بہت بڑے دل کی مالک ہے۔ میں جب بھی اس کے ہاں کچھ لے کر جاتی ہوں۔ زیرِ باری ہو جاتی ہے۔ اس نے آج تک کبھی مجھے جتلایا

نہیں کہ میری لائی ہوئی چیزیں اچھی نہیں ہیں۔'' رکشے کے ساتھ، ساتھ آپا کی زبان بھی رواں دواں تھی۔

''ہاں! لیکن..... اگر وہ نہیں جتلاتیں تو یہ ان کا بڑا پن ہے۔ آپ تو اپنی طرف سے اچھی چیز لے کر جایا کریں۔'' میں نے جل کر جواب دیا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ آپا کے ہر وقت کے کوسنوں نے مجھے بھی ڈھیٹ بنا دیا تھا۔ اب آپا کی گالیوں اور ملامتوں کا مجھ پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا تھا۔

امتل آپی کا گھر شہر کے ایک پوش ایریا میں تھا۔

رکشا ان کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے رکا۔

ہم دونوں نیچے اترے۔ تو آپا نے رکشے والے سے کرایے کی مد میں ایک لمبی چوڑی بحث کر کے پورے پچاس روپے چھڑوا لیے۔ پھر فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

''غور کرو ذرا..... اسے کہتے ہیں ذہانت اور معاملہ فہمی۔'' آپا نے فروٹ والا اسمارٹ سا شاپر مجھے تھمایا۔

اور خود گیٹ کی ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔

''امیر گھرانوں میں اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے جو طور طریقے تمہیں سکھائے تھے۔ یاد ہیں ناں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور آپا کے پڑھائے ہوئے سبق کو پھر سے ذہن میں ازبر کرنا شروع کر دیا۔

چوکیدار نے دروازہ کھولا۔

گھر کے اندر گئے۔ تو امتل آپی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی ڈراما دیکھ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بڑے پُرتپاک انداز میں ہم دونوں سے ملیں۔ میرے ہاتھ سے اماں نے فروٹ والا شاپر چھینا اور بڑے فخر سے امتل آپی کی طرف بڑھایا۔

''اماں! کیا کرتی ہیں؟ کیوں اتنا تکلف کرتی ہیں؟'' امتل آپی نے دلار سے کہا تو آپا جھوم اٹھیں۔

''جب تم اتنے پیار سے مجھے ''اماں'' کہتی ہو تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ اپنی سگی اولاد کے منہ سے تو یہ لفظ سننے کے لیے کان ترس گئے۔'' اماں نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں کو رگڑ کے لال کر لیا۔

امتل آپی پھر سے آپا سے لپٹ گئیں۔

''غم کیوں کرتی ہیں اماں! کیا میں اکیلی کافی نہیں اماں کہنے کے لیے؟'' انہوں نے آپا کے گال پر پیار کیا اور آپا نے مغموم سے چہرے کو مزید مغموم کر لیا۔

رات کے کھانے پر امتل آپی نے ہمارے لیے خاص اہتمام کیا۔ مٹن قورمے کے ساتھ چکن پلاؤ اور کھیر بھی پکالی۔

میں نے فوجن آپا کی نظروں سے ڈرتے ہوئے تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں نکالا۔

کھانا کھانے کے دوران آپا کی نگران نگاہیں بدستور میری پلیٹ پر جمی رہیں۔ ٹیبل پر ہمارے ساتھ امتل آپی کے علاوہ ان کے دو ننھے نیارے سے بچے بھی موجود تھے۔ جبکہ امتل آپی کے شوہر کاروباری ٹور پر ملک سے باہر تھے۔

میں نے پلیٹ میں رکھی بوٹی ہاتھ سے اٹھا کر منہ کی طرف کی تو آپا کی نگاہوں نے سرزنش کی۔

میں نے بوٹی کو واپس پلیٹ میں رکھا پھر کانٹے اور چھری کی مدد سے بوٹی کی تکہ بوٹی کرنے میں مصروف ہو گئی۔

مگر بوٹی تھی کہ چھری کانٹے سے ڈرتے ہوئے پوری پلیٹ میں بھاگنے لگی۔ میں نے لاچار ہو کر دونوں ہتھیار نیچے رکھ دیے۔ اور اماں کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

اسی اثنا میں امتل آپی کسی کام سے کچن میں گئیں تو اماں نے قہرناک نظروں سے مجھے گھورا اور بولیں۔

''اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہیں کتنی بار سمجھا چکی ہوں کہ ہائی کلاس سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے ادب آداب سیکھو۔ یہاں لوگ گوشت کی بوٹیوں کو ہاتھ میں اٹھا کر نہیں بلکہ انہیں چھری اور کانٹے کی مدد سے کاٹ کر کھاتے ہیں۔''

''مگر آپا! مجھے چھری کانٹے سے کھانا نہیں آتا۔'' میں نے رونی صورت بنائی۔

''تو سیکھو..... کب سیکھو گی؟ ڈنگر کہیں کی۔ اتنا

قد کاٹھ نکال لیا مگر عقل ابھی تک گھٹنوں سے باندھے پھر رہی ہو۔'' آپا دبی دبی آواز میں طعنے دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا اماں؟ کس بات پر بچی کو ڈانٹ رہی ہیں؟'' امتل آپی کی اچانک آمد پر آپا جز بز ہو کر بغلیں جھانکنے لگیں۔

''تم تو جانتی ہو بٹیا! کتنی نرم طبیعت ہے میری، میں تو غصے کی حالت میں بھی کسی کو ڈانٹ نہیں سکتی۔''

آپا کی اس بات پر آپی کے دونوں بچے مسکرانے لگے۔

آپا نے ان کی مسکراہٹ سے زچ ہو کر پلیٹ میں رکھی بوٹیوں پر غصہ نکالنا چاہا۔ ان پر چھری کانٹے کی مدد سے کچھ اس جارحانہ انداز میں حملہ کیا کہ ایک بوٹی نے سرکشی دکھاتے ہوئے پلیٹ سے چھلانگ لگا کر آپا کی گود میں جا پناہ لی۔ آپا کے سفید سوٹ کا ستیاناس ہو گیا۔

اور جو سب کے سامنے سُبکی ہوئی وہ الگ۔ آپا نے سٹپٹا کر امتل آپی کی طرف دیکھا۔

وہ نظریں جھکائے، اپنی پلیٹ میں دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔ وہ شاید اماں کو شرمسار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جبکہ ان کے دونوں بچے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

''نانی کو چھری کانٹے سے کھانا نہیں آتا۔'' ان بچوں کو تو جیسے آوازیں کسنے کی چھوٹ مل گئی۔

بڑی مشکلوں سے امتل آپی نے ان ننھے شیطانوں کو خاموش کروایا۔ مگر ان کی آنکھوں سے پھوٹتی شریر مسکراہٹوں نے آپا کو زچ کیے رکھا۔

رات کو سونے کے لیے امتل آپی ہمیں ایک بہترین آراستہ و پیراستہ بیڈ روم میں لے گئیں۔

ہم دونوں دس بارہ انچ کے موٹے اسپرنگ والے میٹرس پر بیٹھے تو جیسے اس کے اندر دھنس سے گئے۔

امتل آپی تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھی گپ شپ لگاتی رہیں پھر گڈ نائٹ کہہ کر باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی آپا نے لیکچر دینا شروع کر دیا۔

''اس بار دھیان سے سونا! یاد ہے ناں..... پچھلی بار تم بیڈ سے نیچے گر گئی تھیں۔ رات کو سوتے وقت گدھوں کی طرح پلسیٹے مت مارا کرو۔ سکون سے سویا کرو۔ تمہیں تو امیرانہ طریقے سے سونا بھی نہیں آتا۔ کل کو خدانخواستہ اگر تمہارا رشتہ کسی کھاتے پیتے گھرانے میں طے ہو گیا تو تمہارے لیے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''آپا فکر نہ کریں! آپ کے ہوتے ہوئے میرا رشتہ کسی اچھے گھر سے نہیں آ سکتا۔'' میں نے جل کر جواب دیا اور لیٹ گئی۔

اسپرنگوں والے گدے پر سونا بھی بہت مشکل کام تھا۔

کتنی ہی دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ خدا، خدا کر کے آنکھ لگ ہی گئی۔ سوتے میں اچانک کروٹ بدلی تو دھڑام سے فرش پر آ گری۔ ہڑبڑا کر جلدی سے اٹھی۔

کوشش یہی تھی کہ آپا کے خبر ہونے سے پہلے اپنی جگہ پر پہنچ جاؤں۔ دل میں دعائیں مانگ رہی تھی اللہ کرے آپا کو میری اس نامعقول حرکت کا پتا نہ چلے۔ مگر وہ قبولیت کی گھڑی نہ تھی۔ جونہی سر اٹھایا۔ آپا بیڈ پر بیٹھی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میں خفت زدہ سے انداز میں مسکرائی۔

''پتا تھا..... کہ تم اس بار بھی ضرور نیچے گرو گی۔ تمہاری اوقات ہی نہیں ہے اتنے مہنگے بیڈ پر سونے کی۔''

میں آپا کی باتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے پھر سے لیٹ گئی۔

آنکھ لگے نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ پھر سے ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔

''تو کیا میں پھر سے زمین پر گر گئی؟'' دماغ میں پہلا خیال یہی آیا۔

مگر آنکھ کھلی تو خود کو بیڈ پر ہی پایا۔

''تو پھر یہ آواز کیسی تھی؟''

آپا سے پوچھنے کے لیے نظر دوڑائی۔

تو اُن کی جگہ خالی تھی۔ میں حیرت سے سوچ ہی رہی تھی کہ بیڈ کی اوٹ سے ایک سایہ سا فرش سے بلند ہوتا دکھائی دیا۔

''او مائی گاڈ! تو کیا آج آپا سوتے میں بیڈ سے

نیچے گر گئیں۔'' دل چاہا کہ قہقہے لگاؤں اور آپا کو خوب تنگ کروں۔

مگر پھر سوچا کہ وہ شرمندہ ہو جائیں گی۔ اس لیے سوتی بنی رہی اور پلکوں کی جھری سے آپا کی حرکات و سکنات ملاحظہ کرتی رہی۔

آپا فرش سے تھوڑی اونچی ہوئیں اور بیڈ پر رینگ گئیں۔ وہ کن انکھیوں سے بار، بار میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

مگر نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں میرے چہرے کے تاثرات پر زیادہ غور نہ کر سکیں۔

اگلے دن پُرتکلف سا ناشتا کیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

گھر آتے ہی شخصی آزادی کا احساس ہوا مگر خوشبو ممانی کا موڈ آف تھا۔ وہ بجھی، بجھی سی دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا ممانی؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے..... تمہارے ماموں مجھے فروٹ لا کر نہیں دیتے۔ حالانکہ لیڈی ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی ہے کہ اس حالت میں فروٹ کا استعمال زیادہ کیا جائے۔ ان سے سیب کھانے کی فرمائش کرتی ہوں تو شلجم لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کھاؤ کھاؤ شلجم اور سیب کے غذائی اجزا اور افادیت ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' خوشبو ممانی نے منہ بسور کر یہ بات سنائی تو میں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''تمہیں کیوں اتنی ہنسی آ رہی ہے؟'' وہ خفگی سے بولیں۔

تو میں نے فوراً اپنا منہ بند کر لیا۔

رات کو ٹانگیں دباتے ہوئے میں نے آپا کے سامنے یہ بات چھیڑی۔

''آپا! ڈاکٹر نے ممانی کو فروٹ کھانے کے لیے کہا ہے۔ جبکہ ماموں انہیں فروٹ لا کر نہیں دیتے۔ پلیز آپ ماموں سے بات کریں ناں۔''

''تم چھوٹی ممانی کی بڑی وکالت کرتی ہو آج کل، خیر تو ہے ناں؟''

''بالکل خیر ہے..... آپ تو جانتی ہیں۔ چھوٹی ممانی، ماں بننے والی ہیں۔ انہیں اچھی خوراک اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔''

''اچھا، اچھا! زیادہ دادی اماں بننے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی ضرورت ہوگی۔ میں دیکھ لوں گی۔'' آپا نے مجھے جھڑک دیا اور میں خاموشی سے سارا غصہ آپا کی ٹانگوں پر اتارنے لگی۔

☆☆☆

بڑے ماموں کی نسبت منجھلے ماموں ماں کے زیادہ اطاعت گزار اور فرمانبردار ثابت ہوئے۔ آپا جو حکم انہیں دیتیں۔ وہ اس پر سختی سے عمل درآمد کرتے۔

بیوی کی ایک نہ سنتے۔ ممانی بیچاری عاجز آ چکی تھیں۔

میرے سامنے تنہائی میں دل کے پھپھولے پھوڑتی رہتی تھیں اور میں تاسف سے ان کی دکھ بھری داستان سنتی رہتی تھی۔

وہ اتنی گوری چٹی اور خوب صورت ہونے کے باوجود بھی کالے کلوٹے منجھلے ماموں پر اپنا کوئی تسلط نہ جما سکیں۔

''دیکھنا منحی! ایک دن میرا وقت بھی ضرور آئے گا۔ کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی ایسی گھڑی ضرور آئے گی۔ جب تمہارے ماموں میرے سامنے جھکنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔''

میں ترحم آمیز نگاہوں سے ممانی کی طرف دیکھنے لگی۔ پتا نہیں بیچاری کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ میں دکھ سے سوچنے لگی۔

اس وقت ہم دونوں صحن میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ آپا محلے کی سی آی ڈی لینے گئی ہوئی تھی۔

بدقسمتی سے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ماموں نے ممانی کی یہ بات سن لی اور گرج کر بولے۔

''تمہارا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ کان کھول کر سن لو۔ جب تک میری ماں زندہ ہے۔ گھر کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ تمہارا وقت کبھی نہیں آئے گا۔''

ماموں کا وارننگ بھرا انداز دیکھ کر میں ڈر گئی۔

''میرا وقت آئے گا اور ضرور آئے گا۔'' ممانی

نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ تو ماموں بھی نرم پڑ گئے۔ بلکہ سوچ میں پڑ گئے مگر خیریت گزری کہ بات یہیں پر ختم ہوگئی۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد خوشبو ممانی ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئیں مگر ماموں اور آپا کے رویّوں میں کوئی خاطر خواہ تغیر پیدا نہ ہوسکا۔

انہی دنوں سب سے چھوٹے ماموں حمزہ نے شادی کرنے کا اعلان کردیا۔ حالانکہ آپا کا ابھی ان کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

مگر چھوٹے ماموں ضد پر اڑ گئے۔ اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں نوشابہ سے شادی کروں گا۔ نوشابہ آپا کی بھتیجی تھی۔

حمزہ ماموں کا اس سے عاشقی معشوقی کا چکر چل رہا تھا۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی گئیں۔ اور بات شادی تک آ پہنچی۔ بالآخر ماموں کے مجبور کرنے پر آپا کو اپنے بھائی کے ہاں رشتہ لے کر جانا ہی پڑا۔ چھوٹے ماموں کی منگنی والے دن آپا کی بیچ دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے منگنی کے موقع پر پھر وہی ڈراما رچایا۔ جو اس سے پہلے دو مرتبہ رچا چکی تھیں۔

نوشابہ کے ہاتھ میں چھوٹے ماموں کے نام کی انگوٹھی ڈالی۔ اور اس کی پیشانی چوم کر اعلان کیا۔ ”آج سے اس کا نام ”کرن“ ہے۔ یہ اپنی روشنی سے میرے گھر کو منور کردے گی۔“ آپا کا یہ اعلان سن کر نوشابہ کے ماں باپ کے چہرے کھل اٹھے۔

مگر میں، بڑی ممانی زینت اور خوشبو ممانی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ منگنی کے موقع پر ہی شادی کی ڈیٹ فکس کردی گئی۔ جو ٹھیک چھ ماہ بعد کی تھی۔

☆☆☆

چھوٹے ماموں کی شادی کی تاریخ بھی آ گئی۔ خوشبو ممانی نے منجھلے ماموں سے شادی کی شاپنگ کے لیے پچاس ہزار مانگے۔ ماموں نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ اپنی شادی کے رکھے ہوئے ملبوسات نکالو اور انہی کو پہنو۔ ننھے

مجھے تم سے محبت ہے

میری آنکھوں کی بے چینی
میرے جذبوں کی سچائی
اگر تم جان بھی جاؤ
تمہیں محسوس بھی ہوگا
میرے لفظوں کے اندر تم
کہیں پہ گنگناتے ہو
کہیں پر رقص کرتے ہو
میری یہ شاعری ساری
تمہارا ورد کرتی ہے
اگر میری یہ نظمیں بھی
تمہارے نام ہوتی ہیں
تو پھر اس کا یہ مطلب ہے
کوئی گہری عقیدت ہے
مجھے تم سے محبت ہے

شاعرہ: فریدہ فری، لاہور

ریحان کی شاپنگ کے لیے دس ہزار روپے پکڑا دیے۔

شادی کی رسموں میں بڑی دونوں ممانیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر آپا نے اپنی ازلی کنجوسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کا ہر نیگ دینے میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کی۔

میں نے باگ پھڑائی کی مد میں آپا سے سونے کے وہ جھمکے مانگے، جو امتل آپی نے منجھلے ماموں کی شادی پر آپا کو بطور تحفہ دیے تھے۔

آپا نے کوسنے دینے کے لیے اپنا منہ کھولا مگر پھر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً بند کرلیا۔ پرس سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا اور پچکارتے ہوئے بولیں۔

”ننھی وہ جھمکے رہنے دو۔ بہت پرانے فیشن کے ہیں۔ یہ پانچ سو روپے رکھ لو۔ بازار سے کوئی اچھے سے آرٹیفیشل جھمکے خرید لینا۔“

”مگر آپا مجھے وہ جھمکے بہت پسند ہیں۔“ میں مچل گئی۔

''ضد نہیں کرتے بٹیا! پیسے پکڑو اور اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید لینا۔'' آپا نے پانچ سو کا وہ نوٹ میری مٹھی میں دیا اور زبردستی مٹھی کو بند کر دیا۔

آپا نے پچاس ہزار کے طلائی جھمکوں کی فرمائش کو پانچ سو روپیہ دے کر ٹال دیا۔

سرمہ ڈلوائی بھابیوں کا ایک اہم نیگ سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپا نے ٹال مٹول کرتے ہوئے یہی کہا کہ شادی کے بعد دے دوں گی۔

بڑی ممانی تو شرافت سے چپ ہو رہیں۔ مگر خوشبو ممانی کے ذہن نے اس وقت خوب کام کیا۔ شاید یہ پلاننگ وہ کافی عرصہ پہلے سے دماغ میں ترتیب دے رہی تھیں۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں جا کر سکون سے بیٹھ گئیں۔ جب دولھا اور ساری بارات تیار ہو کر گاڑیوں میں بیٹھ چکی تھی۔ ماموں انہیں پکارتے ہوئے کمرے میں گئے۔ میں بھی اس وقت ماموں کے ہمراہ تھی۔

ممانی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی آئینے میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھیں۔

''خوشبو فٹافٹ چلو یار! بارات تیار ہو کے باہر کھڑی ہے۔ بس تمہارا انتظار ہے۔''

ممانی کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ کھڑی ہوئیں۔ آہستہ، آہستہ چلتی ہوئی ماموں کے پاس آئیں اور ہاتھ پھیلایا۔

''پچاس ہزار روپیہ چاہیے سر.....'' ممانی کے چہرے پر رقص کرتی ہوئی پُراعتماد مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

''مجھے کیا کسی پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ تمہیں پچاس ہزار تھما دوں۔'' ماموں نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔

''چلو ٹھیک ہے! رہنے دو تم بارات لے جاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ اطمینان سے کہتے ہوئے پھر سے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ماموں جھنجلا گئے۔

''چلو اٹھو، میں تمہیں بیس ہزار دیتا ہوں۔''

ماموں نے جیب سے بٹوا نکالا۔

''بالکل نہیں! پورے پچاس ہزار روپے۔ اس سے ایک پیسہ بھی کم نہیں ہوگا۔'' ممانی پورے طمطراق سے بولیں۔

میں ممانی کی چالبازی اور حکمت عملی کی دل سے معترف ہوگئی۔ میں ان کی طرف دیکھ کر زیرلب مسکرا رہی تھی۔ ممانی کا یہ روپ بہت انوکھا اور نیا تھا۔ جبکہ ماموں کو ممانی کے اس رویے سے بے انتہا حیرت ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ کسی گھاگ بیوپاری کی طرح بولیاں لگاتے رہے۔ مگر ممانی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ پھر ادھار کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے وہ بھی مسترد کر دی۔ جب ماموں کی کوئی دال نہ گلی اور باہر سے گاڑیوں کے ہارن شور مچانے لگے۔ تو ماموں نے زچ ہو کر بٹوے سے پورے پچاس ہزار نکال کر ممانی کی طرف بڑھائے۔

''اب کوئی بھی مزید بات کی تو دو جھانپڑ لگا دوں گا۔'' ساتھ دھمکی بھی دے ڈالی۔ باہر آپا اور دوسرے لوگ ماموں کو پکار رہے تھے۔

ممانی نے بڑی تسلی سے نوٹ گنے اور اپنے پرس میں ڈال لیے اور پھر بڑے فخر سے گردن اکڑائے، ماموں کے ہمراہ باہر آگئیں۔

اور یوں، خوشبو ممانی نے اپنی جرأت اور دور اندیشی سے اپنا یہ دعویٰ سچ ثابت کر دکھایا کہ ''ایک دن میرا وقت بھی آئے گا۔ جب تمہارے ماموں میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

☆☆☆

کرن کے آتے ہی گھر کا ماحول بدل گیا۔

آپا کہتی تھیں کہ کرن کے آنے سے گھر میں روشنی بکھر جائے گی۔ مگر اس نے کچھ اس انداز میں روشنی بکھیری کہ آپا کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اس نے آتے ہی سب سے پہلے تو آپا کا تخت و تاج چھینا۔

چھوٹے ماموں شروع سے ہی بہت تیز طرار اور چالاک تھے۔ ماں کے سامنے بھی زبان چلا لیتے تھے۔ کرن کو ان کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

اسی دوران منجھلے ماموں کی بڑا نسفر دوسرے شہر ہوگئی۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر گھر سے چلے گئے۔ زینت ممانی اور بڑے ماموں پہلے ہی آپا کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ اب آپا اور میں، دونوں مکمل طور پر چھوٹے ماموں اور چھوٹی ممانی کے رحم و کرم پر تھیں۔ میں نے انٹر کیا ہی تھا کہ میرے لیے شعیب کا رشتہ آگیا۔

شعیب بینک میں کیشئر کی جاب کرتے تھے۔ ماں باپ کا سایہ کب کا اٹھ چکا تھا۔ بڑی دو بہنیں جو کہ شادی شدہ تھیں اور اپنے گھروں میں آباد تھیں۔

بڑے ماموں نے اس رشتے کی سفارش کی۔ چھوٹے ماموں نے بھی حمایت کی تو آپا نے ہاں کردی اور پھر جہیز کے نام پر مجھے ضرورت کی ہر چیز دی۔ آپا کا جستی چادر سے بنا ہوا صندوق عمر و عیار کی زنبیل ثابت ہوا۔

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آپا نہ جانے کب سے میرے لیے جوڑ جمع کر رہی تھیں۔ امتل آپی نے مجھے گولڈ کا نیکلس سیٹ دیا۔ بڑے ماموں نے فریج اور اے سی دیا۔ منجھلے ماموں نے الیکٹرک کی بہت سی چھوٹی موٹی مصنوعات دیں۔ سب نے مجھے اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کیا۔

فوجن آپا مجھے رخصت کرتے وقت، میرے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کے روئیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے عادی ہو چکے تھے۔

''پتا نہیں میرے بغیر آپا وقت کیسے کاٹیں گی۔''

رخصت ہوتے ہوئے میرے ذہن میں یہی خیالات آتے رہے۔

میں رخصت ہو کر پیا کے گھر آگئی۔ شعیب بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ وہ اکیلے تھے۔ اس لیے ان کی تنہائی کے ڈر سے میکے جانا بہت کم رہ گیا۔

مہینے دو مہینے بعد جب بھی جاتی۔ آپا خوب گلے شکوے کرتیں۔ میری بے حسی پر خوب ڈانٹتیں۔ مگر ساتھ ہی مجھے اپنے گھر میں آباد رہنے کی دعائیں بھی دیتیں۔

آپا پہلے ہی کمزور تھیں۔ اب مزید کمزور ہو گئی تھیں۔ جسمانی صحت کافی مخدوش ہو چکی تھی۔ چھوٹے ماموں اور چھوٹی ممانی کا رویہ بھی آپا کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔

اقتدار اور کرسی کا نشہ بہت برا ہوتا ہے۔ آپا سے یہ نشہ چھڑایا گیا تو وہ بیمار پڑ گئیں۔ انہوں نے یہ بات دل پر لے لی۔ دل کے ساتھ، ساتھ دماغ بھی ہل گیا۔ ہوشمندی کے ساتھ، ساتھ بہکی، بہکی باتیں شروع کردیتیں۔

ماموں نے خاطر خواہ علاج نہ کروایا جیسا کہ انہیں چاہیے تھا سو ان کی دماغی صحت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ اب تو وہ اکثر گھر سے ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر نکل جایا کرتیں۔

ایک دن شعیب کہیں کام سے جاتے ہوئے مجھے آپا کے گھر کی گلی کے نکڑ پر ڈراپ کر گئے۔ میں گلی کے نکڑ سے پیدل چلتی ہوئی گھر کے قریب آئی۔

دیکھا کہ آپا سفید بال بکھرائے گھر کی دہلیز پر گم صم بیٹھی ہیں۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ میں نے نمناک آواز سے آپا کو پکارا تو وہ سر اٹھا کر خالی، خالی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔

میں ان کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔ انہیں بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور گھر کے اندر لے گئی۔ ان کا ہاتھ منہ دھلایا۔ بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی گوندھی۔

ممانی سے شکوہ کیا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔

''اگر اتنا ہی خیال ہے تو انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ۔ ہم سے مزید بڑھیا کی چوکیداری نہیں ہوتی۔ دن میں دس بار تمہارے ماموں ان کو ڈھونڈ کے گھر لاتے ہیں۔ باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ جب سر پر پڑتی ہے۔ پتا تب چلتا ہے۔'' میں خاموشی سے گردن جھکائے ان کی کڑوی کسیلی باتیں سنتی رہی۔

وہ رات میں نے روتے ہوئے گزار دی۔ آپا چپ چاپ مجھے روتا ہوا دیکھتی رہیں۔ اب وہ باتیں نہیں کرتی تھیں۔ ہر وقت خاموش رہتی تھیں۔ مگر اس

حالت میں بھی اپنی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ سیف کی چابیاں بدستور اپنے پاس رکھتی تھیں۔ اگلے دن شعیب آئے اور مجھے لے گئے۔

مگر میرا دل آپا میں ہی اٹکا رہا۔

ایک ہفتے بعد میں پھر آئی۔ آپا کو نہلایا۔ ان کے بالوں میں کنگھی کی اور پھر میں نے اسے اپنا معمول بنا لیا۔ ہر اتوار کو شعیب مجھے آپا کے ہاں چھوڑ جاتے۔ میں انہیں نہلاتی، ان کے کپڑے بدلتی۔ ان کے بالوں میں کنگھی کرتی۔ ان کو کھلاتی پلاتی اب ان کی حالت میں بہتری کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔

وہ میری باتوں کا جواب بھی دینے لگی تھیں۔

ایک دن آدھی رات کو چھوٹی ممانی کا فون آ گیا کہ فوجن آپا کافی بیمار ہیں۔ ان کی حالت سیریس ہے اور وہ مجھے یاد کر رہی ہیں۔

میں پریشان ہو گئی۔ شعیب کو جگایا اور انہیں کہا۔ ''مجھے فوراً آپا کے پاس لے چلیں۔'' وہ اسی وقت بائیک پر بٹھا کر مجھے آپا کے گھر لے آئے۔

آپا بیڈ پر نیم بیہوش پڑی تھیں۔ چہرے کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی۔ سانس بھی بمشکل کھینچ، کھینچ کر لے رہی تھیں۔

کمرے میں اس وقت آپا کے تینوں بیٹے اور بہویں موجود تھیں۔

میں پاس آ کر بیٹھی۔ آپا کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں پکارا۔ انہوں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ اور بولیں۔

''تم کیسی ہو نھی؟''

''میں ٹھیک ہوں آپا! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں ناں؟ پھر اچانک کیا ہو گیا؟'' میں رونے لگی۔

آپا نے ہاتھ سے مجھے چپ ہونے کا اشارہ کیا۔ اور پھر اپنا تکیہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں نے تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے ان کی سیف کی چابیاں موجود تھیں۔

انہوں نے مجھے وہ چابیاں اٹھا کر سیف کھولنے کا حکم دیا۔

میں اٹھ کر سیف کے پاس آئی۔ میں نے چابی لگا کر سیف کھولا۔ سامنے ہی ایک جیولری بکس رکھا تھا۔ یہ جیولری بکس میں آپا کے پاس پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ اس میں وہ اپنے سونے کے زیورات رکھتی تھیں۔

آپا نے مجھے وہ بکس اپنے پاس لانے کا اشارہ کیا۔

میں نے وہ جیولری بکس آپا کے آگے لا کر رکھ دیا۔ انہوں نے اسے کھولنے کا حکم دیا۔ میں نے جیولری بکس کھولا۔ اس میں کچھ زیور پڑا دکھائی دے رہا تھا۔

سب سے اوپر ایک کڑا رکھا تھا۔ آپا نے اسے زینت ممانی کو دینے کا اشارہ کیا۔

میں نے وہ کڑا اٹھا کر زینت ممانی کو دے دیا۔ اس کے بعد ایک ہار پڑا ہوا تھا وہ اٹھا کر خوشبو ممانی کے حوالے کیا گیا۔ اب ایک سونے کا کلپ تھا۔ جو غالباً آپا کی شادی کا تھا۔ آپا نے وہ اٹھا کر کرن کو دے دیا۔ اب جیولری بکس میں ایک سونے کی مالا تھی۔

آپا نے کانپتے ہاتھوں سے وہ سونے کی مالا اٹھائی۔ اور میرے ہاتھ پر رکھ دی اب بکس میں ایک آخری زیور بچا تھا۔ اور وہ زیور تھا سونے کے وہ جھمکے، جو امتل آپی نے منجھلے ماموں کی شادی پر آپا کو بطور تحفہ دیے تھے۔ آپا نے کانپتے ہاتھوں سے وہ جھمکے اٹھائے اور وہ بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں رونے لگی تو آپا نحیف و نزار آواز میں بولیں۔

''یہ تمہاری باگ پھڑائی ہے جو مجھ پر جب سے ادھار تھی۔ آج میں نے تمہارا ادھار چکا دیا۔'' اس وقت کمرے میں موجود ہر شخص کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ میں پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ آپا نے مجھے رونے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔ چند باتیں مزید کیں بہوؤں کو نزدیک بلا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر آپا غشی میں چلی گئیں۔

اس کے بعد انہوں نے دوبارہ آنکھ نہ کھولی اور نہ ہی کوئی بات کی۔ ہم سب ان کے پاس بیٹھے سورۂ یاسین کی تلاوت کرتے رہے اور فجر کے وقت آپا نے جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ یوں آپا آخری وقت میں سب کے ادھار چکا کر ہلکی پھلکی ہو کر چلی گئیں۔

برے نصیب میرے

شمیم فضل خالق

کھرے بان کی کھردری چارپائی پر لیٹی زرینہ آسمان کی طرف نگاہ کیے بادلوں میں چھپتے اور ابھرتے چاند کی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی۔ کالے، کالے بادل کبھی چاند کو ڈھک لیتے، شریر چاند پل بھر میں اُن کی گرفت سے نکل آتا۔ اس کے ہونٹوں سے ٹھنڈی، ٹھنڈی آہ پھسل گئی۔

''کاش..... میں بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا ہوتی..... بس..... یہ دکھ بھری زندگی میرا مقدر نہ ہوتی۔'' موبائل کی رنگ پر اس نے موبائل اٹھا کر بغیر دیکھے کانوں سے لگالیا۔

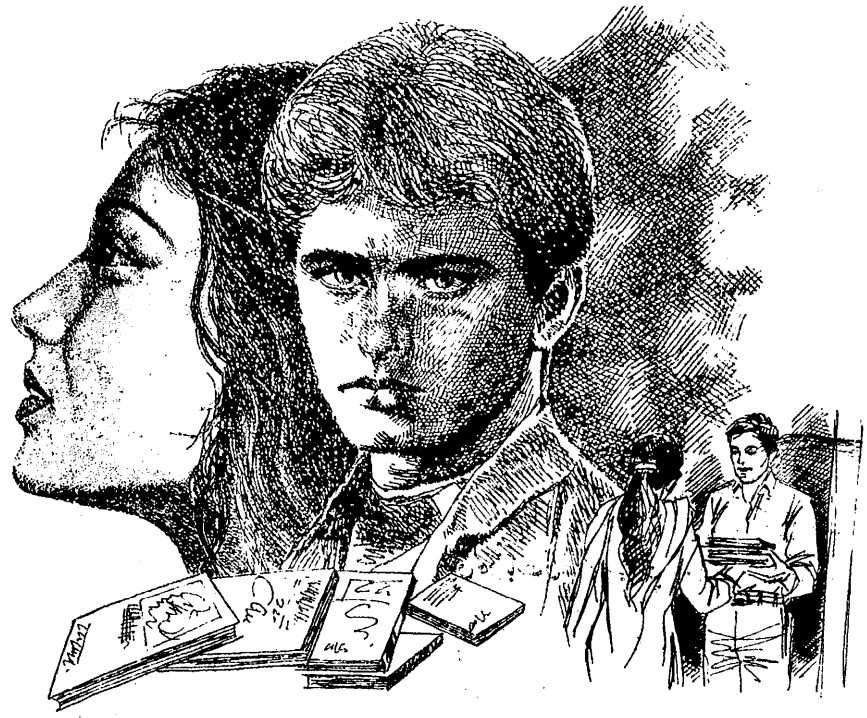

''کیا کر رہی تھیں؟'' راحیل نے شوخی سے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔'' وہ بے دلی سے بولی۔'' اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔''
''کیوں ہمت ہار دیتی ہو زری..... ہمت پکڑو یار.....''
''کیا ہمت پکڑوں راحیل..... پھرتے سیلاب میں تنکے کا سہارا بھی نہیں۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔''تم جانتے تو ہو ابا کو..... وہ میرا رشتہ تمہیں کبھی نہیں دیں گے۔''
''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' راحیل نے الٹا اسی سے پوچھا۔
''تم جانتے ہو ابا کی شرائط..... جب تک لڑکے کا اپنا گھر نہ ہو اور اچھی جاب نہ ہو..... وہ بیٹی کا رشتہ نہیں دیں گے۔ اپنی پہلی دو بیٹیوں کا رشتہ بھی ان ہی شرائط کی بنیاد پر وہ کر چکے ہیں..... اور میرا رشتہ بھی ان ہی شرائط پر کریں گے۔''
''ہاں تو ٹھیک ہے جانم..... ہر باپ اپنی بیٹیوں کے لیے ایسے ہی سوچتا ہے..... اس میں غلط کیا ہے۔'' وہ بڑے رسان سے بولا تو زرینہ بھڑک اٹھی۔
''غلط یہ ہے راحیل کہ تمہارے پاس جاب ہے نہ اپنا گھر پھر ابا کس بنیاد پر میرا رشتہ تم سے طے کریں گے۔''
''دیکھو زری۔'' وہ اسی نرم لہجے میں بولا۔''میں جاب ڈھونڈنے کی کوشش کر تو رہا ہوں اور اگر ایک بار جاب مل گئی تو پھر اپنا گھر بنانا مشکل نہیں ہوگا..... تم مثبت طریقے سے کیوں نہیں سوچتیں..... آخر ابا تمہاری پسند کو بھی تو اہمیت دیں گے ناں.....''
''بالکل نہیں راحیل.....'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''تمہیں ابا کا پتا نہیں ہے، وہ اپنے ارادوں میں بہت مضبوط شخص ہیں..... جو انہوں نے ٹھان لی سو ٹھان لی..... اور بیٹیوں کے لیے انہوں نے رشتوں کا یہی معیار رکھا ہے ایک عدد اپنا گھر اور اچھی جاب..... سمجھے۔''
''تم فکر نہ کرو..... اللہ سب آسان کرے گا۔ بس تم دعا کرتی رہو..... میں اپنی کوشش تیز کرتا ہوں۔ تم اپنی دعاؤں میں تیزی لاؤ۔'' اس نے امید دلاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ زرینہ نے بے دلی سے فون کو دیکھا۔ اسی دوران ابا کھانستے ہوئے دوستوں کی محفل سے گھر آئے۔ زرینہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''ارے..... میری بیٹی یہاں بیٹھی ہے۔'' وہ محبت سے بولے اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔
''امی کہاں ہیں تمہاری۔'' وہ سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے بولے۔
''شاید کچن میں کھانا تیار کر رہی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''اچھا..... بلاؤ انہیں..... آج تم دونوں کو ایک خوشخبری سناؤں گا۔'' وہ مسکرا کر بولے۔
''کیسی خوشخبری ابا.....؟'' زرینہ حیرت سے پوچھنے لگی۔
''امی کو آجانے دو..... پھر تم دونوں کو مل کر سناتا ہوں.....'' وہ زیر لب مسکرا کر بولے۔ اس دوران امی بھی باہر آگئیں۔
''ارے بھئی کس خوشخبری کی بات ہو رہی ہے۔'' وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولیں اور کرسی کھینچ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔
''وہ..... اتوار کے دن ایک فیملی آرہی ہے..... زرینہ کو دیکھنے..... بڑے اچھے اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔'' ابا کے بتانے پر زرینہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا..... وہ وقت آپہنچا تھا جسے وہ اور راحیل دور سمجھ رہے تھے۔
''کس کے توسط سے آرہے ہیں اور آپ کی شرائط پر پورے بھی اترتے ہیں یا نہیں.....؟'' امی اب ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
''احسان کے توسط سے آرہے ہیں۔'' ابا نے بہت پرانے اور گہرے دوست کا نام لیا۔''اور شرائط پر بالکل پورا اترتے ہیں..... ان کا اپنا مکان ہے اور لڑکے کی اچھی پُرکشش جاب بھی ہے..... ویسے بھی میرے سب دوست میری شرطوں کو جانتے ہیں اور میں نے انہیں کہہ رکھا ہے کہ جو لوگ میری ان شرائط پر پورے نہیں اترتے انہیں میرے گھر کا راستہ دکھانے کی

کوئی ضرورت نہیں.....''

زرینہ کا دل ڈوبنے لگا.....اسے لگا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور بیٹھی رہی تو اس کا ہارٹ فیل ہوجائے گا.....وہ اٹھ کر کچن کی طرف چل دی جبکہ ابا اور امی کے درمیان ان لوگوں کے آنے اور ان کی خاطر تواضع کے بارے میں بات ہونے لگی۔

سلطان صاحب اور رقیہ خاتون کی تین بیٹیاں تھیں ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ بڑی دونوں بیٹیوں ہاجرہ اور خدیجہ کی شادیاں ہوچکی تھیں.....ہاجرہ ملتان میں بیاہی گئی تھی جبکہ خدیجہ لاہور کے مضافات میں بیاہ کر گئی تھی۔ دونوں کی شادی پر ابا نے اپنی شرائط منوائی تھیں اور اب دونوں اپنے، اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی زرینہ امی، ابا دونوں کی لاڈلی تھی اس کی پیدائش اپنی دونوں بہنوں کے کافی عرصے بعد ہوئی تھی سو یوں وہ سارے گھر کی لاڈلی تھی۔ راحیل، زرینہ کی دوست صدف کا بھائی تھا، صدف کے گھر آتے جاتے جانے کب اور کیسے راحیل اور اس کے درمیان محبت کا ناتا جڑ گیا جو وقت کے ساتھ، ساتھ مضبوط ہوتا گیا۔ زرینہ تو انٹر کرکے گھر بیٹھ گئی جبکہ راحیل نے ایم بی اے کرلیا لیکن وہ ابھی تک جاب کے لیے جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا لیکن جہاں کوئی امید بندھتی سفارش اور رشوت نہ ہونے کے سبب امید کی ڈور ٹوٹ جاتی۔ راحیل بہت پازیٹو انسان تھا، وہ ابھی اپنی کوششوں سے ہارا نہیں تھا اور مسلسل تگ و دو میں لگا تھا، ان کا گھر بھی کرایے کا تھا، باپ کا سایہ سر پر سلامت نہیں تھا بس ایک ماں اور بہن تھیں۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا تو اسی وقت زرینہ کی کال آئی۔

''اس وقت!'' اس نے حیرت سے گھڑی دیکھی..... رات کا ایک بج رہا تھا۔

''کیا بات ہے زری.....تم نے اتنی لیٹ کال کی ہے.....خیر بہت تو ہے؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''خیر بہت ہوتی تو میں تمہیں کال کیوں کرتی.....'' وہ نم لہجے میں بولی۔

''کیا ہوا.....؟ کچھ بتاؤ گی بھی یا سسپنس ہی پھیلاؤ گی۔''

''اتوار کو میرے رشتے کے لیے ایک فیملی آرہی ہے.....ابا اس سلسلے میں خاصے پُرجوش ہورہے ہیں۔''

''اوہ.....'' اس کی بات سن کر وہ چپ ہوگیا۔ خاصی دیر تک چپ رہنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔

''تم کیوں دل برا کررہی ہو جانم..... جہاں لڑکیاں ہوں وہاں رشتے تو آیا ہی کرتے ہیں۔''

''گویا تمہارے نزدیک یہ کوئی بڑی بات ہی نہیں.....اور اگر لڑکے میں ابا کی بتائی ساری خوبیاں ہوئیں اور انہیں میں پسند آگئی.....تب کیا ہوگا؟''

''اور اگر انہیں تم پسند نہ آئیں تو.....'' راحیل نے بات مذاق میں ٹالنی چاہی۔

''راحیل.....پلیز.....بات مذاق میں مت ٹالو۔ یہ خاصا سیریس معاملہ ہے.....تم سمجھتے کیوں نہیں..... یہ میری اور تمہاری زندگی کا معاملہ ہے۔''

''بالکل زری جان.....لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ میں نے جاب کے لیے اپنی تگ و دو میں اضافہ کردیا ہے اور یقیناً جلد ہی کوئی جاب مل جائے گی..... پھر سب سے پہلے میں امی اور صدف کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔'' وہ زرینہ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''بس تم ٹینشن نہ لو.....ریلکس ہو جاؤ.....''

راحیل جانتا تھا کہ وہ چھوٹی، چھوٹی بات دل پر لے لیتی ہے سو خود فکر مند ہونے کے باوجود اسے تسلی دی لیکن زرینہ کا دل قابو میں نہیں آرہا تھا اب تو بس وہ یہی دعا کررہی تھی کہ آنے والے لوگوں کو وہ ہی پسند نہ آئے اور انہیں اتنا ٹائم مل جائے کہ راحیل کو جاب مل جائے اور وہ لوگ رشتہ مانگنے آجائیں۔

اتوار کی صبح، صبح صدف کا فون آگیا۔ وہ بادلِ ناخواستہ کچن میں امی کا ہاتھ بٹا رہی تھی.....فون پر صدف کا نام دیکھ کر وہ فون کان سے لگائے، لگائے اپنے

کمرے میں آ گئی۔

''ہاں صدف..... کہو سب خیریت تو ہے؟''

''نہیں زری..... خیریت ہی تو نہیں ہے۔'' صدف نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ ''بس یوں سمجھو..... ہمارے ستارے گردش میں آئے ہوئے ہیں اور ہم کسی طرح گردش سے نکل نہیں پا رہے۔''

''کیوں..... کیا ہوا.....؟'' وہ بے چینی سے بولی۔

''کیا بتاؤں زری..... بھائی نوکری کی تلاش میں ہلکان ہو گئے ہیں اور نوکری ہے کہ مل کر نہیں دے رہی.....'' صدف روہانسی ہو کر بولی۔ ''اب تو سمجھو کھانے کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' وہ چونک کر بولی۔

''بس کیا بتاؤں..... عجیب موڑ پر آ گئے ہیں ہم زری..... ہم گھر کے دگرگوں حالت بھائی سے چھپائے پھرتے ہیں..... ان حالات میں اماں کو میری شادی نہ ہونے کی فکر کھائی جا رہی ہے جبکہ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں، مجھے بھائی کی فکر ہے..... اگر تم اُن سے چھن گئیں تو وہ جیتے جی مر جائیں گے..... وعدہ کرو زری..... تم بھائی کا انتظار کرو گی ناں..... ہے ناں.....!''

''میں تو انتظار کر لوں گی صدف..... لیکن حالات انتظار نہیں کریں گے۔'' پھر اس نے آنسوؤں کے بیچ صدف کو آج آنے والے رشتے کے بارے میں بتا دیا..... اور دونوں سہیلیوں کے درمیان کافی دیر تک آنسوؤں کی برسات میں بات چیت ہوتی رہی جب زرینہ کو امی نے آواز دی تو اس نے بھرے دل سے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

رشتے کے لیے آنے والے لوگوں میں ایک ماں اور بیٹا تھا۔ وہ خاتون بہت ہنس مکھ اور بے تکلف سی تھیں جو ہر بات ختم کرنے کے بعد ایک چھوٹا سا قہقہہ ضرور لگاتیں اور ان کی ہنسی اتنی خوب صورت تھی جیسے بہت سی چڑیاں ایک ساتھ چہچہا رہی ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کا تعارف کراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''یہ میرا بیٹا حماد ہے..... اسی کے رشتے کے لیے میں آئی ہوں اور اسے ساتھ اس لیے لائی ہوں کہ لڑکا لڑکی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں..... اور دونوں طرف سے پسندیدگی ہو تو بات آگے بڑھائی جا سکے.....'' پھر انہوں نے میز پر رکھے لوازمات کو دیکھا تو قدرے ناگواری سے بولیں۔

''معاف کرنا بہن..... لیکن آپ نے اتنا زیادہ تکلف کیوں کیا ہے..... مجھے یہ سب پسند نہیں..... ہم اگر رشتے دار بننے جا رہے ہیں تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ وہی کچھ کھانا پینا ہوگا جو ہم خود کھاتے ہیں۔ رشتے داروں کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک مناسب نہیں۔'' اس دوران زرینہ، امی کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں سلام کیا..... ان خاتون نے محبت سے اسے پاس بٹھالیا اور چھوٹے، چھوٹے سوالات کرنے لگیں..... اور جب وہ چائے کے خالی برتن لے کر چلی گئی تو وہ خاتون امی اور ابا سے کہنے لگیں۔

''مجھے تو آپ کی بیٹی بہت پسند آ گئی ہے..... اور حماد تمہیں لڑکی کیسی لگی؟'' حماد نے آہستہ سے سر ہلا کر گردن ہلا دی..... تب انہوں نے حسب عادت چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا۔

''لو جی..... ہماری طرف سے تو رشتہ طے ہو گیا..... اب آپ لوگ اپنی بیٹی سے پوچھ کر ہمیں جواب دے دیں..... وقت کی کوئی قید نہیں..... جتنے دن چاہیں لے لیں۔'' پھر وہ قدرے ٹھہر کر بولیں۔ ''گھر میں ہم دو ہی بندے ہیں ایک میں، ایک میرا بیٹا..... اس کے والد اس کے بچپن میں ہی گزر گئے تھے..... خدا ان کو کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے۔ مرنے سے پہلے ہمارے سروں پر چھت فراہم کر گئے تھے..... خاصا کشادہ گھر ہے ہمارا..... حماد میرا بہت لائق بچہ ہے، تعلیمی میدان میں یہ ہر سال نمایاں طور پر کامیاب ہوتا رہا اور اب ماشاء اللہ ایک اچھی جاب پر لگا ہے۔'' پھر وہ بیٹے سے کہنے لگیں۔

''حماد..... تم انکل کو اپنے آفس کا ایڈریس لکھ کر دے دو..... اگر انہوں نے اپنی تسلی کرنی ہو تو آسانی

سے کرلیں۔''

''نہیں بہن.....'' امی متاثر ہو کر بولیں۔ ''آپ کا کہنا ہی کافی ہے۔''

''ارے نہیں.....'' وہ خاتون بولیں۔ ''یہ تو بیٹی والوں کا حق ہوتا ہے، وہ بیٹی جیسی قیمتی چیز دیتے ہیں تو اپنی تسلی تو کرنی چاہیے ناں انہیں بہر حال.....آپ لوگ ہر طرح سے اپنی تسلی کرلیں..... پھر ہمیں بتا دیں۔'' اس دوران حماد ایک کاغذ پر گھر اور آفس کا ایڈریس لکھ کر ابا کو تھما چکا تھا..... پھر وہ امی، ابا کو حیرت زدہ چھوڑ کر اجازت طلب کر کے چلے گئے۔

''احسان نے ان لوگوں کی بہت تعریف کی تھی..... پھر بھی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنے اچھے لوگ ہوں گے۔'' ابا سر ہلا کر امی سے کہنے لگے۔

''ہاں.....اور بیٹا کتنا سعادت مند اور کتنا خوب صورت بھی ہے..... سچ بات تو یہ ہے کہ وہ کتنا ہماری زری کے ساتھ جچے گا.....اور پھر فیملی اتنی مختصر.....اس طرح کے لوگوں کے لیے تو لوگ وظیفے پڑھتے ہیں۔ خدا نے ہماری بیٹی کے لیے اس طرح کی فیملی بھیج دی.....شکر ہے اپنے رب کا.....''

''بس اب تم زری سے اس کی رائے لے لو..... میں ان لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرانا چاہتا.....'' ابا بولے۔

کچن میں کھڑی زرینہ کا دل قطرہ، قطرہ پگھل رہا تھا.....اس کی ساری دعائیں بیکار گئی تھیں۔ برتن دھوتے ہوئے اس سے ایک گلاس سنک سے نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔ صبح بھی وہ ایک پلیٹ توڑ چکی تھی۔ امی بغور اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ گلاس کے ٹوٹے ٹکڑے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالنے لگی تو امی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور بولیں۔

''زری بیٹا.....میں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو.....اپنے خیالوں میں گم رہتی ہو.....تمہارا کھانا پینا بھی چھوٹ گیا ہے بیٹی..... مجھے بتاؤ..... کیا بات ہے.....میں صرف تمہاری ماں نہیں.....تمہاری دوست بھی ہوں، ویسے بھی میں نے تو کبھی تم بہنوں سے کوئی فاصلہ نہیں رکھا.....پھر تم مجھے اپنے دل کا حال بتاتی کیوں نہیں.....کوئی مسئلہ ہے کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''کک.....کوئی مسئلہ نہیں امی.....'' وہ بھرائی آواز میں بولی لیکن جب امی نے اسے گلے سے لگا لیا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔

''مجھے بتاؤ زری.....ایک دوست سمجھ کر اپنا دل ہلکا کرو.....تمہیں اس رشتے سے کوئی مسئلہ ہے تو میرے ساتھ شیئر کرو کیونکہ میں دیکھ رہی ہوں کہ جب سے یہ رشتہ تمہارے لیے آیا ہے.....تم بے حد الجھی، الجھی اور پریشان رہنے لگی ہو۔'' اور تب زرینہ نے سسکیوں کے بیچ امی کو سب کچھ بتا دیا۔ ایک لفظ بھی نہیں چھپایا۔ امی کو جب راحیل کے متعلق پتا چلا تو وہ بہت حیران ہوئیں.....وہ صدف کو زرینہ کی دوست کی حیثیت سے جانتی تھیں..... کافی دیر تو وہ خاموش رہیں.....پھر بولیں۔

''راحیل کو میں نے دیکھا ہے بظاہر اس میں ناپسند کرنے والی کوئی بات نہیں.....لیکن تمہارے ابا کی جو دو مین شرائط ہیں ان پر وہ پورا نہیں اترتا.....اس لیے مجھے توقع نہیں کہ تمہارے ابا مان جائیں گے.....نہ اس کی جاب ہے نہ اپنا گھر.....!''

''امی.....'' وہ جلدی سے بولی۔ ''وہ جاب ڈھونڈ رہا ہے بہت جلد اسے جاب مل جائے گی.....اور وہ کہتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے گھر کی ہی تگ و دو کرے گا.....''

''ہوں.....'' امی نے ہنکارا بھرا۔

''تم ان سے کہہ دو کہ وہ لوگ رشتہ لے کر آجائیں..... میں اپنی طرف سے کوشش کروں گی..... آگے تمہارا نصیب.....'' امی نے اسے نرمی سے کہا۔

زرینہ کو گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھائی دی۔ ناامیدی میں اتنی سی امید بھی بہت بڑی تھی.....وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور اس نے راحیل کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی رنگ پر اس نے فون اٹھا لیا۔

''کیا ہوا زری..... ان لوگوں کو تم پسند نہیں آئیں ناں..... یا پھر انکل کو وہ لوگ پسند نہیں آئے.....؟'' وہ بے چینی سے پوچھنے لگا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا..... ابا کو بھی وہ لوگ بہت پسند آئے اور اُن کو بھی میں پسند آگئی۔''

''پھر.....؟'' وہ شکست خوردہ آواز میں بولا۔

''پھر کچھ نہیں..... بس تم آنٹی اور صدف کو میرا رشتہ مانگنے بھیج دو۔''

''کک..... کیا.....؟ کہہ رہی ہو؟ مذاق کر رہی ہو ناں.....'' وہ حیرت کی انتہاؤں پر تھا۔

''نہیں..... کوئی مذاق نہیں کر رہی.....'' پھر اس نے ساری بات بلا کم و کاست راحیل کو بتا دی۔

''لیکن زری..... کم سے کم میری جاب ہوتی تو شاید تمہارے ابا کسی نہ کسی طرح مان بھی جاتے..... اب تو مجھے مشکل لگ رہا ہے۔''

''تم اپنے اندازے رہنے دو راحیل..... امی نے کہا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا..... بس تم اپنی امی کو یہاں آنے کے لیے تیار کرو.....'' آہٹ پر اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا..... راحیل نے اپنی ماں سے بات کی تو وہ بری طرح بھڑک اٹھیں۔

''کیا کہہ رہے ہو..... گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں اور تمہیں شادی کی سوجھ رہی ہے..... پاگل تو نہیں ہوگئے ہو..... جانتے ہو نہ، نہ کرتے بھی کتنا خرچ آتا ہے، ان رشتوں، ناتوں پر۔''

''اماں.....'' راحیل رسان سے بولا۔ ''شادی کی بات ابھی کون کر رہا ہے..... اس میں تو سال دو سال تک کا عرصہ لگے گا..... لیکن اماں، زری کے رشتے آرہے ہیں..... ایک بار اس کا رشتہ میرے ساتھ طے پا جائے تو مجھے تسلی ہو جائے گی۔''

''ہاں تو اماں..... اس میں حرج کیا ہے۔'' صدف بولی۔ ''ہم کو اس کا رشتہ مانگنے ہی جانا ہے..... ابھی بھلا کون سا خرچہ ہوگا۔''

''اور خرچہ جو بھی ہوگا..... میں رقم کا بندوبست کر دوں گا جتنی رقم آپ کو چاہیے ہوگی.....'' راحیل نے ماں کو تسلی دی تو وہ بادلِ ناخواستہ سہی لیکن راضی ہو گئیں..... اور راحیل نے ان کو ذرا بھی وقت ضائع نہیں کرنے دیا اور اسی شام کو دونوں کو لے کر زرینہ کے گھر چھوڑ دیا..... اور خود وہ دروازے سے واپس آگیا۔

ابا اور امی دونوں نے پُرتپاک طریقے سے ان کا استقبال کیا۔ امی نے ان کی اچھی طرح سے آؤ بھگت کی..... ابا بھی پاس ہی بیٹھے رہے..... راحیل کی اماں ثریا نے چائے پینے کے دوران بات شروع کی اور اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی صاحب..... میں راحیل کے لیے زری کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں..... راحیل کو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں، اس میں کوئی بری عادت نہیں..... سلجھا ہوا سمجھدار بچہ ہے میرا۔'' ابا کچھ دیر سر جھکائے کچھ سوچتے رہے..... پھر سر اٹھا کر نرم لہجے میں بولے۔

''ہاں..... راحیل کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں..... کہاں پر جاب لگی ہے اس کی.....؟''

''وہ..... جاب ابھی نہیں ملی بھائی صاحب.....'' ثریا نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''انکل.....'' صدف جلدی سے بیچ میں بول پڑی۔ ''وہ بھائی جاب کے لیے بہت زیادہ کوششیں کر رہے ہیں..... ان شاء اللہ جلد ہی انہیں جاب مل جائے گی۔''

''ہاں بھائی صاحب.....'' ثریا بولیں۔ ''میرا بیٹا جاب حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہے..... اور یقین کریں میں خود بھی اس پوزیشن میں زری کے رشتے کے لیے نہیں آنا چاہ رہی تھی کہ جب راحیل کو نوکری ملے گی تو میں رشتہ لینے آؤں گی..... لیکن جب پتا چلا کہ زری کے لیے دوسرے رشتے آرہے ہیں تو..... لیکن آپ یقین کریں جلد یا بدیر راحیل کو جاب مل جائے گی.....'' ابا بہت سنجیدگی سے ان کی ساری بات سن رہے تھے..... پھر انہوں نے ہنکارا بھرا اور بولے۔

''بہن جی..... گھر تو آپ کا اپنا ہوگا ناں.....

پہلے تو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے..... آپ لوگ کرایے کے گھر میں رہتے تھے۔'' اندر کھڑی زرینہ کے پاؤں رعشے کے مریض کی طرح لرزنے لگے اور دل بری طرح ڈوبنے لگا۔ راحیل کی اماں کی بھی بولتی بند ہو گئی..... بڑی دیر بعد وہ تھوک نگل کر بولیں۔

''راحیل کو جاب مل جائے بھائی صاحب..... تو سب سے پہلے وہ اپنا گھر خریدے گا..... یہ وہ بار، بار کہتا ہے۔ ویسے بھی مہینہ تو کھٹ سے گزر جاتا ہے..... ہر ماہ کرایے کے پیسے دینا آسان کام تو نہیں.....''

''لیکن بہن جی..... مہنگائی کے اس دور میں گھر خریدنا بھی آسان بات نہیں.....'' ابا ایک گہری اور لمبی سانس لیتے ہوئے بولے پھر وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولے۔

''بہن جی..... ہر ماں، باپ اپنی اولاد کے لیے اچھا سوچتے ہیں..... بیٹی کو کسی کے حوالے کرتے ہوئے ماں، باپ اتنا چاہنے کے حق میں تو ہوتے ہیں ناں کہ اس کا شوہر روزگار پر ہو..... اور اس کا اپنا گھر ہو جہاں یہ ڈر نہ ہو کہ کوئی سامان پھینک، پھانک کر سڑک پر لے آئے گا۔'' اندر کھڑی زرینہ کا دل قطرہ، قطرہ پگھل رہا تھا..... ہاتھ، پاؤں کانپ رہے تھے اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے..... ابا کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر گمبھیر آواز میں بولے۔

''بہن جی..... برا مت مانیں لیکن مجھے یہ رشتہ منظور ہی نہیں ہے کہ بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں..... انہیں بوجھ سمجھ کر سر سے اتارا نہیں جاتا۔ آپ کی بھی بیٹی ہے، کیا آپ اسے کسی ایسے شخص کے حوالے کر سکتی ہیں جس کا اپنا گھر ہو نہ اس کا کوئی روزگار ہو..... میرا خیال ہے کوئی ماں، باپ ایسا نہیں چاہیں گے۔ یہ میرا آخری اور حتمی جواب ہے..... امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گی۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے یہ گویا اشارہ تھا کہ اب آپ لوگ بھی جا سکتے ہیں اور ان کے گھر سے باہر جانے کے ساتھ ہی ابا، امی سے کہنے لگے۔

''میں حماد کو فون کرتا ہوں کہ اس کی والدہ کل ہی آ کر زری کو انگوٹھی پہنا دیں.....'' امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ابا گھر سے باہر چلے گئے اور اندر کھڑی زرینہ کی دنیا جیسے اندھیری ہو گئی۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ، چیخ کر روئے۔ وہ کمبل میں گھس کر سسکیوں اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس نے اپنا موبائل بند کر کے دو منٹ دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ راحیل اور صدف کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ وہ راحیل سے محبت ضرور کرتی تھی لیکن اس کے لیے اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی..... اگرچہ اسے معلوم تھا کہ ابا کا فیصلہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

کیا ہوگا لیکن ایک موہوم سی امید ضرور تھی کہ شاید ابا اس کی پسندیدگی جان کر راحیل کو مثبت جواب دے دیں..... لیکن شاید امی نے ابا کو یہ حقیقت بتائی ہی نہیں تھی کہ راحیل والے رشتے میں زرینہ کی پسند شامل ہے، شاید امی نے صرف پرانی شناسائی کا حوالہ دیا ہو۔ شام کو امی کمرے میں آئیں تو وہ ابھی تک رو رہی تھی، اس کے آنسو کسی طرح خشک نہیں ہو رہے تھے۔ اسے جیسے ساری دنیا سے نفرت ہوگئی تھی..... اس کا دل نہ اٹھنے کو چاہ رہا تھا نہ کسی سے بات کرنے کو..... امی اس کے لیے دودھ کا گلاس لائی تھیں، تپائی پر دودھ رکھ کر انہوں نے پیار سے اسے پکارا اور اس کا کمبل اٹھایا تو اس کا چہرہ رو، رو کر سرخ پڑ گیا تھا۔ امی کو دیکھ کر وہ بے اختیار ان سے لپٹ کر رو پڑی۔ امی نے اسے خود سے لپٹا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر بولیں۔

''بیٹا..... جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں..... تمہارا جوڑا بھی یقیناً حماد کے ساتھ بنا ہوگا..... تبھی تو راحیل کے ساتھ تمہارا رشتہ طے نہ ہو سکا۔''

''لیکن امی.....'' وہ رو کر بولی۔ ''اگر میرا جوڑا خدا نے حماد کے ساتھ بنایا تھا تو راحیل کے لیے میرے دل میں محبت کیوں ڈالی تھی۔''

''بیٹا..... یہ وقتی پسندیدگی ہوتی ہے، یہ شادی کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گی..... تم اپنے رب پر بھروسا رکھو وہ سب ٹھیک کر دے گا۔''

''پر امی..... ابا نے میرے ساتھ بالکل اچھا نہیں کیا..... ان کو چاہیے تھا کہ وہ دونوں رشتے میرے سامنے رکھتے اور میرے انتخاب پر فیصلہ کرتے.....'' وہ سسکیوں کے بیچ بولی۔

''ہاں.....'' امی ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ''ہونا تو ایسا ہی چاہیے تھا۔ لیکن بیٹا تمہارے ابا ایسا نہیں سوچتے، وہ کہتے ہیں کہ بچیوں کی سوچ کچی ہوتی ہے وہ اپنے لیے درست فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ تم دیکھو..... تمہاری بہنوں کے لیے بھی انہوں نے خود ہی فیصلہ کیا تھا..... اور پھر یہ بھی دیکھو زری کہ کوئی بھی باشعور انسان راحیل کے بجائے حماد کا ہی انتخاب کرتا..... تم حماد سے مل چکی ہو..... کیا کمی ہے اس میں جبکہ راحیل کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ایسے..... جان بوجھ کر تمہارے ابا تمہیں دریا میں دھکا تو نہیں دے سکتے تھے ناں.....'' وہ سسکتی رہی اور امی اسے سمجھاتی رہیں..... وہ کیا کہتی، امی کی ساری باتیں صحیح تھیں لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتی جس کی دھڑکنیں راحیل کے نام کی مالا جپ رہی تھیں۔

☆☆☆

ہر طرح کا وقت گزر ہی جاتا ہے..... وہ دن بھی آ گیا جب زرینہ کی انگلی میں حماد کے نام کی انگوٹھی سج گئی اور حماد کی انگلی میں زرینہ کے نام کی۔ امی کی بہت ساری نصیحتوں کا یہ فائدہ ہوا کہ اگرچہ زرینہ کے دل کی دنیا اجڑ گئی لیکن اپنی حرکات و سکنات سے اس نے ظاہر نہیں کیا کہ وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہے۔ موبائل تو اس نے بند کر کے اسی دن سے الماری میں پھینک دیا تھا۔ ظاہر ہے راحیل اور صدف نے بار، بار فون کیا ہوگا بلکہ صدف تو دو بار گھر بھی آئی تھی لیکن امی نے اسے زرینہ سے ملنے نہیں دیا اور آرام سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''صدف بیٹا..... زری کا رشتہ طے پا گیا ہے جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اچھا ہوگا کہ نہ تم اس سے ملو اور نہ ہی راحیل کو کوئی امید دلاؤ کہ یہ زری اور راحیل دونوں کے لیے بہتر ہے ورنہ اس طرح تو دونوں کی زندگی برباد ہوگی۔ نہ تو زری اپنے گھر میں بس سکے گی اور نہ ہی راحیل اسے بھول سکے گا..... شاید دونوں کے نصیب میں ایک دوسرے سے ملنا نہیں تھا..... تو بس دونوں کو اپنے، اپنے نصیب پر صبر کرنا ہوگا۔ یہ ہم سب کے لیے بہتر رہے گا۔''

صدف روتے ہوئے چلی گئی تھی..... جلد ہی زرینہ کی شادی ہوگئی..... اس دوران اس نے راحیل کو بھولنے کی ہر ممکن کوشش کی..... اور بار، بار اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ پوری ایمانداری سے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کرے گی اور اپنے شوہر کی وفادار رہے گی..... حماد شکل صورت کا جتنا اچھا تھا اس سے کہیں زیادہ اس کی

عادات واطوار بے مثال تھیں اس نے زرینہ کو ڈھیروں محبتیں دیں..... ہر آسائش لاتے مہیا کی اس کی ماں بھی ہر وقت زرینہ پر واری صدقے ہوتی رہتیں۔

اتنی ساری محبتیں پا کر زرینہ بہل گئی تھی..... اب وہ گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی تھی۔ حماد کے لیے اس کے جذبوں میں شدت آگئی تھی..... جب بھی آنے آفس سے آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ گھبرا جاتی تھی..... اور اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگ جاتی اور امی اور ابا اسے خوش اور مطمئن دیکھ کر بہت خوش تھے۔ وہ اکثر اس سے ملنے آیا کرتے تھے..... ننھا وسیم جب اس دنیا میں آیا تو گویا زرینہ کی زندگی بالکل مکمل ہوگئی۔ وسیم کے لمس نے اس کے وجود کو ایک الوہی خوشی سے ہمکنار کر دیا..... وہ جب اسے سینے سے لگاتی تو اسے لگتا جیسے دنیا میں اولاد کی خوشی سے زیادہ بڑی کوئی خوشی نہیں۔ وسیم ابھی سال کا پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ پھر امید سے ہوگئی۔ اس بار خدا نے اسے بہت پیاری بیٹی دی۔ حماد کی والدہ بچوں کے نام اپنی پسند سے رکھتی تھیں وسیم بھی انہوں نے اپنی پسند سے رکھا تھا اور بچی کا نام انہوں نے صائمہ رکھ دیا۔

زرینہ نے ایک اچھی بہو کی طرح ہمیشہ اپنی ساس کی خواہش کا احترام کیا..... دونوں بچے زرینہ اور حماد کے ساتھ، ساتھ اس کی ساس کی بھی آنکھوں کا تارا تھے..... زرینہ کی امی اور ابا اب حج پر جانے کے خواہش مند تھے۔ پچھلے دو سال سے وہ درخواستیں دیتے لیکن ابھی ان کا بلاوا نہیں آیا تھا۔ سو وہ صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے۔ صائمہ تین سال کی تھی کہ اچانک ہی زرینہ کی امی اور ابا کا حج کا بلاوا آگیا۔ قرعہ اندازی میں ان کا نام نکل آیا۔ وہ دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے ان کی دلی مراد بر آئی تھی اور مذہبی فریضہ پورا ہونے جا رہا تھا۔ زرینہ شادی کے بعد بہت کم میکے جاتی امی اور ابا خود ہی ملنے آجاتے تھے لیکن اس بار وہ، حماد اور ساس اماں سب خاصے اہتمام سے وہاں گئے ساتھ میں پھولوں کے ہار بھی لے گئے اور ائرپورٹ تک انہیں چھوڑنے گئے۔ باقی بہنیں بھی اپنے شوہروں کے ساتھ ماں، باپ سے ملنے آئی تھیں..... وقتی طور پر ایک اداسی کا سماں چھایا رہا لیکن دل میں خوشی بھی تھی کہ خدا نے ان کے ماں، باپ کی ایک دیرینہ خواہش پوری کر دی تھی۔"

حج کا فریضہ تو اداس ہو گیا تھا مگر مدینہ میں روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں پاک شہر میں ان کی تدفین ہوئی۔ دونوں بہنیں دوسرے شہر..... منتقل ہو گئی تھیں سو زرینہ اپنے میاں اور بچوں میں لگی رہی۔ اس دن آسمان پر کالے، کالے بادل چھائے تھے دن میں شام کا سا سماں لگ رہا تھا۔ اماں، زرینہ سے کہنے لگیں۔

"زری بیٹا..... صحن سے چیزیں اندر کر لو..... بارش پل بھر میں شروع ہونے والی ہے۔"

"جی اماں....." وہ جلدی سے وہ کپڑے تار سے اتارنے لگی... جو صبح دھو کر ڈالے تھے..... ساس اماں چیزیں اندر کرنے میں اس کی مدد کر رہی تھیں اور ساتھ، ساتھ بول بھی رہی تھی۔

"خدا خیر کرے موسم کے تیور خاصے خراب لگ رہے ہیں۔" اتنے میں ایک زوردار کڑک ہوئی اور ساتھ ہی بجلی بڑے زور سے چمکی۔

"بچے کہاں ہیں زری بیٹا....." اماں دہل کر بولیں۔

"اندر ہیں اماں..... سلا چکی ہوں انہیں....."

وہ کپڑوں کا گٹھر اندر رکھتے ہوئے مصروف انداز میں بولی کہ اچانک داخلی گیٹ بڑے زور سے بج اٹھا۔"

"میں دیکھتی ہوں اماں....." زرینہ بولی۔" اس موسم میں کون آ گیا....." وہ خود کلامی کرتے ہوئے گیٹ کھولنے لگی..... باہر کوئی اجنبی کھڑا تھا۔

"وہ جی..... یہ حماد صاحب کا گھر ہے؟"

"جی..... ان کا ہی گھر ہے لیکن وہ گھر پر نہیں ہیں..... آفس گئے ہوئے ہیں۔"

"وہ جی..... ان کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے..... ہم نے انہیں ہاسٹل پہنچا دیا ہے..... آپ کو فون کر رہے تھے، آپ

اٹینڈ نہیں کر رہی تھیں اس لیے گھر کا ایڈریس تلاش کیا..... اور.....'' زرینہ کے ہاتھ پاؤں سے جیسے جان سی نکلنے لگی.....اس کا سر چکرانے لگا اور دل ڈوبنے لگا۔

''وہ.....ٹھیک.....ٹھیک تو ہیں۔'' وہ رندھی آواز میں بمشکل بولی۔

''جی آپ پلیز اسپتال آجائیں۔'' وہ اسپتال کا نام بتا کر کہہ کر چلتا بنا۔اس دوران اماں بھی گیٹ تک آگئی تھیں.....انہیں بھی کسی انہونی کا احساس ہوا..... ایکسیڈنٹ کی بات سن کر وہ چیخنے چلّانے لگیں..... زرینہ خود کو سنبھال کر انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگی۔اماں گھر سے باہر بھاگ رہی تھیں..... اپنے بال نوچ رہی تھیں، زرینہ کی حالت خود غیر ہو رہی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اماں کو کمرے میں لے گئی..... انہیں پانی پلایا اور جب وہ تھوڑی سی سنبھل گئیں تو زرینہ ان سے کہنے لگی۔

''اماں.....خدا پر بھروسا رکھیں.....حماد بالکل ٹھیک ہوں گے ،آپ دعا کیجیے اور بچوں کے ساتھ رہیے.....میں اسپتال جاتی ہوں۔''

''میں.....مجھے.....بھی لے جاؤ.....زری بٹیا۔'' وہ رو رو کر بولیں۔

''نہیں اماں.....بچے گھر میں اکیلے ہیں..... میں جاتی ہوں، وہاں سے آپ کو فون کرلوں گی..... بس آپ دعا کریں کہ دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

اس نے کچھ رقم اپنے ساتھ لی اور گھر سے نکل آئی.....گھر سے اسپتال کا راستہ مختصر تھا لیکن زرینہ کو لگ رہا تھا جیسے یہ بہت لمبا رستہ ہو.....وہ امید اور ناامیدی کے درمیان لٹک رہی تھی.....اس کا دل قطرہ، قطرہ پگھل رہا تھا، ہونٹوں پر مسلسل دعائیں جاری تھیں..... ایمرجنسی کے پاس ہی احسان کھڑا تھا۔ احسان، حماد کے آفس میں کام کرتا تھا۔حماد ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے احسان کو گھر بھیجا کرتا تھا اسے احسان پر بہت اعتماد تھا۔حماد کی دیکھا دیکھی اماں اور زری بھی اسے ہر کام کا کہتیں.....کبھی وہ بجلی والے کو گھر لا کر بجلی ٹھیک کراتا.....کبھی یوٹیلٹی بلز جمع کراتا..... اس وقت بھی زری احسان کو دیکھ کر پُرسکون سی ہو گئی..... احسان لپک کر اس کے پاس آگیا.....اور جلدی سے بولا۔

''بھابی.....آپ.....آپ کو خبر مل گئی میں تو حیران تھا کہ یہ بری خبر میں آپ کو کیسے سناؤں گا۔''

''احسان بھائی.....حماد کیسے ہیں؟'' وہ رندھی آواز میں بولی۔

''خدا کا شکر ہے بھابی کہ اُن کی زندگی بچ گئی..... ورنہ ایکسیڈنٹ بہت ہی برا تھا.....؟'' پھر وہ ایکسیڈنٹ کی تفصیل بتانے لگا.....

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟'' وہ لرزتی آواز میں اس سے پوچھنے لگی.....احسان کے جواب دینے سے قبل کمرے سے ڈاکٹر نمودار ہوئے.....زرینہ دوڑ کر اُن کی طرف گئی۔

''ڈاکٹر صاحب.....میرے شوہر اب کیسے ہیں..... میرا مطلب ہے حماد صاحب..... جو ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوئے ہیں۔''

''اچھا.....وہ.....ان کی زندگی تو بچ گئی ہے..... خدا کا شکر ادا کریں.....'' ڈاکٹر مختصر بات کر کے ایک طرف چلے گئے ،اس نے وہیں کھڑے، کھڑے خدا کا شکر ادا کیا اور موبائل اٹھا کر اماں کو فون کرنے لگی۔

ایک لمبا عرصہ اسپتال میں گزار کر حماد گھر واپس آگیا لیکن اس حالت میں کہ وہیل چیئر اس کی ساتھی بن چکی تھی وہ خود اٹھنے، بیٹھنے سے لاچار تھا۔ جو جمع جتھا تھا اس کے علاج پر خرچ ہو چکا تھا.....لیکن علاج اب بھی جاری تھا اور آہستہ، آہستہ کر کے گھر کی چیزیں بکنے لگی تھیں.....حماد کی اماں ہر حالت میں بیٹے کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتے دیکھنا چاہتی تھی اور زرینہ ان کے ساتھی تھی۔ گھر میں اداسی اور ویرانی پھیلی تھی.....حماد اس قدر ڈپریس ہو گیا تھا کہ وہ ہر وقت سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا۔ زرینہ اس کی دل جوئی کرتی، اس کی خدمت میں وہ کوئی کوتاہی نہ کرتی لیکن حماد جیسے

ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اماں کی وہ چڑیوں کی چہکار کی سی ہی جانے کہاں کھو چکی تھی۔ اب تو اماں اور زرینہ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نمودار نہ ہوتی۔ اماں حماد کو نت نئے ڈاکٹروں اور حکیموں سے ملاتیں وہ اس سلسلے میں لاکھوں روپے خرچ کرتی اور تب تک ایک وقت ایسا آیا کہ ان کا گھر بک گیا۔ زرینہ اگرچہ دل سے نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بچوں سے گھر کی چھت چھن جائے لیکن حماد بھی خاموش تھے اور اماں کی تو ایک ہی دُھن تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے...... بس حماد ٹھیک ہو جائے...... اماں، زرینہ کو تسلی دیتیں کہ حماد ٹھیک ہو جائے گا تو یہ سب پھر آ جائے گا۔ حماد جب صحت مند تھا تو اس نے ایک اچھے اسکول میں وسیم کا داخلہ کرایا تھا لیکن اب بچی بھی بڑی ہو گئی تھی اور اسے بھی داخل کرانا تھا۔ حماد اور زرینہ دونوں اپنے بچوں کو اچھی ایجوکیشن دینے کے خواہش مند تھے لیکن اب یہ ممکن نہ تھا، گھر بک گیا انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر کرایے پر لے لیا اور تب وسیم کو بھی پرائیویٹ اسکول سے اٹھا لیا اور دونوں بچوں کو قریب کے سرکاری اسکول میں داخلہ دلا دیا۔

اس دن حماد بہت ڈسٹرب تھا وہ مسلسل رو رہا تھا خود زرینہ کی بھی بری حالت تھی وہ بھی کئی بار اماں اور حماد سے چھپ کر رو چکی تھی لیکن حالات کا تو مقابلہ کرنا تھا...... زرینہ کی نہ تو اتنی تعلیم تھی کہ اسے کوئی اچھی جاب ملتی اور نہ ہی گھر کی ذمے داریاں اسے گھر سے باہر قدم نکالنے دیتیں...... سارا دن وہ گھر کے کاموں اور بچوں کے کاموں میں مصروف رہتی اور حماد کو تو قدم، قدم پر اس کے ساتھ کی ضرورت پڑتی...... وہ ایک گھنٹے میں کئی، کئی بار اسے آوازیں دیتا اور وہ سارے کام چھوڑ کر بھاگ کر اس کے پاس آتی زندگی گھن چکر بن چلی تھی۔ اسے اپنے کپڑوں کا ہوش رہتا نہ کھانے کا...... بس زندگی مسلسل کام کی تفسیر بن چکی تھی۔

جانے آج کتنی مدت بعد وسیم اور صائمہ نے پارک جانے کی فرمائش کر دی۔ وہ اور حماد اکثر بچوں کو پارک لے جایا کرتے تھے جہاں بچے کھیلتے، کودتے، آئس کریم کھاتے اور وہ اور حماد قریبی بینچ پر بیٹھ کر بات چیت کرتے اور بچوں کو اچھل کود کرتے، بھاگتے دوڑتے دیکھ کر خوش ہوتے۔ اب تو جیسے سارا منظر نامہ ہی بدل گیا تھا...... اس نے اپنے آنسو پیتے ہوئے نرمی سے بچوں کو جواب دیا۔

''بیٹا...... تمہارے ابو بیمار ہیں...... انہیں چھوڑ کر کیسے پارک جا سکتے ہیں...... تم دونوں گھر میں ہی کھیلو ناں......'' بچے تو اداس ہو کر خاموش ہو گئے اماں اور حماد قریب ہی بیٹھے تھے اماں کو بچوں کی اداسی چبھ سی گئی سو وہ بولیں۔

''لے جاؤ بیٹا بچوں کو پارک...... میں حماد کے ساتھ ہوں۔''

''ہاں، میری بیماری میں بچوں کا کیا قصور ہے، لے جاؤ انہیں...... خوش ہو جائیں گے۔'' حماد بھی بولا۔

دونوں کی رضامندی دیکھ کر وہ جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ بچے ہنسی خوشی تیار ہونے چل دیے...... جس پارک میں وہ ہمیشہ جایا کرتے وہ پہلے والے گھر سے قریب تھا لیکن اب اس گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ زرینہ نے رکشا روکا اور بچوں کے ساتھ پارک پہنچ گئی۔ بچے کافی وقت کے بعد پارک آئے تھے سو وہ خوشی سے چھلانگیں مارتے جھولوں کی طرف دوڑے...... زرینہ بچوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ بچے ایک جھولے سے دوسرے کی طرف بھاگ دوڑ رہے تھے۔ زرینہ کھڑے، کھڑے تھک گئی تو قریب کی بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اسے شدت سے رونا آیا۔ کبھی حماد بھی اس کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا...... وہ دونوں آپس میں گپ شپ لگاتے اور بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر خوش ہوتے رہتے...... لیکن اب تو جیسے خوشیوں کا موسم بیت گیا تھا...... زرینہ کو لگا جیسے اس کی زندگی خزاں کے زرد پتوں جیسی ہو گئی ہے اس نے اپنے حلیے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی تو اسے لگا جیسے وہ کسی کے گھر کام کرنے والی ماسی ہے ایک ٹھنڈی، ٹھنڈی آہ اس کے لبوں پر دم توڑ گئی۔ رش بڑھ گیا تھا۔

بچے کھیل کھیل کر تھک گئے تھے اب انہیں بھوک لگنے لگی تھی وہ دوڑ کر اماں کی طرف آگئے، اور بھوک، بھوک کی صدائیں لگانے لگے..... پارک کے ایک کونے میں خاصی بڑی کینٹین بنی ہوئی تھی۔

''مما..... میں زنگر برگر کھاؤں گا۔'' وسیم مچل کر بولا۔

''اور میں بھی.....'' صائمہ بھی فوراً بولی.....

زرینہ نے انہیں تو کوئی جواب نہیں دیا آگے بڑھ کے کینٹین والے سے برگر کی قیمت پوچھی۔

''500 روپے کا جی۔'' وہ مصروف انداز میں کہتا ہوا دوسری طرف گھوم گیا..... زرینہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا..... دو برگر 1000 روپے کے آتے تھے اور زرینہ کے پاس 600 روپے تھے جس میں اتنے پیسے بچنے چاہیے تھے کہ واپسی کا کرایہ بھی ہو جاتا..... وہ تھوک نگلتے ہوئے بچوں کو پھسلانے لگی کہ وہ کوئی اور چیز لے لیں..... برگر تو پرانے ہوتے ہیں پیٹ خراب کر دیتے ہیں وغیرہ، وغیرہ..... لیکن بچے بھی بضد تھے کہ وہ برگر ہی کھائیں گے اتنے میں کسی نے اسے آواز دی تو اس نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ یہاں کون ہے جو اسے پہچانتا ہے..... لیکن اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا..... اس کے پیچھے صدف کھڑی تھی۔ لیکن وہ تو پہچانی نہیں جا رہی تھی..... قیمتی کپڑے، نوک پلک سے بنی سنوری جیسے گڑیا ہو۔ دونوں حیرت کے جھٹکوں سے سنبھل پائیں تو ایک دوسرے سے لپٹ گئیں..... وہ صدف کو اور صدف اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی..... دونوں کی حیرت کی نوعیت مختلف تھی۔ صدف کا چہرہ چمک رہا تھا اس کے کپڑے قیمتی تھے جبکہ زرینہ کا چہرہ بجھا، بجھا تھا..... کپڑے معمولی ملگجے تھے، بولنے میں پہل صدف نے کی۔

''زری..... تمہیں کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے ناں.....؟'' وہ نہایت حیرت سے پوچھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ وہ اپنی پیاری دوست زری سے ہی مخاطب ہے..... زری نے ڈھیر سارے آنسو اپنے اندر اتار لیے اور ابھی اسے جواب نہیں دے پائی تھی کہ ایک صائمہ کی عمر کی بچی جھولوں کی طرف سے بھاگتی ہوئی آئی اور صدف سے کہنے لگی۔

''پھپھو..... مجھے زنگر برگر کھانا ہے۔'' اس بچی کی دیکھا دیکھی صائمہ بھی ضد کرنے لگی۔

''مما مجھے بھی زنگر برگر کھانا ہے۔''

''چلو..... میں آج تم سب کو زنگر برگر کھلاتی ہوں.....'' صدف نے صائمہ کو پیار کرتے ہوئے تو زرینہ جلدی سے بولی۔

''نن..... نہیں وہ دراصل..... ان کے پیٹ ٹھیک نہیں ہیں صدف.....'' وہ بمشکل بولی۔

''ارے چھوڑو..... اتنے پیارے بچے ہیں تمہارے..... کچھ نہیں ہوتا..... چلو بچو.....'' وہ تینوں بچوں کو ساتھ لے کر کینٹین کی طرف بڑھی..... زرینہ کا دل اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔

''کیا یہ بچی راحیل کی بیٹی ہے؟'' اس کا دل بار، بار اس سے پوچھ رہا تھا..... ''اگر ہاں تو..... یہ کایا کیسے پلٹ گئی..... ان کے انداز سے تو بالکل غربت عیاں نہیں ہو رہی..... بچی کا لباس اور جوتے ہزاروں کے لگتے ہیں اور صدف کا بھی لگتا ہے کسی امیر کبیر فیملی سے تعلق ہے.....'' اسے یہ بات بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ اس کے بچوں کو صدف برگر کھلائے اور ان پر خواہ مخواہ اتنے پیسے خرچ کرنے..... وہ انہی سوچوں میں گم تھی۔ تینوں بچے مزے سے ہنستے مسکراتے اور برگر کھاتے ہوئے آ رہے تھے۔

''بچو..... اب تم آپس میں دوست بن گئے ہو اس لیے چلو اب مل کر کھیلو..... تب تک میں اور تمہاری مما باتیں کرتے ہیں۔'' وہ زرینہ کے ساتھ بینچ پر بیٹھتے ہوئے بچوں سے بولی۔

''ہاں زری..... اب اپنے متعلق بتاؤ.....'' وہ اب اس سے مخاطب تھی۔ بچے کچھ فاصلے پر کھڑے برگر انجوائے کر رہے تھے۔

''ویسے جہاں تک میں نے سنا تھا... تمہاری شادی بڑے کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی ہے

لیکن.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے چپ ہوگئی۔ زرینہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری..... کافی دیر تک تو اس سے کچھ بولا نہیں گیا..... پھر وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہ پوچھو صدف..... بس یوں سمجھو جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے..... میں شاید تقدیر ہی ایسی لکھوالائی تھی کہ سب الٹ پلٹ ہوگیا.....'' پھر اس نے ساری کہانی صدف کو سنا ڈالی..... اپنی بہت پیاری دوست کی کہانی سن کر صدف کا دل دکھ سے بھر گیا..... آخر میں زرینہ روتے ہوئے بولی۔

''امی، ابا ہوتے تو ان سے ایک چھوٹا سا شکوہ ضرور کرتی کہ کاش وہ میرے نصیب کے اچھا ہونے کی دعا کرتے..... میرے لیے اپنا گھر اور لڑکے کی جاب کی شرط نہ رکھتے۔ دیکھو..... اب کچھ نہیں رہا..... اپنا گھر نہ جاب.....'' صدف کے آنسو اس کے اندر گر رہے تھے بظاہر وہ زرینہ کو تسلی دے رہی تھی لیکن اس کا اپنا دل خون کے آنسو رو رہا تھا پھر زرینہ کی آنکھوں میں مچلتے سوال دیکھ کر اس نے سمجھ لیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے سو اس نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''بھائی تمہاری شادی کے بعد بالکل پاگل سے ہو کر رہ گئے تھے انہیں کسی کام، کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی وہ جو سارا دن جاب کے پیچھے پھرتے رہتے..... اب انہیں بھی کچھ پروا نہیں تھی..... ایسے میں ان کے ایک دوست نے انہیں ملک سے باہر جانے کے لیے کہا ان کا دوست خود بھی جا رہا تھا۔ اماں نے یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ شاید اس طرح وہ تمہاری جدائی کے غم کو بھلا سکیں..... ان کے دوست نے بھائی کی بہت مدد کی..... مالی بھی اور جذباتی بھی..... وہ کینیڈا چلے گئے اور پھر کچھ عرصہ تو خیر لگ گیا اُن کو وہاں سیٹ ہونے میں لیکن پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ بھائی کو بہت اچھی جاب مل گئی اور وہ ہمیں بہت سارے پیسے بھیجنے لگے۔ فون پر بات بھی کرتے تو لہجے میں اطمینان جھلکتا۔ نئے ماحول اور نئے ملک نے انہیں تمہارے غم سے نکلنے میں بہت مدد دی۔ ابھی پچھلے سال انہوں نے اپنے لیے نیا مکان بھی خرید لیا ہے..... میری بھی ابھی چند ماہ پہلے ہی شادی ہوگئی ہے۔ بھائی کے دوست نے ایک اچھے خاندان کی ایک اچھی لڑکی سے بھائی کی وہیں شادی کرا دی۔ اب بھائی کے دو بچے ہیں ایک بیٹی اور ایک بیٹا..... وہ ابھی چند روز پہلے ہی پاکستان آئے ہیں..... ان کی بیگم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سو وہ اپنے بیٹے کے ساتھ گھر پر رک گئیں..... میں گڑیا کے ساتھ یہاں پارک میں آگئی ہوں..... بھائی بھی ساتھ ہیں..... اُن کا ایک پرانا دوست انہیں مل گیا سو وہ ان سے باتوں میں لگ گئے تو میں گڑیا کو لے کر کینٹین کی طرف آگئی۔'' یہ سب سن کر زرینہ کا دل جیسے ڈوب کر رہ گیا۔

''کیا کھیل ہیں تقدیر کے۔'' وہ جیسے خود سے بولی۔

''ابا..... کاش..... آپ بیٹی کے رشتے کے ساتھ یہ مکان اور جاب کی شرائط نہ رکھتے بس اچھے نصیب کی دعا دیتے..... تو آج میں اس طرح تہی دامن تو نہ ہوتی۔''

''زری.....'' صدف نے اس کا ہاتھ تھام کر دکھ بھرے ملتجی لہجے میں کہا۔

''ایک درخواست کرتی ہوں..... خدارا تم بھائی سے نہ ملنا کہیں ان کے پرانے زخم اُدھڑ جائیں..... وہ بڑی مشکل سے سنبھلے ہیں..... تمہیں اس حالت میں دیکھ کر وہ ٹوٹ جائیں گے۔'' ڈھیر سارے اشکوں کو پیتے ہوئے زری نے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈھیر آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتارتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کاش..... والدین اپنی بیٹیوں کی شادی کرتے ہوئے ان کے اچھے نصیب کی دعائیں کریں اور یہ سوچ لیا کریں کہ دولت ہاتھ کا میل ہے جو ہمیشہ ساتھ نہیں دیتا۔

بچے رکشے میں بیٹھے آپس میں چہلیں کر رہے تھے جبکہ وہ سڑک پر دوڑتی اس لمبی کار کو دیکھ رہی تھی جس میں راحیل، صدف اور اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور جو ریڈ بتی پر رک گئی تھی۔

❁❁❁

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت . . . اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ حسین جذبے . . . کہیں یہ پھولوں پر ساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں . . . غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے . . . لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے . . . اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے

ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے

وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں عالی کی باتوں میں ہمیشہ ''وہ'' موجود ہوتا۔ وہ ایسا ہے..... وہ ایسا ہے لیکن عمائم نے کبھی اس کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ عالی بہت حسن پرست تھی شاید اسی لیے وہ عمائم کے ساتھ تھی۔ عمائم، حریم سے لیپ ٹاپ مانگتی ہے تو ایمان وہیں کھڑا تھا اور احتشام باہر سے آیا تھا جب حریم واپس لیپ ٹاپ لینے آتی ہے تو عمائم کہتی ہے کہ ایمان کو شکریہ کہنا تو وہ بتاتی ہے کہ لیپ ٹاپ احتشام کا ہے اس پر عمائم حیرت زدہ رہ جاتی ہے، عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دو لوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور اموجان اور تیسری شخصیت دادی پھپھو۔ وہ بچپن سے اپنے ساتھ ایسا سلوک ہوتے دیکھ رہی تھی مگر حیران کن بات تھی کہ وہ اس بات کی وجہ سے ناواقف تھی۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ حرم نے عمائم کو بتایا کہ ایمان نے ماما سے کہا ہے کہ تائی امی سے عمائم کا رشتہ مانگیں۔ ایمان، عمائم سے کہتا ہے کہ وہ اموکو راضی کرے گا تو عمائم کہتی ہے کہ یہ بات تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھی جائے گی۔ ثریم، عمائم کو اپنی بہن کی شادی پر بلاتی ہے، نورس، عمائم کے ذمے نمائش کا کام کرتی ہے اس کی کامیابی سے ملنے والے پیسے سے یتیم لڑکیوں کی شادی ہوگی۔ اموعمائم سے کہتی ہیں کہ ایمان کبھی اس کا نہیں ہوگا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ چاہتی ہیں کہ ماہم کا رشتہ احتشام کے لیے مانگ لیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ضرور مانگیں مگر اذان کے لیے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ بسمہ چاچی بعد میں عمائم سے معافی مانگتی ہیں کہ یہ دن ہی ایسا ہے شاید تو وہ پوچھتی ہے آج کیا دن ہے تو بسمہ چاچی کہتی ہیں جیل والوں کی ملاقات کا دن۔ جس پر عمائم دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جیل میں کون ہے۔ عمائم، نورس کے ساتھ ثریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور عالی کہتی ہے کہ تم چلی جاؤ میں ایک کام میں پھنس گئی ہوں۔ نورس اپنی گاڑی چھوڑ کر گئی تھی۔ ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوٹس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ صبح وہ امی کو بتاتی ہے کہ میرے ڈاکومنٹس چوری ہوئے ہیں جو امانت تھے۔ ثریم، عمائم سے پیکٹ کا پوچھتی ہے تو بتاتی ہے کہ پیکٹ چوری ہوگیا ہے۔ ثریم، عمائم کو بتاتی ہے کہ پیکٹ میں نوٹس نہیں تھے کچھ اور تھا اور اگر وہ نہ ملا تو تمہارے اور میرے لیے تباہی ہے۔ عمائم، جامعہ جانے لگتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے جہاں جارہی ہو بے فائدہ ہے واپس آجاؤ۔ عالی کا اس کے پاس میسج آتا ہے کہ نورس نے اسے اسٹرک آف کر دیا ہے۔ عمائم، نورس کو کال کرتی ہے تو وہ اٹینڈ نہیں کرتی میسج کرنے پر کال کرتی ہے تو کہتی ہے مجھے وہ پیکٹ ہر صورت میں چاہیے۔ عالی، احتشام کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ عالی کہتی ہے کہ اس نے احتشام سے بات کی ہے اس کی اپروچ بہت اوپر تک ہے، بات بڑھ گئی تو نورس نہیں چھوڑے گی۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے احتشام اور عالی کے ڈرامائی ملاپ سے پریشان ہو تو وہ حیران رہ گئی۔ عمائم جامعہ جاتی ہے تو گارڈ ڈھائی گھنٹے بعد اسے اندر جانے دیتا ہے، نورس کہتی ہے وہ پیکٹ تمہارے گھر سے غائب ہوا ہے تم کو وہ پیکٹ گم ہونے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ نورس کو ہر صورت وہ پیکٹ چاہیے تھا، وہ عمائم کو معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے عمائم کے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ آج جامعہ میں رہے گی۔ عمائم سے اصلی بات جاننے کے لیے نورس، ثریم کو عمائم کے پاس بھیجتی ہے۔ انتظامیہ کی ہیڈ اسے کھانے کی ٹرے میں چھپا کر ایک پرچہ بھی دیتی ہے جس پر محمد غوری کا تاریخی واقعہ لکھا تھا۔ عمائم کو اس کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو ٹیرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ اذان کی کسی غلطی سے ان کے کوڈ ڈی کوڈ ہو جاتے ہیں تو احتشام اس پر بہت غصہ کرتا ہے۔ اموجریم کو بتاتی ہیں کہ عمائم کی وجہ سے ایمان ان سے بات نہیں کر رہا، ان کی یہ بات ماہم سن لیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج ایمان تو کل کوئی اور بھی عمائم کے لیے کھڑا ہوگا۔ ثریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی ہے۔ عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہوگئی وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار..... احتشام، روشان کو بتاتا ہے کہ کوڈ ڈی کوڈ ہو گئے ہیں اب محتاط رہنا ہوگا۔ عمائم، ام رومان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے

سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔عامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہو گی۔طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔لیکن عامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے پا کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عامہ، شام کو طیش دلانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عمامے اور اپنی عزت سے بہت پیار ہے۔تم واپس لوٹ جاؤ۔فیقہ اور عامہ کی رخصتی ایک ساتھ طے کر دی گئی۔

طابہ (بھاوج) عامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، وہ اسے مجبور کرے گی تو وہ ضرور بولے گا۔عامہ کہتی ہے کیا وہ سول میرج کے لیے مان جائے گا اور کیا وہ عامہ کا ساتھ دے گی تو طابہ معذوری ظاہر کرتی ہے اور کہتی ہے میں تقی سے بات کروں گی۔عامہ، طابہ کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔

عامہ فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عامہ حادثاتی موت کا شکار ہوگئی ہے۔آپ بارات مت لائیے گا۔عامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں وہ اس پر غصہ کرتی ہیں وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کر لی۔فرخ (منگیتر عامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہو جاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہو گئیں۔شمسہ بھابی، عامہ کو کہتی ہیں کہ طابہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔عامہ کا کالج میں ایڈمیشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔طابہ اپنے شوہر تقی سے کہتی ہے کہ فیقہ کو شام اور عامہ کے حوالے سے کچھ شبہات ہیں تو تقی کہتا ہے کہ شام جس سے بھی بات کرے وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھیں گی۔عامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عامہ کے لیے گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔منصور سیال، شام کو بتاتا ہے کہ وہ فیکٹری گیا تھا اور وہاں تقی نے اس کی پٹائی کر دی تھی۔منصور سیال پھر فیکٹری جاتا ہے اور منیجر سے شام کی تنخواہ مانگتا ہے تو وہ اسے منع کر دیتا ہے۔لیکن وہ شام سے دس ہزار لے کر ہی جاتا ہے۔عامہ، منصور سیال کے بارے میں تصدیق کرتی ہے تو شام اسے جھڑک دیتا ہے۔کالج کے اندر جانے سے عامہ گھبراتی ہے تو وہاں اسے سونیا ملتی ہے۔سونیا کے ساتھ عامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہو جاتی ہے۔سونیا جب عامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔عامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ کا یہ حشر کیسے ہوا وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔دادی، شام کو عامہ کی ذمے داری اٹھانے سے منع کرتی ہیں تو وہ کہتا ہے مجھے صالح بھیا نے کہا تھا وہ منع کریں گے تو میں اسے لے کر نہیں جاؤں گا۔عامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ پھپھو بہت پیاری تھی ان کی دوست نے ان کے منہ پر کوئی کریم لگا دی جس سے ری ایکشن ہوا اور گھر والوں نے اس کا صحیح علاج نہیں کرایا جس کی وجہ سے ان کی یہ حالت تھی کہ چہرہ عجیب سیاہی مائل ہو گیا تھا..... طابہ، عامہ سے کہتی ہے کہ تم تقی کو سب کچھ بتا دو..... سونیا، عامہ سے کہتی ہے کہ وہ فیقہ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے کہ وہ نارمل ہو جائے۔منصور سیال کا فون آتا ہے تو عامہ، شام کو بلانے جاتی ہے تو وہ اسے ڈانٹتا ہے کہ تم نے یہ کال کیوں سنی۔تقی، شام کو بتاتے ہیں کہ فیکٹری کے سامنے پلاٹ کا جو کیس تھا وہ ہار گئے ہیں اور وہ پلاٹ منصور سیال نے لیا ہے اور اب وہ ان کے مقابل آ کر بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ صوفی صالح نے رابعہ کے ساتھ (شام کی ماں) منصور سیال کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل کی شکل دکھائی تھی۔اور شام کو خود لے آئے تھے۔تاج بیگم، شام سے کہتی ہیں کہ وہ تین مہینے کے بعد فیقہ سے اس کی شادی کر دیں گی وہ تیار رہے۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 10

یہ سرکاری عمارتوں جیسی بوسیدہ سی بلڈنگ تھی۔جگہ، جگہ سے پینٹ اکھڑا ہوا، خارش زدہ سی دیواریں، عمارت قریب دو منزلہ تھی۔نچلا حصہ فوج داری کے مقدمات کے لیے مختص تھا۔یعنی فوج داری کے کلائنٹ نچلے حصے تک محدود تھے۔اوپر والا حصہ دیوانی مقدمات کے لیے مخصوص تھا۔اوپر صرف وہی کلائنٹ جاتے تھے جن کے دیوانی کیس پھنسے ہوئے تھے۔

سلیم ہمدانی کے چیمبر سے ہوتا ہوا وہ فضول گندی سی بل دار سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔کاؤنٹر پر ایک بابا اونگھ رہا تھا۔وہ اس بابے کو آنکھیں دکھا کر ریسپشن تک آیا۔ایک موٹی سی گہری سانولی آنٹی ٹائپ خاتون اسے دیکھ کر دل

آویزی سے مسکرائی تھی۔ یہ وہی ''آنٹی'' تھی جس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اس نے مس وکیل صاحبہ کے ہتھے اپنا کیس چڑھا دیا تھا۔ نتیجتاً آج وہ ''لڑنے'' کے لیے محترمہ کے چیمبر پہنچ چکا تھا۔ وہ بالشت بھر کی ''کبوتری'' اس کے ہاتھ سے بچنے والی نہیں تھی۔ اتنی بھاری فیس ہڑپ کر کے ایک لفظ ''سوری'' اس کے منہ پر مارا اور چلتی بنی۔ آج وہ پچھلے حساب بے باق کرنے آیا تھا۔

آنٹی نے مسکرا کر اسے ویلکم کہا۔

''مس ہمدانی تو میٹنگ میں ہیں۔'' اس نے ڈیلے چرا کر واضح جھوٹ بولا تھا۔ سامنے بھی طاہر تھا۔ بال کی کھال اتارنے والا۔ اس کے جھوٹ کو پکڑ کر بولا۔

''کیسی میٹنگ؟ کہاں کی میٹنگ؟ کیا اپنے آپ سے میٹنگ کر رہی ہے۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''دیکھیے سر۔'' آنٹی منہ میں شرینی گھولنے لگی تھی طاہر نے بیچ میں سے بات اچک لی۔

''دیکھنے تو آیا ہوں۔ اگر تم دیکھنے دو تو۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''آپ پہلے وجہ بتائیں..... کیوں ملنا چاہتے ہیں؟'' آنٹی نے عقل کا سوال کر ہی لیا تھا۔ طاہر نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''فیس واپس لینے۔'' اس کی بے نیازی قابلِ دید تھی۔ آنٹی کے ڈیلے ابل پڑے تھے۔ جیسے بڑا دھچکا لگا ہو۔

''وہ تو نہیں ملے گی۔'' آنٹی نے بمشکل کہا۔

''کیوں نہیں ملے گی؟ میں تمہیں لے کر دکھاؤں گا۔'' اس نے آنٹی کے ڈیلوں میں دیکھ کر چیلنج کیا تھا۔

''بڑے، بڑے سورماؤں کو واپس نہیں ملی۔ تم کہاں کے بیچارے ہو۔'' آنٹی منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

''غضب خدا کا، کوئی پہلی پیشی میں شفعہ ہار جاتا ہے؟'' طاہر کا اندر جل رہا تھا۔ تقی کی گالیاں یاد آرہی تھیں۔ اوپر سے منصور کی فون کال۔ جس میں اس نے مقدمہ ہارنے پر ''تعزیت'' کی تھی۔ طاہر کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اندر موجود اس پرکٹی کبوتری کے سارے پر کتر دے۔

''آئی ایم سوری۔'' مس ہمدانی نے سر جھکا کر کہا تھا۔ بالآخر طاہر اس نازک اندام ناکام وکیل مس ہمدانی سے مل لیا تھا۔ طاہر جاتے، جاتے ذرا پلٹ آیا۔ آنکھوں میں استعجاب تھا۔ اس ''سوری'' کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ سو وجہ معلوم کرنا ضروری تھا۔

''آپ چاہیں تو ہاف فیس واپس کر سکتی ہوں۔'' وہ رو دینے کو تھی جیسے فیس کی واپسی سے جان نکل رہی تھی۔

''ویسے آج تک کسی کو کی نہیں ہے۔'' مس ہمدانی کی پھر سے آواز آئی تھی۔ ''آپ کے لیے سابقہ ریکارڈ توڑ سکتی ہوں۔'' اس نے گویا طاہر کی پچھلی تمام نسلوں پر احسان کیا تھا۔ وہ ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ دل نے ایک ساتھ بہت سی ہیٹ مس کی تھیں۔ وہ دل کی بدلتی کیفیات پر حیران نہیں تھا۔ اس دل دغا باز نے پہلے بھی کورٹ میں یہی حشر سامانی کی تھی۔ تبھی وہ ہارے کیس کو بھول کر گھر چلا گیا تھا۔

''بڑی مہربانی۔'' طاہر نے پسیجے دل کے ساتھ کہا۔ ''آدھی فیس کا احسان میری جان پر مت دھرو۔ بلکہ اس فیس سے ڈھنگ کے دو صوفے خرید لو۔ کوئی بھولا بسرا ''مرغا'' اگر پھنس بھی جائے تو کم از کم بیٹھنے کی کوئی جگہ تو ہو۔'' اس نے بڑا مخلصانہ مشورہ دیا تھا جو محترمہ کو دل و جان سے پسند آگیا تھا۔

''میں ایسا ہی کروں گی، آپ کا شکریہ۔'' وہ کھل پڑی۔ کیونکہ کلائنٹ فیس واپس لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کی جان میں جان آگئی تھی۔ طاہر ذرا سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ پھر کافی دیر کی ''بچار'' کے بعد بولا۔

''مس ہمدانی! ایک بات بتاؤ۔'' اس کا انداز بڑا سنجیدہ قسم کا تھا۔ مس ہمدانی سابقہ ہونق پن بھلا کر ہمہ تن گوش

ہوئی تھی۔

''فرمایئے، مطلب پوچھیے۔'' اس نے اخلاق کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تم نے میرا مقدمہ کیوں ہارا؟'' طاہر نے سابقہ سنجیدگی سے وضاحت پوچھی تھی۔ مس ہمدانی کی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔ چہرے پر پھیکے تاثرات پرنٹ ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں سائے سے لہرائے تھے یا پھر طاہر کو ہی محسوس ہوئے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''وہ کیا ہے ناں، مسٹر طاہر صمدانی! میں نے آج تک کوئی مقدمہ جیتا ہی نہیں۔'' وہ بڑی معصومیت سے طاہر کے سر پر بم بلاسٹ کر چکی تھی۔ طاہر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ چہرے پر حیرت بکھر گئی۔

''اس دفعہ بھی سابقہ ریکارڈ برقرار رکھا ہے اور مجھے اس پر فخر ہے۔'' مس ہمدانی نے اپنے ''فخر'' کی وضاحت نہیں کی تھی۔ تاہم طاہر کو بڑے زور کا چکر آیا تھا۔ وکیل صاحبہ اس کو چکراتے دیکھ کر پانی لینے کے لیے بھاگی تھیں۔

☆☆☆

دھوپ صحن میں چکراتی پھر رہی تھی۔ ظہر کے بعد پورے گھر پر سکوت طاری ہو جاتا تھا۔ بھابیاں، بچے سب کمروں میں گھس جاتے۔ یہ وقت بڑا خاموش اور اداس کر دینے والا ہوتا تھا۔ جیسے کائنات سکوت میں سمٹ رہی ہو۔ گھر میں بکھرا سناٹا اس کی روح میں بھی اتر جاتا تھا۔ وہ بولائی، بولائی سی اندر باہر چکراتی رہتی۔

اس وقت وہ کچن میں کھڑی تھی۔ جالی کی ساری کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ باغیچے کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔ عمامہ کے منال املتاس کے نیچے اونگھ رہے تھے۔ یہ منال، طاہر لے کے آیا تھا۔ عمامہ کو پسند تھے سو آ گئے۔ اس کے بھائی زندگی بھر سے عمامہ کی فرمائشیں پوری کرتے آ رہے تھے۔ بڑے بھی اور چھوٹے بھی۔

بھائی تو اس کا بھی موجود تھا مگر عمروں کے وسیع فرق کی بنا پر وہ اپنے اکلوتے بھائی سے فاصلے پر رہتی تھی۔ اس نے صالح بھیا کو بھائی کم باپ زیادہ پایا تھا۔ سو بے تکلفی تو کبھی نہیں تھی۔ کچھ اپنی زندگی میں ہونے والے اس حادثے کی وجہ سے وہ اہلِ خاندان سے کٹ چکی تھی۔ بہت کم گھر والوں کی محفلوں میں شریک ہوتی۔ بہت کم بولتی، بہت کم ہنستی تھی۔ اس نے وقت سے پہلے خود پر بڑھاپا طاری کر لیا تھا مگر یہ خول تب چٹخ گیا جب اچانک اماں نے اس کی زندگی کے رنگ ایک فیصلے سے اتار دیے تھے۔ وہ خوش کم حیران زیادہ تھی۔ اماں نے فیصلہ کیا اور اس پر قائم ہو گئیں۔ حالانکہ فیقہ نے دبی، دبی آواز میں کہا بھی تھا۔

''اماں! شام مجھ سے چھوٹا ہے۔ یہ رشتہ بے جوڑ نہیں۔ وہ اتنا مکمل اور میں ادھوری..... بدنما۔'' وہ بھیگی آواز میں تلخی سے کہتی رہی تھی مگر اماں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اپنی مرضی کا فیصلہ کیا اور فیقہ کی شام کے ساتھ شادی طے کر دی تھی۔ حالانکہ یہ شادی اس کی بدقسمتی سے ہو ہی نہیں سکی۔ وجہ کوئی بھی ہو، شادی رک تو گئی تھی۔ اگر ہو جاتی؟ اس کے دل کی دھڑکنوں میں اسی سوچ سے تلاطم آ جاتا تھا۔ شام سے رشتہ بدلا تو سوچ، خیال، خواب بھی بدل گئے۔ اندر جو شام سے زیادتی کا احساس پنپ رہا تھا خود بخود مٹ گیا۔

''یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ شام کو اعتراض ہوتا تو انکار کرتا۔'' اماں نے کہا تھا۔ وہ اماں کے بہلاوے میں آ گئی تھی۔ بات تو درست تھی، اگر شام کو اعتراض ہوتا تو فیقہ کو ریجیکٹ کر دیتا۔ وہ دل سے مطمئن ہو گئی تھی پھر بھی شام اور عمامہ کو دیکھ کر اس کا دل بند ہونے لگتا تھا۔ شام کی جھکی، جھکی نگاہوں کے نیچے بکھرتے رنگ اور آنکھوں سے چھلکتی ''بوئے گل'' عمامہ کے پیروں سے لپٹتی تھی اور پیروں میں ہی بسیرا کر لیتی۔ وہ ایک احساس کیا تھا؟ عمامہ کی آنکھ سے پگھلتا ہوا شام کی پلکوں پر بکھرتا ہوا۔

فیقہ اس احساس سے نگاہ چرا لیتی تھی۔ کیا تھا۔ اگر تھوڑا خود غرض ہو جاتی۔ اس دور میں ہر بندہ اپنا فائدہ ہی

سوچتا ہے۔ اپنے فائدے کے لیے اتنے بڑے، بڑے گناہ کر لیتا ہے۔ سو فیقہ کوئی گناہ تو نہیں کر رہی تھی۔ اپنی ماں کے حکم پر سر جھکانا گناہ کے زمرے میں تو نہیں آتا ناں؟ انسان کے پاس ہزار تاویلیں اور ہزار دلیلیں ہوتی ہیں۔ جہاں مرضی اپنے مفاد کے لیے فٹ کر لے۔

حالانکہ اماں کی ''خواہش'' سے پہلے شام اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ محض ایک خالہ زاد بھائی تھا۔ طاہر، اس کے بھتیجے سے بھی چھوٹا۔ بہت خوب صورت، معصوم اور کم گو سا۔ فیقہ کو بھی بہت پیارا لگتا تھا۔ کیونکہ شام کی زندگی میں باپ کے نام کی ایک ٹریجڈی موجود تھی۔ ایک گندا، برا اور غلیظ سا حوالہ۔ بیچارے کی ماں بھی نہیں تھی۔ سو فیقہ کی ہمدردی شام کے لیے بہت تھی۔ وہ ٹوٹے خاندان کا بچہ تھا۔ تنہا تھا، اکیلا تھا۔ سو اس گھر میں سب نے ہی شام کے بہت ناز اٹھائے تھے۔

شام کی اس کے ساتھ بچپن کی منگنی تھی یا نہیں؟ اس حوالے سے فیقہ کو کچھ پتا نہیں تھا تاہم اماں نے اس کے ذہن میں یہ بات جمادی تھی کہ وہ شام کی بچپن سے منگیتر ہے۔ اگر اماں کہہ رہی تھیں تو ایسے ہی ہوگا۔ وہ گہرائی میں جانے کا تردد کیے بغیر شام کے رشتے پر بہت خوش تھی یا پھر خوش ہونا سیکھ رہی تھی۔ اس بات سے قطع نظر شام خوش تھا یا نہیں۔

شام اس سے کبھی بے تکلف نہیں تھا۔ عمر کے دس سال ایک بڑی خلیج تھے۔ وہ فیقہ کے بجائے عمامہ کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ اس سے کھیلتا، اس سے باتیں کرتا، اس کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ فیقہ کو کبھی جیلسی فیل نہیں ہوئی تھی۔ اتنے سال وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھتی رہی تھی مگر جب سے رشتہ بدلا تھا، فیقہ کے لیے عمامہ اور شام کو ایک ساتھ سوچنا بھی محال تھا اور دیکھنا تو بڑا تکلیف دہ امر تھا۔

جو ''بوئے گل'' شام اور عمامہ کے آس پاس چکراتی پھر رہی تھی۔ لاکھ نگاہ چرانے، دانستہ نظر انداز کرنے، جھٹلانے کے باوجود فیقہ کے اندر چٹکیاں بھر، بھر کے احساس دلاتی تھی۔ جیسے شام اور عمامہ کے بیچ کچھ ہے اور یہی احساس فیقہ کے دل میں عمامہ کے خلاف کدورت بھرتا جا رہا تھا۔

عمامہ کو کیا حق پہنچتا تھا اسی رستے پر بھاگتی چلی جاتی جو رستہ عمامہ کا تھا نہیں۔ جو رستہ فیقہ کے لیے منتخب ہو چکا تھا۔ جس پر فیقہ کے قدم رکھے جانے تھے۔ جس رستے پر فیقہ نے چلنا تھا۔ اس رستے پر عمامہ کو چلنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

کیونکہ وہ ''راہ'' فیقہ نے خود اپنے لیے نہیں چنی تھی۔ اس کے بزرگوں نے چنی تھی۔ بھیا اور اماں نے ایک ستھرا رستہ اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ راہ عمامہ کے لیے منتخب نہیں کی گئی تھی۔ عمامہ اس لحاظ سے فیقہ کے آگے نہیں، بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ صدیوں کے فاصلے پر، قرنوں کی فصیلیں تن گئی تھیں۔ عمامہ پیچھے تھی۔ فیقہ بہت آگے تھی۔ یہ عمامہ کی شکست اور فیقہ کی فتح تھی۔ پھر عمامہ کیوں نہیں سمجھتی تھی؟ وہ شام کے رستوں سے ہٹتی کیوں نہیں تھی؟ جگہ چھوڑتی کیوں نہیں تھی؟ اسے ایک نہ ایک دن ہٹنا ہی تھا تو پھر ابھی کیوں نہیں؟

وہ کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ معاً اس کی نگاہ اندر آتے شام پر پڑی۔ وہ پتھریلی روش پر چلتا ہوا سیدھا آ رہا تھا۔ ہاتھ میں کچھ کتابیں بھی تھیں۔ جب سے فیقہ کا شام سے رشتہ طے ہوا تھا۔ دونوں میں بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ پہلے پہل بھی فیقہ ہی اسے مخاطب کرتی تھی۔ شام تو ہمیشہ اس سے جھجکتا تھا۔ وہ کھڑکی سے دیکھتی رہی۔ شام کچن کی طرف آ رہا تھا۔ یقیناً کھانا کھانے کا ارادہ تھا۔ فیقہ نے برنر جلا کر توا چولھے پر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ آٹا فریج سے نکال رہی تھی جب شام اپنے دھیان میں چلتا ہوا کچن میں آیا۔ فیقہ کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ تیزی سے واپس پلٹنا چاہتا تھا جب فیقہ نے بے ساختہ اسے پکارا۔

''کھانا نہیں کھاؤ گے؟'' اس نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ چلتا، چلتا رک گیا۔

''کیا تیار ہے؟'' اس نے نظر چرا کر پوچھا۔ فیقہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''روٹی پکالوں۔تم منہ ہاتھ دھوآؤ۔میں کھانا لگاتی ہوں۔'' وہ نرمی سے مسکرا کر بولی تھی۔شام سر ہلا کر چلا گیا۔ کتابیں تخت پر رکھی تھیں۔پھر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔اس کی واپسی تک گرم، گرم پھلکے تیار تھے۔فیقہ نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔اب وہ جان کر ترکاری کی ٹوکری اٹھا کر اسے کاٹنے لگی تھی۔کن انکھیوں سے شام کی طرف بھی دیکھتی جارہی تھی۔وہ مگن سا سر جھکا کر کھانا کھا رہا تھا۔جیسے وہ کچن میں اکیلا ہو۔فیقہ نے کچھ سوچ کر گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہ کتابیں کیسی ہیں؟'' اس کا اشارہ تخت پر رکھی کتابوں کی طرف تھا۔شام ایسے چونکا جیسے اسے اپنے علاوہ کسی اور کی کچن میں موجودگی کی توقع نہیں تھی۔وہ حیرانی سے سر اٹھا کر دیکھنے لگا پھر دوبارہ سے سر جھکا لیا۔

''سی ایس ایس کی تیاری کررہا ہوں۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔فیقہ نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔پھر وہ چپ سی کر گئی تھی۔سمجھ نہیں آرہا تھا مزید کیا بات کرے۔شام نے تین چار منٹ میں کھانے کا فریضہ ادا کر لیا تھا۔اب وہ اٹھنے کو پر تول رہا تھا جب فیقہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولی۔

''شام.....رکو۔'' اس نے بے ساختہ آواز لگائی تھی۔شام رک سا گیا تھا تاہم اس کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا۔فیقہ کو اس کا یہ انداز بہت چبھا تھا۔

''جی۔'' شام نے مدھم آواز میں کہا۔فیقہ اسے دیکھتی رہی تھی۔وہ بیزار نہیں کھڑا تھا۔پھر بھی اسے بیزار سا لگا...یا فیقہ کے یہ اپنے ہی محسوسات تھے۔اس کی جگہ عمامہ ہوتی تو کیا یہ ایسے کھڑا ہوتا؟

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔'' فیقہ نے بمشکل کہا تھا۔سمجھ نہیں آرہا تھا کہ شام سے گفتگو کو طویل کیسے کرے۔

''کیا؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''تمہیں، اس رشتے پر اعتراض تو نہیں؟'' بہت مشکل سے ہی سہی بالآخر اس نے کہہ ہی دیا تھا۔گو کہ وہ اس وقت ایسا سوال نہیں کرنا چاہتی تھی۔کیا خبر، شام کوئی اس کی توقع کے برخلاف جواب دے دیتا پھر بھی بلا ارادہ منہ سے نکل گیا تھا۔وہ بے دھیانی میں کھڑا تھا۔اسی بے دھیانی میں بولا۔

''کیسا رشتہ؟'' وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔فیقہ دھک سی رہ گئی تھی۔اس کا جواب فیقہ کی توقع کے برعکس تھا۔

''تم کس کے گمان میں ہو شام؟'' اس کا پھنکارتا سوال شام کو چونکا گیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ بے چین سا ہوا تھا۔

''تم کیوں سمجھو گے؟'' فیقہ کا لہجہ بلا کا چبھتا ہوا تھا۔اس کے گہرے سانولے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔وہ خوب صورت ملائم سفید ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔یہ ادا اس کی بے چینی اور اضطراب کی غماز تھی۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔'' شام کی آواز اب بھی بہت دھیمی تھی۔وہ الجھا، الجھا سا کھڑا تھا۔جیسے اس کی بات سمجھنا چاہتا ہو۔

''جو تم سمجھنا نہیں چاہتے۔'' فیقہ نے بھرے دل سے کہا۔

''فیقہ آپا.....'' وہ بولتے ہوئے اچانک خیال آنے پر رکا تھا پھر لب بھینچ کر رہ گیا۔فیقہ نے زخمی نگاہ سے اسے دیکھا تھا۔وہ پھر سے نظر چرانے لگا۔

''بول دو، جو بولنا ہے جو تمہارے دل کے اندر ہلچل موجود ہے۔'' فیقہ نے رنج بھرے لہجے میں کہا۔

''کیسی ہلچل؟'' وہ دھیما پڑا۔فیقہ آخر کہنا کیا چاہتی تھی؟

''بہت انجان ہو؟'' اس نے کرختگی سے کہا تھا۔چہرے پر غصہ چھانے لگا۔شام کا سر جھک گیا تھا۔

''کچھ کرتے کیوں نہیں؟'' وہ ہونٹ کاٹ کر چیخی۔

''کیا کروں؟'' شام نے بے بسی سے کہا تھا۔وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔فیقہ کے سوالوں سے بچنا چاہتا تھا

مگر فیقہ؟ وہ تو کچھ ٹھان کے کھڑی تھی۔

''بیچ منجدھار میں لٹکا رکھا ہے۔ آر یا پار کا فیصلہ کرلو'' وہ بھی پل صراط پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ بہت بے خوفی سے بولی۔ شام نے چونک کر اپنا جھکا سر اٹھایا۔ وہ گویا حیران رہ گیا۔ فیقہ کہنا کیا چاہتی تھی؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ کر فیقہ نے دھیمی رنج بھری کرخت آواز میں کہا۔

''اگر مجھ سے رشتے پر اعتراض ہے تو انکار کردو'' وہ بکھری آواز میں بولی تھی پھر اسے ساکت چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

رات کی لہروں میں عنبر اشہب تیر رہا تھا۔ ماحول خاموش، بھیگا، نم، نم اور اداس تھا۔ سرما کی راتیں جتنی طویل ہوتی ہیں اتنی غمگین بھی ہوتی ہیں۔ صوفی صالح کے گھر تو رات بڑی جلدی اترتی تھی۔ سرِ شام بتیاں گل ہو جاتیں۔ رات کا کھانا جلدی نمٹا دیا جاتا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد سب اپنے، اپنے کمروں میں گرم لحاف لے کر دبک جاتے۔ بھائیوں کو رات گئے تک باہر پھرنے کی عادت نہیں تھی۔ سو سرما میں سرِ شام ہی خاموشی پوری کوٹھی میں چھانے لگتی۔

عمامہ نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا تو ہوا کا سرد جھونکا زبردستی اس کی ناک میں گھس آیا۔ اس نے بے ساختہ شال کا کونا ناک پر رکھا۔ باہر دھند کی چادر بکھر رہی تھی۔ درختوں کی شاخیں دھوئیں میں لپٹ رہی تھیں۔ باہر کا تیرتا سناٹا اندر بھی گھس رہا تھا۔ منال ٹھنڈ کی شدت سے بے نیاز اپنے کاٹیج میں آرام کر رہے تھے۔ عمامہ نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کردیے۔

صوفے کی طرف آتے ہوئے اس کی سینٹرل میز پر نظر پڑی تھی۔ گرم، گرم نمکین مونگ پھلی، کاجو، اخروٹ اور بادام ایک ٹرے میں رکھے تھے۔ سونے سے پہلے طاہرہ زبردستی اسے تھما گئی تھیں۔ تب سے لے کر اب تک ٹرے ویسی کی ویسی پڑی تھی۔ عمامہ نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ اس وقت طابہ بھابی کی باتیں سوچ رہی تھی۔ طابہ کے مشورے دل کو لگتے ضرور تھے تاہم عمامہ کی ان مشوروں پر عمل کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ نہ وہ اتنی بے باک تھی کہ تقی بھائی کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ تقی بھائی لاکھ بہت چاہنے والا بھائی تھا مگر بہن کے ''معاشقے'' کی خبر کو کس انداز میں لیتا؟ ان کے گھرانے میں ایسی باتیں سخت معیوب سمجھی جاتی تھیں تاہم طابہ اسے مسلسل اکساتی تھی، ہمت دلاتی تھی۔ اس کا مورال ہائی کرتی۔ اسے آگے قدم بڑھانے پر مجبور کرتی۔ طابہ کا خیال تھا شادی ایک مرتبہ تو رک چکی ہے لیکن ہر دفعہ عمامہ ایسی خوش نصیب نہیں کہ فرخ کا ایکسیڈنٹ ہو، اب جو دادی نے پھر سے تین ماہ بعد فیقہ اور شام کی شادی کا شوشا چھوڑ دیا تھا تب سے عمامہ کے اندر اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ نہ پڑھائی میں دل لگ رہا تھا، نہ کسی محفل میں۔ وہ بھابیوں سے بھی کترا رہی تھی۔ حالانکہ طابہ بھابی نے واضح کہا تھا کبوتر کی طرح آنکھیں میچنے سے خطرے ٹلتے نہیں ہیں۔

وہ اتنی نڈر تو تھی کہ کوئی بھی خطرہ مول لے لیتی مگر کوئی برابر تو کھڑا ہوتا، شام اس حوالے سے کبھی بھی عمامہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں مگن تھی جب گیلری میں رکھا فون بجنے لگا۔ گھنٹیوں پر گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ عمامہ کو خبر تھی کوئی بھی گرم لحاف چھوڑ کر باہر نہیں نکلے گا۔ ویسے بھی کمروں میں بند لوگوں تک فون کی آواز نہیں جاتی تھی۔ عمامہ کو ہی اٹھنا پڑا۔ فون اس کے کمرے سے قریب تھا۔ وہ زینہ اتر کر نیچے آ گئی تھی۔ فون پر نہ جانے کون ڈھیٹ تھا۔ اس نے سوچتے ہوئے فون اٹھایا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''اچھا تو یہ تم ڈھیٹ خاتون ہو'' سونیا کی آواز سن کر عمامہ خوش دلی سے بولی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا اضطراب غائب ہو گیا تھا۔ سونیا کی آواز عمامہ کو اسی طرح فریش کر دیتی تھی۔

''ڈھیٹ کسے کہا؟'' سونیا چیخی۔

''تمہیں۔'' عمامہ نے مسکرا کر کہا تھا۔ سونیا کا دوسری طرف یقیناً منہ لٹک گیا ہوگا۔ عمامہ نے تصور کی آنکھ سے ہی انجوائے کرلیا تھا۔

''ایک تو اتنی مستقل مزاجی سے تمہیں کال کررہی تھی۔ اوپر سے نخرے دیکھو محترمہ کے۔ فون کیوں نہیں اٹھایا؟ کب سے لگی ہوں۔'' سونیا نے اسے بھی لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ جواباً عمامہ نے طویل وجہ بتائی تھی جسے سن کر سونیا نے برے منہ سے کہا۔

''ایک تو صالح ہاؤس پر رات جلدی اتر آتی ہے۔ میں اور آپی تو جاگ رہے تھے۔ اتنی اچھی مووی دیکھی ہم نے..... بڑا مزہ آیا۔'' وہ عمامہ کا دل للچاتی مسکرائی تھی۔ جانتی تھی عمامہ کے گھر میں ٹی وی تک نہیں۔ ریڈیو ہے مگر بھائیوں تک محدود ہے۔ وہ ریڈیو پر خبریں سنتے تھے۔ عمامہ کو اچانک یاد آیا۔

''آپی سے یاد آیا۔ میرے بھائی طاہر کو تمہاری آپی سے بہت شکوے ہیں۔'' اس نے سوچا، لگے ہاتھوں سونیا تک اس کی آپی کی ''نااہلی'' کے بارے میں رپورٹ پہنچادے۔

''کس لیے؟'' سونیا حیران ہوئی۔ ''مطلب کس سلسلے میں شکوے؟'' اس نے وضاحت سے پوچھا تھا۔

''کیس کے سلسلے میں، میرے بھائی کا ایک کیس تمہاری آپی نے شاندار طریقے سے ہارا ہے۔'' عمامہ نے برے دل سے بتایا تھا۔ دوسری طرف سونیا کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔ وہ ہنس، ہنس کر دُہری ہوگئی تھی۔ عمامہ کو ہنسی کی سمجھ نہ آئی۔ کہیں سونیا کا دماغ تو نہیں چل گیا تھا۔ سونیا ہنس، ہنس کر بے حال ہوتی گئی تھی۔ پورے سات منٹ بعد اس کی ہنسی بمشکل رکی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' عمامہ حیران ہوئی۔

''اچھا تو میری آپی نے تمہارے بھائی کا کیس شاندار طریقے سے ہارا ہے؟ او مائی گاڈ.....'' سونیا کو پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اتنا ڈھیر سارا ہنسنے کے بعد اس نے خود ہی وجہ بتائی۔ ''میری جان! میری آپی نے آج تک کوئی کیس جیتا ہی نہیں۔ تمہارا بھائی وہاں کدھر جا پھنسا؟'' سونیا ہنس، ہنس کر بمشکل چپ ہوئی تو عمامہ بات سمجھ کر ہنسنے لگ گئی تھی۔

''او..... یعنی میرا بھائی تو برا پھنسا۔'' اس نے آنکھوں کی نمی ہاتھ سے پونچھی تھی۔ ہنسنے کی وجہ سے آنکھ میں آنسو اتر آئے تھے۔

''کوئی ایسا ویسا۔'' سونیا مزے سے بولی تھی۔ ''ایکچوئیلی یار! میری آپی کو وکالت میں ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ یہ تو پاپا کے مجبور کرنے پر لاکرنا پڑا۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ کبھی کسی کیس کو سیریس لیتی نہیں۔'' سونیا نے مزید تفصیل فراہم کی تھی۔ عمامہ نے خوب انجوائے کیا۔ اب وہ طاہر کو بتائے گی۔ کتنا مزہ آئے گا پھر اچانک اسے سونیا کے فون کا خیال آیا تھا۔

''تم نے فون کیوں کیا؟'' عمامہ نے حیرت سے پوچھا۔ اس وقت وہ کم ہی کال کرتی تھی۔

''صدشکر، تمہیں خیال تو آیا۔'' سونیا نے طنزاً کہا تھا۔ عمامہ منہ بنا کر رہ گئی۔

''جلدی بولو، میں ٹھنڈ سے اکڑ رہی ہوں۔'' وہ بھنچی آواز میں چیخی تھی۔ تب سونیا جلدی سے شروع ہوگئی، مبادا عمامہ فون ہی نہ بند کردے۔

''میں نے فیقہ کے لیے بڑی زبردست پلاننگ کی ہے۔ میں فیقہ کو سرتاپا بدل دوں گی۔ اس میں زندگی، جوش اور رنگ آجائیں گے۔ اسے بتاؤں گی زندگی محدود نہیں وسیع ہے۔ شام سے شروع ہوکر شام پر ختم نہیں ہوتی۔ اس میں تبدیلیاں آئیں گی۔ سوچ بدلے گی، فیقہ بدلے گی تو عمامہ تمہاری بھی زندگی بدل جائے گی۔ فیقہ کی برین

واشنگ کروں گی یہاں تک کہ وہ ٹھیک فیصلے کی پہچان کر لے گی۔ بعد ازاں ہم اس کی اچھی جگہ شادی کروا دیں گے۔ بولو کیسا؟'' سونیا بہت پُرجوش سی بتا رہی تھی۔ اس کے اندر ایک جذبہ، ایک ولولہ ابھر رہا تھا۔ عمامہ کچھ دیر کے لیے چپ کر گئی تھی۔ کیا یہ آسان تھا؟ کیا یہ ممکن تھا؟

''بہت فٹ..... مگر فیقہ تمہاری بات کیوں مانے گی؟ مجھے امید نہیں۔ فیقہ مجھ سے وابستہ ہر فرد سے خار کھانے لگی ہے۔'' عمامہ نے افسردگی سے کہا تھا۔ تاہم ایک امنگ، ایک امید کی چنگاری اس کے اندر بھی ابھر آئی تھی۔ فیقہ کا بدلنا، اس میں تبدیلی آنا۔ شام سے دستبردار ہونا..... پھر فیقہ کی کسی اچھی جگہ شادی۔ سب کچھ کتنا آسان ہو جاتا۔ کتنا زبردست ہو جاتا۔ زندگی میں رنگ، خوشیاں اور جگنو چمک اٹھتے۔ سونیا کی پلاننگ بہت اچھی تھی۔ عمامہ کے دل کو لگی تھی۔

''میں اس کا مائنڈ میک اپ کروں گی۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ وہ خود بول کر شام کی زندگی سے دور ہو جائے گی۔ تم دیکھ لینا عمامہ۔'' سونیا نے ایک جذبے سے کہا تھا۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ ایڈونچرز کی وہ دیوانی تھی۔ اس کے ہاتھ ایک نئی مصروفیت آ چکی تھی۔ اس کا جوش و جذبہ قابلِ دید تھا پھر اچانک لائن ڈراپ ہو گئی تھی۔ عمامہ نے سوچا اور دوبارہ کال کرے مگر تھوڑی دیر بعد فون پھر سے بج اٹھا تھا۔ عمامہ پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے فوراً فون اٹھا لیا تھا۔ پھر اپنی ہی دُھن میں بے ساختہ بولی۔

''کیا فیقہ خود شام کے رشتے سے انکار کر دے گی۔ دیکھو سونیا! کچھ غلط نہ ہو۔ میں شام کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اندر کہیں خدشات بھی بہت تھے۔ وہ خوف زدہ بھی تھی..... پریشان بھی تھی۔ کیونکہ یہ کام رسک کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ عمامہ، شام سے دستبردار ہونے میں ہلکان ہو رہی تھی پھر فیقہ تو دنیا کے رسم و رواج کے مطابق شام کی منگیتر تھی۔ اس کی شادی طے تھی۔ وہ جلدی رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے۔ پھر فیقہ کیسے شام کو اسے دان کرتی؟ بہت کٹھن مرحلے تھے۔ بڑے مشکل سلسلے تھے۔ یہ آگ کا دریا تھا جس میں سونیا نے چھلانگ لگا دی تھی ساتھ عمامہ کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟ کیا بہتر ہو سکتا تھا؟ عمامہ کا دماغ بند ہونے لگتا۔

اس وقت وہ گھٹی، گھٹی آواز میں سونیا سے مخاطب تھی۔ تاہم دوسری طرف سے صرف گہری سانس خارج کی گئی تھی۔ عمامہ کو فوراً محسوس ہوا۔ وہ سونیا نہیں تھی۔ عمامہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ ریسیور میں خاموشی تھی بس سانسوں کا ارتعاش محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی تھا جو سانس لے رہا تھا۔ فون پر موجود تھا تاہم بول نہیں رہا تھا۔ عمامہ کی جان نکلنے لگی۔ اس نے بے خیالی میں سونیا سمجھ کر کیسے الفاظ ادا کیے تھے؟ ''میں شام کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔'' عمامہ کی جان پر بن آئی تھی۔ اس نے ریسیور پر گرفت مضبوط کر کے بڑی مشکل سے حواس مجتمع کیے تھے اور کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

''ہیلو! کون؟''

☆☆☆

عمائم کے دل کی دھڑکن میں غضب کا تلاطم تھا۔ خوف نے اس پر ایک دم طویل پنجا گاڑا تھا۔ وہ کراہ بھی نہیں سکی تھی۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی لاتعداد شکنیں تھیں۔ گھبراہٹ، وہم اور خوف نے لمحوں میں اسے شل کر دیا تھا۔ وہ خوف کے عالم میں الماری کے اس ڈھیر کو دیکھتی رہی۔ یہ ڈھیر اتنا ہی بے ترتیب تھا جس قدر عمائم کے دل کی دھڑکنیں۔ یہ اس کی ترتیب شدہ الماری کی حالت تھی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی کسی نے اس کی الماری الٹ پلٹ کر کے یہاں سے پیکٹ چرایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ پیکٹ کپڑوں کے ڈھیر تلے چھپا کر الماری کو بے ترتیب کر دیا گیا تھا۔ اس ساری سچویشن کری ایٹ کرنے کا مقصد کیا تھا؟ عمائم کو خوفزدہ کرنا؟ اسے چونکانا؟ پریشان کرنا؟ یا کسی اہم نکتے سے عمائم کی توجہ کو ہٹانا؟

اس کے اعصاب بکھر رہے تھے۔ ذہنی طور پر عمائم کو شدید دھچکا لگا تھا۔ جذباتی طور پر وہ بہت نڈھال ہوئی تھی۔ اور ساتھ خوفزدہ بھی.....

نورس کا پیکٹ عمائم کے ہاتھ میں تھا، ایسا پیکٹ جو کرن نے عمائم کو دیا جو عمائم سے اپنے ہی کمرے کی الماری سے گم ہو گیا تھا۔ پھر اتنے دن کی اعصابی کشمکش کے بعد پیکٹ کا دوبارہ مل جانا...... یہ سب کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ یا کیوں کیا گیا تھا؟ نورس کا اس پیکٹ کے لیے حساس ہونا، غصہ کرنا، عمائم کو آفس میں قید کر دینا۔ پیکٹ کی وصولی کے لیے نورس کا جارحانہ انداز...... یقینی طور پر یہ پیکٹ معمولی نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس پیکٹ میں کچھ غیر معمولی ضرور تھا۔ کیا؟ یہ عمائم نہیں جانتی تھی۔ مگر جاننا ضرور چاہتی تھی۔ جس پیکٹ نے ذہنی طور پر اسے اتنے دن سزا دی تھی، یہ عمائم کا حق تھا کہ وہ اس پیکٹ کو کھول کر دیکھے، اس میں آخر تھا کیا؟ کیوں اسے چرا گیا تھا؟ پھر کیوں واپس رکھا گیا؟ وجہ تو ضرور ہوگی؟ لیکن بڑا سوالیہ نشان تو یہ تھا آخر کون اتنا دیدہ دلیر تھا جس نے عمائم کے کمرے میں دوبارہ گھسنے کی جرأت کی تھی۔

معاً عمائم کے موبائل پر میسج ٹیون بجی تھی، اس کی توجہ ہٹ سی گئی۔ کارپٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ہاتھ لمبا کر کے موبائل اٹھالیا تھا۔ عمائم کے اسی ہمدرد کا میسج تھا جو اسے ہر بری خبر کے لیے پیشگی اطلاع کرتا تھا۔

عمائم نے میسج کھول کر دیکھا۔ لکھا تھا۔ ''کنویں کی تہ میں کچھ ہوتا ہے...... امید ہے مل چکا ہوگا تمہیں۔'' عمائم نے گہری سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ وہ اس غائبانہ ہمدرد کی معترف ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ میسج ملا تھا، عمائم نے بے تابی سے کھول کر دیکھا۔ ''چھوٹی سی بات، چھوٹا سا نکتہ محرم اور مجرم کا ننھا سا فرق...... تمہیں سمجھانا آسان نہیں...... کیا تم اب بھی نہیں سمجھیں؟'' کافی بھنا کر سوالیہ نشان ڈالا گیا تھا۔ عمائم نے جلدی سے ٹائپ کیا۔

''نہیں......'' بات شرمندگی کی تھی...... پھر بھی اس نے اعتراف کرلیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ سمجھی نہیں تھی پھر اکڑتی کیوں؟

''اب میں تمہیں کیا کہوں؟'' بھنایا ہوا میسج ملا تھا۔ عمائم کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

''جو مرضی......'' اس نے جلدی سے ٹائپ کیا تھا۔ جانے اب وہ کیا لکھے؟ کچھ دیر بعد جواب آیا تھا۔

''سوچ لو...... میں جو بھی کہوں، تسلیم کرو گی۔'' اب بڑے مزے سے لکھا گیا تھا۔ گویا وہ انجوائے کر رہا تھا، عمائم نے ہونٹ بھینچ کر جواب دیا۔

''سوچ لیا'' اسے جواب پڑھنے کی جلدی تھی۔ جواب ٹھہر کے ملا تھا، اس نے بے تابی سے پڑھا۔

''جلد بازی حماقت ہے...... پھر سے سوچ لو......'' وہ عمائم کو ایک موقع اور دے رہا تھا۔ عمائم نے اس موقع کو ضائع کیا۔

''بکو بھی۔'' وہ چڑ گئی تھی اسی لیے بھنا کر ٹائپ کیا تھا۔ دوسری طرف خوب مزہ لیا گیا، جواب بھی ترنت آیا تھا...... عمائم کی پتلیاں سکڑ کر رہ گئیں۔ اس نے جواب کو سہ بار پڑھا تھا۔

''انسان کے پاس حسن ہوتا ہے یا عقل...... اگر دونوں چیزیں اکٹھی مل جائیں تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا...... محبوب کی عقل تو ہوتی بھی ٹخنوں میں ہے...... محبوب کا مطلب سمجھتی ہو محبوبہ......؟'' اتنا لمبا جواب، وہ بھی آخر میں حواس گم کرنے والے الفاظ، عمائم ہل کر رہ گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔ ایسے جواب کی عمائم کو توقع نہیں تھی۔ وہ گم صم رہ گئی تھی۔ اس نے خوف کے عالم میں موبائل رکھ دیا۔ اسکرین پر لکھے الفاظ ہلا دینے کے لیے کافی تھے۔ ہر طرف ایک لفظ کی بازگشت تھی۔ ''محبوبہ...'' عمائم کا جیسے دل بند ہونے لگا تھا۔

''محبوبہ'' دیواروں سے بھی آواز آرہی تھی، کمرے کی چھت، فرش، سینریاں کورس میں جیسے گا رہے تھے۔ عمائم اندر باہر سے پسینہ، پسینہ ہورہی تھی۔ دل کی دھڑکنوں میں عجیب سا شور تھا۔ وہ ان آوازوں سے گھبرا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد پھر سے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی تھی۔ عمائم نے ڈرتے، ڈرتے میسج دیکھا۔

''سنو، تم ناں بہت ڈفر ہو، سمجھتی نہیں، آنکھیں کھولو، دماغ کی بند کھڑکیاں بھی کھولو، کنویں کی تہیں ''راز'' اس لیے اگلتی ہیں۔ تاکہ تم جیسے سبق حاصل کریں۔ اچھے برے کی پہچان کریں۔'' پہلے سے مختلف جواب تھا۔ عائم سابقہ کیفیت بھلا کر الجھ گئی تھی۔ وہ ہر دفعہ اسے الجھا دیتا تھا۔

''اس طرح تو نہیں سمجھو گی۔'' تلملاتا جواب آیا تھا۔ گویا وہ بہت بھنا رہا ہو کہ کیسی کند ذہن سے متھا لگا ہے۔

''ایک بات پر غور کرو..... ایک تمہاری چیز ہے، ایک میری چیز ہے، میری چیز تم چرا لیتی ہو یا تم سے گم ہوتی ہے، میں تم سے جارحانہ واپسی کا مطالبہ کرتا ہوں۔ تمہیں تنگ کرتا ہوں جبکہ تم بے قصور ہو، دانستہ کچھ غلط نہیں کیا تم نے۔ پھر بھی میں تمہیں جذباتی دھچکے پہنچاتا ہوں۔ تو تم سمجھ لو ناں..... میں بہت ''کم ظرف'' ہوں۔ سو مجھ سے تم کنارہ کرو۔'' اتنا واضح، ٹھوس اور پختہ جواب آیا تھا۔ عائم کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ آخر اس کی بات کا مفہوم کیا تھا؟ عائم ہکا بکا رہ گئی تھی۔ پھر اس نے سر تھام لیا..... دوبارہ کوئی میسج نہیں آیا تھا۔ عائم کافی دیر انتظار کرتی رہی تھی۔ پھر تھک کر پیکٹ کو دیکھنے لگی۔ جو بڑے اچھے طریقے سے بند کیا گیا تھا۔ عائم دیکھے بغیر چین لینے والی نہیں تھی۔ حالانکہ دماغ کہہ رہا تھا۔ پیکٹ کی تلاشی نہ ہی لو۔ پھر بھی اس نے پیکٹ کھولنے سے گریز نہیں کیا تھا۔

بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے گفٹ ریپر پیکنگ کھول لی تھی۔ اندر ایک لوہے کا باکس تھا۔ وہ بھی آرام سے کھل گیا تھا۔ عائم نہ جانے کیا توقع کر رہی تھی۔ اندر سے بڑی عجیب چیزیں نکلی تھیں۔ جیسے کھودا پہاڑ، نکلا چوہا..... عائم کا منہ اتر گیا تھا۔ اس نے سیاہ ٹیپ اور عجیب سا آلہ واپس باکس میں رکھ دیا تھا۔

''ایک دم فضول.....'' وہ غصے میں بڑبڑاتی پیکنگ کرنے لگی تھی۔ پھر بھنا، بھنا کر ساری الماری دوبارہ سے سیٹ کی تھی۔ سارے استری شدہ کپڑوں کے گولے بنا دیے گئے تھے۔ اسے بے حد غصہ آتا رہا۔

''اللہ، ہاتھ ٹوٹیں، جس نے میری الماری کو ہاتھ لگایا۔'' وہ بڑبڑ کرتی رہی تھی کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ عائم نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے شموں کھڑی تھی۔ دانت نکوس کر اندر آ گئی۔

''باجی! ایک تھیلی ملی آپ کو.....؟'' شمو نے آتے ہی سوال داغا تھا۔ عائم نے آنکھیں سکیڑ کر شموں کو دیکھا۔

''میری الماری کو تم نے ہاتھ لگایا، وہ تھیلی الماری میں تم نے گھسائی۔'' عائم نے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے غصے سے پوچھا تھا۔ شموں نے فٹافٹ دو منٹ کا سر نفی میں ہلایا۔

''نہیں باجی! یہ تھیلی تو نہیں، میں نے تو دوسری تھیلی اٹھا کر رکھی تھی۔'' شموں نے بیڈ سائڈ ٹیبل سے ایک تھیلی نکال کر عائم کو پکڑائی تھی۔ ''وہ جو پھولوں کا گلدستہ تھا ناں جو آپ کے کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ اسی میں سے نکلی تھی یہ تھیلی..... پھول میں نے ڈرم میں الٹ دیے۔ تھیلی سنبھال دی تھی۔'' شموں نے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ عائم کا ماتھا ٹھنک گیا۔ تو کیا یہ تھیلی بھی نورس کی تھی؟ اس نے دراز کھول کر تھیلی نکالی، اندر سفید سفوف بھرا تھا۔ نہ جانے یہ کیا تھا؟ عائم سمجھ نہیں سکی تھی تاہم اس نے تھیلی بھی پیکٹ کے ساتھ رکھ دی۔ صبح نورس کو دینے کا ارادہ تھا۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی۔ بار، بار اٹھ کر پیکٹ کو دیکھتی تھی کہ پھر نہ کہیں آگے پیچھے ہو جائے۔ رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔

صبح تائی امی اسے گھر میں موجود پا کر نہال ہو گئی تھیں۔ عائم کو بڑا اچھا ناشتا کروایا تھا۔ حالانکہ عائم کی طبیعت بوجھل تھی پھر بھی تائی امی کی خوشی کے لیے اس نے ناشتا کر لیا۔ جب وہ جامعہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تب تائی امی دوبارہ روم میں آ گئیں۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا... جیسے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ عائم ان کی بے چینی کو بھانپ گئی تھی۔ پھر تائی امی نے خود ہی بتا دیا۔

''تم سے کچھ کہنا تھا۔'' انہوں نے تمہیدی انداز اپنایا۔

''تو کہیے ناں.....'' عائم نے بے ساختگی سے کہا۔ وہ بالوں میں برش کرتی رہی۔ پھر تائی امی کے قریب بیٹھ

گئی۔ انہوں نے اس کے بالوں کی چوٹی گوندھ دی تھی۔ پھر گلابی ربن سے نچلے بال باندھ کر کھلے چھوڑ دیے۔ عمائم دوبارہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اب وہ منہ اور ہاتھوں پر لوشن لگا رہی تھی۔

''ایمان کی خواہش بابا صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ ساتھ ایمان کی ماں کے متعلق ناپسندیدگی کی وجوہات بھی پہنچائی گئیں۔ یہ کام ماہم اور اس کی ماں کے علاوہ کون کر سکتا ہے۔ تاہم تمہارے حق میں بہتر ہی ہوا۔'' انہوں نے نرم انداز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔ عمائم چونک گئی تھی۔ یعنی اس کی غیر موجودگی میں اتنا کچھ ہو بھی گیا؟ بابا صاحب تک ایمان کی خواہش پہنچ گئی؟ اموکی ناپسندیدگی بھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' عمائم نے اضطراب کی لہروں کو دباتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک دم پریشان ہوگئی تھی۔ نہ جانے بابا صاحب کا فیصلہ کیا ہوگا؟ ایمان کے لیے اس کے جذبات بڑے سرد تھے۔ اموا سے ناپسند کرتی تھیں اور عمائم کو کسی کے سر پر مسلط ہونے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

''انہوں نے ایمان کو بلوا بھیجا۔'' تائی امی نے مزید بتایا۔

''پھر؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

''دو گھنٹے تفصیلاً بات ہوئی تھی۔ بابا صاحب نے ایمان کو سمجھایا تھا۔ سارے آپشن سامنے رکھے۔ اس کی ماں ذہنی مریضہ ہے۔ وہ اپنی ماں کو تکلیف نہ دے، کیا پتا ایمان کی ضد سے مجبور ہو کر وہ خود کو نقصان پہنچا دے۔ پہلے بھی وہ دو مرتبہ خودسوزی کی کوشش کر چکی ہے۔ ایمان بات سمجھا یا نہیں..... مگر خاموش ضرور ہو گیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے، آئندہ کے لیے یہ معاملہ ختم ہو چکا۔'' انہوں نے عمائم کو جیسے ایک خوشخبری سنائی تھی۔ عمائم اندر تک پُرسکون ہوگئی گو کہ عمائم کو ایمان نے کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی ایمان کے ''اعلان'' نے اسے سب کی نگاہ میں مجرم بنا دیا تھا۔ وہ اموتو کیا کسی کو بھی تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر اموکی نفرت کو جانتے ہوئے کیسے ایمان کے بارے میں سوچتی؟

''عمائم.....! تمہارے فائنل پیپر ہو جائیں تو میں تمہاری شادی کا ارادہ رکھتی ہوں۔'' تائی امی کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔ اس نے گہری سانس فضا کے سپرد کیا۔

''شادی کے لیے ایک عدد دولھا کہاں سے امپورٹ کریں گی؟'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا کر بولی۔

انہوں نے اسے مصنوعی انداز میں گھورا۔

''میری اتنی پیاری بیٹی کے لیے دولھا کیوں نہیں ملے گا۔'' انہوں نے پیار سے اسے چھیڑا تھا۔ عمائم نے ٹھنڈی آہ سی بھری تھی۔ پھر اٹھ کر گاؤن پہننے لگی۔ تائی امی کی آنکھوں میں تحیر در آیا۔

''یہ کب خریدا؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔ عمائم کو گاؤن کے ساتھ وہ معصوم لڑکی نور یاد آ گئی تھی۔ اس کا احسان بھی جو عمائم بھول نہیں سکتی تھی۔ گرے گاؤن پہن کر گائیوں کے مطلب لڑکیوں کے غول میں چھپ چھپا کر جامعہ سے باہر نکلنا اور اب دوبارہ جامعہ میں جانا..... بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔

''یہ میری فرینڈ کا ہے۔'' اس نے مختصر بتایا تھا پھر نور کا اکارڈ لے کر شولڈر بیگ اٹھایا اور باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں ماما، بسمہ اور عائشہ بیٹھی تھیں۔ ماما، بیٹی کو نہ جانے کیا بتا رہی تھیں۔ عمائم کو دیکھ کر ان کا منہ بن گیا تھا۔ چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ عائشہ سسرال سے آئی تھی۔ عمائم نے کراس کا حال احوال مروتاً پوچھا۔ ماما کا مزاج اور بھی برہم ہو گیا..... تاہم انہوں نے کوئی جلا کٹا جملہ نہیں کہا تھا۔ بسمہ اس کے گاؤن کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ عمائم جلدی سے باہر نکل آئی۔

پورچ میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ڈرائیور بھی نہ جانے کہاں تھا؟ عمائم کو حیرت ہوئی۔ اس کے لیے ایک گاڑی مخصوص تھی۔ گھر پر ہی موجود رہتی تھی۔ نہ جانے اب کہاں تھی؟ اس نے ریلنگ کی طرف غیر ارادتاً دیکھا۔ وہاں حریم

لٹکی ہوئی تھی۔

''گاڑی تو ورکشاپ میں ہے عمائم! تم رکو، اکیلی نہ جانا۔ میں احتشام بھائی سے کہتی ہوں۔'' حریم اس کی پریشانی سمجھ کر مدر ٹریسا بنتی دوسرے ہی لمحے برابر والوں کے لان کی طرف جھک کر آواز لگا رہی تھی۔ احتشام اپنے گیراج میں تھا، حریم کی بات سمجھ کر بولا۔

''او کے حریم..... کوئی اور حکم.....'' اس نے انکساری سے حریم کو ''اڑنے'' پر مجبور کر دیا تھا۔ عمائم تک بھی... بہ آسانی اس کی آواز پہنچ گئی تھی۔ وہ جو حریم کو منع کرنے کے اشارے کر رہی تھی لب بھینچ کر رہ گئی۔ اب احتشام کے ساتھ جانے کا احسان لینا تھا۔ اس کی طبیعت بہت بیزار ہوگئی تھی۔ یہ حریم بھی ناں کچھ زیادہ ہی حاتم طائی بنتی ہے، دوسروں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتی ہے، وہ کھڑی رہ گئی تھی معاً ان کے گیٹ کے پاس جیپ کی آواز آئی تھی۔ اوپر سے حریم کے اشارے۔

''جاؤ بھی عمائم! شام بھائی ہوگا۔'' وہ ریلنگ پر لٹکی تھی۔ عمائم اسے گھورتے ہوئے باہر نکل آئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا۔ ''دیکھا عمائم! شام بھائی میری بات نہیں ٹالتا۔'' وہ مصنوعی کالر کھڑے کیے مسکراتی رہی تھی۔ عمائم بھنا کر باہر نکل آئی۔

احتشام کسی شیطان کی طرح سر پر سوار تھا۔ جانے کیوں احتشام سے ٹکرانے کے اتفاقات کچھ زیادہ ہو رہے تھے۔ وہ کلستی ہوئی جیپ تک آئی۔ احتشام نے خود ہی پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ جب وہ بیٹھ گئی تب عمائم نے محسوس کیا تھا کہ فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے برابر کوئی اور بھی تھا۔ شاید وہی چمکتی آنکھوں والا آفیسر..... عمائم کو خیال گزرا تھا۔ ہو بہو وہی تھا۔ وہ مزید کچھ نہیں سوچ سکی تھی۔ کیونکہ اس کے برابر احتشام آکر بیٹھ گیا تھا۔ عمائم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ احتشام اس کے اتنا قریب بیٹھا تھا۔ اس کے دل کی حالت عجیب ہوگئی۔ ہتھیلیاں نمی میں ڈوب رہی تھیں۔ پلکیں مرتعش تھیں۔ گال دہک رہے تھے۔ بہت گرم ہو رہے تھے۔ جانے اسے کیا ہو رہا تھا۔ کیا ایک سو دس ڈگری محبت کا بخار.....؟ عمائم کی جیسے جان پہ بن آئی۔ وہ اس گلیشیر سے محبت افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو برف کا پہاڑ تھا۔ بے حد برفیلا اور سرد..... لیکن احتشام کو دیکھ کر یہ جذبات کوئی نئے نہیں تھے۔ یہ تو بہت پرانے احساسات تھے۔ اسے دیکھ کر دل میں بیٹھا، بیٹھا سا درد اٹھتا تھا۔ جو عمائم کو تنہائی میں بھی سہا دیتا تھا۔ پہلے پہل احتشام کا رویہ عمائم کے لیے بڑا کھردرا اور ہتک آمیز ہوتا تھا تاہم عمائم نے نوٹ کیا تھا۔ احتشام کے لہجے میں اب نرماہٹ ہوتی تھی۔

''تم کہاں جاؤ گی؟'' احتشام کی آواز اسے سوچوں کے گرداب سے کھینچ لائی تھی۔ وہ بے ساختہ چونکی۔

''جامعہ.....'' اس نے گڑبڑا کر مختصر بتایا تھا۔ احتشام نے ڈرائیور کو ایڈریس اور رستہ سمجھایا۔ اب وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے اپنے دوست سے بات کر رہا تھا۔

''انڈوں پر بیٹھ کر دریا عبور کرنا ہے۔'' وہ بڑے ہلکے، پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔ شاید اپنے دوست سے مذاق کر رہا تھا۔ وہ اس کے مزاح کو سمجھ گیا۔ تبھی گردن موڑ کر بولا۔

''میں مرغا نہیں، جو انڈوں پر بیٹھوں۔'' دوست کا منہ بن گیا تھا۔ فوراً انگلی اٹھا کر کہا۔

''تو کیا مرغی ہو روشان..... میری جان.....'' احتشام لیپ ٹاپ کھولے بڑا مصروف تھا۔ گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائے وہ دونوں ''محاذوں'' پر کام کر رہا تھا۔ دوست کو جواب بھی دیے رہا تھا۔ اپنا کام بھی کر رہا تھا۔ عمائم نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ اسکرین پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ انگلیاں مصروف تھیں۔

''خبردار! مجھے مرغی کہا۔'' روشان نے پھر سے وارننگ دی تھی۔ ''تم خود ہوگے، فارمی مرغے۔'' اس نے

حساب برابر کیا تھا۔ احتشام کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔ جیسے وہ رد ں بات کو بڑا انجوائے کر رہا تھا۔

''نہیں، میں تو دیسی ککڑ ہوں۔'' احتشام نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔ عمائم کو بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ جسے اس نے بمشکل چھپایا تھا۔ تب بھی عمائم کو لگا جیسے شام نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا ہو، وہ تھوڑی خفت زدہ سی رہ گئی تھی۔

''فرض کرو، تم ایک خوب صورت، ماڈرن، لبرل، مرغی سے ٹکراتے ہو۔'' احتشام ایک مرتبہ پھر روشان کو چڑا رہا تھا۔ اور وہ پھر چڑ کر بھنایا۔

''میں ایسے فرض نہیں کرتا۔'' اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ احتشام نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

''آج کچھ دیر کے لیے فرض کرلو.....'' احتشام کا اشارہ سمجھ کر اس نے بڑی بری شکل بنالی تھی۔ پھر اس پر احسان کرتا ہوا بولا۔

''کرنا تو نہیں تھا مگر کرلیتا ہوں۔'' روشان نے بادلِ ناخواستہ اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

''مرغی کی تم اچھی، اچھی تصویریں لے لینا۔'' اس نے بڑے عام سے انداز میں بات کہی تھی۔ اتنی عام کے عمائم نہ سمجھ سکی تھی۔ تاہم اس کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ صد شکر منہ پر حجاب تھا۔ ورنہ سارا پول کھل جاتا۔ ان کی باتیں سن کر عمائم کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔

''دیکھو راز داری سے جانم! یہ نہ ہو مرغی جوتی اتار کر تمہاری دُھنائی کردے۔'' بڑے انداز میں سمجھایا گیا تھا۔ روشان سمجھ گیا۔ پھر چڑ کر بولا۔

''مرغیاں سینڈلز نہیں پہنتیں۔'' وہ دوبارہ سے گردن موڑ کر چنکا۔ ''اور انگریزی بھی نہیں بولتیں۔ ماڈرن بھی نہیں ہوتیں۔''

''یہاں معاملہ الگ ہے جان.....'' احتشام نے اسے پچکارا..... ''ہماری مرغی انگریزی دان بھی ہے، ماڈرن بھی ہے۔ ہوشیار بھی، چوکنا بھی، چالاک بھی۔'' اس نے جیسے مرغی کی خصوصیات پر گردان پڑھ دی تھی۔ عمائم لال بھبوکا ہوگئی۔ ہنسی ضبط کرنا بڑا محال تھا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ جامعہ کی عمارت جلدی آجائے لیکن احتشام کا ڈرائیور بے انتہا سست الوجود تھا۔ چیونٹی کی چال پر ڈرائیونگ ہو رہی تھی۔

''پھر تو اچھا ''روسٹ'' تیار ہوگا۔'' روشان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''پر تم سے ہضم کرنا محال ہے۔'' اس نے مسکرا کر اسے احساس دلایا تھا۔ ''بڑی ہلچل مچائے گی۔''

''کون.....؟'' روشان ایک بھوں اچکا کر بولا۔

''تیری گھر والی۔'' احتشام نے گھور کر روشان کو دیکھا۔ وہ سمجھ کر گردن کو جھٹکے دینے لگا تھا۔

''او..... یعنی تیری سالی.....'' روشان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ یقیناً مرغی پر بحث مکمل ہو چکی تھی۔ احتشام نے لیپ ٹاپ کو بند کیا۔ بیگ میں ڈالا پھر موبائل نکالا..... دو تین میسج لکھے۔ ایک فون کال کی۔ پھر سے روشان کی طرف دیکھا اور ایک ''پاس'' جیب سے نکال کر روشان کو دیا تھا۔ جسے اس نے اچک کر سنبھال لیا۔

''بائی داوے تم نے تعارف نہیں کروایا؟'' اس کا اشارہ عمائم کی طرف تھا۔ عمائم دھک سے رہ گئی تھی۔ احتشام کا دوست خاصا منہ پھٹ تھا۔ اب جانے اس کی کیا درگت بناتا؟ وہ سہم سی گئی تھی۔

''عمائم.....'' احتشام نے ایک لفظی تعارف روشان کے منہ پر مارا تھا۔ عمائم کو بہت ہی برا لگا۔ کیا تعارف ایسے کروایا جاتا ہے؟ عمائم کو اپنی بہت توہین محسوس ہوئی تھی۔ تاہم روشان نے اس تعارف کو بہت کافی جان کر ایسے سر ہلایا تھا گویا عمائم کو قرنوں سے جانتا ہو۔ عمائم کو اس کا انداز بہت عجیب لگا تھا۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' روشان نے اخلاقیات جھاڑنے کی کوشش میں باچھیں پھیلائی تھیں۔ جواباً عائم کو بھی سر ہلانا پڑا تھا۔ تاہم اندر سے وہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔ کیا تھا اگر احتشام اسے بطور کزن متعارف کروا دیتا۔ اس کا ''اسم'' تو چھوٹا نہ ہو جاتا۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا۔

''روشان تم نے ٹیولپ دیکھے.....؟'' کچھ دیر بعد احتشام کو جیسے خیال آیا تھا عائم پھر سے دھک ہوئی۔ تو گویا وہ اسے سنا رہا تھا۔ عائم کو خوشامد والا سارا واقعہ یاد آ گیا۔ اور شدید شرمندگی بھی ہوئی۔

''تمہارے روم میں؟ ہاں دیکھے ہیں..... مگر سوکھ گئے۔'' روشان کی بات نے عائم کو بری طرح چونکا ڈالا تھا۔

اسے پکا یقین ہو گیا تھا کہ احتشام، عائم کو سنا رہا تھا۔ گویا جتلا رہا تھا کہ تمہارے دیے ہوئے ٹیولپ کے پھول میں نے سنبھال کر رکھے ہیں، پھینکے نہیں ہیں اس بات سے عائم کیا سمجھتی.....؟ اس کے دل کی دھڑکنوں میں تلاطم مچ گیا تھا۔ گھبراہٹ نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ گردن گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جیسے احتشام کی نظر سے بچنا چاہتی ہو۔

''لیکن تمہیں تو سرخ گلاب پسند تھے نا؟'' روشان نے چونک کر کہا۔ عائم بھی ٹھٹکی تھی۔ احتشام بے نیازی سے بتا رہا تھا۔

''لیکن ٹیولپ بھی برے نہیں..... کوئی اتنے پیار سے دے تو.....'' اس کا انداز بلا کا ذومعنی تھا۔ عائم کا سر جھک گیا۔ جی چاہ رہا تھا۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دے۔ مارے شرم اور خفت کے برا حال تھا۔

''تم پر بھی کسی کو ''پیار'' آ گیا؟'' روشان اسی چالاک کا مکار دوست تھا۔ لفظ، لفظ پکڑنے میں ماہر..... احتشام اس کی بات پر بردباری سے مسکرایا۔ اک نظر عائم کو دیکھا اور بولا۔

''کوئی ایسا ویسا.....؟'' اس کا انداز بڑا دلبرانہ تھا۔ عائم پانی، پانی ہو کر بہہ گئی تھی۔ روشان نے ایک معنی خیز قہقہہ لگایا تھا۔ عائم شرمندگی کے بھنور میں پھنس گئی۔ معاً گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ پھر جیپ نے بریک لگائی تھی۔ سامنے عالی کی کار تھی۔ جس کا جیپ سے تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اور عالی کی آنکھیں عائم کو احتشام کی جیپ سے نکلتے دیکھ کر پھٹ گئی تھیں۔ عائم بھی عالی کو دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ حتیٰ کہ ایک لفظ شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا۔ عائم کے بھاگتے ہی روشان نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''ایسی بے مروت، بے لحاظ، بے دید، ایک شکریہ تک نہیں کہا۔'' روشان کا قلق جانے والا نہیں تھا۔ احتشام نے اس کا کندھا تھپتھپا کر تسلی دی تھی۔

''زبردستی کہلوا لیں گے۔ تو غم نہ کھا'' وہ عقابی نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھتا مسکرا کر بولا تھا۔ پھر روشان کو الرٹ کرتا باہر نکل گیا۔ روشان اس کا اشارہ سمجھ کر چوکنا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جامعہ کا گیٹ عبور کر کے وہ عالی کے ہمراہ اندر داخل ہوئی تھی۔ اور اسے لگا، گیٹ سے باہر جیپ کی ساری گفتگو وہیں چھوڑ آئی ہے۔ جامعہ کے اندر داخل ہوتے ہی نورس کا خوف حواس منجمد کرنے لگا تھا۔ نورس اس کا کیا حشر کرے گی۔ وہ اندر ہی اندر سہم گئی۔ آخر وہ نورس کو دھوکا دے کر مغرور ہوئی تھی۔ اس نے بڑی غیر ذمے دارانہ حرکت کی تھی۔ عالی اسے کشمکش میں مبتلا دیکھ کر بھی نہ سمجھی ویسے عالی خود بھی کچھ کنفیوز لگ رہی تھی۔

''یہ گاؤن تمہارا تو نہیں.....'' عالی نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ شاید اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا چاہتی تھی۔ عائم نے نظر چرا کر بتایا۔

''نورکا ہے۔'' وہ جلدی سے بولی تھی۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ ''نورس سے کچھ کام ہے۔'' اس نے عالی کو بتایا اور اس کی بات سنے بغیر ایڈمن آفس کی طرف بڑھ گئی۔ عالی بھی بے چین سی گیٹ کے قریب چلی گئی۔ اس کے چہرے

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832

منڈی بہاؤالدین 0331-7619788 مغل آباد 0301-7681279 مانسہرہ 0333-5021421
ڈسکہ 0300-9463975 سمبڑیال 0333-8604306 کوٹ رادھا کشن 03004992290
حجرہ شاہ مقیم 03006969881

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پر گھبراہٹ اور بے چینی واضح تھی۔ عمائم نے مڑ کر دیکھا۔ عالی گیٹ کے قریب ٹہل رہی تھی۔ جانے اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا؟ عمائم کو اپنی پریشانی تھی سو عالی پر غور نہیں کر سکی تھی۔ ایڈمن آفس میں داخل ہونے سے پہلے اس نے گاؤن اتار دیا تھا۔ پھر بے دھڑک اندر داخل ہوگئی۔ نورس آفس میں موجود تھی۔ اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ عمائم کی منتظر ہے۔ جیسے اسے یقین تھا عمائم ضرور آئے گی۔ اسے دیکھ کر نورس کو غصہ نہیں آیا تھا۔ حالانکہ آنا چاہیے تھا۔ مزاج بھی برہم نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ ہونا چاہیے تھا۔ عموماً نورس غصہ نہیں کرتی تھی۔ بڑی ٹھنڈی اور مدھم رہتی تھی۔ اس وقت بھی خاصی خندہ پیشانی سے بولی۔

''زہے نصیب، تشریف لائیے۔'' نورس نے مسکرا کر گداز صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ عمائم دل ہی دل میں سہمتے ہوئے بیٹھ گئی۔ نورس کے انداز معمولی نہیں تھے۔ عمائم کا حلق تک خشک ہوگیا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔'' نورس پھر سے مسکرائی تھی۔ آج تو بات بے بات مسکرا رہی تھی۔ جانے مسکراہٹوں سے قتل کرنے کا ارادہ تھا؟ عمائم سمجھ نہ سکی۔ تاہم نورس کا بڑھتا جوش اور ولولہ عمائم کے حواس اڑا رہا تھا۔ وہ کیوں اتنی پُرجوش اور خوش تھی؟ عمائم کو بیٹھی نظر سے دیکھ رہی تھی حالانکہ عمائم تو کچھ اور ہی توقع کر رہی تھی۔ لیکن سب کچھ توقع کے برخلاف ہو رہا تھا اس کا مغرور ہونا نورس کے لیے باعثِ تسکین یا خوشی تھا؟ عمائم سوچ نہیں پائی تھی۔

''عمائم! تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے بلکہ میں تو شاکڈ رہ گئی ہوں۔'' نورس اپنی جگہ سے اٹھ کر عمائم کے قریب آگئی تھی۔ عمائم ہکا بکا رہ گئی۔ آخر اس نے کیا کر دیا تھا۔

''میں تو تمہیں بہت ڈفر سمجھتی تھی۔ جیسے کتابوں کے علاوہ کچھ آتا نہیں..... تاہم تم نے میرے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے ہیں۔'' نورس نے بڑے جوش سے عمائم کا ہاتھ دبا دیا تھا۔ اسے اپنا ضروری پیکٹ بھول گیا تھا۔ جس کی خاطر اس نے ''غدر'' مچا رکھا تھا۔

''تم تو بڑی کمال چیز ہو عمائم.....!'' نورس سراہتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ عمائم ابھی تک ہونق تھی جیسے کچھ بھی پلے نہ پڑا ہو۔

''تمہارے پاس بہت اعلیٰ دماغ ہے۔'' وہ جیسے اس کی صلاحیتوں کی معترف ہو چکی تھی۔ عمائم نے بھلا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اسے یاد نہیں آیا تھا۔

''عمائم! تم میرے ساتھ کام کرو گی؟'' نورس نے اچانک کہا تھا۔ عمائم کی آنکھیں پھیل گئیں۔

آخر نورس کو ہو کیا گیا تھا؟ اس کا دماغ تو نہیں چل گیا؟

''میں تمہیں اس جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دوں گی۔'' نورس نے عمائم کے سر پر بم گرایا تھا۔ ''اس جامعہ کی منتظم اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ یہ تو اس کا دیرینہ خواب تھا۔ ایسا خواب جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر نورس آج کہہ رہی تھی؟ کیا عمائم کا خواب پورا ہونے والا تھا؟

''اور تم حیران رہ جاؤ گی، تم پر انعام و اکرام کی بارش ہو جائے گی۔ سمجھو، تمہیں منتخب کر لیا گیا ہے۔'' نورس نے عمائم کے گال پر ہاتھ پھیر کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا، عمائم بے ہوش ہوتے، ہوتے رہ گئی تھی۔ نورس اس کو ہارٹ اٹیک کرانے والی تھی۔ اس کا دل سہم، سہم گیا۔

''تم بولتی کیوں نہیں ہو عمائم!'' نورس کو اچانک اس کی خاموشی کا احساس ہوا تھا۔ پھر وہ اس کا گال تھپتھپا کر بولی

''بہت حیران ہو ناں.....!'' وہ مسکرائی تھی۔ ''چلو، میں تمہاری حیرت دور کرتی ہوں۔'' نورس کو جیسے اس ترس آگیا تھا پھر اس نے پروجیکٹر پر کوئی فلم چلا دی تھی۔ خود وہ عمائم کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

''ایک چھوٹا سا حساس کیمرا اس آفس کی سیکورٹی کے لیے لگا رکھا ہے، خوش قسمتی سے تم کو یہیں بند کیا تھا۔

اور جگہ ہوتی تو اتنا حیران کن منظر ہماری نگاہ سے اوجھل رہتا۔'' نورس نے اشارے سے اسے ویڈیو کی طرف متوجہ کیا تھا۔ عمائم کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے حواس منجمد ہوگئے تھے۔ یہ وڈیو کسی اور کی نہیں، عمائم کی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔ ایک، ایک منظر اس کے حواس گزر رہا تھا۔

یہ اس ٹائم کے کلپ تھے جب اس نے اُمِ رومان کو دھوکے سے باتھ روم میں بند کردیا تھا پھر بڑی ہوشیاری سے لاک کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ آگے ہال کے کلپ تھے۔ جب اس نے نورنامی لڑکی کو بیوقوف بنا کر اس کا کارڈ اور گاؤن لیا تھا۔ ایک کلپ گیٹ کا بھی تھا۔ جب وہ لڑکیوں کے غول میں گرے کلر کا گاؤن پہنے گم ہوگئی تھی پھر نور کا کارڈ دکھا کر باہر نکل گئی۔ وڈیو کے اختتام پر نورس نے تالی بجائی تھی۔ وہ عمائم کو سراہ رہی تھی۔ اس کی معترف ہو رہی تھی۔ اور عمائم کا سر شرمندگی سے جھک گیا تھا۔

''ویلڈن عمائم! تم تو بڑے بڑے سورماؤں کو الو بنا سکتی ہو، میں تمہاری مرید ہوگئی۔'' نورس نے مسکرا کر بڑے جوش سے کہا تھا۔ وہ اس سے شدید متاثر تھی۔ عمائم کو نورس کے جوش، ولولے اور خوشی کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ آخر وہ کیوں اتنی مسرور تھی؟ کیا عمائم کے دھوکے پر نورس کو خوش ہونا چاہیے تھا؟

''تمہیں خبر نہیں عمائم! جامعہ کی حساس اور زیادہ آمد و رفت والی جگہوں پر حساس کیمرے سیکورٹی کے لیے نصب ہیں تاکہ کسی مشکل میں گرفتار ہونے سے پہلے الرٹ ہوجایا جائے۔ لڑکیوں کی حفاظت کے لیے۔ یاد ہے، پچھلے سال جامعہ سے ایک نہیں، تین لڑکیاں لاپتا ہوگئی تھیں۔'' نورس نے پچھلی کسی بات کا حوالہ دیا تھا۔ عمائم تو اتنی حیران تھی۔ اثبات میں سر ہلا بھی نہ ہلا سکی۔ حالانکہ اس بھیانک واقع کے بعد تائی امی نے اسے جامعہ آنے جانے سے منع کردیا تھا۔ تاہم عمائم کے لیے خاموش ہوگئیں۔ وہ ڈگری لیے بغیر جامعہ کو چھوڑنا چاہتی بھی تو یہ ممکن نہیں تھا۔

''عمائم! سمجھو تو تمہاری لاٹری نکل آئی ہے اوپر والوں کو تمہاری ذہانت متاثر کرگئی۔ اب تمہیں عملی طور پر میرے ساتھ کام کرنا ہوگا۔'' نورس چمکتی آنکھوں سے مخاطب تھی۔ عمائم کو 'اوپر والوں' کی بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔ سو کام کی نوعیت بھلا کیا پوچھتی؟ اس کا دل تو بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ابھی تک نورس نے اپنے پیکٹ کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ نہ عمائم اپنا شولڈر بیگ کھول سکی۔

''بولو.. منظور ہے؟'' نورس نے اپنا ہاتھ پھیلا لیا۔ تو گویا وہ اسے اتنے عظیم الشان جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنانے پر تیار ہوگئی تھی۔ یہ اعزاز عمائم کے حواس گم کرگیا تھا۔ کیا وہ اتنی بھاری ذمے داری اٹھانے کے قابل تھی؟ جبکہ ابھی تک اسے ڈگری بھی نہیں ملی تھی۔ اور نہ وہ کوئی تجربہ رکھتی تھی۔ نہ اس میں اتنی سمجھ بوجھ تھی۔ وہ تو ابھی تک ایک طالب علم تھی۔ سیکھنے کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ کیسے اتنا بوجھ اٹھانے کی ہامی بھر لیتی؟ کیسے نورس کی بات مان لیتی؟ کیسے نورس سے عہد کرلیتی؟

''عمائم! یہ موقع مت گنواؤ..... ایسا ''ہن'' کسی، کسی پر برستا ہے۔'' نورس نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ عہد لیے بغیر ٹلنے والی نہیں تھی۔ بالآخر عمائم کو بولنا ہی پڑا۔ وہ بہت مشکل سے زبان کھول سکی تھی۔

''بہت مشکل ہے نورس! میں اتنی بھاری ذمے داری کیسے اٹھا پاؤں گی؟'' عمائم نے محتاط انداز میں کہا تھا۔

''میں ہوں ناں تمہارے ساتھ، کچھ مشکل نہیں..... سب سکھاؤں گی۔'' نورس نے اس کی ہمت بندھائی تھی پھر وہ دو گھنٹا اسے سمجھاتی رہی۔ اس کے لفظوں میں تاثیر تھی۔ اسے منانے کا اور قائل کرنے کا فن آتا تھا۔ اس کی زبان میٹھی تھی۔ اسے لفظوں سے کھیلنا بھی آتا تھا۔ سو عمائم قائل کیسے نہ ہوتی۔ نورس کے مجبور کرنے پر لاکھ تحفظات ہونے کے باوجود عمائم کو ہامی بھرتے ہی بنی تھی۔ پھر اسے خیال سا آیا۔

''نورس! آپ کا پیکٹ مل گیا ہے۔'' عمائم بمشکل مسکرا سکی تھی۔ نورس کی آنکھوں میں تحیر امڈ آیا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو۔

''واقعی! یہ تو معجزہ ہوا'' نورس کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ اس نے پیکٹ اور تھیلی نکال کر نورس کے حوالے کر دی تھی۔ نورس کے چہرے پر عجیب تاثر ابھرتے تھے۔ آنکھوں میں عقابی چمک بھرنے لگی تھی۔ اس نے عمائم کے سامنے ہی پیکٹ پھاڑ کر لوسے کا باکس نکال لیا تھا پھر ٹیپ اور ایک آلہ نکال کر دیکھنے لگی۔ اس نے بڑی مہارت سے ٹیپ او آلے سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ کئی جگہوں سے انہیں ادھیڑ کر کھولا۔ کئی جگہوں سے تکنیکی آپریشن کیا تھا۔ ہر زاویے او ہر نگاہ سے ٹیپ کو پرکھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثر تھے۔ وہ ٹیپ کے اندر سے ایک حساس لینس نکال چکی تھی پھر اس کی آنکھوں میں برہمی نظر آئی۔ وہ دوبارہ سے ٹیپ کا معائنہ کرنے لگی تھی۔

''نورس سے دھوکا'' اس نے زیرلب بڑبڑا کر کہا۔ ''یہ جانتے ہوئے بھی کہ نورس کی آنکھ سے بچنا محال ہے۔'' اس نے ٹیپ کو پُرزہ، پُرزہ کر دیا تھا۔ آخر وہ کیا کر رہی تھی؟ عمائم قطعاً نہیں سمجھی۔

''یہ پیکٹ جس چور کے ہتھے چڑھا تھا۔ اس نے ٹیپ اور آلہ بدل کر بھیجا ہے۔ یہ ہماری چیزیں نہیں۔ نورس کو دھوکا دینا آسان نہیں۔'' وہ غیظ میں آگئی تھی۔ چہرے پر شدید غصہ تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر خود پر قابو پایا۔

''میں نے نہیں بدلا۔'' عمائم گھبرا گئی۔ نورس بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں نے کب کہا تم نے بدلا ہے۔'' وہ گہری سوچ بھرے لہجے میں بولی جیسے کسی نتیجے پر پہنچ رہی تھی۔

''تمہارے گھر میں کون ''مشکوک'' بندہ ہے عمائم!'' اس کا انداز بڑا عجیب تھا۔ عمائم حیران رہ گئی۔ بھلا اس کے گھر کون مشکوک تھا؟

''کوئی بھی نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر بھی۔ سوچو عمائم۔'' وہ بے چین سی بولی تھی۔ عمائم کا انداز سابقہ ہی تھا۔

''ہمارے گھر ایسا کوئی فرد نہیں۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ نورس کچھ دیر سوچتی رہی تھی پھر گہری سانس کھینچ کر بولی تھی۔

''اوکے..... پھر بھی محتاط رہو۔'' اس نے ٹیپ اور آلے کو توڑ مروڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا پھر عمائم کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا ایک کام کرو۔ میس کی طرف راشن ڈپو آرہا ہے۔ اپنی نگرانی میں ''اسٹور'' کروا دو۔'' نورس نے اس کے ذمے کام لگایا تھا۔ ایسے کئی کام وہ پہلے بھی کرتی رہتی تھی۔ سو سر ہلا کر اٹھنے لگی۔

''چلتی ہوں نورس۔'' اس نے اجازت چاہی تھی پھر پروجیکٹر کی طرف دیکھ کر گہری سانس کھینچتی باہر نکل گئی۔ اس کا دماغ جیسے گھوم گیا تھا۔ وہ کاریڈور سے ہوتی ہوئی ہال میں آگئی۔ جلد ہی نورا سے دکھائی دے گئی تھی۔ عمائم کو دیکھ کر نورا قریب آگئی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جیسے عمائم کا وعدہ ایفا کرنے پر مسرور ہوئی ہو۔

''نورا! یہ تمہارا کارڈ اور گاؤن۔ بہت، بہت شکریہ۔ تم نے میری مدد کی۔'' عمائم نے دل سے کہا تھا۔ نورا مسکرا دی تھی۔ جیسے اسے شکریے کی ضرورت نہیں تھی۔

''میں تو ہاسٹل میں رہتی ہوں۔ کہیں آتی جاتی نہیں۔ گاؤن نہ بھی ملتا تو خیر تھی۔'' اس نے اخلاق سے کہا۔

''پھر بھی وعدہ تو آج کا تھا ناں۔'' عمائم نرماہٹ سے بولی۔ نورا خلاقاً مسکرائی تھی پھر عمائم اس سے اجازت لے کر میس اسٹور کی طرف آگئی تھی۔ یہ جامعہ کے میس کی بلڈنگ تھی۔ ایک طرف میس ہال تھا۔ دوسری طرف میس اسٹور تھا۔ عمائم انٹرنس پر کھڑی تھی۔ جب راشن ڈپو میڈیم ٹریکٹر ٹرالے پر لدا ہوا آیا تھا۔ ٹریکٹر چلانے والا ایک جوان تھا۔ بہت خوش شکل، اسمارٹ سا۔ چہرے پر جگہ، جگہ چکنائی اور سیاہی لگی تھی۔ پی کیپ اور گلاسز بھی پہن رکھے تھے۔ چہرے پر مونچھیں بھی تھیں۔ عمائم کھڑی دیکھتی رہی۔ اسی وقت اسٹور کا ہیڈ حواس باختہ چلا آیا۔

''میڈم کو بتا کر آئیں، ڈیلر نے نیا ڈرائیور بھیجا ہے۔ کم بخت ایکسیڈنٹ کر آیا۔ سارے انڈے ٹوٹ گئے۔'' اسٹور کا ہیڈ بہت غصے میں تھا۔ چھوٹا ٹریکٹر اور انڈوں کے کریٹ سے بھرا ٹرالر ٹوٹے انڈوں سے لدا ہوا تھا۔ فضا میں

کچے انڈوں کی ناگوار باس پھیلی تھی۔ عمائم نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ انڈوں کے سیکڑوں کریٹ الٹے پڑے تھے۔ بن اور رس کے پیکٹس کا کچومر نکلا ہوا تھا۔ یعنی نرا نقصان ہی نقصان تھا۔ عمائم کا دماغ چکرا گیا۔

''نئے ڈرائیور کو میڈم کے پاس لے چلو۔'' اس نے اسٹور کے ہیڈ کو ہدایت کی تھی۔ اس سے تو نورس ہی نمٹے گی اب۔ ڈرائیور خاصا ہراساں تھا۔ عمائم الٹے قدموں نورس کے آفس کی طرف آ گئی تھی۔ ڈرائیور کے آنے سے پہلے اس نے نورس کو نقصان کی اطلاع دے دی تھی۔ حسبِ معمول نورس کو بلا کا غصہ آیا تھا۔ آخر نقصان معمولی نہیں تھا۔ اس نے ڈرائیور پر سارا غصہ اتارا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سنتا رہا تھا۔ ایک دفعہ بھی صفائی نہیں دی تھی۔ عمائم کو ڈرائیور کا انداز بڑا عجیب لگا تھا۔

''ہمارا نقصان پورا کرو... ہر قیمت پر۔'' نورس نے تحکم سے کہا تھا۔ ڈرائیور کا پہلی مرتبہ رنگ فق ہو گیا۔

''میں غریب آدمی ہوں جی، کہاں سے پورا کروں؟'' وہ گڑگڑایا۔ عمائم کو اس کی آواز بڑی جانی پہچانی لگی تھی۔ وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔ اس نے کہاں پر یہ آواز سنی تھی؟ عمائم کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ تاہم یہ آواز ماضی قریب میں سنی گئی تھی۔

''جہاں سے مرضی کرو، اگر نہ کیا تو تھانے بھجوا دوں گی۔'' نورس نے اسے خوب دھمکایا۔ وہ گھگیانے لگا تھا۔ بہت دیر منتیں کرتا رہا۔ پاؤں پڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ نورس کو ان باتوں پر ترس نہیں آتا تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑی کٹھور تھی۔ ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کر کے چٹخی تھی۔

''آنکھیں کھول کر ڈرائیونگ کرتے ناں۔'' وہ دہاڑی تھی۔

''غلطی ہو گئی مائی باپ، معاف کر دو۔'' ڈرائیور کا بھونپو چلتا رہا تھا پھر نورس کے دہاڑنے پر واپس پلٹ گیا۔ عمائم اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی پھر وہ نورس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی جو اسے مزید ہدایات دے رہی تھی۔ عمائم، نورس کی بات غور سے سنتی رہی۔ ایسے ہی غیر ارادتاً اس کی نگاہ دائیں طرف مڑی تھی۔ یکا یک وہ بری طرح چونک گئی تھی۔ نورس اس وقت کال سن رہی تھی۔ اس کا دھیان عمائم کی طرف نہیں تھا اور عمائم کا سارا دھیان دائیں طرف تھا۔ ہاسٹل کی بلڈنگ کے پچھلی طرف گول دائرے کے قریب جھاڑیوں کی بائیں جانب بلاشبہ وہ ڈرائیور ہی چھپ کر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو اینچ کا چمکتا سا اسمارٹ موبائل تھا۔ اس نے دو سیکنڈ میں دو تین تصویریں کھینچیں اور الٹے قدموں جھکا، جھکا پچھلی طرف بھاگ گیا تھا۔ عمائم کی جب تک اس پر نگاہ پڑی تھی تب تک وہ اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔ عمائم جیسے ساکت رہ گئی تھی۔ وہ کون تھا جو عمائم اور نورس کی تصویریں بنا کر لے گیا تھا؟ عمائم کو جب تک سمجھ آئی بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ جیسے پتھر کی مورت میں ڈھل گئی۔ آخر دو سیکنڈ میں کیا ہوا تھا؟ اس کا دماغ چکرا تا رہ گیا۔

☆☆☆

اس نے آنکھیں سکیڑ کر ٹرالر لوڈ ہوتے دیکھا تھا۔ ورکر بھاگ، بھاگ کر بڑی احتیاط کے ساتھ انڈوں کے کریٹ رکھ رہے تھے۔ کچھ ورکر رس اور بن کے بڑے، بڑے تھیلے بھی لوڈ کرتے جا رہے تھے۔ ڈیلر کان پر بال پوائنٹ اڑس کر رجسٹر ہاتھ میں پکڑے اونچی آواز میں ہدایات دے رہا تھا۔

''او چھوٹے، جلدی کر مدرسے کا مال ہے۔ او، جلدی ڈرائیور کو بلا۔'' اس کا ریکارڈ اونچی آواز میں بج رہا تھا۔ چھوٹا بھاگتا، بھاگتا ڈیلر کے پاس آیا۔

''استاد! ڈرائیور کی بیوی بیمار ہے، چھٹی مانگ رہا ہے۔'' چھوٹے نے استاد کی منت کرتے ہوئے بتایا تھا۔ جواباً ڈیلر نے چھوٹے کے کندھے پر مکا مارا۔

''اس کی بیوی تو کبھی تندرست نہیں ہوئی۔ بلا کم بخت کو... کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' ڈیلر غیظ بھرے لہجے میں

پھنکارا تھا۔ تب ڈرائیور سر پر صافہ لپیٹے غیظ سے کوارٹر کے کواڑ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس کی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھیگ رہی تھیں۔ اس نے استاد سے اجازت لی اور ٹریکٹر کی سیٹ پر چڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ٹریکٹر چہل پہل والے علاقے سے نکل گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر ڈرائیور کو بریک لگانے پڑے تھے۔ سامنے دو جوان کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیور کو نیچے اتارا۔ اسے کان میں کوئی بات سمجھائی تھی پھر مٹھی بھر نوٹ اس کی ہتھیلی میں دبائے۔

''جا، بیوی کا علاج کر، دوائی لا کے دے۔ مدرسے میں مال ہم پہنچاتے ہیں۔'' جوان نے ڈرائیور کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اس نے کوئی اور سوال نہیں کیا... بلکہ دعائیں دیتا واپس چلا گیا۔ اسے یقین تھا ٹریکٹر ٹرالر بحفاظت واپس پہنچ جائے گا۔

اب وہ لیدر کے ایک بیگ سے کچھ چکنائی اور سیاہی کا محلول نکال رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے اس نے چہرے پر جگہ، جگہ پینٹ کیا تھا۔ آنکھوں پر گلاسز لگائے۔ پی کیپ پہنی اور ٹریکٹر کی اسپیڈ پکڑ لی تھی۔ رستے میں ایک جگہ اس نے بڑی احتیاط سے ایکسیڈنٹ کیا۔ جب سارے کریٹ انڈوں کے ٹوٹ گئے تب وہ مطمئن ہو کر جامعہ کی طرف آ گیا۔

گیٹ نمبر 2 پر پاس دکھا کر اندر پہنچا۔ گارڈ نے اسے روکا نہیں تھا۔ وہ میس اسٹور کی طرف پہنچ گیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق میس انچارج چیخ پڑا تھا۔ سارے انڈے ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اس پر بری طرح چیختا رہا تھا۔ بعد ازاں اسے تھانے لے جانے پر مجبور کرتا رہا۔ اس نے گڑگڑاتے ہوئے انچارج کے پیر پکڑ لیے تھے۔

''مجھے میڈم کے پاس لے چلو، میں خود میڈم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔'' اس کی گڑگڑاہٹ پر میس انچارج نے ہیڈ سے کچھ کہا تھا۔ وہاں ایک لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ یہاں پر اس لڑکی کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے میڈم کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں پر بھی وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا دل تھوڑا سا اپنی جگہ سے ہٹا۔ تاہم وہ بڑا پُراعتماد تھا۔ میڈم نے توقع کے عین مطابق اس کی بڑی بے عزتی کی تھی۔ تھانے تک پہنچانے کی دھمکی بھی دی۔ وہ میڈم کے نقوش حفظ کر کے تھکے، تھکے قدم اٹھاتا چلا گیا تھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے جھاڑیوں میں پناہ لی۔ وہاں پر بھی اس لڑکی کے تاثرات سے محظوظ ہوتا رہا تھا جو حیرت اور بے یقینی سے اسے گھورتی رہی تھی۔ جیسے پہچاننے کی کوشش میں تھی۔

پھر اس نے بڑے محتاط انداز میں میڈم کی دو تین اینگل سے تصویریں لی تھیں۔ وہ اپنا کام کر چکا تو حیران رہ گیا۔ میڈم نے تو نہیں تاہم اس لڑکی نے اسے تصویریں بناتے دیکھ لیا تھا۔ وہ لمحے کے آخری حصے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ لڑکی شاید اسے پہچان چکی تھی سوا تنی شاکڈ تھی کہ میڈم کو بھی کچھ بتا نہیں سکی۔

عمائم نے گردن کا رخ موڑ کر دور، دور تک اسے تلاش کرنا چاہا تھا لیکن حدِ نگاہ کوئی وجود دکھائی نہیں دیا تھا۔ نورس میس انچارج کی درگت بنانے چلی گئی تھی۔ عمائم نے سوچا وہ نورس کو بتا دے۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ اتنی جلدی جامعہ کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا تھا پھر عمائم اسے پہچاننے کی انتھک کوشش کر چکی تھی۔ وہ جوان اس کا دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ بس یاد نہیں آ رہا تھا۔ اسے کہاں دیکھا ہے؟ اس کوشش میں تھک کر وہ دستکاری اسکول کی طرف آ گئی تھی۔ یہ بلڈنگ جامعہ کی مین بلڈنگ کے پیچھے اسی احاطے میں تھی۔ راستے میں نورا سے ٹکرا گئی۔ وہ اسکول کی طرف جا رہی تھی۔ عمائم کا بازو دبوچ کر بولی۔

''عمائم! میرے ساتھ چلیں۔ میں نے بڑا زبردست ماڈل بنایا ہے اور بلوچی کڑھائی کی شالیں بھی نمائش کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔'' نورا نے بڑے جوش سے کہا تھا۔ عمائم کو اس کا دل توڑنا مناسب نہیں لگا تھا۔ وہ نورا کے ساتھ اسکول کی بلڈنگ میں آ گئی تھی۔ یہاں پر دو بڑے ہال تھے۔ دونوں ہی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ اس وقت ہر درجے کی لڑکی بڑی پُرجوش سی اپنے کام میں مصروف تھی۔ عمائم کی آنکھوں میں حیرت اور ستائش کے ملے جلے رنگ

ابھرے تھے۔ اس نے ایسے، ایسے نادر نمونے دیکھے۔ خوب صورت کپڑے، کوٹ، شالیں، کروشیے کی چادریں، کشن، ہاتھوں سے بنی کھجور کے پتوں کی ٹوکریاں، لکڑی کے خوب صورت ڈیکوریشنز، مٹی کے برتن، ٹی سیٹ، ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، شیشوں سے سجے گھڑے، چٹائیاں، مٹی کے گلدان، کاغذ سے بنے پرندے، جانور، گل دان، پھول عمائم کی آنکھیں کھلتی چلی گئی تھیں۔ کیسے، کیسے آرٹسٹک ذہن اور ہنرمند ہاتھ تھے۔ ایک طرف ازار بند بُنے جارہے تھے، ایک گروپ رنگ برنگے شیشے، موتی اور گھنگرو لگے پراندے بنا رہا تھا۔ ایک کھڈی پر ہاتھ سے بنے کھیس تیار ہورہے تھے۔ عمائم گھوم پھر کر دیکھتی رہی۔ کچھ لڑکیوں کو مشورے بھی دیے تھے۔ وہ ویلکم چیکنگ پر آئی تھی۔ نمائش میں رکھنے کا سارا سامان قریب، قریب تیار تھا۔ تاہم نورس نے کوئی مخصوص اناؤنس نہیں کیا تھا ہر چہرے پر خوشی اور جوش دکھائی دے رہا تھا۔ نور نے عمائم کو بتایا۔

''ہم تو ایک، ایک دن گن، گن کر گزار رہے ہیں۔ جانے کون سی ڈیٹ فکس ہوگی؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا تھا۔ عمائم خود اس بات سے ناواقف تھی کہ نورس کون سی ڈیٹ فائنل کرتی ہے۔ ہر لڑکی کی آنکھ میں سوال تھا۔ ''نمائش کب ہوگی؟'' عمائم نے ان سب کو تسلی دی تھی پھر نور کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔ رستے میں نور نے قدرے شرماتے ہوئے عمائم کو بتایا۔

''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہو عمائم۔'' نور نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ نورس کی چونکہ عمائم ''نورِ نظر'' تھی سو جامعہ کی اکثریت عمائم کو خاصا پروٹوکول دیتی تھی لیکن نوران لڑکیوں سے خاصی الگ اور منفرد تھی۔ وہ عمائم کی خوشامد نہیں کرتی تھی۔ بلکہ دل سے پسند کرتی تھی۔ وہ بڑی جلدی عمائم کے قریب آگئی تھی۔ اس کا خاندان حادثے کا نہیں دھماکے کا شکار ہوگیا تھا۔ باقی جو رشتے دار تھے انہوں نے نور کی ذمے داری لینے سے انکار کردیا تھا۔ تب سے نور اسی جامعہ کو اپنا ٹھکانا سمجھتی تھی۔ یہی اس کی پناہ گاہ تھی۔ یہی اس کا گھر تھا اور عمائم کی صورت میں اسے بہن مل گئی تھی۔ عمائم بھی لازمی نور سے مل کر واپس جاتی۔ حالانکہ نور اس سے بہت جونیئر تھی۔ وہ بڑی دکھی سی لڑکی تھی۔ اکثر اپنے گھر والوں کی یاد میں روتی دکھائی دیتی تھی۔ عمائم سے اپنے دکھ شیئر کرتی۔

''کبھی، کبھی مجھے اپنا وجود بے معنی لگتا ہے عمائم، میرا زندہ بچنا ضروری تو نہیں تھا۔'' ایک دن بہت زودرنج ہو کر نور نے عمائم سے کہا تھا تب عمائم بہت خفا ہوئی۔

''نور! مایوسی کی بات نہیں کرتے۔ تمہارا زندہ رہنا کیوں غیر ضروری ہے؟'' یہ خفگی سے اسے سمجھاتی۔

''میرا پورا خاندان ختم ہوچکا ہے۔ میرے بچنے کا کیا فائدہ تھا؟'' وہ دکھی ہو کر رونے لگتی۔ اکثر مایوس نظر آتی۔

''پاگل لڑکی، کیا خبر، اللہ نے تمہیں کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کیا ہو۔'' عمائم اسے پیار سے تسلی دیتی۔ سمجھاتی، اس کی ڈھارس بندھاتی۔

''یہ کہاں ممکن ہے، میں تو عام سی بندی ہوں۔'' نور حیران ہوجاتی۔

''کبھی، کبھی عام لوگ بہت ''خاص'' کام کر جاتے ہیں۔'' عمائم مسکراتی۔

''کیا واقعی؟'' وہ اور بھی حیران ہوتی۔

''ہاں، بالکل۔'' عمائم کے چہرے پر تبسم بکھر جاتا۔

''تو مجھے اس خاص کام کا انتظار رہے گا۔'' نور ہنسنے لگتی تھی۔ روتے میں ہنسنا کتنا دلفریب لگتا ہے۔ عمائم بے خیالی میں سوچتی رہتی تھی۔

''کیوں نہیں۔'' عمائم بھی ہنس پڑتی۔ اب بھی نور کی کسی بات پر وہ مسکراتی ہوئی ہال کی طرف جارہی تھی جب حواس باختہ سی عالی ٹکرائی۔ وہ گراؤنڈ کی طرف سے آرہی تھی۔ عمائم کو دیکھ کر رک گئی۔

''کہاں غوری میزائل کی طرح اڑی جارہی ہو؟'' عمائم نے عالی سے پوچھا تھا۔ وہ قدرے گڑبڑا سی گئی تھی

پھر رک کر عمائم کی طرف دیکھنے لگی۔اس نے ہاتھ میں اخبار بھی پکڑ رکھا تھا۔

''تم بھی تو ایٹم بم کی طرح بھری پھر رہی ہو۔تاکہ کسی کے بھی سر پر پھٹ سکو۔'' عالی نے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔ عمائم کو بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔

''ارے.....ارے، میں کہاں؟'' وہ مسکراتی چلی گئی تھی۔عالی مصنوعی خفگی سے غرائی۔

''یہ تم نورس کی بغل میں اتنا کیوں دکھائی دے رہی ہو؟'' اس نے کلس کر پوچھا تھا۔عمائم کو خواہ مخواہ کھانسی آ گئی تھی۔

''تو گویا خاتون! آپ جل رہی ہیں۔'' عمائم نے اسے خوب کلسایا تھا۔اس کی بھویں تن گئی تھیں پھر اس نے تیکھے چتون سے پوچھا۔

''میں کیوں جلوں گی؟ نورس سے جلتی ہے میری جوتی۔'' عالی کا انداز بڑا بے ساختہ تھا۔عمائم حیران رہ گئی پھر خفگی سے اسے گھورنے لگی تھی۔عالی نے بھی جلدی سے زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔گویا اپنی غلط بکواس کا احساس ہو گیا تھا۔

''سوری، منہ سے پھسل گیا۔'' عالی نے ہنسی دبا کر کہا۔

''شرم کرو، جامعہ کی اونر ہے۔ہماری اتالیق ہے۔سوچ سمجھ کر بولا کرو۔'' عمائم نے اسے ڈپٹ کر سمجھایا۔

''اوکے، نو نصیحت......میں نورس نامہ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''چلو، میں ''احتشام'' نامہ سننے کے موڈ میں ہوں۔اگر کچھ سنانا چاہو تو۔'' اس نے معنی خیزی سے کہا تھا۔عالی کو کھانسی آتی، آتی رہ گئی تھی۔

''اوہو، اتنی بڑی تبدیلی؟ پہلے تو اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں تھا۔'' عالی مکاری سے ڈیلے گھما کر چہکی۔

''نام تو اب بھی سننا گوارا نہیں۔میں تو تمہاری خاطر کہہ رہی تھی۔'' عمائم گڑبڑائی۔

''اچھا۔'' وہ معنی خیزی سے چیخی۔''تبھی آج صبح احتشام کی جیپ سے برآمد ہوئی ہو۔'' اس کا انداز بڑا کلسانے والا تھا۔عمائم غصہ کرنے کے بجائے ہنس پڑی تھی۔اِدھر عالی کو بڑے حیرانی کے جھٹکے لگ رہے تھے۔عمائم جلدی سے گفتگو بدلنے لگی۔مبادا عالی اس کے دل کی بدلتی کیفیت کا کوئی رنگ پا جائے۔اس نے غیر ارادتاً ثریم کے بارے میں پوچھا تھا۔

''آئی نہیں ثریم؟''

''نہیں، تمہیں نہیں پتا کیا؟'' عالی ساری چونچالی بھول کر بے ساختہ سنجیدہ ہوئی تھی۔عمائم کی آنکھوں میں تفکر ابھر آیا تھا۔گویا معاملہ سنگین تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''ثریم کی رشتے دار کرن ہے ناں۔دور پار کی کزن لگتی ہے۔اس کے پاپا کی کزن ہیں، ان کی اکلوتی بیٹی کرن۔وہ کنسرٹ سے واپسی پر کڈنیپ ہو گئی تھی۔بیچاری کی لاش کسی گٹر کے پاس سے ملی ہے۔ثریم کے گھر پر سمجھو قیامت ہے۔'' عالی نے افسردگی سے بتایا تھا پھر عمائم کے ہاتھ میں اخبار تھما دیا۔اس نے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اخبار پکڑ کر دیکھا۔سامنے ہی بھیانک خبر لگی تھی۔

''مغوی لڑکی کرن کو کنسرٹ سے واپسی پر نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا تھا۔گٹر کے پاس سے مسخ شدہ لاش ملی ہے۔'' آگے تفصیلات لکھی تھیں۔عمائم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔تصور کے پردے پر گلابی لڑکی، گلابی کپڑوں میں مسکراتی ہوئی نظر آنے لگی۔پیکٹ اور پھولوں کا بوکے پکڑے.....عمائم کو لگا، اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔

(جاری ہے)

شام ڈھلے

سیما بنتِ عاصم

کتنی عجیب بات تھی ناں..... امی اور بابا کے درمیان ہر معاملے میں زمین آسمان کا تضاد تھا۔ پھر بھی ان کی سالوں سے بن رہی تھی تو بلاشبہ اس کا بڑا کریڈٹ امی کے ٹھنڈے میٹھے رواں پانی کے جھرنے جیسے مزاج کو جاتا تھا۔ وہ کتنی ہی جگہ طرح دے جاتیں..... سو کئی باتیں دب جاتیں۔ بابا کہتے..... اور درست ہی کہتے کہ کبھی چھوٹی، چھوٹی باتیں مل کر کسی بڑی بات کی وجہ بن جاتی ہیں، اور کبھی بڑی سے بڑی

بات پر بھی انسان دھول ڈال دیتا ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ بابا سدا سے مزاج کے تیز تھے۔ مزاج کے بے پروا اور من موجی..... اور شادی سے پہلے تک کی زندگی موج مستی..... شغل میلوں کی نذر رہی..... ان کے برعکس امی کا ٹھنڈی میٹھی نرم چھاؤں جیسا مزاج..... کبھی بابا کے منفی رویّوں کو ہوا نہ دے سکا..... وہ سو باتوں پر دھول ڈال کے چلتیں..... سو بھی رہی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ بابا کے سب کس بل نکل گئے تھے..... اور اب تو بابا بھی کہنے لگے تھے کہ وہ امی ہی تھیں جنہوں نے بابا کو ان کے لاابالی پن سمیت بھگت لیا تھا۔

اور شیبا ٹھہری ان کی لاڈلی، چہیتی اور مزاج آشنا بیٹی..... اس سے بابا کی طویل نشستیں جمتیں..... بابا کی زندگی اس کے لیے اِک کھلی کتاب تھی..... مگر ماضی کا ایک ورق اسے بابا کی پرانی ڈائری سے ملا تو ان کے سر ہوگئی۔

''بتائیں ناں بابا..... کون تھی وہ آخر..... جس کے عشق نے آپ کو اپنا آپ بھلا رکھا تھا۔'' اس نے ڈائری میں درج سطر دُہرادی تھی۔ بابا نے لاکھ دامن بچایا..... آنا کانی کی..... مگر وہ ہار ہی گئے۔

''تھی ایک بیچاری..... مگر اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اس کا رشتہ لے کر جانے سے صاف منع کردیا۔'' وہ تصور میں اس کا سراپا دیکھ رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا بابا.....؟''

''محبت کا ڈراپ سین..... اِک روز میری اماں اور میرے بھائی نے مجھے سینما دکھانے کا چکمہ دے کر ٹیکسی میں بٹھایا۔ ٹیکسی صدر تک پہنچی تو اماں نے ٹیکسی کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا..... ٹیکسی ان جانے رستوں پر سفر کرنے لگی تو میں کھٹکا..... مگر میرے دائیں، بائیں دونوں بھائی مجھے بالکل دبوچے بیٹھے تھے..... میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آج سب نے مل کر میری شادی خانہ آبادی پکی کر رکھی ہے۔ بس لاعلمی میں بندھ گئے۔''

''اور بابا اس دوشیزہ کا کیا بنا..... جس سے آپ شادی کرنے پر تلے تھے؟''

''وہ تم نے سنا نہیں..... نہ جنوں رہا..... نہ پری رہی..... سچ تو یہ ہے کہ نگہت (امی) کے ساتھ بندھ کر ہر خسارہ بے معنی ہوگیا۔''

بات وہیں آکے رکتی ہے کہ کبھی، کبھی بڑی سے بڑی بات پر بھی دھول پڑ جاتی ہے اور یہ امی کا نصیب تھا..... وہ جو کہا گیا ہے با ادب با نصیب..... سو اُن سے جڑ کر بابا کی جون بھی بدل گئی تھی۔

یہ زندگی ہے..... وقت کا کارواں چلتا رہتا ہے..... زندگی سے جڑے کردار بدلتے رہتے ہیں۔ نئے رشتے بنتے ہیں تو پرانے اِدھر اُدھر ہوجاتے ہیں..... ان کے نقشِ قدم پڑتے، پڑتے بالآخر مٹ جاتے ہیں۔ اور نکاح کے دو بول ان میں تو قدرت نے بھی تاثیر رکھی ہے۔

سو سابقہ محبت کے نقش مدھم پڑتے، پڑتے بالآخر مٹ گئے تھے وگرنہ کبھی تو ان کے لبوں پر کوئی نہ کوئی ذکر آ ہی جاتا ہے۔ اور امی کی خاموشی اور برداشت والی پالیسی..... ساری زندگی بنا گئی تھی۔ امی کی ساری سمجھ بوجھ ان کی خاموشی میں ہی چھپی تھی۔

ہزار وعدوں سمیت بیاہ کر لانے والی ساس نے بابا کی زندگی ان کے سر تھوپ کر صاف ہاتھ جھاڑ لیے کہ اب تم جانو اور تمہارا کام..... بھگتتے پھرو اپنی بگڑی بھٹکی روش.....

امی نے بابا کے فرمان کی ڈور کو تھام کر زندگی کی کڑوی کسیلی کو سہا تھا۔ اگرچہ بابا کے مزاج کا لاابالی پن کافی آگے تک چلا..... امی ہنر مند تھیں گھر کی گاڑی کھینچنے کو گھر بیٹھے جو کام ملا کیا..... مگر کبھی میکے جا کر سوال نہیں کیا۔

بابا کی ساری من موجیاں تب تک چلیں، جب تک اللہ نے اولاد سے نہ نوازا..... عاشی کے بعد عینی شیبا اور پھر جیا اولاد ہوگئی تو اپنی زندگی کسی پس منظر میں

جاپڑی...... امی نے ان کے ساتھ کڑا وقت گزارہ تھا۔ مگر بھی نصیب پھوٹنے کا شکوہ نہیں کیا۔ بابا کا دم خم گزرتے وقت کے ساتھ سمندری جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا تھا...... کچھ بابا نے خود کو بدلا...... کچھ ان سب کا نصیب...... ننھیالی مکان کے ترکے سے ملنے والی رقم سے امی نے بابا کو اِک شاپ کھلوادی...... جو اب سپر جنرل اینڈ میڈیکل اسٹور کہلاتی ہے۔

وہ جو کہتے ہیں ناں کہ پروردگار بھی کسی کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل لے...... اب بابا بھی امی کی دو چار کھری کھوٹی سن لیا کرتے تھے۔ بیٹیوں کے لیے وہ بہترین باپ تھے...... ان سب کا دل ہاتھوں پر رکھتے تو شاید گزرے وقت کا ازالہ کرتے۔ بقول امی سب باپ کی سر چڑھی تھیں۔ اور شیبا میں تو ان کی زندگی تھی...... بابا کے کندھے سے لٹک کر اپنی جائز نا جائز ہر بات منوالیتی...... اور بابا کی جیب خالی کروانے میں تو چاروں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اس میں کچھ شک نہیں تھا...... ٹھلیے، چھابڑیوں والوں کا کاروبار ان کے دم قدم سے چلتا...... کیا مجال جو کوئی پھیری، چھابڑی والا گلی سے نامراد گزر جائے اور اس لاڈ و پیار نے بھی ان کے مزاج بگاڑے نہ تھے۔ سال بھر پہلے سب سے بڑی بیٹی عاشی کو بیاہتے وقت امی نے گھنٹا بھر سمجھایا۔

''وقت اور انسان، کیسا بھی ہو...... بدلتا ضرور ہے۔ انسانوں سے یہ سوچ کر سمجھوتا کرنا کہ وہ جیسا آج ہے سالوں بعد نہ ہوگا۔'' مانو امی نے اپنی زندگی عاشی کے پلو میں باندھ دی تھی۔ اور وہ عاشی آپا ہی تھیں جو صبر، شکر کے معاملے میں سرتاپا امی کا عکس تھیں۔ لاکھوں میں ایک مگر بلا کی توکل والی۔ سو جس کھونٹے باندھ دیا، بندھ گئی تھیں...... اور بری بھلی جیسی نصیب ہوئی تھی خوش تھیں۔ واقعی خوش بخت وہ ہے جو اپنے بخت پر خوش ہے۔ یونہی تو نہیں کہا گیا ناں...... کسی پر لاکھ کتابیں لاد دو...... انسان سیکھتا وہی ہے جو دیکھتا ہے۔ ماں کی گود کو اولاد کی پہلی تربیت گاہ اسی لیے کہا جاتا ہے۔

عینی اور جیا میں بھی امی کا تھوڑا بہت عکس تو تھا ہی...... ٹیڑھی کھیر تو بس اِک شیبا ہی ثابت ہوئی تھی۔ کم عقلی اور نادانی جس پر ختم تھی۔ تازہ، تازہ انٹر بھگتایا تھا...... اور اس عمر میں آنکھیں خواب بُنتی ہی ہیں...... سو جیون ساتھی کے لیے اس کے مزاج آسمانوں پر سفر کرتے...... کوئی عام اور مناسب سا رشتہ دماغ کو لگتا ہی نہیں تھا...... اب وہ عاشی جیسا جگر کہاں سے لاتی...... جو کہتی تھی کہ آخر شادی ہی تو کرنی ہے...... کسی سے بھی کر لی جائے کیا فرق پڑتا ہے...... مگر جیون ساتھی کے نام پر کسی کو بھی سر کا تاج بنا کر پھر اس میں آئیڈیل کی خوبیاں تلاش کرنا...... یا اس کے سانچے میں خود کو ڈھالنا، حماقت نہیں تو کیا کہلاتی۔ اور شاید یہیں آ کر قدرت انسان کا غرور اس کے قدموں میں ڈال دیتی ہے۔ اس کے لیے آنے والے رشتے عینی کی جانب مڑ جاتے...... اس کی بلا سے...... امی اکثر سر تھام کر بیٹھ جاتیں کہ نہ جانے کیا بنے گا اس لڑکی کا...... اب اس مڈل کلاس گھرانے کی عام سی لڑکی کے لیے آسمان سے شہزادہ تو اترنے سے رہا...... اور اس کا وہی اِک گمان کہ شکر خورے کو اوپر والا بھی شکر دے ہی دیتا ہے۔

بابا کا ماضی کے ورق الٹنا تھا کہ شیبا امی کے سر ہوگئی...... ہو نہ ہو...... ماضی کا کوئی حوالہ ان سے بھی جڑا ہوگا...... امی لاکھوں میں ایک تھیں،...... کیا ممکن تھا کہ کوئی واسطہ، تعلق نہ رہا ہو...... انہوں نے لاکھ دامن بچایا مگر نہ جی...... کسی پرانی کتاب کے بوسیدہ صفحے پر لکھی بات، شیبا کے دل پر نقش تھی جو لوگ خاموشی سے ہر بات سہہ جاتے ہیں ان کے لیے طے ہے کہ ان کا دل زخم خوردہ ہوتا ہے...... امی بھی ہار گئیں۔

''واسطہ تعلق ہی سمجھ لو...... بس ایک نسبت تھی...... رشتہ تو گھر والوں کا جوڑا ہوا تھا۔ مگر جب جڑ گیا تو انسیت ہو ہی گئی تھی مگر ایک خاندانی چپقلش نے سب کچھ ختم کر دیا تھا۔'' وہ بول اٹھی تھیں۔

''آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا......؟'' شیبا نے کریدا۔

''دکھ...... ہاں...... اس وقت تو یہی لگا تھا کہ دنیا

ہی لٹ گئی..... مگر جب میری شادی ہوگئی تو وہ بات ہی نہیں رہی۔''

''مگر امی..... یوں بھی تو ہوتا ہے ناں کہ کوئی ہم میں رہ جاتا ہے۔ اور کسی میں ہم.....؟'' شیبا نے سوچا..... امی نے جیسا تشنہ وقت گزارہ..... یقیناً کسک تو جاگتی ہوگی..... یوں نہ ہوتا عدم تو، یوں ہوتا.....

امی نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا تھا۔

''رات گئی، بات گئی..... جب نئے رشتے بنتے ہیں..... پرانوں پر خود بخود گرد پڑ جاتی ہے۔ تعلق کو مکمل بس ایک مضبوط بندھن کرتا ہے..... اس کے سوا تو سب رسہ کشی ہے یا بھٹکاوا۔'' امی کی بات شیبا کے دل میں کھب کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

جیا پہلا پیپر دے کر لوٹی تو سرتاپا لرز رہی تھی۔ کسی لفنگے نے گھر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ امی سے لپٹ کر دھواں دھار روئی، کالج تو گھر سے قریب ہی تھا مگر اسے کسی کا ساتھ نہ ملا۔ امی نے جیا کو مقدور بھر تسلی سے نوازا۔

''یہ راہ چلتے اچکے، آوارہ لڑکے گھر سے نکلنے والی ہر لڑکی کو مفت کا مال سمجھتے ہیں۔ مگر لڑکی ان کے مطلب کی نہ ہو تو پھر وقت ضائع نہیں کرتے..... جلد راہ بدل لیتے ہیں۔''

اس سے اگلا سبق شیبا سے پڑھ کر کس کو یاد رہتا..... انہوں نے بارہا اسے بھی سمجھایا کہ ''ایسا ہو تو کسی سیکورٹی گارڈ وغیرہ کی مدد لو..... یا کہیں تھم کر کسی بھی معقول بندے سے کچھ پوچھنے کھڑی ہو جاؤ۔ موقع پا کر اس لفنگے کی طرف اشارہ بھی کرو..... وہ یہ سمجھ کر کہ تم اس کی شکایت کر رہی ہو بھاگ نکلے گا..... یہ دنیا ہے بیٹا، اس کو جھیلنے کے لیے بڑا جگرا درکار ہوتا ہے۔''

مگر جیا کم حوصلہ تھی..... امی نے اگلی بار شیبا کو اس کے ہمراہ کیا..... اگرچہ وہ خود ایسی کون سی علامہ تھی۔ تازہ، تازہ انٹر بھگتا کر فراغت کے دن گنتی..... موبائل ہاتھ لگ جاتا تو وقت کا شمار ہاتھوں سے نکل جاتا..... یہ تو پھر چند گھنٹے تھے..... اور سوشل میڈیا کی دنیا..... اللہ کی پناہ..... بابا یوٹیوب پر اسلامک چینلز دیکھتے تو سو کانوں کو ہاتھ لگاتے۔

''اللہ بچائے اس سوشل میڈیا کی دنیا سے..... انسان دنیا کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھے تو جانے کہاں کہاں مات کھائے..... لوگوں نے اپنا کاروبار چمکا کو مذہب تک کو نہ بخشا.....''

اور ان چاروں کی سانسیں موبائل کے ساتھ چلتیں جیا کے دوسرے پیپر کا پہلا گھنٹا تو مطلوبہ کلاس تلاش ہی میں نکل گیا..... پرائیویٹ کالج کی بلند و با عمارت میں طویل، طویل راہداریاں پھرتے ا سارے کالج کا نقشہ از بر ہو گیا تھا۔ ٹانگیں شل ہو لگیں، تب کہیں جا کر جیا کو رول نمبر ملا۔ شیبا ویٹنگ لاؤنج کے لیے مڑنے لگی کہ اِک طویل قامت مضبو وجود سے ٹکرا گئی۔ سر اٹھا کر دیکھا براؤن آنکھیں مسکراتے لب، سلیقے سے جمے بال، بلا کی پُرکشش شخصیت تھی..... وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ لاؤ میں دیگر عورتوں، لڑکیوں کا اِک ہجوم تھا۔ وہ وہیں بیٹھی..... موبائل کے لیے بیگ کھولا تو دھک سے رہ گئی..... موبائل غائب تھا۔ ہراساں ہو کر سارا بیگ چھان مارا..... موبائل ہوتا تو ملتا۔ یک لخت نظر میں و ٹکراؤ گھوم گیا..... ہو نہ ہو یہ ان ہی لمحات کا شاخسا تھا..... ایک نہ دو پندرہ ہزار کا موبائل تھا۔ امی تو اس کی جان ہی لے لیتیں۔ اس کے قدموں میں بجلیاں سی بھ گئی تھیں۔ منٹوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کیا۔ مگ راستے میں ہی ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اسی کی تلاش میں اس طرف آ رہا تھا۔ ایک بار پھر اسے ان براؤن آنکھوں، مسکرا لبوں کا سامنا تھا۔ دل کو چھو لینے والی سحر انگیز شخصیت..... اسے شکریے کے لفظ کم پڑ گئے۔

''بابر الزماں نام ہے میرا'' شاید اس کے کسی خواب عکس تھا وہ..... اللہ سمجھے..... اس جیا کو۔ ایک نہ دوبارہ پیپر تھے۔ جیا نے کمبائن دینے کے لیے محنت بھی بہت کی تھی۔

اِدھر وہ اِک بابر الزماں تھا کہ کالج کے جا کون سے فرائض بھگتاتا کہ ہر جگہ نظر آتا..... بار ہا ٹکرا

ہوا۔ آنے بہانے.....گرما کے تپتے جھلستے دن تھے، لاؤنج میں پنکھوں کی ہوا کم پڑ جاتی...... بھانت، بھانت کی بولیوں کا شور......اس کا دم گھٹتا......وہ باہر نکل آتی۔

اس دن ڈسپینسر کی تلاش میں بھٹک گئی۔ داخلی دروازے سے جڑا اس کا دفتر......کالج کے انٹرنس کی داہنی جانب جہاں بق ہوسناٹا چند درخت...... اگلے ہی پل وہ نظر کے سامنے تھا...... بلند قامت، مضبوط وجود، گولڈن براؤن لشکارے مارتی نظریں اور لبوں کے کٹاؤ میں مچلتی مدھم سی مسکراہٹ۔

''آپ میں بہت اٹریکشن ہے۔'' دو چار رسمی جملوں کے بعد پہلا ہی جملہ شیبا کے دل کی دنیا زیروزبر کر گیا۔ وہ خود کون سا کم تھا......روبرو ہوتا تو نظر بھر کر دیکھنے کے لیے سر اونچا کرنا پڑتا۔ گولڈن براؤن آنکھوں میں زندگی جاگتی تھی۔ اور لبوں کے کٹاؤ میں ہمہ وقت مچلتی مسکراہٹ......اس نے لحہ بہ لحہ خود کو اسیر ہوتا محسوس کیا۔ نظروں کے تبادلے کے ساتھ ہی جانے کیسے نمبروں کا بھی تبادلہ ہوا تھا......اسی رات وہ آن لائن تھا۔

''میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا آپ کو......؟'' گو کہ دل اپنی رفتار بھولنے لگا تھا مگر نخرہ دکھایا۔

''اس ٹائم میں سو جاتی ہوں۔ آپ کی پوسٹ پر آنکھ کھلی۔''

''اچھا......اتنا دم تھا اس پوسٹ میں......؟'' اس نے شرارتاً کہا تھا......وہ لب کا کونا دبا کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر ہنس دی۔

''اپنے سب دوستوں سے میں اسی ٹائم بات کرتا ہوں...... اور اب تو آپ بھی دوست بن گئی ہیں۔''

بہت سادہ اور رواں سا انداز تھا......وہ کھٹک گئی۔

''آپ کو پتا ہوگا کہ دوستی کیا ہوتی ہے؟'' معنی خیز انداز تھا۔ شیبا کے اندر اتھل پتھل مچی......مگر اک الجھن نے آگھیرا یہ تبسم و تکلم کہیں اس کی عادت ہی نہ ہو......تصور میں دو گولڈن براؤن آنکھیں مسکائی تھیں۔ اس کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ انکار کا سوال ہی نہیں تھا......مگر جواباً اس کا لہجہ سادہ اور شفاف تھا۔

''نہیں، مجھے نہیں پتا......کیونکہ میں نے کبھی کی نہیں......''

''کبھی وقت دو تو بتاؤں گا۔''

''جی......'' وہ سرتاپا پسینے میں نہا گئی تھی۔

اس کا آفس کالج میں ایک طرف سناٹے کی جگہ پر تھا اور وہ سہ پہر کے بعد ملنے پر اصرار کر رہا تھا۔ پیپرز ختم ہو گئے تھے......اب وہ کیسے جاتی خیر ایک روز جیا کو لے کر کالج چلی آئی۔ وہ اسے دو منٹ انتظار کا کہہ کر غڑاپ سے اندر آفس میں جا گھسی تھی۔ مگر جیا کا ہوّا اس کے دماغ پر سوار ہی تھا......اس کے آفس کی داہنی دیوار میں جڑی کھڑکی مین گیٹ تک کا پتا دیتی......اس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں زندگی لشکارے مارنے لگی تھی۔

''سو کیوٹ......بیٹھو گی نہیں......؟''

''بس دو منٹ......وہ بھی آپ کے اصرار پر آئی ہوں بہن کے ساتھ، وہ نہ آجائے کہیں...... باہر انتظار کر رہی ہے۔'' اس نے کسی اور خدشے سے کہا تھا۔ وہ کچھ اور سمجھا۔

''تو اندر چلیں......؟'' گولڈن براؤن آنکھوں میں شرارت مچلنے لگی۔

شیبا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''جی......؟ دماغ تو درست ہے آپ کا؟'' اس کے روم سے جڑے اندھیرے سے اسٹور روم میں کالج کا فالتو کاٹھ کباڑ تھا۔

اس کے اندر دھکڑ پکڑ مچ گئی تھی۔ سو، وہ مارے باندھے کرسی پر بیٹھ گئی۔ مگر پل، پل بھاری تھا۔

''پھر کب ملو گی......؟'' وہ جلد ہی اٹھ گئی تھی۔ وہ بھی ساتھ ہی اٹھ گیا۔

''جا رہی ہیں؟'' چلتے سے وہ سوالیہ ہوا۔

''ظاہر ہے، رہنے تو نہیں آئی ناں......وہ ایک دم ہی اس کے ساتھ آ لگا۔

''ایک سیلفی ہو جائے؟'' اور شیبا کی لاکھ

مزاحمت پر بھی اسے پکڑ کر کھٹا کھٹ جانے کتنی سیلفی بنا ڈالیں۔

''اُف توبہ.....'' وہ سرتاپا پسینے میں نہا گئی۔ اس کے مضبوط و توانا وجود کا بھرپور لمس..... شیبا کے انگ، انگ میں شرارے سے بھر گیا تھا۔ بمشکل اپنا آپ چھڑایا..... تن بدن میں جیسے چنگاریاں ہی چنگاریاں بھر گئی تھیں۔

اور یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی ان چھوئی شے کو تحریک نصیب ہو جائے تو جڑ تو پکڑتی ہے ناں..... اس نے لمحہ بہ لمحہ خود کو اس جذبے کا اسیر ہوتے پایا تھا۔ فاصلے بہت تیزی سے سمٹے تھے۔ اور زندگی کے لیے محبت ضروری ہے یہ اس نے اب جانا تھا۔ شیبا کے لیے زندگی ان لمحات میں سمٹ آئی تھی۔ جب وہ روبرو ہوتا یا آن لائن ملتا..... اور وہ پل، پل گن کر یہ وقت گزارتی..... اور شاید یہی محبت ہوتی ہے، اسے بھی لگتا..... اس کی زندگی انتظار بن گئی ہے۔ صرف چند دنوں کی بات تھی مگر اِک بھرپور سراپا..... اِک بھرپور چھا جانے والی شخصیت اس کے حواسوں پر چھانے لگی تھی..... سو اب اس کا دل گھر کے کسی کام میں نہیں لگتا..... کان ہمیشہ موبائل کی بیپ پر لگے رہتے..... رات گئے تک اس سے بات چیت یا میسجنگ چلتی وہ اس سے تنہائی کے بہانے ڈھونڈتی..... مگر ان لمحات میں وقت ہاتھوں سے نکل جاتا..... اس کے سر پر مینڈ سوار رہتی تو دن بھر سوئی جاگی سی کیفیت رہتی..... کوئی کچھ کہتا، وہ کچھ سنتی۔ ان سب بے اعتدالیوں، بے قاعدگیوں کا کچھ تو نتیجہ نکلنا ہی تھا..... سو وہ بیمار پڑ گئی تھی۔

اس ناگفتہ بہ حالت میں بھی..... شیبا نے پل، پل اسے یاد کیا تھا۔ اس سے شناسائی کے دن انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے..... مگر اسے لگتا کہ لمحہ نہ کٹتا..... بس اِک جھلک بھی مل جاتی..... اس کے اندر چھینٹے پڑ جاتے..... اس نے سنا تو مزہ لیا۔

''میری وجہ سے آپ اتنی ریلیکس ہوتی ہیں..... اور اکیلے ملنے سے ڈرتی ہیں..... واہ کیا بات ہے۔''

اب یہ بھی کوئی کہنے والی بات تھی..... وہ ج ہتھیلی پر لے کر اس سے ملنے آتی اسے اند ستاتے..... کہیں کوئی دیکھ نہ لے کوئی آنہ جائے اور اِک وہ تھا کہ اسے ڈر ہی نہیں تھا کسی کا..... وہ وہ ہی ایسا ہوتا تھا کالج بھر میں الو بولنے لگتے..... اس سدھارنے کا وقت ہی نہ ہوتا۔ جانے دیر تک کون۔ کام بھگتاتا۔

''تو چلو پھر..... کہیں آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔'' ا خدایا..... اتنی دلیر تو وہ کبھی نہیں رہی تھی۔ اور یہیں آ کر اکھڑ جاتا۔ ''دوستی میں ''نو'' کا لفظ نہیں سمجھیں۔'' اس کی جان پر بن آتی..... وہاں پر واکس کوتھی..... محبوب عجیب سرکش ہواؤں کا محبوب..... بکھیر کر رکھ دینے والا مزاج تھا..... بس اپنی منواتا۔ اپنی ہی چلاتا..... مگر بات بھی تو ماننے والی ہو۔

آج بھی اس نے اڑنے کو پر تولے..... ساتھ آ گیا..... اِک سیلفی پر بھی وہ ہچکچاتی تھی..... آج بھی تیور ایسے ہی تھے..... وہ دو قدم پیچھے ہ تھی۔ مگر اس نے بازو سے دبوچ لیا..... اس سانسیں گھٹنے لگیں۔ مگر اس کی گرفت مضبوط تھی..... شیبا کا کمزور سا احتجاج.....

''اُف اللہ..... یہ کیا کر رہے ہیں..... چھوڑ ناں..... اُف..... کوئی دیکھ لے گا۔ بمشکل خود چھڑایا..... مگر انگ، انگ میں جیسے بجلیاں سی بھر تھیں۔ دنوں وہ اپ سیٹ رہی..... جیسے کوئی سنبھال رکھی ہوئی چیز ان جانے میں چھن سے گر کر ٹوٹ گئی۔ مگر اس کا ہر بار کا اصرار..... کہ جب ہو گیا تو ہی گیا..... لیکن اب وہ چوکنی رہتی..... اور وہ کہتا..... دوستی میں اتنا تو چلتا ہے..... اور اصل دوستی ہوتی ہے..... وہ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بس اس کے زندگی ان ہی لمحات میں تھی..... اس کا سرکش و جی انداز..... شیبا کو بھاتا تھا۔ مگر وہ خواہشات کا اسیر تھا یہی خواہشات لفظوں کے ہیر پھیر میں نظر آتیں مگر اِک اٹھارہ سالہ انٹر پاس لڑکی کیا خاک سمجھتی..... وہ

خوابوں میں کھو جاتی۔

☆☆☆

اور کوئی سمجھتا نہ سمجھتا عاشی تو سمجھ ہی گئی تھی کہ وہ آج کل کن ہواؤں میں ہے۔ عاشی سے نظر یاتی اختلاف اپنی جگہ مگر یہ بھی خوب تھا کہ اس کی گھر بھر میں عاشی سے ہی خوب بنتی.....سو اس بار وہ آئی تو اس کے کندھے سے جڑ کر حکایتِ دل الف سے یے تک سنا دی تھی۔ اور اس نے پہلا سوال یہی پوچھا۔

''سنو وہ دیکھنے میں کیسا ہے؟''

''بالکل میرا آئیڈیل.....'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''خوب صورت اتنا کہ نظر نہ ہٹے.....آنکھیں چندھیا جائیں.....اور قد کاٹھ ایسا کہ دیکھنے کے لیے سر اونچا کرنا پڑتا ہے۔''

''ایسے لوگ فلرٹ ہوتے ہیں.....کہیں عادی ہی نہ ہو.....ہر اک در پہ جھکاتا ہو جبیں۔''

''عاشی.....پلیز.....ضروری تو نہیں ...کہ تصویر کا تاریک رخ ہی دیکھا جائے۔'' اس کے لہجے میں اتنی لجاجت تھی کہ عاشی پل بھر کو چپ سی رہ گئی۔

''اچھا.....کیا کہتا ہے.....کیا چاہتا ہے؟''

''دوستی.....'' اس نے بلا توقف کہا۔ ''کہتا تو یہی ہے۔''

''تمہیں پتا بھی ہے.....دوستی کیا ہوتی ہے؟''

اب وہ کیا کہتی کہ وہ تو بس سیدھے سبھاؤ محبت کرنے والوں میں سے تھی۔

''وہ دوستی کو کن معنوں میں رکھتا ہے یہ ضرور پوچھ لینا اس سے.....کہیں ایسا نہ ہو تم کچھ اور سمجھتی ہو، اس کی سوچ کچھ اور ہو.....'' عاشی کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔

''جیا کو پتا ہے.....؟''

جواباً شیبا نے انکار میں سر ہلایا۔

''اندازہ تو ہو گیا ہوگا.....ایسی بچی بھی نہیں ہے اب وہ۔''

''آئی ڈونٹ کیئر.....ویسے اس نے کبھی کچھ کہا یا پوچھا نہیں۔''

''اگر پوچھا تو کیا کہو گی؟''

''وہی جو سچ ہے.....ہزار جھوٹ بولنے سے تو بہتر ہے۔''

''اگر اس نے بابا کو بتا دیا تو.....؟''

''ان کو میں خود بھی بتا سکتی ہوں.....اور یہ تم بھی جانتی ہو۔''

''تم کو نہیں لگتا یہ رسک ہے۔ میرا مطلب ہے کسی انجان بندے سے.....'' نہ، نہ کرتے بھی عاشی کہہ ہی گئی۔ اور وہ سننے سمجھنے کی پوزیشن میں کب تھی کہ دل اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے پر آمادہ ہی نہیں تھا اور... جب کسی سے محبت کا تعلق جڑ جائے تو وہ انجان کب

غزل

اب تو آہٹ سے مری نیند اُڑی جاتی ہے
اتنی وحشت ہے کہ ہر سانس رکی جاتی ہے

دور بیٹھے ہوئے بچوں کا خیال آتا ہے
جاگتی آنکھوں ہی میں رات کٹی جاتی ہے

خوف و دہشت ہے خموشی کا ہے عالم ہر سُو
دل کی دنیا تو مری آج لُٹی جاتی ہے

اس قدر خوف ہے دنیا میں وبا کا دیکھو
اب کہاں دل کی کوئی بات سنی جاتی ہے

کوئی بھی کام کہاں مجھ سے کیا جائے گا
شاعری بھی کہاں ایسے میں لکھی جاتی ہے

پڑی مشکل تو رہا ساتھ مرے فضلِ خدا
زیست تو بوڑھے کے مانند تھکی جاتی ہے

یہ بتایا ہے شگفتہ نے اسے رک رک کے
دل کی یہ بات ہے جو پیار سے کی جاتی ہے

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

رہتا ہے۔ عاشی اک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔ شاید محبت اس سے کہیں بڑھ کر خوش فہم ہوتی ہے۔

''تو پھر...... موصوف اپنی والدہ کو لے کر آئیں گے؟'' عاشی نے جھٹ سے کہا۔

''ہائیں......'' وہ سٹ پٹائی...... اس بات کا تو سارے فسانے میں کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔

''تو پھر محبت کی یہ نیا کیونکر پار لگے گی؟'' بات تو سچ تھی مگر بات تھی رسوائی کی۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی تھی۔ عاشی سے لاکھ اختلاف سہی...... مگر اس کی بات شیبا کے دل میں کھب کر رہ گئی تھی۔ سو اس نے سیدھے سبھاؤ پوچھ لیا کہ اور کتنی لڑکیوں سے تعلق ہے وہ ہنس دیا۔

''مجھے انکار نہیں...... میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔ کالج سے لے کر اب تک کئی دوستیاں چلیں...... سوشل میڈیا پر بھی بھرمار ہے۔'' اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر طرح دے گئی۔ مگر ایسے ہی کسی نازک لمحے میں کہہ بھی گئی۔

''تم اتنے پیارے اور نائس ہو کہ تم سے کسی کو بھی پیار ہو سکتا ہے۔''

''اچھا...... وہ پیار آج تک مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا۔''

''ہو سکتا ہے اسے تم سے پیار ہو...... جو just تمہارے میسجز کی خاطر دیر تک جاگتی ہے اور تمہاری ایک جھلک میں جس کی زندگی ہے۔'' دل کڑا کر کے وہ کہہ گئی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ سب کچھ بنا کسی احساس بغیر کسی جذبے کے ہے؟''

اس کی نظروں میں ان کہا سا تاثر در آیا تھا۔ مگر وہ گھاگ شکاری تھا دانہ ڈال کے...... خود پرے ہو کر تماشا دیکھتا۔

''اچھا...... تو آپ کو... مجھ سے کتنی محبت ہے؟''

وہ اسی سے پوچھ بیٹھا اور شیبا نے سوچا یہ وقت ہاتھ سے پھسل گیا تو پھر ہاتھ آنے والا نہیں...... پھر اسے کہنے سے کون روک سکتا تھا کہ وہ جہاں بھی رہے...... ہر دم...... ہر پل اس کا خیال اس کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس کی ایک جھلک میں اس کی زندگی ہے اور یہ کہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا وہ پل بھر کو چپ رہ گیا۔

''صرف باتوں سے محبت کرنا...... وہ صرف بات تک ہوتی ہے محبت ہے تو اسے ثابت بھی کرنا پڑتا ہے۔''

شیبا کو اسے اس دن کی جسارت یاد دلانی پڑی...... اتنا ہی آسان تھا کیا کہ کوئی بھی ایرا غیرا اسے چھو کر جاتا...... یہ اسی محبت کا صدقہ تھا۔ اسے خاک نہ پروا تھی۔

''یہ تو نارمل بات ہے...... اس سے پیار نہیں ثابت ہوتا یہ تو دوستوں میں بھی ہوتا ہے ناں۔''

''چلو رومانس کا مطلب بھی لگے ہاتھوں بتا دو۔''

شیبا کو عاشی کی وہ بات یاد آ گئی۔ لیکن ایسا نہ ہو وہ کچھ اور سمجھتی ہے اور اس کی سوچ ہی کچھ اور ہو...... اور اس کے جواب سے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اللہ معاف کرے۔ محبت کی ایسی تعریف...... کہیں دیکھی نہ سنی...... اس میں خود کو کسی کے حوالے کرنے کا حوصلہ ہوتا بھی تو...... اس کی بھی آخر کچھ حدود ہوتی ہیں۔ اس نے شیبا کی محبت کو پزیرائی نہیں دی تھی تو رد بھی نہیں کیا تھا...... مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی...... every thing is fair in love and war جو معلوم نہیں کس نے ایک کہہ دیا تھا۔ اب محبت کے سب آزار ایک ہی بندہ بھگتتا پھرے یہ تو کہیں درج ہی نہیں تھا۔

''تو پھر آپ میرے لیے اتنا مت سوچیں...... کہیں ایسا نہ ہو میں کسی اور سے راہ و رسم بڑھاؤں تو آپ کو ناگوار گزرے...... میں نے بتایا ناں میری فرینڈ زکئی ہیں۔'' اس نے صاف، صاف بتا دیا تھا...... گویا یہ تو ایک طرفہ محبت ٹھہری...... وہ تو وقت گزاری کر رہا تھا اور بتا کر جتا کر، کر رہا تھا۔ مگر شیبا تو ان راہوں پر قدم رکھ چکی تھی سو آگے ہی بڑھتی رہی۔

''آپ کا ٹرسٹ نہیں ہے مجھ پر ورنہ آنکھیں بند کر کے آ جاتیں۔'' وہ مسلسل ملنے پر اصرار کرتا رہا اور

اب اِک نیا شوشا چھوڑا تھا۔

''آنکھیں بند کر کے آ گئی تو کسی اور سے ٹکرا جاؤں گی۔ اچھا لگے گا کیا.....؟'' اس نے اڑانا چاہا مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ اسے ستانے کو آ گیا..... آگے پیچھے پھری مگر اس کا مزاج اور چڑھ گیا۔ کالز کرنا ہی نہیں..... ریسیو کرنا بھی چھوڑ دیں..... اِک نہ دو کئی دن گزر گئے اور اس کے لیے یہ چند دن عذاب بن گئے..... اور یہیں آ کر وہ ہار جاتی تھی۔ سو وہ کھنچی چلی گئی۔ اِک، اِک پل اس نے کانٹوں پر گزارہ تھا۔ اِک عجیب سی بے چینی اور ناقابلِ بیان کیفیت..... امی سے سو جھوٹ گھڑے تب کہیں جا کر جیا سے خلاصی نصیب ہوئی تھی کیونکہ اس کا اصرار یہی تھا کہ اکیلی آ جاؤ۔

''زہے نصیب.....!'' اس روز اسے پا کر وہ کھل اٹھا تھا..... ''میں نے پل، پل تمہارا انتظار کیا..... یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ محبت میں اتنا تو چلتا ہے۔''

''تمہاری ناراضی..... دوری مجھے منظور نہیں..... اور یہ تم جانتے ہو..... میری جان پر بن جاتی ہے، میری سانسیں رکنے لگتی ہیں۔'' اس کا اعتراف سچا تھا۔

اس کی نظروں میں اک عجیب ناقابلِ بیان کیفیت تھی۔ اگلے ہی پل وہ اس کے نزدیک تر تھا..... اس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں ان کہا تاثر امڈ آیا تھا۔ آفس میں نیم تاریکی تھی..... حبس اور گھٹن..... کالج آف کے بعد جنریٹر بند ہو جاتا تھا۔ شیبا دو قدم پیچھے ہٹی تو اس کی پشت دیوار سے جا لگی..... وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔ بے ترتیب سانسوں کی حدت اس کے چہرے سے ٹکرانے لگی۔

''تمہیں مجھ سے محبت ہے ناں..... محبت قربت کے سوا بھلا اور کیا مانگتی ہے۔ اس قربت سے محبت بڑھتی ہے۔ اگر مجھے اپنی محبت کا یقین دینا ہے تو میری خواہش.....'' اس کا لہجہ گمبھیر ہوا۔ شیبا کی نظروں میں خوف امنڈنے لگا تھا..... اس نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔ بھاری بھرکم ہاتھ کا حلقہ اس کی نازک سی کمر کے گرد تنگ پڑنے لگا..... شیبا کسی درندے کے شکنجے میں پھنسی معصوم چڑیا کی طرح... پھڑپھڑائی تھی..... پل بھر کو اس کی ساری حسیات جاگ پڑی تھیں جیسے کچھ ہونے، کچھ کھونے جا رہا ہے۔ اس کی نازک سی مزاحمت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور اس کے تیور خطرناک تھے۔

اس نے اپنی پوری قوت اسے دھکیلنے میں صرف کر دی تھی۔ مگر وہ جونک کی طرح ہو گیا تھا..... نازک وجود کی مزاحمت ناکام پڑ گئی تھی۔ اس کی عقل نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا..... بمشکل اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''کوئی دیکھ لے گا اِدھر..... اندر چلو..... میں وہیں آتی ہوں۔'' اس کے ایک ہی جملے پر اس کی نظروں میں اُمڈتا خوفناک تاثر..... بے ترتیب سانسوں کا زیر و بم..... اس کی گرفت تیزی سے ڈھیلی پڑتی چلی گئی۔ اور بس اِک ثانیے کا عمل تھا۔ وہ پلٹ کر اندر اسٹور میں گھسا..... اور شیبا نے دو قدم بڑھ کر اسٹور روم کے ادھ کھلے دروازے کو قوت سے کھینچ کر بند کر کے کنڈی چڑھا دی تھی۔ اگلے ہی پل وہ بجلی کی رفتار سے آفس تو کیا کالج کی حدود سے نکلتی چلی گئی تھی۔

دنوں وہ مضطرب رہی..... رہ، رہ کر اِک کسک جاگتی تھی..... کیا اتنے ہی بے وقعت تھے اس کے سادہ و شفاف بے ریا جذبے..... اور کیا اتنی ہی بیوقوف تھی وہ کہ کھنچتی چلی گئی تھی..... بار، بار ذہن کی سطح پر وہ گولڈن براؤن آنکھیں مسکاتی تھیں۔ وہ سر جھٹک دیتی۔ بظاہر خوش وضع نظر آنے والے لوگ اتنے خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ چند لمحوں نے اس کا اصل بے نقاب کر دیا تھا۔ اس نے ٹوٹ کر اسے چاہا تھا۔ اِک بے نام رشتہ..... اِک انجانا سا تعلق..... جس نے سارے فاصلے مٹا دیے تھے۔ مگر اس کی خواہشات وہ نہ جان پائی یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔ یقیناً اب اسے..... اس کو بھلا دینا چاہیے تھا۔ اور وہ اسی سعی میں تھی۔ مگر وہ بھلانے دیتا تب ناں۔ اور یہ بھی خلافِ توقع ہی تھا کہ بابر الزماں نے اسے کال کر لی تھی۔

''کیا یہی قدر وقیمت تھی تمہاری نظر میں..... محبت جیسے سادہ وشفاف بے ریا جذبے کی۔ کیا تمہارے لیے میں اتنی ہی بے مول تھی؟''

''انسان صرف اپنی خواہشات کا اسیر ہے۔ اسے نام کوئی بھی دے دیا جائے۔ کم از کم میرے لیے تو محبت بھی صرف خواہش کا نام ہے۔''

''شاید اس لیے کہ تم جیسے لوگ ہر لڑکی کو مفت کا مال سمجھتے ہیں۔'' وہ سلگ اٹھی۔

''تمہارا جو جی چاہے سمجھو۔ مگر جان لو کہ جب کوئی لڑکا کسی لڑکی سے تنہائی میں ملاقات مانگتا ہے تو اس کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ تم کیوں اتنی بھولی بنی رہیں۔'' وہ اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔

''ہمارے درمیان جسٹ دوستی تھی۔ تم اسے محبت تک لے گئیں تو اس محبت کا تھوڑا بہت ایڈوانٹیج مجھے بھی تو ملنا چاہیے تھا۔'' وہ نہایت سفاکی سے کہہ رہا تھا۔

''گرل فرینڈ وہ ہوتی ہے ..... جسے کوئی بھی لمٹ کراس کرنے کا کوئی ایشو نہیں ہوتا..... اور دوست جسٹ کام کی بات ہوتی ہے۔'' اس نے بے دھڑک کہا تھا۔ اور گھڑی کی چوتھائی میں شیبا کے دماغ کی کھڑکیاں کھلتی گئیں بات صاف تھی۔ محبت اس کے لیے وقت گزاری تھی اور محض خواہشات کی تسکین.....

''ویسے تمہارا جو جی چاہے سمجھو..... مگر یاد رکھو۔ تمہیں آخری دفعہ مجھ سے ملنے آنا ہی ہوگا۔''

''اور اگر نہ آؤں تو.....؟'' اس نے صاف جواب پکڑایا۔ جواباً اس کی ٹون بدل گئی۔

''تو یاد رکھو..... سوشل میڈیا پر تمہاری وہ تصویر وائرل ہوگی جو ہمارے تعلق کو دس سے ضرب دے کر پیش کرے گی..... اور دنیا چٹخارے لے کر دیکھے گی.....'' اس کا لہجہ خطرناک تھا اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ سانپ پٹاری سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے اردگرد زمین چکرانے لگی تھی۔ کتنی نادان، کم عقل ہوتی ہیں اس جیسی لڑکیاں۔ جو چند دنوں کے ساتھ کو زندگی سمجھ کر خواب بنتی ہیں۔ آدمی کو تنہائی کے مواقع دے کر خود اپنا مقام گرا دیتی ہیں۔

بابا کی بات یہیں آ کر درست ثابت ہوئی، لیبل کی خوب صورتی پر پروڈکٹ خریدنے والے پھر خام مال پر سر پکڑ کر روتے ہیں۔

اس کے اندر کوئی مدھم سُروں میں سسکنے لگا تھا۔ دل کا اِک گوشہ خالی ہو کر رہ گیا تھا..... اب بات گھوم گھام کے وہیں آن رکی..... چھوٹی، چھوٹی باتیں مل کر کسی بڑی بات کی وجہ بن جاتی ہیں۔ مگر بات ہاتھوں سے نکلنے لگی تو کمک لازمی تھی۔ اسے عاشی کو بتانا پڑا..... اور اس نے کمال یہ کیا کہ بابا کو جڑ دیا۔ اگلی بار کال آئی تو اس نے سیدھے سبھاؤ بابا کو جا پکڑایا۔ اس کا فون آیا تو جانے کیا کہا سنا کہ..... اس کی ساری گیدڑ بھبکیاں غبارے کی ہوا کی طرح پھک سے نکل گئیں..... وہ دم دبا کر بھاگ نکلا..... جانے اچھا ہوا کہ برا مگر اس کا بھروسا ٹوٹ گیا تھا۔ بابر الزماں کی اصلیت بے نقاب ہوگئی تھی۔ اس سے بہت سہل طریقے سے خلاصی بھی نصیب ہوگئی مگر جانے کیوں اِک سناٹا سا اس کے اندر آ ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

بابر الزماں کے قصے کو کئی ماہ گزر گئے اب جا کر وہ نارمل ہونے پر آئی تھی کہ اس کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ عاشی کے بعد اسی کا نمبر تھا وہ پیچھے ہٹ گئی کہ چھوٹی کی شادی کے لیے سوچیں یوں آنے والے رشتوں سے انکار کرتی چلی گئی۔ مگر قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ ایک فیملی ایسی آ گئی کہ اس کے سوا کسی کے رشتے پر راضی نہ ہوئی۔ اس پر ہوا یوں کہ بابا کے پرانے شناسا نکل آئے یوں گھر میں مزید آمد و رفت بڑھ گئی۔ آئے دن کیرم اور شطرنج کی بازیاں جمتیں موصوف نوشاہ میاں خود بھی خوب چکر لگانے لگے۔ پر شیبا کا انکار اقرار میں نہ بدلا جبھی ایک روز خود موصوف سے اس کا سامنا ہو ہی گیا۔ یا شاید عاشی نے ماحول استوار کیا تھا۔

''جی مجھے احتشام رضوی کہتے ہیں۔ مزید کچھ

کہنے سے پہلے پوچھ سکتا ہوں آپ کے مسلسل انکار کی کیا وجہ ہے؟''

اب وجہ اگر بتانے والی ہوتی تو وہ کیوں نہ بتاتی...... کہ اس کا دل ساری دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کسی نئے رشتے کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھا۔ ننھا سا دل...... اس میں کچھ شک نہیں...... بندہ معقول تھا۔ آسمان سے اترے شہزادے کا خمار اتر چکا تھا۔ بیٹیاں بیاہنے کے لیے بابا کی ترجیحات مختلف تھیں۔ اسے بھی سمجھ آگئی تھی مگر......! اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر پھر بولا۔

''اِک بات کہوں۔ دنیا کی ہر شے آپ تھوڑی بہت کوشش سے حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر سچے جذبے صرف قسمت سے ہی ملتے ہیں۔'' وہ اِک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ یہ اس سے بڑھ کر کون جانتا تھا۔

''شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو...... جو میری زندگی کو مکمل کر سکتی ہے۔''

اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ یکایک کچھ کھو دینے کا احساس بڑھ کر دُگنا ہو گیا۔ اسے انکار نہ تھا...... بندہ معقول ہی تھا۔ اور یہ سب کو نظر آ رہا تھا۔ اس کا جھکاؤ، شیبا کی طرف ہی تھا۔ مگر شیبا کو انکار اس سے شادی پر نہیں بلکہ شادی پر ہی تھا۔ اور یہ بابا بھی سمجھتے کہ دل اِک دھچکا کھا کر سنبھلنے میں وقت تو لیتا ہی ہے اور شاید بابا اسی وقت کا ایڈوانٹیج اسے دے رہے تھے۔

''سمجھ آگئی ہو تو میرے لیے سوچنا ضرور...... میں انتظار کروں گا۔'' اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ بابا پر غصہ آ رہا تھا مگر کیا کرتی۔ بابا کے سامنے چپ چاپ کھڑی تھی۔

''تمہارے آنسوؤں پر مجھے اِک دانشور کی بات یاد آ رہی ہے۔ جو اس نے اپنے بچے کو کسی کھلونے کے ٹوٹنے پر روتے پا کر کہا تھا کہ ''تم اِک ایسی چیز کے لیے رو رہے ہو۔ جو تمہارے لیے نہیں رو سکتی......'' اس کے رونے میں اور شدت آگئی تھی۔ بابا نے اسے کھل کر رونے دیا تھا۔ اسے لگا اس کے اندر جلتی جھلتی کسی شے پر چھینٹے سے پڑتے چلے گئے تھے۔ نارسائی کا اِک جسم و جاں کو چبھتا احساس...... اور اس احساس کی شدت...... یہ ٹھیک ہی تھا کہ سچے جذبے خوش بختوں کا نصیب بنتے ہیں۔ بابا نے اسی شام...... احتشام کو اس کا عندیہ پہنچایا تھا۔ جواباً۔ اس نے جلد ہی شیبا کا گھیراؤ کیا تھا۔

''تو میں بات پکی سمجھوں؟'' لہجے میں شرارت...... آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بلاوجہ اداس ہو گئی۔

''جانے بھی دیجیے۔ میں نادان ہوں۔ کم عقل اور......'' خود کے لیے مزید تشبیہات نہ پا کر وہ خاموش ہو گئی۔

''ارے واہ...... ملایئے پھر ہاتھ...... یہ ساری کوالٹیز تو مجھ میں آپ سے بڑھ کر ہیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔''

''ہائیں...... تین؟'' وہ سٹپٹائی تھی۔ ہاتھ سمیٹے ہوئے تھے۔

''جی ہاں...... میں بابا اور آپ...... بھئی ان سے شطرنج کی بازیاں جمانے کے لیے ہی تو ہم نے آپ کو منظور کیا ہے۔'' وہ اسے گھوری بھی نہ دے پائی تھی کہ بابا کا نزول ہو گیا۔

زندگی کی طویل راہوں میں
لوگ ملتے ہیں...... چھوٹ جاتے ہیں
دل کے رشتے عجیب رشتے ہیں
تیرے آنے سے ٹوٹ جاتے ہیں

''بابا......!'' لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے بابا کی سیاست سمجھ آگئی۔ ان کی اِک بات سے کہانی واضح ہو گئی تھی۔ یہ بابا کی ملی بھگت تھی۔ اور شاید یہیں آکرامی کی بات درست ثابت ہوتی تھی۔ جب نئے رشتے بنتے ہیں پرانے پر خود بخود دھول پڑ جاتی ہے۔ اس کا اندر شفاف ہو چلا تھا۔ وہ دل سے مسکرائی تھی۔ اگلے قدم پر احتشام اس کا ہم قدم تھا۔ جو یقیناً سچا ساتھی ثابت ہوتا۔

❀❀❀

ناولٹ

کاہے کو بیاہی

دردانہ نوشین خان

ابھی میٹرک کا امتحان دیا تھا کہ ثمینہ کی شادی سننے میں آئی۔ کیسے؟ کیونکر؟ اتنی جلدی؟ چہ مگوئیاں بڑھتی چلی گئیں۔ آخر سبب ہاتھ لگ گیا۔ ثمینہ کے ابا نے کسی لڑکے کو اسے گلی میں رسالہ دیتے دیکھ لیا تھا (بلکہ پکڑ لیا تھا) ثمینہ، ابا کو دیکھ کر دوڑتی ہوئی گھر میں گھسی۔ کپڑے دھوتی ماں کی اس کے خوف زدہ چہرے پر نگاہ پڑی ابھی کچھ پوچھ ہی نہ پائی تھی کہ پیچھے، پیچھے نذر محمد (ابا) داخل ہوا۔ جھپٹ کے ثمینہ سے امتحانی گتا اور اس کے ساتھ رسالہ نکالا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک بار نہیں لگاتار ثمینہ کے منہ پر گتا مارتے، مارتے دہاڑنے لگا۔

''آوارہ...... کمینی...... بدبخت...... کون تھا وہ؟''

اگرچہ راحت بیگم کی انیس سالہ شادی شدہ زندگی میں ملک نذر محمد سے اونچی آواز میں بات کرنے کی کوئی مثال نہیں تھی مگر سمجھدار جوان بچی کی درگت نے ایسے بھڑکایا کہ دھلی ہوئی قمیص فرش پر پٹخ کر آگے بڑھی۔ ثمینہ کو اپنے پیچھے دھکیل کے تن کر بولی۔

''کیا کیا ہے اس نے؟ کیوں شروع ہو گئے ہو جوان بچی پر......''

''شروع تو میں اب ہو کے دکھاؤں گا...... جوان بچی سے جوانی سنبھالی نہیں جا رہی۔ یہ لعنت ملامت اسے کافی نہیں ہے، اس سے پہلے کہ یہ میری غیرت کا جنازہ نکالے میں اس کا......'' رسالہ پھینک کر وہ اِدھر

اُدھر دیکھنے لگا۔ غصے سے نتھنے پھولے جارہے تھے۔
ماں نے جانا کہ آج ثمینہ نہیں بچتی اسے دھکا کر چلائی۔

''کمرے میں بھاگ جا۔'' وہ اسکول کے ہی...
عبائے میں کمرے کی طرف بھاگی اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ ثانیہ (چھوٹی بہن) برآمدے میں کھڑی تھی اس کی آنکھوں میں نفرت کا طوفان تھا۔ اور یہ نفرت ابا کے وحشیانہ طرزِعمل پر تھی۔

نذر محمد نے بند کمرے کے کواڑ نہیں کھٹکھٹائے۔ راحت کو کچھ نہیں سنایا بلکہ اچانک یک دم باہر نکل گیا۔ ثانیہ اور ثمینہ نے سکھ کی سانس لی تو لی ہو راحت کا خوف وخطر ماسوا ہوگیا۔ خدا جانے کیا ہونے والا تھا۔

''کون کم بخت تھا؟ تو نے رسالہ پکڑا ہی کیوں اس سے؟''

''امی مجھے نہیں پتا۔'' زاروقطار روتی ثمینہ کے سامنے ثانیہ نے پانی کا گلاس لا رکھا۔

''پہلے کبھی آتا تھا؟ تو مجھے بتاتی، تم نے کبھی بات نہیں کی، نتیجہ دیکھ لیا؟ رسالے میں کیا تھا...... خط تھا؟''

''میں نے...... نہیں کھولا۔''

''خط بھی ہو تو ثمینہ باجی کا اس میں کیا قصور...... وہ دے رہا تھا، یہ نہیں دے رہی تھی۔'' ثانیہ کے بھینچے ہوئے لب کھلے۔ ''اتنا تو اندھا بھی سوچ سکتا ہے۔'' لفظوں کے چیتھڑے اس نے ناموجود باپ پر مارے۔

''اندھا سوچ سکتا ہوگا تمہارا باپ نہیں...... خدا خیر کرے، وہ کہیں اس کو مار پیٹ کے نہ آئے۔ یا خدا آج کیسا سورج نکلا ہے ہمارے گھر پر......'' آنسو تو تینوں ''عورتوں'' کے بہہ رہے تھے۔ مگر عورت کے آنسو کوئی خاص قابلِ ذکر بات نہیں ہوتی۔

ملک نذر محمد رات کو گھر میں داخل ہوا۔ خاموشی سے کھانا کھایا، کھانے کے بعد بیوی سے کہہ کر چائے بنوائی۔ وہ چائے کا مگ لائی تو کہا۔

''بیٹھو میرے پاس۔''

''یا الٰہی خیر..... یا اللہ رحم۔'' راحت دھڑکتے دل کو سنبھالتی بیٹھ رہی۔

''میں نے ثمینہ کا رشتہ طے کر دیا ہے۔''

''ک..... کیا؟''

''وہ لوگ کل آئیں گے۔''

''کون لوگ.....؟''

''ہماری برادری کے ہیں..... خیر پور جنوبی میں زمینیں ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں، اپنا کماتے کھاتے ہیں، لڑکا دوحاج ہے نہ بڈھا..... مناسب رشتہ ہے۔''

''ہماری ثمینہ بہت چھوٹی ہے..... دیہات..... دور.....'' ماں کے الفاظ غلط ملط ہو رہے تھے۔

''جتنی چھوٹی ہے اتنی کافی ہے..... شادی جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔''

''پھر بھی..... میں تو کہتی ہوں۔''

''دو ٹکے کا کبوتر باز رسالہ دے رہا تھا..... یہ سلسلہ کب کا ہوگا کہاں جا کے رکنا تھا..... اللہ نے بچا لیا...'' راحت کی اگر مگر..... توقع کے عین مطابق بیکار جا رہی تھی۔

''رہی بات دیہات اور دوری کی..... دیہاتی میں بھی تھا۔ تم پتوکی سے بیاہ کر یہاں آئیں..... کوٹ ادو تب دیہات تھا۔ تب میں کوٹ ادو میں رہتا تھا۔'' نذر محمد ٹانگیں پسارتے ہوئے دانتوں میں خلال کرنے لگا۔ راحت چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے الفاظ جوڑ رہی تھی کچھ کہنے والی تھی کہ وہ پھر بولا۔

''راحت..... کھانے کا انتظام کر لو..... جو لینا ہے بتا دو..... وہ کل آ رہے ہیں۔''

''کیوں آ رہے ہیں؟'' ماں تو بالکل ناقص العقل ہو رہی تھی۔

''مجید، اس کا ابا، اماں، چند لوگ اور ہوں گے..... ثمینہ کا نکاح ہے۔ ایک ہفتہ لیں گے تیاری کر کے اس سے اگلے جمعے رخصتی کر دوں گا۔''

آواز کا یہ پتھر ثمینہ، ثانیہ اور ان کے بھائیوں اظہر، مظہر سب کے کانوں کو لگا تھا۔ بھائیوں نے (اظہر، ثمینہ سے بڑا اور مظہر چھوٹا تھا، ثانیہ سب سے چھوٹی تھی) گویا کانوں میں روئی ٹھونس لی۔

''میں..... معافی مانگ..... لیتی ہوں۔'' ثمینہ لرزتے بدن کانپتی ٹانگوں سے ایک دم اٹھی۔

''معافی کس بات کی.....؟'' ثانیہ کی آنکھوں میں تھا مگر مصلحت کے تحت اٹھ گئی۔

''ہاں چلتے ہیں۔''

وہ دونوں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئیں۔ پھیکے بلب کی نیم اندھیری روشنی میں ابا کی گھورتی آنکھیں شیر کی طرح چمکیں..... ثمینہ کی ہمت کمزور پڑتی محسوس کر کے ثانیہ بول پڑی۔

''ابا..... ثمینہ باجی کو معاف کر دیں۔''

''ابا..... مجھے.....''

''خبردار..... جو مجھے پکارا، ہٹ جا میرے سامنے سے..... ثانی اسے لے جا..... میں اسے جہنم میں نہیں ڈال رہا..... ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے مگر عشق معشوق نہیں برداشت مجھے..... ثانی تو اتی سی ہو کر اس کے لیے بڑھ چڑھ کر بول رہی ہے، اپنے جوتے اپنے سر کو آنے لگے..... اظہر کی ماں، کہاں جا بیٹھی ہو..... تکیہ لاؤ، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

اس کے بعد دونوں جہاں کھڑی تھیں جم کر رہ گئیں۔ ثانیہ اپنی بہن کے چہرے پر نگاہیں جمائے تھی ثمینہ بے مقصد سمت ٹکٹکی باندھے..... دونوں میں جنبش تک نہ ہوتی تھی۔ باپ منہ پھیرے کروٹ لے کر لیٹ رہا تھا..... پھر ثمینہ کے ہیولے میں حرکت آئی..... دونوں ہیولے غائب ہو گئے۔

کل آئی..... نذر محمد کی خواہش کے مطابق گزر گئی..... اگلا جمعہ بھی کہاں دور تھا۔

''تیڈی مہندی توں میں واری آں
مہندی والے آمان جوانیاں
جیوے بنڑا عمراں ساریاں

(اور مرگئی بنی عمراں ساریاں) مراثین ڈھولک

کے ساتھ گلا پھاڑ گا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک لال پھولدار فراک والی ناچ کے ٹوٹے پھوٹے اسٹیپ لیتی لہرا، لہرا کر کسی باراتی یا مہمان عورت سے دس بیس کا نوٹ پکڑتی اور زور سے آواز لگاتی۔

''ویل..... ویل..... گھوٹ دی بوادی ویل.....''

''ویل..... ویل..... گھوٹ دی چاچی دی ویل۔''

جہاں، جہاں وہ گھنگرو والے پاؤں سے گھومتی، پتلی لال دری سمٹ کر سلوٹیں بناتی تھی۔ نذر محمد کے گھر کے صحن میں شامیانے کے نیچے ناکافی پنکھے اور گرمی تھی۔ خیر پور جنوبی سے آئی ہوئی بارات گلی کے نسبتاً کھلے موڑ پر ٹھہری ایک بس پر مشتمل تھی۔ چند گاڑیاں اور موٹر سائیکل نذر محمد کے مہمانوں کے تھے۔ مردانہ انتظام گلی کے سامنے والے خالی مکان میں تھا..... وہاں میزیں کرسیاں اور قریبی مکان سے کچی وائر کے ذریعے مہیا کی گئی بجلی سے چلتے پنکھے اور بلب تھے..... ایک قنات کی اوٹ میں دیگیں رکھی تھیں بان کی چارپائی پر دھلی ہوئی اسٹیل کی پلیٹیں، چمچ، ڈونگے اوندھائے رکھے تھے۔ عجلت میں کی گئی بے دلی کی تیاری منہ بولتی تھی۔ ملک نذر محمد کے حساب سے یہ شادی غریبانہ مگر بارات والوں کی توقع سے بڑھ کر امیرانہ تھی۔ کھانا وافر تھا، برف والا پانی اور ٹھنڈی بوتلیں بھی تھیں۔ بجلی بند نہ ہوتی تھی، پنکھے مسلسل چل رہے تھے اور کیا ہوتا۔

دولھے (مجید) کی ماں اپنا تیس سال پرانا عروسی جوڑا اور لال پراندہ ڈالے خوشی سے اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ لال مہندی میں رچے ہوئے اور کلائیاں کانچ کی موٹی سبز سرخ چوڑیوں سے بھری تھیں۔

''میری نوں (بہو) چاند کا ٹکڑا ہے۔'' وہ کہتی تھی۔

مگر یہ تو کوئی چاند کے ٹکڑے کو جا کر دیکھتا۔ ثمینہ کے کمرے میں قیامتِ صغریٰ اتری ہوئی تھی۔ ایک مرتے بدن پر چمکیلا سرخ سوٹ کا چڑھاوا تھا۔ دو دفعہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ثانیہ بار، بار کمرے سے لڑکیوں کو نکالتی کہ گھٹن کم ہو۔ پانی کے چھینٹے مار کر ثمینہ کو ہوش دلاتی..... گھٹن تو اس کے اندر تھی جو پانی کے گلاس پلانے یا برف والا جام شیریں چکھانے سے بھی کم نہ ہوتی۔ بیچاری ماں نے اتنی ہمت کر لی کہ چمکیلا لال جوڑا اتروا کے لان کا سرخ سوٹ پہنا دیا جس پر لیس لگی تھی۔

''اتنے لمبے سفر اور گرمی میں بروکیڈ نہیں پہنا جا سکتا۔''

''میرا ریتوں، رسموں والا جوڑا ہے۔'' دولھے کی ماں (سجو ماسی) نکتہ چینی کرنے لگی۔

''ثمینہ باجی کے بازوؤں پر خراش پڑ گئی ہیں۔'' ثانیہ چپ نہ رہ سکی۔ سجو ماسی نے بولنے پر ثانیہ کو بغور دیکھا۔ رو، رو کر اس کی آنکھیں بھی سوج رہی تھیں گھر کے عام کپڑوں میں تھی۔

''بی بی..... توں تاں نہ رو..... ہک دلہن شودی روندی بس نی کرے دی۔'' (بی بی تم تو نہ رووٗ..... ایک تو دلہن بیچاری روتے بس نہیں کرتی)

رخصتی یوں کی گئی کہ لان کے دوپٹے کا گھونگٹ اوپر سے سنہری تاروں کی کڑھائی دار چادر اوڑھا کر ثمینہ کا چہرہ تاڑنے والی نظروں سے چھپا کر بس میں سوار کر دیا گیا۔ اس کا کاجل رو، رو کر پھیل رہا تھا۔ لپ اسٹک کو اس نے سرخ چادر سے رگڑ کر مٹا دیا تھا اس کے سوا میک اپ نامی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا دبلا پتلا جسم کانپ رہا تھا۔ بھائیوں نے تقریباً اٹھا کر بس میں چڑھایا تھا۔ ماں کا جگر کٹ رہا تھا۔ اس کے بطن میں پلی تھی، وجود کا حصہ تھی، ایک ہفتے سے برابر رو رہی تھی۔ ماں نظریں چار نہ کرتی کہ حوصلہ نہ پڑتا۔ اس کے خاوند کی بے جا ضد نے کم عمر بیٹی کی بلی چڑھا دی۔

ثانیہ اب نہیں رو رہی تھی بلکہ شعلہ بار نظروں سے باپ بھائیوں کو گھور رہی تھی جو جہیز کا سامان بس کی چھت پر لدوانے میں مشغول اور مطمئن تھے۔ ثانیہ کے پاس محلے دار سہیلی رملہ نے جا کر کہا۔

''دولھا ذرا بھی اچھا نہیں..... کالا اور گنوار..... نوکروں جیسا۔''

''تمہیں کیا؟''

''لگتا ہے چاچا، چاچی نے بھی یہی سوچا..... تمہیں کیا۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ بات تیر کی طرح لگی۔ ثانیہ بھاگتی ہوئی گھر کے اندر ثمینہ کے چھوڑے ہوئے چھوٹے کمرے میں یوں گئی جیسے ثمینہ کو وہاں بیٹھا ہوا پالے گی۔ پھر گھبرا کر باہر نکلی۔ امی اب دوپٹے سے ناک پونچھتی بچا ہوا کھانا سنبھلوانے میں لگی تھیں۔

''ابا کو رج کے کھانا کھلا دیں..... ٹرے بھر دیں میں دے آؤں.....'' پھر چیخ کے کہا۔ ''بھائیوں کو بھی رجوا دیں..... آپ بھی پُر باش کھائیں۔''

''اور تم.....''

''آپ کو کیا؟'' وہ پھر سے روتی ہوئی اندر جا رہی تھی۔

☆☆☆

تین گھنٹے کی مسافت طے کر کے بارات خیر پور جنوبی پہنچی..... سڑک سے اتر کر اونچے نیچے راستے طے کرتی بس ایک کچے میدان میں جا کر رکی۔ رات کے نو بج رہے تھے اور وہاں کے معمول کے مطابق بجلی جا چکی تھی۔ بس سے اترتی آوازیں ''بجلی چلی گئی ہے، نو بج گئے۔'' ''اوئے موبائل جلاؤ۔'' اس کی تصدیق کر رہی تھیں۔ کھلے میدان میں سامنے ایک دروازے پر جھنڈیاں لٹک رہی تھیں، یہ ہی شادی والا گھر تھا۔ بس کے اندر بیٹھی ہوئی مراثیوں نے لمبی جمائیاں لی اور پھر ڈھولک پر تین بار سوئی مار کر ڈھم، ڈھم کی۔ ثمینہ جو کسی گھڑی نیند میں اونگھ گئی تھی ہڑ بڑا کر جاگی..... دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یاد آیا کہ میں دلہن ہوں، یہ میری بارات ہے۔

صحن میں جس چارپائی پر کھیس بچھا تھا وہاں دلہن کو لا بٹھایا تھا۔ اس کا گھونگٹ ہٹا دیا گیا تھا۔ ایک گاؤ تکیہ لا کر پیچھے رکھا گیا۔ نیم اندھیارے صحن میں بچوں کی چیخ و پکار، عورتوں کا ہنسنا بولنا، مردوں کی آوازوں کا شور پھیل گیا تھا۔ مراثنیں اپنی بھاری بھرکم آواز میں پیسے کم ہونے کی تکرار کر رہی تھیں۔ غور سے دیکھا... تو یہ تکرار اور فحش مذاق اس مرد سے ہو رہے تھے جو اس کی چارپائی پر بیٹھا تھا جس کے گلے میں اس گرمی میں ابھی تک نوٹوں کا ہار تھا۔ ہار میں رنگین کپڑوں کی دھجیوں کی سجاوٹ پروئی ہوئی تھی۔ (شاید اسے نوٹوں کے سبب ہار عزیز تھا اور وہ اسے اندھیرے میں کہیں رکھ کر نقصان نہیں کروانا چاہتا تھا) پھر ان دونوں کے درمیان چھابی میں ٹھنڈے نان اور بڑی سی تھالی میں بوٹیوں بھرا سالن لا کر رکھا گیا۔ یہ اسی دیگ کا سالن تھا جو ثمینہ کے ابا نے ساتھ دی تھی۔ ایک لیمپ دلہن، دولھا کی چارپائی کے پاس لا کر اعزاز بخشا گیا۔ باقی افراد صحنِ چاندنی میں کھا پی رہے تھے۔

''کھاؤ۔'' مجید نے کہا اور کھانے لگا۔ کہیں سے دو نیم ٹھنڈی بوتلیں لائی گئیں۔ ثمینہ نے آدھی بوتل کو گلاس میں ڈالا اور گھونٹ، گھونٹ کر کے پیتی رہی۔ کھانے کا ایک لقمہ لینے پر جی آمادہ نہیں ہوا۔ جب تک بجلی آئی ثمینہ کے جہیز کا سامان لیمپ کی روشنی میں اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد بجلی آ گئی۔ خوشی کے نعرے لگے۔ بجلی آنے کے بعد اس کے کمرے کو سیٹ ہونے کی شکل دی گئی۔ بیڈ پر چادریں بچھائی گئیں۔ وہ ایک گھنٹا مزید اسی چارپائی پر تماشائے زیارت بنی بیٹھی رہی۔ دلہن کا منہ دیکھنے والی لڑکیاں عورتیں حتیٰ کہ اوچھے بدتمیز بچے تک رج گئے۔ اور اکتاہٹ سے وہ ناک تک بھر گئی تو اسے کمرے میں لے جایا گیا۔

ثمینہ نے کمرے میں جاتے ہی زیور اتارا۔ اور پانی کا جگ منگوا کے پچھلے دروازے سے باہر تھوڑی کھلی گیلری جتنی جگہ تھی وہاں منہ ہاتھ دھو لیا۔ جہیز میں دیا گیا چھت کا پنکھا ابھی ڈبے میں بند تھا اس لیے جہیز کا پیڈسٹل کمرے میں چل رہا تھا۔

مجید آیا اس کی بول چال، شکل صورت، اٹھک بیٹھک، حرکات و سکنات کچھ بھی ثمینہ کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اگر کوئی خوبرو افسر بھی ہوتا تو اسے کسی مرد کے قریب ہونا ناگوار ہی گزرتا کیونکہ یہ شادی نہیں جبر اور ظلم تھا۔ مجیدے کے ساتھ ناگواریت بلکہ

کراہیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر اندر کے رد کو کچلتے، کچلتے وہ نیم مردہ ہوگئی۔

☆☆☆

جس کم سن لڑکی کو ناپسندیدہ رشتے اور قطعی نامناسب خاوند سے حکمیہ جوڑا گیا تھا اس کو ملنے اور لینے کی رسم بھی والدین نے سات دن بعد نبھائی۔ ان سات دنوں کی دیہاتی محنت کی مشقت اور سات راتوں کی ہیبت نے اس کا کچومر نکال دیا تھا۔ کیسی دلہن اور کہاں کی دلہن..... تیسرے دن کی صبح سے اس کو اس کا ٹائم ٹیبل دے دیا گیا۔ کالی ہانڈیاں مانجھنے سے ٹوٹے ناخن، تندور میں روٹیاں پھینکنے جلانے اور ہاتھ باز جھلسانے کے بعد شدید گرمی میں توے پر بیس، بیس روٹیاں پکانے سے گرمی دانے اور کیل مہاسے والا چہرہ، کس کے بال باندھے میلے دوپٹے کو کمر سے باندھے وہ بیٹھ، بیٹھ کر جھاڑو دے رہی تھی جب امی، ابا دیہڑے میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے کہ وہ بہت شدت سے چونکی۔ شدت سے دل مچلا کہ ماں کے سینے سے لگ کر بلکنے لگے۔ مگر وہ جھاڑو پکڑے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور دور سے سلام کیا۔ باقی آؤ بھگت، سجو ماسی کرتے ہوئے انہیں ثمینہ کے کمرے میں لائی۔ ماں بہت سے تحفے لائی تھی۔ کھانے پینے کا سامان، پھل مٹھائی، سلے ہوئے لان کے نئے سوٹ، سجو اور مجید کے علاوہ اس کے بھائی نوید اور بہن عائشہ اور سسر کے سوٹ..... سجو کی تو آنکھیں کھل گئیں۔ ثمینہ جب چائے بنا کر لائی تو ڈپٹ کے بولی۔

''ہائے، ہائے دلہن یہاں سے چیزیں لے جاتی..... یہ کیسی چا بنا لائی ہو۔'' چائے پیالیوں میں تھی اور ساتھ ایک پلیٹ میں نوید کے ذریعے دیہاتی دکان سے منگائی گئی برفی اور ٹھنڈے پکوڑے تھے۔

''جیسی چائے یہاں پیتے ہیں ویسی لائی ہوں..... یہ اپنی والی چائے تو روز ہی پیتے ہوں گے۔'' وہ بظاہر ہنس کے بولی۔

عائشہ (ثمینہ کی نند) آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی مگر ثمینہ کی ہم عمر تھی۔ وہ ایک تیز طرار لڑکی تھی اس نے حال ہی میں اپنا نام عائشہ سے علیشہ کرلیا تھا۔ علیشہ، ثمینہ کے ابا کو ''چاچو، چاچو'' کرتی آگے پیچھے پھرتی۔ کبھی تکیہ لاکر پیش کرتی کبھی ثمینہ کی امی کے کاندھے دباتی کہ لمبے سفر سے تھک گئی ہوں گی۔ حالانکہ بھاوج سے معمولات میں اس کا رویہ تنک چڑھا اور بے نیازی کا ہوتا تھا۔ سجو ماسی بیٹی کی میٹھی، میٹھی حرکتیں دیکھ، دیکھ کر مسکراتی اور دور تک سوچتی..... کبھی مٹھائی، کیک، پیسٹری نہ کھانے والوں کی عید ہوگئی تھی۔ والدین ریت کے مطابق بیٹی کو لینے آئے تھے۔ وہ کپڑے بدل کر چپ چاپ چل دی۔ مگر اب اس کے اندر ''واپس نہیں جاؤں گی'' کی تکرار تھی۔ بیٹی کی ظاہری و باطنی ٹوٹ پھوٹ سے انجان بنتے ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر باپ کی پگ کی لاج رکھنے پر شاباش اور دعا دی۔ جس کے ہر لفظ کے ہر حرف کا مطلب تھا اب یہی تیرا گھر اور یہی تیری منزل ہے اور یہ بھی اشارہ دے دیا کہ ہم تمہاری مدد کرتے رہیں گے۔ پھر وہ بیوی کو مشورہ دینے لگے۔

''اظہر کی ماں..... علیشہ بیچاری آگے پڑھنا چاہتی ہے، اُدھر ہائی اسکول نہیں ہے اسے یہاں نہ لے آئیں..... اچھی کڑی ہے۔'' یہ وہ شخص تھا جس نے اپنی بیٹی کے آگے پڑھنے کے خواب لمحوں میں نوچ لیے تھے۔

باورچی خانے کے چوکے پر ماں کے کندھے سے لگی۔ وہ آہستہ، آہستہ بتائے جاتی تھی۔

''امی، مجھے مجید سے گھن آتی ہے، وہ دانت صاف نہیں کرتا ہے، گالم گلوچ اور اوے توے کر کے بات کرتا ہے..... رات کو کھانے میں پیاز بھی کھاتا ہے۔ امی آپ سمجھ سکتی ہیں۔''

''بیٹی..... خاوند کا حق ہوتا ہے اس سے اسے شریعت، قانون نہیں روک سکتا۔ عورت گزارہ کرتی ہے بیٹی.....'' ماں کے ٹھنڈے جواب ہوتے۔

''میں کیوں گزارہ کروں، میری ہی دو وقت کی روٹی بہت بھاری ہے۔'' پھر وہ الگ ہو کے بولی۔

''امی..... میں کسی کوٹھی میں جھاڑو پوچا کرلوں گی، میں کسی بھی طرح اپنی روٹی کمالوں گی بس..... مجھے سر چھپانے کی چھت دے دیں..... یا اگر آپ اس میں بھی مجبور ہیں تو چھت بھی نہ دیں، مجھے بس طلاق دلوادیں۔''

''میری جند کا ٹکڑا..... شروع میں لڑکیوں کا دل نہیں لگتا..... بعد میں مرد بھی لڑکی کو دیکھ سن کر بدل جاتے ہیں۔ میں مجید کی ماں کو سمجھا آئی ہوں، تمہیں مزید تعلیم کی اجازت دے دے گی۔ ہیلتھ ڈپلومہ علی پور سے ہوجائے گا۔ پھر صحت کے محکمے میں چھوٹی نوکری مل جائے گی؟''

''ماسی سجو مان گئی ہے؟''

''ہاں..... اس لیے مانی ہوگی کہ اپنا کمائے کھائے گی تو ہمارا کیا نقصان۔''

''میں علی پور کیسے جاؤں گی؟''

''نوید نہیں جاتا کالج..... تمہیں لیتا جائے گا۔''

''امی..... پھر بھی مجیدا.....''

''اچھا، کچھ صبر بھی کرتے ہیں بیٹی۔''

پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے دن مجیدا آ گیا۔ علیشہ اس کے ساتھ تھی۔

''مامی..... وہاں ہائی اسکول نہیں ہے تو.....'' وہ ابھی اتنا ہی بولا تھا۔

''ہاں، ہاں ماموں ہوں اس کا..... کوئی مسئلہ ہی نہیں.....'' ابا خوش ہوگیا۔ پھر سر اپا انکسار ہوکے بولا۔ ''پتر..... ثمینہ کا خیال رکھا کرو..... کمزور ہوگئی ہے۔''

''اس کا دل لگایا کرو..... یہ اتنے کام کاج کی عادی نہیں ہے، کام کے لیے کوئی عورت رکھ لو۔'' امی نے نذر محمد کی بات کا آسرا پکڑا۔

''مامی..... کھانے پینے کی کمی نہیں ہے، دودھ مکھن، چاول، گڑ..... یہ خود ہی نہیں کھاتی دل تو عورت لگاتی ہے گھر کو گھر بناتی ہے۔'' وہ سولہ سالہ لڑکی عورت بن چکی تھی اور سولہ سالہ بہن بچی تھی۔ پھر مجید، ثمینہ سے مخاطب ہوا۔

''چل اپنے ابو کو ہی بتادے شہر سے کیا لینا ہے۔'' پی کے فارغ ہوتو بعد میں کھایا کر۔ اسے کسی چیز کی اس پر ابا نے یہی کہنا تھا۔ ''ہاں بیٹی کچھ لینا خریدنا ہے تو بتاؤ۔'' ثمینہ کے انکار کو مجید نے شرم قرار دیتے ہوئے اسے لے جا کر شاپنگ کرانے پر مامی کو اصرار کیا۔ طرہ یہ کہ اس شاپنگ میں علیشہ بھی ساتھ چلی جائے۔

''اسے بھی شہر دکھالاؤ۔''

پس خشتِ اول یہ رکھ دی گئی تھی کہ ثمینہ کے میکے سے کوئی آئے تو پھر بھر کر تحفے لائے اور ثمینہ میکے جائے تو بھر کے تحفے لائے۔ ماں بھی اپنے ہجر کا مداوا مہینے میں دو بار اظہر یا مظہر کے ذریعے طرح، طرح کی چیزیں بھجوا کے کرتی رہی۔ اس مداوے نے ثمینہ کی سسرال کا حوصلہ بڑھایا۔ مطالبہ نمبر ایک جہیز کی واشنگ مشین بے دردی سے استعمال ہونے کے سبب خراب رہنے لگی تو سجو ماسی نے یہ قربانی دی کہ اسے پرانی مشین کہہ کر اپنے تصرف میں لا کر ثمینہ کے لیے نئی واشنگ مشین کا تقاضا کیا ورنہ وہ اپنے اور اپنے مرد کے کپڑے ہاتھ سے دھوئے۔ یہ مطالبہ پورا ہوا تو جس، جس چیز کی جہیز میں کمی رہ گئی تھی باری، باری طریقے بدل کر مانگی گئی۔ یہاں تک کہا جاتا۔

''سردیوں، گرمیوں کے مردانہ زنانہ کپڑے لیتی آنا۔ فلاں کے جوتے فلاں کی جرسی شال، یہاں کچھ ڈھنگ کا نہیں ملتا.....'' دیدہ دلیری اتنی تھی کہ نہ کبھی کسی چیز کی قیمت پوچھی گئی اور نہ احسان مندی کا کوئی تاثر ہوتا۔ سزا تو نذر محمد کو بھی مل رہی تھی ثمینہ کی سزا کی نوعیتیں اور تھیں۔

پہلے پہل بہت عجیب لگتا کہ خاوند کھانا کھائے تو بیوی انتظار میں پاس رہے کہ اس کو کوئی ضرورت نہ پڑ جائے..... اسے پتا نہ تھا وہ مجید کو کھانا دے کر اپنا کھانا نکال کر دوسری جگہ بیٹھ کر کھانے لگی۔ خاوند نے کمرے سے آواز دے کر نمک مانگا۔ وہ جا کر دے آئی۔ پھر کچی ہری مرچ مانگی اسے پھر اپنی پلیٹ چھوڑ کر اٹھنا پڑا سجو ماسی نے اسے ہی ڈپٹ دیا۔

''اپنی تھالی لینے کی جلدی ہوتی ہے۔ گھر والا کھا

ضرورت ہوتو آوازیں دیتا رہے۔ وہیں بیٹھی رہا کر۔'' چنانچہ بعد میں اسے ''مت'' آگئی۔ وہ خاوند کے سامنے کھانا رکھ کر کتے کی طرح مالک کے سامنے مناسب فاصلے پر دم سادھے موجود رہتی۔ برتن بھانڈے خالی ہونے پر لے جاتی۔ چائے، سگریٹ کا حکم پورا کر کے اپنی تھالی اٹھانے کی روادار ہوتی۔

شروعات میں وہ نادان تھی۔ جواب دینا نہیں آتا تھا۔ ڈرپوک تھی، منہ سے بھاپ تک نہ نکالتی۔ رفتہ، رفتہ اس نے جانا کہ تابعداری پر بھی گالیاں پڑتی ہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ منکسر تھی مؤدب تھی یا نہ تھی تو اس نے چپ کا تالا توڑ دیا۔ شادی کے ایک سال بعد پہلا بیٹا پیدا ہوگیا۔ زچگی میکے میں ہوئی۔ سارا خرچہ انہوں نے اٹھایا۔ دورانِ چلہ ثمینہ کو ڈپلومے کے امتحان کی خاطر واپس آنا پڑا۔ جو دیسی گھی، شہد، مکھن وہ لائی تھی مجیدے اور ماسی نے ڈٹ کر کھایا۔ پراٹھے تلے، حلوے بنائے۔

بچہ دن بھر رُلتا، مٹی میں کھیلتا، مٹی کھانے کا عادی ہوا تو پیٹ پھولا رہتا، پیٹ دکھتا روتا رہتا، ثمینہ کو اب قریبی دیہی مرکزِ صحت پر نوکری مل گئی تھی۔ وہ اپنی شُدبُد تک دوا لاتی اور دیتی رہتی۔ مجیدے کے لیے یہ کوئی قابلِ ذکر تکلیف ہی نہیں تھی۔ نوکری بھی ابا نے سفارش سے لگوادی تھی۔ وہ ڈیوٹی پر چلی جاتی، بچہ پھر مٹی میں ہوتا، ابھی سوا سال کا ہوا کہ دوسرا حمل ٹھہر گیا۔ زندگی حال سے بدحال ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

نوکری کے کسی کام کے سلسلے میں شہر کے ڈسٹرکٹ اسپتال جانا تھا۔ وہاں سے کام نمٹا کر اچانک ماں، باپ کے گھر گئی تو سب پریشان ہوگئے۔ سب کو لگا وہ لڑ کر نکالی یا نکلی ہے۔ امی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اظہر بھائی کا تاثر روکھا سا ہوگیا۔ ابا گھر پر نہیں تھے۔ علیشہ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' کی گردان کرنے لگی۔ ''سب خیریت ہے، اسپتال میں کام تھا۔'' اس روز ثمینہ کو بہت دور تک حقائق صاف نظر آئے۔

چادر اتار کر چارپائی پر بیٹھی۔ سب کی جان میں جان آگئی۔ سب ایک دم شیریں گفتار اور نثار ہونے لگے۔ وہ اپنے گھر کو غور سے دیکھتی رہی، خبریں سنتی رہی۔ ثانیہ میٹرک سائنس کے پرچے دے چکی تھی۔ علیشہ نے کالج میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لے لیا تھا۔ اظہر بھائی کو ابا نے نیا موٹر سائیکل دلوایا تھا۔ ابا نے چھوٹی گاڑی لے لی تھی۔ امی کے کپڑے، علیشہ، ثانیہ کے کپڑے دیکھ کر لگا کہیں جانے والے تھے یا کہیں سے آئے ہیں۔ لان کے نئے، نئے سوٹ لگ رہے تھے۔ صاف ستھرا گھر تھا، سیٹ اور اچھے سامان والے کمرے..... دھول، مٹی، گندگی سے مبرّا ٹائلوں والا صحن..... علیشہ گوری ہوگئی تھی۔ اجلے ہاتھ پاؤں والی گوری شہری لڑکی جو سفید یونیفارم پر میرون پٹی لگا کے کالج جاتی تھی۔ انگلش کے لفظ ملا کر بولتی۔ مقبول عام ٹی وی ڈراموں کے ساتھ ٹک ٹاک اور انسٹاگرام کی باتیں کرتی۔ اظہر بھائی کے ساتھ ہنستی بولتی دونوں کھلکھلا کر ہنس رہے ہوتے اور یہ سب ابا کے سامنے ہوتا تھا۔ مگر یہ سب حلال تھا۔ ثانیہ پڑھاکو، لائق اور کم گو تھی یا اب زیادہ ہوگئی تھی، کہا جاتا تھا کہ وہ ڈاکٹری پڑھے گی اور ثمینہ خود کو کہیں نہیں پاتی تھی۔

ہاں یہ درست ہے امی نے ثمینہ کے بالوں میں تیل کا مساج کیا..... اس کو اپنا خیال نہ رکھنے پر بار، بار پیار سے سمجھایا، کریمیں لے دیں، کپڑے خرید کر ساتھ کردیے۔

''امی..... مجھے واپس نہ بھیجو..... امی میرا دل نہیں لگتا...'' ثمینہ جب بھی دل کی بات کرتی تو یہی کہتی۔

''بچی کیسی باتیں کرتی ہو، دو بچے ہوگئے..... اب تو خود کماتی ہو۔'' جب ثمینہ ہائی ایس یا ویگن میں واپسی کا سفر کر رہی ہوتی اس کے لہو میں ''ہائے ربانیوں لگدا دل میرا'' کا نوحہ دوڑ رہا ہوتا۔ وہ میکے جا کر بھی خوش نہیں ہوتی تھی۔ شادی شدہ لڑکیاں میکے جا کے دل کی بیٹری چارج کروا آتی ہیں..... اس کے دل کی بیٹری ختم ہوچکی تھی۔ ایک آگ تھی جس میں من جھلستا رہتا۔

امی نے بالآخر فیصلہ کیا کہ ثمینہ کے پہلے بچے کو ہم رکھ لیتے ہیں اچھا کھلائیں، پلائیں گے، اچھی تربیت اور تعلیم دیں گے۔ اس فیصلے کی ابا نے بھی تائید کردی۔ مجیدے نے بھی معمولی ردوکد کے بعد اجازت دے دی۔ ثمینہ کو تو تسلی اور خوشی ہوئی کہ عفان اچھے ماحول میں محفوظ ہوگیا۔ سجو ماسی نے شروع میں پوتے کی یاد میں ٹسوے بہائے جسے وہ دن بھر پلٹ کر نہ دیکھتی تھی۔ ثمینہ کو چھڑی چھانٹ ہونے کے طعنے دیے۔ ثمینہ کی دوسری زچگی کے دن قریب آئے تو اس نے چھٹی اپلائی کرکے مجیدے سے میکے چھوڑ آنے کو کہا۔

وہ فصل کی فروخت میں چھوٹے بڑے نوٹ الگ کرنے میں مگن تھا۔ ''پہلی بار تو پہلی تھی۔ اب کیا سارے چھلے ماں کے گھر ہوں گے۔'' سجو ماسی کی طرف سے جواب آیا۔

وہ بغیر پوچھے کمرے میں آدھمکی تھی۔ یوں کسی وقت میاں، بیوی کے درمیان آجانا اس کی روٹین تھی۔

''یہاں کون میری خدمت کرے گا.....'' ثمینہ اب بھی مجیدے سے مخاطب تھی۔

''ناں..... یہاں تو ترے دشمن بیٹھے ہیں..... ماسی نسیمو مائی ساری وتی کے کیس کرتی ہے۔ سمجھدار تجربہ کار دائی ہے۔''

''پتا ہے مجھے جتنی سمجھدار تجربہ کار ہے.....اس کے بگڑے کیس زچہ بچہ سینٹر آتے ہیں۔''

''نسیمو مائی سے بچے جنوانے والیاں ساریاں مرگئی ہیں۔ چاچے دلبر کی نوں (بہو) ترنم، اس کی بہن تبسم.....'' سجو ماسی ابھی مزید نام سوچ کر یاد کررہی تھی کہ ثمینہ نے کہا۔

''ترنم تبسم نے تحصیل جا کے ڈیلیوری کرائی تھی۔ نسیمو مائی خدمت کرنے بعد میں جاتی تھی۔''

''اچھا، اچھا زبان نہ چلاؤ..... مائی نسیمو کو تیس سال ہوگئے ہیں یہ کام کرتے۔'' مجید انوٹوں سے سر اٹھا کر پہلی بار بولا۔

''نسیمو کو بھی جانتی ہوں اس کے کام کو بھی جانتی ہوں۔''

''اچھا تو اپنے سینٹر میں کروالے.....'' سجو ماسی نے اپنے تئیں بڑا مشورہ دیا۔

''یعنی اپنا کیس آپ کروں..... مجھے امی کے گھر پہنچوادیں۔ آنے جانے کے کرایے کے سوا آپ کا کیا لگنا ہے۔''

''تو ہمیں ابا کے پیسے سنوار رہی ہے۔ ہم تو خرچہ کرنے کو تیار ہیں جا اپنی مرضی سے رہی ہے تو خرچے نہ سنوا۔''

''یہاں جو خرچہ آپ کریں گے اول تو خاک خرچہ ہوگا اوپر سے میری تنخواہ کاٹ کے رکھ لوگے۔ اونہہ.....'' اس کی زبان نڈر ہوچکی تھی۔ اس کے بعد مجیدے نے جو گالیاں بکیں.....سجو ماسی نے جو گھٹیا زبان بولی اس سارے گند خانے کے بعد دونوں نے سوچا کہ فائدہ اور بچت ہماری ہے اور اسے احسان دھر کر میکے بھجوادیا گیا۔

☆☆☆

ثمینہ کھانے کی چیز پر جھپٹ کر اڑنے والے کوّے کو کوسے جاتی تھی۔ اس کی امی متعجب ہوگئیں۔

''ثمینہ تمہاری زبان کیسی ہوگئی ہے۔ کبھی بلی کو گالی، کبھی کوّے کو مندا.....تم ایسے تو نہیں بولتی تھیں۔''

''امی.....آپ نے کبھی سنا نہیں تھا، خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، آپ تو پتوکی کے پڑھے لکھے گھرانے کی تھیں آپ نے ضرور سنا ہوگا.....'' جواب خاصا تلخ تھا۔

''خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑنا ہوتا تو میں نے بھی پکڑ لیا ہوتا۔ تمہارا باپ غصے میں کم نہیں تھا۔'' اس کے لیے گرم سوپ لاتے ہوئے کہا۔

''ایک ہوتا ہے گرم غصہ.....ایک ہوتا ہے غلیظ غصہ.....میری زندگی ان دونوں نے برباد کی.....'' پھر ہنس کے بولی۔ ''امی آپ خربوزے کے رعب میں آکر پٹھان بن گئیں۔'' (بے موسم کے پھیکے خربوزے) ہنستے، ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

''بدتمیز.....شرم نہیں ماں کو کہتے۔'' امی کو بھی ہنسی آگئی۔ انہی دنوں ایک دن بیٹھے بٹھائے بولی۔

''پیاری ماں.....تم بتا رہی تھیں رسالہ دینے والے کبوتر باز کی شادی ہوگئی.....اب تو میرا محبوب ہرجائی نکلا.....اب تو میری جان اس کی سزا سے چھڑادو.....''

''تم اب بھی ایسا سوچتی ہو ثمینہ باجی.....'' کتابیں جھاڑ کر رکھتی ثانیہ نے حیرت سے گردن موڑی۔

''انسان ہوں ناں.....جب زندگی کو دیکھتی ہوں تو زندہ رہنے کی خواہش سر اٹھانے لگتی ہے۔''

''تم ایسا کرو.....ایف اے کا کورس منگالو۔''

''ایف اے، بی اے، ایم اے.....اس کا فائدہ.....؟ مجیدے کے ساتھ ڈنگروں کی طرح جینا اور آگہی میں اضافہ کرتے چلے جانا۔ برین ٹیومر کو دعوت دینا۔''

''عفان اور وجدان اب تمہاری خوشی ہیں۔''

ایک آہ بھر کر وہ اوپر دیکھنے لگی۔ فضا میں آزاد پنچھی اڑ رہے تھے۔ وجدان کی پیدائش اور چھلا خدمات کرواتے وقت گزر گیا۔ ایک بار پھر تحفوں کی... بھرمار کے ساتھ ثمینہ کو اپنی گاڑی میں تزک و احتشام سے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔

طویل عدم موجودگی کی وجہ سے کمرا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں بدل چکا تھا۔ میلی چادریں، چکنے، چیکٹ تکیے، پلنگوں کے نیچے دھکیلے ہوئے شاپر، چھلکے، سالن کی سنی ہوئی تھالیاں، کٹوریاں، سنگھار میز پر داغ دھبے، سگریٹ کی ڈبیاں، اس کی آمد کی اطلاع کے باوجود کمرے کو جوں کا توں رکھ کر اسے نظر انداز کر کے دکھایا گیا۔

سسرال میں قدم رکھتے ہی ماں کے گھر والے ناز نخرے قصۂ پارینہ ہوئے۔ حال ہی میں چھوڑے ہوئے اجلے گھر کا تاثر تازہ تھا۔ ویہڑے میں ہجو ماسی کی چارپائی کے ساتھ کپڑا باندھ کر جھولا بنایا اور بچے کو اس میں ڈال دیا جسے ہجو ماسی لیٹے، لیٹے ہلاتی رہی۔ کمرے میں آئی دوپٹا اتار کر ایک طرف رکھا۔ جھاڑو پکڑا، صفائی کر کے چادریں بدلیں، میلے کپڑوں کا انبار نکل آیا۔ مغرب تک دھلائی والی مشین چلتی رہی۔ رات کو فارغ ہوئی، تحفوں کی تقسیم ہوئی، اس کے گھر سے لایا گیا کھانا سب نے مزے لے کر کھایا۔ اس کی لائی مٹھائی کے ٹوکرے سے بستی میں پوتے کی آمد کی مٹھائی بانٹی گئی۔ مجیدا نہال ہو رہا تھا۔ اسے وہ پہلے سے زیادہ بھدا اور میلا لگا۔ جبر کا موسم پھر سے شروع ہوگیا۔

نوکری پر جانے سے پہلے وجدان کی فیڈر دھو کر ابال کر ماسی ہجو کو دے جاتی۔ واپسی پر وہی فیڈر تین بار استعمال ہونے کے بعد کہیں گری ہوئی ملتی۔ کچھ کہنے پر یہی سننے کو ملتا۔

''بچے پل جاتے ہیں، ہمارے بھی پل گئے۔''

یہ ان دنوں کی بات ہے وجدان چھ ماہ کا تھا۔ چھٹی کا دن تھا، ناشتے سے فارغ ہو کر وہ گودام والی کوٹھڑی کی صفائی کرنے گھس گئی۔ گودام والی کوٹھڑی اس کے کمرے کے پیچھے تھی۔ چوہے وہاں سے نکل کر ادھر آجاتے۔ لہٰذا اس نے اچھی طرح صفائی کرنے کی ٹھان لی۔ ابھی اندر گھسے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

''بھابی کیا ہوا؟'' نوید دوڑا۔

ثمینہ کو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ نوید نے سانپ دیکھ لیا۔ اسے مارنے کو لپکا سانپ تو مر گیا۔ شور شرابے پر سب اکٹھے ہوگئے۔ ثمینہ کے پاؤں پر خون کی بوند سانپ کاٹے کا ثبوت تھی۔ نوید نے ہی ٹانگ کس کر باندھی کہ زہر اوپر نہ چڑھے موٹر سائیکل پر پیچھے ثمینہ اور اس کے پیچھے مجیدا اسے سنبھال کر بیٹھا۔

ابتدائی طبی امداد کے بعد انہوں نے بڑے اسپتال فوری ریفر کر دیا۔ مگر بجائے اسپتال کے مجید اسے گھر لے آیا کہ فلاں سپیرے کو بلوا کر زہر نکلوا دیں گے۔ نوید سپیرے کو بلانے بھاگا۔ ثمینہ پر جوں، جوں غنودگی چھا رہی تھی اس کے میکے اطلاع کرا دی گئی تھی۔ روتے پیٹتے وجدان کو گاؤں کے بچے لیے پھر رہے تھے۔ کوئی نام نہاد سپیرا گلے میں منکوں کا ہار ڈالے، کالا تھیلا لٹکائے بانسری بجاتا پہنچا تو سارے یوں خوش ہوئے جیسے مسیحا آپہنچا ہو..... گاؤں کے مردوں،

عورتوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ ثمینہ کی حالت لمحہ لمحہ گر رہی تھی۔ سپیرا چاقو کو آگ پر تپا کر کٹ لگانے کو تھا کہ آندھی طوفان کی رفتار سے نذر محمد، اظہر، مظہر، ثانیہ اور علیشہ گاڑی سے پہنچے اور دوڑتے ہوئے ثمینہ کے پاس آئے۔ ثانیہ نے ڈاکٹر کی ہدایت کردہ گولیاں گھول کر منہ میں ڈالیں۔ ڈاکٹری پٹیاں کس کے باندھی، انجیکشن لگا کر ڈرپس لگا دی۔ اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ مظہر نے وجدان کو اٹھایا۔ اظہر نے اس دوران مجید کو بے روک ٹوک لتاڑا تھا۔

''جاہل، عقل کے دشمن، ہم نے تمہیں اپنی بہن مار کے دینے کے لیے نہیں دی۔ مرلی بجانے کا تماشا دیکھ رہے ہو، تمہیں اس کی حالت نظر نہیں آتی۔''

اس بھاگ دوڑ میں علیشہ بھی ان کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی مگر یکا یک پتا چلا وہ اس کو چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

''کہاں گئے.....'' کیا چلے گئے؟'' وہ دروازے تک جا کے جھانکی۔

''ہاں چلے گئے ہیں، آج تمہیں دو کوڑی کا کر کے گئے ہیں۔'' نوید نے باہر سے پلٹتے بتایا۔

''اور ہمیں بھی۔'' ماسی سجو تو رنج و توہین سے تلملا رہی تھی۔ ''میں کہتی ہوں مجید نے کوٹھری میں ناگ چھوڑا تھا.....اس کا کیا قصور تھا؟ اور یہ اس معصوم میری دھی کو یہاں دھکا مار کے ڈال گئے؟ اس کا کیا قصور تھا؟ اری تو آئی کس لیے تھی تو نہ آتی۔''

''اماں مجھے جانا ہے۔'' علیشہ کا اپنا غم تھا۔

''اری سجو.....فکر نہ کر.....بٹھائیں اپنے پاس کب تک بٹھائیں گے۔'' کسی سگی کی آواز آئی۔

''بٹھانا کیا ہے.....یہ تو گھر پہنچتے ہی مر جائے گی۔ آدھے رستے چل جائے بڑی بات ہے۔'' مجید نے بے دردی سے دانت نکال کر کندھے اچکائے۔ یہ بات لطیفہ نہ تھی مگر اس کی ماں سجو بھی یوں ہنسی جیسے پہلے سے جانتی ہو، صرف نوید کے چہرے پر اُن کی ہنسی کو سمجھ نہ پانے والی کیفیت تھی۔

اللہ کا کرم ہو گیا کہ ثمینہ موت کے منہ سے نکل آئی..... اس سانحے نے ثمینہ کے گھر والوں کو اس کی کسمپرسی کی چشم دید گواہی دے کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک ماہ تک اس کا بے حد سنجیدگی سے علاج ہوتا رہا۔ ثمینہ کا رنگ پیلا زرد، خون کی شدید کمی اور جسمانی طور پر کمزور ہو گئی۔ یرقان کا حملہ ہو گیا تو یرقان کا علاج پرہیز شروع ہو گیا۔ تمام اخراجات ثمینہ کا باپ کر رہا تھا۔ مجیدے کا دو تین بار رسمی فون آیا مگر نذر محمد تک نے بے اعتنائی برتی۔

ثمینہ کی تندرستی کے بعد مجیدے نے اس کی واپسی کا تقاضا کیا۔ نذر محمد نے بیٹی کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔ نذر محمد نے اس کی طلاق نہ دینے کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گھر کے خالی حصے میں ایک کمرا اور منسلک واش روم بنوا کر ثمینہ اور اس کے بچوں کو اس میں آباد کر دیا۔

ثمینہ کی پکی نوکری نہ تھی کہ تبادلہ ہوتا، نوکری ختم ہو گئی اور وہ ایف اے کی تیاری کرنے لگی۔ یہ تبدیلیاں ثمینہ کے لیے اتنی خوش کن تھیں کہ بیماری کے اثرات اور مایوسی اڑنچھو ہو گئی۔ وہ پھر سے جی اٹھی۔ یہ وہ دورانیہ تھا جس میں ثمینہ شادی کے بعد پہلی بار اپنی زندگی جیتی دکھائی دینے لگی۔ وہ اپنا خیال رکھنے لگی۔ روکھے بال اور بے جان جلد کی فکر کرنے لگی۔ اس کے پاس زیادہ پیسے نہیں ہوتے تھے وہ کوشش کرتی تھی کہ بچوں کی ضروریات یا مطالبے کے لیے ابا سے کچھ نہ مانگے۔ ابا سے بول چال تو بحال ہو چکی تھی۔ وہ اتوار یا جمعے کے دن عفان، وجدان کو گھمانے لے جاتے تھے۔ باہر سے کھلا پلا کر لاتے۔ عفان تو اسی کو اپنا گھر اور ابا، امی کو ماں، باپ سمجھتا تھا۔ اظہر، مظہر بچوں سے پیار کرتے۔ اظہر بھائی فارمیسی کا کورس مکمل کر کے میڈیکل اسٹور کھولنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کی شادی کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ علیشہ کے سوا کسی کو نہیں سوچتا تھا اور نہ ہی گھر والے اس سے الگ سوچ رکھتے تھے۔ ثمینہ نے پرائیویٹ اسپتال میں

نرس کی جاب کرلی۔

☆☆☆

اُدھر علیشہ کا عرصہ ڈیڑھ دو سال سے کالج چھوٹ گیا تھا۔شہری زندگی،بس پر کالج آنا جانا، کلاس فیلوز سے دوستیاں، ڈراموں کی باتیں، موبائل کی دنیا اور سب سے بڑھ کر اظہر کی دل پشوریاں خواب کی طرح کھوگئی تھیں۔وہ اظہر کو کسی نہ کسی طرح اداسی ،ہجرو فراق کے پیغام پہنچاتی رہتی۔اظہر نے ماں، باپ سے کہنا شروع کیا کہ علیشہ کو واپس لے آئیں۔ اس سارے معاملے میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔اس کی تعلیم بھی مکمل کرادیں۔ یہ ڈیڑھ، دو سال کا دورانیہ تھا۔ اس دورانیے میں مجیدے نے بچوں سے ملنے کے لیے بھی چکر لگائے۔ نذر محمد کو سمجھانے اور ثمینہ کو منانے کی کوشش کی۔ثمینہ تو اس کی صورت دیکھتے ہی گھر سے نکل جاتی یا چھپ جاتی تھی۔

پھر ایک دن مجیدا ... اپنی ماں سجو اور مخبوط الحواس باپ کو لے کر آ پہنچا۔ علیشہ بھی بھابی اور بچوں کو ملنے کے بہانے بن سنور کر ساتھ آئی تھی۔

شادی کے آٹھ سال بعد پہلی بار وہ گاؤں کے تحفے گڑ، شکر، چاولوں کا آٹا، باجرے کا آٹا، ریوڑیاں، گجک، پنجیری، چوری پر مشتمل شاپر لائے تھے۔ علیشہ، عفان کو گلے سے چمٹا کر آنسو بہانے لگی۔سجو ماسی چھوٹے وجدان کو گود میں لیتی اور چومتی اور وہ گود سے نکل، نکل جاتا۔ مجیدے کا ابا پہلے تو ٹھس، ٹھس روتا اور پھر دیکھتا، روتا اور دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا اور نذر محمد کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر رقت بھری آواز نکلی۔

’’بھرا نذر محمد (بھائی نذر محمد) میرے بندھے ہاتھ دیکھ، میرا سفید سر دیکھ......میری چٹی داڑھی کی لاج رکھ لے......جو قصور ہم سے ہوئے ہیں معافی مانگتا ہوں......اب غصہ تھوک دے، میری نوں (بہو) اور پوتوں کو گھر بھیج۔ اپنا گھر آ کر آباد کرے، میں اس کا خیال رکھوں گا......ثمینہ کو نوکری وہاں بھی مل جائے گی۔ کہتا ہوں مجیدا اور ثمینہ بے شک اپنا کوئی کوارٹر لے کر رہ جائیں......آتے جاتے تو رہیں گے......‘‘ پھر وہ دوبارہ ناک آنکھیں رگڑنے لگا۔ وقفہ پا کر سجو ماسی گویا ہوئی۔

’’بھرا نذر محمد......بھر جائی راحت......زندگی اس طرح تو نہیں گزرتی۔ ثمینہ دو بچوں کی ماں ہے......اب اپنا گھر بسائے ساری عمر اماں کے گوڈے کے ساتھ تو نہیں بیٹھی رہے گی۔‘‘ وہ دونوں بول چکے تو نذر محمد نے کہا۔

’’میری بیٹی کو دیکھو......اس کی صحت کیا تھی؟ یاد ہے ناں......؟ اب اس کی صحت دیکھو، میں نے اللہ کے فضل سے اس کا خیال رکھا ہے۔ یہ ایف اے کی تیاری کررہی ہے، آگے پڑھے گی۔‘‘

’’پڑھے، پڑھے ضرور پڑھے...... بے شک پڑھے......ہم کیوں روکیں گے۔‘‘ مجیدا زبان میں التفات بہا کر بولا۔

’’اور میرا نواسہ عفان انگریزی اسکول میں پڑھ رہا ہے، قاری اس کو قرآن پاک کا سبق دینے آتا ہے۔ یہ تو گاؤں میں ایک دن نہ رہ سکے۔‘‘ امی نے بات کا سرا پکڑا۔

’’سجو......تم خود جانتی ہو، وہاں کیا ہے؟ کچے کوٹھے، سانپ، بچھو، صفائی نہ ستھرائی، جتنے میلے باہر سے اتنے میلے اندر سے......تم لوگوں کو تو میٹھا بولنا بھی نہیں آتا......میٹھا بولنے پر تو خرچ نہیں ہوتا ناں......‘‘

’’ہم تو جیسے انسان نہیں ہیں......بی بی ہم بھی انسان ہیں......میٹھا بولنے والے نہ ہوتے تو یہ علیشہ روز عفان کو یاد کر کے نہ روتی۔‘‘

’’باقی سانپ بچھو تو پکے گھروں سے بھی نکل سکتے ہیں روز تو سانپ نہیں نکلتے، ایک حادثہ تھا، ہو گیا......‘‘ مجید نے دلیل دی۔

بحث و تمحیص نے طول کھینچا۔ آخر نذر محمد نے گیند ثمینہ کی کورٹ میں ڈال دی۔

’’یہ بیٹھی ہے ثمینہ......اس سے پوچھو، اس کی جو

مرضی ہوگی میں وہی کروں گا۔ یہ مجید کے ساتھ جاتی ہے اس کا خاوند ہے، جائے۔''

''میری مرضی.....؟ آپ کریں گے.....''

سوال میں صرف جہان حیرت ہی نہیں جہانِ طنز تھا۔ پرانے زخم تازہ ہوگئے تھے۔ سجو ماسی کے لبوں پر بھی نذر محمد کے لیے ''کیوں جھوٹ بولتے ہو'' کی مسکراہٹ تھی۔ نذر محمد سر کھجانے لگا۔ راحت دائیں بائیں دیکھنے اور عفان کو بلانے لگی۔ مجید نے عفان کو کھینچ کر گود میں چڑھالیا۔

''ابو کے پاس تو آؤ یار.....ابو کو نظم سناؤ۔''

''یہ نظم نہیں poem کہتا ہے۔'' اظہر نے یاد دلایا۔

''کیسے ہو مظہر بھائی..... کتنے بے وفا لوگ ہو..... مجھے کسی نے یاد ہی نہیں کیا، میں تو سب کو اتنا یاد کرتی تھی۔'' علیشہ بالوں کی لٹ انگلی پر لپیٹتے ہوئے اظہر کی طرف دیکھتے ہوئے مظہر سے مخاطب تھی۔

''ایک تو تھا جو پہاڑے کی طرح رٹتا تھا۔'' اظہر نے جل بھن کر کہا۔

''رٹے ہوئے پہاڑے بھول بھی جاتے ہیں۔'' علیشہ نے جملہ پھینکا۔ اظہر مسکراہٹ چھپاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے انگ، انگ میں آج ایک ترنگ تھی۔ لگاوٹوں کے مبالغہ آرا اظہار، اِدھر اُدھر کی بے معنی اور بامعنی باتوں میں کبھی ہنس کے کبھی رو کے ثمینہ کو واپس چلنے کا اصرار ہوتا رہا۔

''بیٹھو بیٹی.....'' راحت نے ثمینہ کو الگ کمرے میں بلایا۔

''مجھے معلوم ہے آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے.....آپ پر ہمیشہ میری روٹی بھاری رہی ہے۔''

''اس طرح بات نہ کرو ثمینہ.....تم ہی اس مسئلے کا حل بتادو.....غصہ ہمیں بھی آتا ہے مگر غصہ کر کے بٹھائے رکھنا مسئلے کا حل نہیں ہے، طلاق وہ دیتا نہیں ہے۔''

ثمینہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر ہونٹ بھینچ لیے.....وہ سر جھکا کر فرش پر پاؤں سے لکیریں کھینچتی رہی۔

''آؤ میرے پاس بیٹھو بیٹی.....میں بات کر رہی ہوں فیصلہ نہیں کر رہی ہوں، حکم نہیں دے رہی۔''

''امی.....''

''ہاں بیٹی.....کیا کہنا چاہتی ہو؟ انہیں الگ گھر کا کہہ دیں.....وہ الگ گھر کا کہہ تو رہے ہیں، عفان کو تو ہم ہرگز نہیں بھیجیں گے۔ وجدان کو بھی میں پال لوں گی، تم ایف اے کے بعد بی اے کر لینا.....نرسنگ کا کورس کر کے شہر کے بڑے اسپتال.....''

''نہ دکھائیں جھوٹے خواب.....نفرت ہے خوابوں سے مجھے.....'' ماں کو چپ لگ گئی۔

''مجھے نہ الگ گھر چاہیے.....نہ ہی بچوں کو یہاں رکھ کر پالنا چاہیے.....مجھے مجیدا پسند نہیں ہے۔'' کمرے کی فضا میں سناٹا چھا گیا۔ مایوسی کا گدھ تاڑ لگائے بیٹھا تھا۔ ماں، بیٹی میں سے کسی کے پاس کوئی لفظ نہیں تھا۔ بس گھڑی سیکنڈ، سیکنڈ گنتی شمار کر رہی تھی۔

''ہاں بھئی، کیا میٹنگ ہو رہی ہے۔'' ابا داخل ہوئے۔ ''میں نے مجید کو کہہ دیا ہے.....اس کے ماں، باپ کو گواہ بنا کر.....میں بیٹی ایک مہینے کے لیے اس شرط پر بھیج رہا ہوں کہ اسے اب کوئی شکایت نہ ہو.....بتا رہا تھا کہ کمرا سیمنٹ کرا کے سفیدی کرادی تھی۔ صحن کا فرش بھی پکا کرلیا ہے.....کوٹھڑی کو خالی کر کے صاف کروادیا ہے۔ باقی کام آہستہ، آہستہ کرلیں گے۔''

''چھوٹے عفان کو میں نہیں بھیجوں گی۔'' امی نے گویا ثمینہ کی روانگی پر مہر لگائی۔

''کوئی مسئلہ نہیں.....تم رکھ سکتی ہو تو رکھ لو.....انہیں ہم سمجھادیں گے جہاں بڑا بچہ ہے دوسرا بھی سہی.....ثمینہ بیٹی..... اب تم تیاری کرو۔ یہ کمرا تمہارا ہے، تمہارا رہے گا۔ شادی شدہ بیٹی کو بغیر کسی فیصلے کے ہم کب تک بٹھا سکتے ہیں.....آج وہ خود چل کر آئے ہیں، منت کر رہے ہیں.....کہیں ایسا نہ ہو کل کو ہمیں منت کرنا پڑے.....تمہارے بھائیوں کی شادی کرنی ہے، زندگی ہمیشہ آگے چلتی ہے، سب باتیں سوچنا پڑتی ہیں۔'' ابا نے دلائل کا انبار لگادیا۔ یہ ہی بڑی بات تھی کہ وہ دلیل اور محبت سے بات کر رہے تھے

جن کی ٹھنڈی مار سے سر اٹھانا ممکن نہ تھا۔ ثمینہ کو ہتھیار ڈالنا ہی تھے۔

زندگی ضرور آگے چلی ہوگی ثمینہ پیچھے لوٹ آئی۔ گاؤں میں کچھ نہیں بدلا تھا۔ کمرے کی سفیدی اور صحن میں لگی پختہ اینٹوں سے رواج اور مزاج نہیں بدلے تھے۔ مجیدے کی محبت یہی تھی کہ دن میں کئی بار کمرے کا دروازہ بند ہوتا اور کھلتا رہتا۔ لہجہ اور الفاظ وہی تھے رویہ اور بندہ وہی تھا۔

ایک مہینے نے ثمینہ میں پھٹی ایڑیوں، بھدے ناخنوں، سانولے چہرے والی محنت کش دیہاتن کا روپ بھر دیا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ اداس رہتی تھی۔ اس نے اچھے دن ایک بار پھر گزار کر دیکھے تھے۔ اس کی بہن میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ بلا مبالغہ اپنی بہن کی ملازمہ کے معیار پر نظر آتی تھی۔ اجلی لڑکیوں کی سنگت، مہذب رویے، فیشن کے لباس، جدید جوکس، انگریزی الفاظ، موویز، وڈیوز، دورِ حاضر کے مروجہ مباحثے، ملکی حالات پر نظر وہ ان سب کا حصہ رہی تھی، رہنا چاہتی تھی۔ اس نے بھی اچھی زندگی کے سپنے دیکھے تھے۔ تعلیم یافتہ، شائستہ، خوش لباس، ہم خیال جیون ساتھی کا سپنا اس کے اندر مرتا نہ تھا۔ اپنا خود مختار گھر، اپنے بچے اپنے پاس، مرضی کا کھانا، پینا، جاب پر جانے والا باشعور شوہر یہی کچھ چاہتی تھی۔ اسے دولت کی حسرت نہ تھی۔ اس کے سپنے اسی آمدنی میں سما سکتے تھے اگر آمدنی مناسب اور معقول طریق پر خرچ ہوتی..... سوال آمدنی کا نہ تھا، البتہ مجیدا اور سجو ثمینہ کی ذات کو تنخواہ کے حصول سے الگ کرنا نہ چاہتے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی جواز اسے نہ چاہتے ہوئے باپ کے در کا سوالی بناتا۔

وقت گزر رہا تھا۔ دجدان کے بعد شامہ اور شامہ کے بعد امامہ اس کی گود میں آگئیں، دونوں بچیاں دو سال کے فرق سے پیدا ہوئیں۔ گاؤں کی دائی نسیو نے پیدا کیں..... وہ اپنی ہر ضد ہار چکی تھی۔ اب اسے اپنے جسم کی بدنمائی یا اپنی تکلیف کی پروا نہیں رہی تھی۔ شامہ

کورونا وائرس کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال

ہم اپنے رشتے داروں سے بہت پیار کرتے ہیں ہماری وجہ سے کسی کو مسئلہ ہو یا کسی کی وجہ سے ہمیں مسئلہ ہو تو بہتر ہے کہ اپنے گھروں میں رہتے ہوئے اپنی اور گھر والوں کی صحت کا خیال رکھیں کیونکہ جو اصول آپ اپنے گھر کے لیے وضع کرتے ہیں تو دوسرا آگے اس پر عمل نہیں کرتا اور نہ ہی ہم کسی کو کہہ سکتے ہیں۔ اپنے بچوں اور فیملی کو ہم ہر طرح سے سمجھا سکتے ہیں لیکن دوسرے کو ہم مجبور نہیں کر سکتے تو اس کا بہتر حل یہی ہے کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا احتیاط کریں۔ پہلے بہت زیادہ ملنا ملانا، گلے ملنا محبت میں منہ ماتھا بھی چومتے تھے۔ ابھی ہم لوگوں کو اس کا بہت خیال رکھنا پڑے گا کیونکہ ابھی بہت زیادہ جراثیم پھیلے ہوئے ہیں تو اپنے آپ کو کنٹرول کریں اور لوگوں کو بھی سمجھانے کی کوشش کریں۔ کافی لوگ سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

مجھے گھر میں رہنا گھر اور فیملی کو وقت دینا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ جو کام آپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے اب وہ کام کر رہے ہیں۔ سب سے بہترین آئیڈیا ہے کہ فون پر رابطے میں رہیں۔ کسی کے گھر بھی نہیں جا رہے۔ خود کو محفوظ بھی رکھ رہے ہیں۔ سب کے معاشی حالات بھی ڈاؤن ہیں۔ آپ کسی کے گھر جائیں گے، کوئی آپ کے گھر آئے گا تو مہمانداری میں تو مسلمان آگے ہیں اور ہمارا کلچر بھی ہے تو اس وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ساری گیدرنگ نہ کریں۔ اللہ کرے یہ ختم ہو جائے تو پھر ملیں جلیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ نماز، روزہ میں نے بہت اچھے سے نبھایا ہمیشہ سے زیادہ اچھی طرح..... بہت عرصے بعد یہ سلسلہ مستقل ہوا ہے تو میں بہت خوش ہوں، اللہ کرے یہ کرونا جلدی سے چلا جائے۔ آمین۔

شمیم..... ابوظہبی

اور امامہ کے رُل کے پلنے کی کڑھن پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ وہ اپنے ماں، باپ سے مکمل مایوس ہو چکی تھی۔ اب اسے وہاں جا کے رہنے، چار دن بی بی رانی بن بیٹھنے، پیزا، برگر کھانے، شاپنگ پر اپنی بہن اور ماں کے ساتھ خود کو جاہل شودی محسوس کرانے، ہر نئی چیز کے تعارف پر نقلی ہنسی ہنسنے۔۔ ترقی پر مبارک باد دینے اور اپنے آپ پر ترس کروانے کی ہمت رہی تھی، نہ ضرورت...... وہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر مر چکی تھی۔

مگر ہوا یوں کہ نذر محمد سترھویں گریڈ کی نوکری سے ریٹائر ہوا۔ یکمشت اچھی خاصی رقم ملی، اس نے اظہر کی علیشہ سے شان و شوکت سے شادی کی۔ وہ اس کی لاڈلی ہاتھوں کی پلی بہو تھی۔ جہیز بھی خود بنایا، اپنے پاس سے رخصت کر کے آپ لا بسایا۔ علیشہ کی ماں اور بھائیوں کو کچھ بھی خرچ نہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود وہ کہتے ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ (علیشہ نے ایم اے کر لیا تھا۔) سوہنی سجل بیٹی نذر محمد کو مفت مل گئی۔ اظہر کی لاٹری کھل گئی۔ بدلے میں انہیں کم پڑھی، معمولی صورت ثمینہ ملی۔ معمولی صورت تو وہ مزدوروں جیسی زندگی گزار کے ہو چکی تھی۔ وجوہات کو پسِ پشت ڈال کر نظر آنے والے حقائق یہی تھے۔ نذر محمد کی بہو اعلیٰ تعلیم یافتہ، اسمارٹ شوخ و شنگ جدید لڑکی تھی۔ سجو کی بہو اکھڑ زبان، پرانے رنگ ڈھنگ کے کپڑے پہننے والی مٹیالی عورت تھی۔ یہ عورت اس لڑکی سے ایک سال بڑی تھی۔

شادی پر پیسے کی ریل پیل دیکھ کر سجو کی آنکھیں کھل گئیں۔ ماں نے مجیدے کو بٹھا کر سمجھایا کہ باپ کو ملنے والے پیسوں میں ثمینہ کا بھی حصہ ہے اسے یہ حصہ مانگنا چاہیے...... یہ بے تکا تقاضا سن کر ثمینہ نے انکار کر دیا۔

''ابا نے بھائیوں اور ثانیہ کو الگ، الگ حصے نہیں دیے۔''

''کیا پتا اندر سے دے چکا ہو، نہ بھی دے چکا ہو تو ثانیہ کو مہنگی پڑھائی کروا رہا ہے۔ اظہر، مظہر پر خرچ کر رہا ہے بڑے کو میڈیکل اسٹور کروا کے دیا ہے...... تم اپنا حصہ لے کر آؤ۔''

''کس چیز کا حصہ؟''

''او (فحش گالی) ابھی تک سمجھ نہیں آئی، جو تا اتاروں تو سمجھ آئے گی۔''

''وہ تو میرا حصہ ہے، لوں نہ لوں میری مرضی......'' وہ ڈھیٹ بن چکی تھی۔

''بکواس بازی نہ کر، میں تجھے ویگن میں بٹھا آتا ہوں، امامہ کو لیتی جا شامہ دادی کے پاس رہ جاتی ہے۔ پرسوں اتوار کو واپس آجانا، تیاری کیا کرنی ہے ابھی دفتر سے آئی ہو۔''

''ثمینہ دھی، چھوٹا گوشت یہاں نہیں ملتا...... کافی سارا لیتی آنا...... بڑا کھا، کھا کر تیرے منہ پر تل نکل آئے ہیں۔''

جواب بہت تھے ثمینہ کے پاس...... جواب دے بھی سکتی تھی۔ مجیدے کی گالیوں اور تھپڑ سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا اس نے، ڈر تب تک ہوتا ہے جب تک کھونے کے لیے کچھ بچا ہوتا ہے۔ اور بیوی کو ڈر تب تک ہوتا ہے جب تک گھر ٹوٹ نہ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس کے ہاں دونوں اسباب نہیں تھے، پر جانے کیا سوچ کر اس نے امامہ کی چند چیزیں سمیٹیں امامہ کے کپڑے بدلے۔ شامہ کو کہیں باہر بھیج کر امامہ کو لیے مجید کے ساتھ ویگن اسٹینڈ چل دی۔ پندرہ منٹ کے پیدل راستے میں وہ اسے دلائل مہیا کرتا رہا۔ قائل کرتا رہا (وہ تو ساتھ چلا ہی اسی لیے تھا) ثمینہ راستے میں ب عوامی سواری میں مجید کی بات کا کم ہی جواب دیتی تھی۔ اختلاف والا جواب تو بالکل بھی نہیں کیونکہ مجیدا بھرے چوک میں اس کو گالیاں نکال سکتا تھا اور بعید نہیں ک مار پیٹ پر آجاتا۔

ثمینہ کو بچی اٹھائے یوں سامنے اچانک پا کر و ایک دفعہ پھر حیران و پریشان ہو گئے۔

''سب خیر ہے؟ شامہ کہاں ہے؟'' امامہ ک پکڑتے ہوئے امی نے پوچھا۔

''تم نے بتایا ہی نہیں، تم آرہی ہو ہم گاڑی میں لے آتے۔'' مظہر بولا۔

''ارے واہ..... ثمینہ بھابی آئی ہیں۔'' کچن سے جوسر آف کر کے علیشہ جھانکی ملازمہ واشنگ مشین سے وجدان کے کپڑے نکال کر تار پر پھیلا رہی تھی۔

''زندگی تو میرے بغیر خوب رواں دواں جواں ہے۔ تو پھر میں کیوں ہوں؟ عجب خیال گزرا۔

''کیسی ہیں آپ ثمینہ بھابی۔'' جیسے وہ اس سے بہت بڑی اور سینئر ہوگی جوس کا گلاس احترام سے پیش کرتے ہوئے جینز، شرٹ والی علیشہ نے کہا۔

''علیشہ بھابی..... میں اتنی ٹھیک ہوں جتنا کوئی آپ کے میکے میں ہوسکتا ہے اور آپ اتنی ٹھیک ہیں جتنا کوئی میرے میکے میں ہوسکتا ہے۔'' ثمینہ نے چھکا مارا .....علیشہ سنی ان سنی کر کے کھسک گئی۔

آمدم برسرِ مطلب..... ثمینہ نے اپنا سوال پٹاری سے نکالا۔

''ابا کو ریٹائرمنٹ کے بعد کتنی رقم ملی ہے؟''

''کیا کہہ رہی ہو؟ سکون تو پکڑو۔''

''لائیں مجھے دیں گڑیا کو..... ہیلو گڑیا.....'' علیشہ نے آگے بڑھ کر امی کی گود سے امامہ کو لے لیا۔

''پہلے ناشتا بنالو پھر چائے بنالینا۔ بچی کو مجھے دے دو۔'' امی نے علیشہ کو تلقین کی، امامہ نیچے اتر کر کھیلنے میں لگ گئی تو امی نے ثمینہ کو چمکارا۔ ''آؤ میری چندا..... ماں کے پاس آ کر بیٹھو..... بتاؤ کیا بات ہے؟''

''مجھے آپ کے داماد نے بھیجا ہے۔'' اور پھر مختصراً کہہ سنایا۔ ابا آئے اور اصل صورتِ حال جانی تو ثمینہ کو اچانک پانے کی حیرت غضب ناک اشتعال میں بدل گئی۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے یہ سوچا کیونکر ہے۔''

''آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔'' امی نے تحمل سے کہا۔

''آرام سے بیٹھ گیا لو..... ابھی میں نے دو بچوں کی شادی کرنی ہے۔ اللہ نصیب کرے ہم بوڑھے حج کر آئیں۔ اپنی بیماری، بڑھاپے کا آسرا بھی بچا کر رکھنا ہے۔ میں یہ پونجی بانٹ نہیں سکتا۔ اگر ایک کو حصہ دوں تو دوسروں کا بھی حق ہے۔''

''ابا جان..... یہ سارے جواب آپ اپنی پیاری بہو کے بھائی کو دیں۔'' اس نے بے نیازی سے ناشتے کی ٹرے کھسکا کر اپنے سامنے رکھی۔

''rude ہوگئی ہے۔'' علیشہ بڑبڑاتی ہوئی گئی۔

نذر محمد نے فون اٹھالیا۔ اس کے طیش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بات مجید سے ہو رہی ہے۔ اُدھر اظہر دبے، دبے لفظوں میں روکتا۔ اسے یہ فکر تھی کہ بات بگڑی تو ثمینہ پھر سے یہاں بیٹھ سکتی ہے۔ کم و بیش یہ فکر گھر کے ہر فرد کو تھی۔ عفان اور وجدان اسکول سے آئے تو بھاگتے ہوئے ثمینہ کو ملے۔ ثمینہ نے دونوں کو دائیں بائیں لپٹالیا۔ وہ بھی خوش ہوئے مگر جلد ہی اپنے معمولات میں مگن ہوگئے۔ چھوٹا وجدان، امامہ سے کھیلنا چاہتا مگر وہ بدک کر رونے لگتی۔

وہ ایک رات تو اسے بسر کرنا تھی۔ امی اپنے بستر میں بیٹھی ثمینہ کے نصیبوں پر آنسو بہا رہی تھیں۔ ساتھ بیڈ پر ثمینہ بھی امامہ کو سلا رہی تھی اور اماں کو دیکھ رہی تھی۔

''امی..... ثانیہ مجھے یاد نہیں کرتی؟''

''ثانیہ کے اندر تمہیں لے کر آج تک غصے کا طوفان ہے..... تم کل نہ جاؤ۔''

''میری نوکری ہے..... میں چھٹی لے کر نہیں آئی۔ صبح گیارہ، بارہ تک نکل جاؤں گی۔''

''مجید کو جا کر کیا کہو گی؟''

''مجھے اب کیا کہنا ہے، ابا کہہ چکے ہیں۔ اسے جواب مل چکا ہے۔''

''مگر وہ بکواس تو کرے گا۔ چپ تو نہیں رہنے والا۔''

''جو کہے گا کہہ لے..... اس کی بکی ہوئی گالیاں مجھے چپک نہیں جاتیں۔ اس کے اعمال نامے کی نیکیاں مجھے شفٹ ہوتی رہتی ہیں۔ بشرطیکہ نیکیاں ہوں..... ورنہ وہ میرے گناہ تو وصول کرتا ہوگا۔''

''یہ تو اللہ کے معاملے ہیں۔''

''معاملے تو سارے ہی اللہ کے ہوتے ہیں۔''

اظہر بھائی نے کمرے میں آ کر جھانکا۔

''جاگ رہی ہو...... ثمینہ تم فکر ہی نہ کرو...... اب مجیدے کی مجال نہیں تمہیں کچھ کہے...... اس کی بہن ہے ہمارے گھر میں ہے تیرا بھائی زندہ ہے...... تجھے کچھ کہے گا تو اسے نکال کر باہر کروں گا......'' ایسا مصنوعی دعویٰ تھا کہ ماں رونا بھول کر اسے تکنے لگی۔ ثمینہ زور سے ہنس پڑی۔

''میرے باغیرت بھائی...... مجھے تو وہ (فحش گالی) کے سوا کچھ بلاتا نہیں...... تم ابھی علیشہ کو (فحش گالی) کہہ کر بلانا ذرا...... باہر نکالنا تو دور کی بات ہے'' اب وہ اسی طرح لاجواب کر دیا کرتی تھی۔

''دیکھو تو میری بھانجی سوتے میں ہنس پڑی ہے ثمینہ...... یہ ہو بہو تیری شکل ہے۔ شامہ کو کیوں نہیں لائی۔'' اظہر نے بات ہی بدل دی۔

''میرے بچے اسی طرح بٹے ہوئے ہیں...... پل جائیں گے جیسے تیسے۔'' چند باتیں کر کے اظہر اٹھ گیا۔ صبح ثمینہ، امامہ کو لیے واپس چلی گئی۔

بس سے اتر کر خیر پور جنوبی کے بس اسٹاپ پر خالی بینچ پر ثمینہ گود میں بچی کو فیڈر دیے بیٹھی تھی۔ گود والی بچی کا فیڈر کب سے خالی ہو چکا تھا مگر ثمینہ خیالوں میں گم تھی۔ اسے گھر جانے کی کوئی کشش تھی نہ جلدی...... ایک بدنما سوا گت اس کا منتظر تھا۔ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ زبان سے نکلا۔

''کہاں سے ملتا ہے کالا پتھر؟''

''جی...... کالا پتھر؟'' کوئی تھا جس نے اس کی خود کلامی سن لی تھی۔ کالا پتھر کے حوالے سے خبریں پڑھتا ہوگا ایک اور خبر کے اندیشے نے متوجہ کیا ہوگا۔

''آپ پریشان ہیں بی بی۔''

اجلا لباس اچھا حلیہ...... خوشحال گھرانے کا لگتا تھا...... ثمینہ نے جلدی سے آنسو صاف کیے اس پر نظر ڈالی۔ وہ پہچان گیا فوراً بولا۔

''آپ؟ آپ دیہی مرکزِ صحت پر ہوتی ہیں؟ چھوٹا سا تو علاقہ تھا۔ ''آپ کا نام......'' وہ جیسے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے لگا۔

''ثمینہ......''

''جی...... ثمینہ میڈم...... یہاں کس کا انتظار کر رہی ہیں؟''

''نہیں، میں گھر جا رہی ہوں...... ابھی بس سے اتری ہوں۔''

''میں شہریار جوئیہ ہوں...... بھابی کے ساتھ ایک بار سینٹر آیا تھا۔ آپ کو وہاں دیکھا تھا...... میں وکیل ہوں۔''

''اس تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔'' بیزار ثمینہ نے بچی کو اٹھایا۔ بیگ کاندھے پر لٹکایا اور چل دی۔ وہ دور کھڑی اپنی گاڑی تک گیا۔ گاڑی میں بیٹھا مگر اسٹارٹ نہ کی۔ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ شاید اسے واہمہ ہوگا کہ کالا پتھر نہ تلاش کر لے۔

☆☆☆

ثمینہ گھر پہنچ گئی...... سجو ماسی چٹائی پر سرسوں کے ساگ کا انبار لیے دھڑا دھڑ کاٹ رہی تھی...... مجید اور نوید ایک ہی تھالی میں سے سوتیوں کا زردہ کھا رہے تھے...... تین سالہ شامہ مٹی میلی گندے ہاتھوں سے اس تھالی پر گری پڑتی تھی۔ سامنے سے آتی ثمینہ کی طرف سجو کا منہ اور ان دونوں کی پشت تھی۔ وہ مجیدے کو آنکھ مار کر آہستہ سے بولی۔

''تیری شہزادی آ رہی ہے۔'' کچھ ایسا بھی کہا کہ آتے ہی نہ شروع ہو جانا۔ شامہ ماں کی طرف لپکی۔ ثمینہ نے سلام کر کے شامہ کو انگلی سے پکڑا اور کمرے میں چلی گئی۔ امامہ کو بٹھا کر شامہ کو اٹھایا۔

''گندی بچی، کتنی گندی ہو رہی ہو...... تیرے منہ پر ستھری جگہ نہیں ملتی جہاں پپی کروں...... چلو منہ دھلاؤں تمہارا۔'' اس نے شامہ کے ہاتھ منہ دھلائے۔ سردی کے سبب تازہ پانی سے نہلا نہیں سکتی تھی۔ اس کے کپڑے بدلے، موزے اور جوتے پہنائے، اتنے میں مجید اندر آ گیا۔

''آتے ہی کس کام میں لگ گئی ہو...... یہ تو پھر ویسے ہی میلی ہو جائے گی۔ روٹی شوٹی کھاؤ......! کچھ حال دو......''

''روٹی کھا کے بھی تو پھر سے بھوک لگ جاتی ہے۔ کیا گندا حال تھا اس کا..... جھدار نی لگ رہی تھی۔ حال تو فون پر سن لیا ہے۔''

''فون تو کیا تھا ماموں نے..... مگر میں سمجھا نہیں تھا۔''

''کیا؟'' ثمینہ نے بستر کی چادر جھاڑتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔

''تو اپنی ماں سے بات کر کے اسے سمجھاتی بات.....''

''کیا سمجھاتی.....؟''

''او (فحش گالی)..... تو بیٹھ کے بات نہیں کر سکتی۔ میں کیا گھوم، گھوم کر ترا منہ دیکھتا رہوں۔''

''میرا منہ نہ دیکھو..... آواز سنو..... پیسے میری ماں کے نہیں ہیں، ابا کے آئے ہیں۔ ابا نے جواب بتا دیا۔ ان کے اپنے خرچے ہیں۔''

''ہوں گے خرچے تو ان کی اولاد نہیں ہے؟ تیری غریبی پر تیرے ماں باپ کو ترس نہیں آتا۔ میں کوئی کاروبار کرلوں گا..... اس کی بیٹی سکھی رہے گی۔'' چھوٹی اماں رونے لگی تو وہ اس کو دیکھنے کے لیے مڑی بازو سے کھینچ کر اسے سامنے کر کے وہ چیخا۔

''پہلے میری بات کا جواب دے..... یہ تو روتے رہتے ہیں۔''

''میں تمہاری بات کا کیا جواب دوں..... ابا کو میرے اوپر ترس آتا تو وہ یہاں میری شادی نہ کرتے..... اور ہاں..... میرے ابا نے تمہاری بہن کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر شان و شوکت سے بیاہ کر عیش و آرام سے رکھا ہوا ہے..... اب تمہارا اور تمہارے ابا کا فرض ہے مجھے اسی طرح عیش و آرام سے رکھیں..... دونوں طرف کے ذمے دار میرے ابا نہیں ہیں۔'' جواب تو اس کو لاجواب آتے تھے۔

''ابا کی لگتی..... میرے آگے تو تیری زبان مشین کی طرح چلتی ہے۔ کاٹ کے کتوں کو ڈال دوں گا..... وہاں جا کے بھی میرے خلاف بولی ہو گی..... مر نہ جاتا بڈھا اگر لاکھ دو لاکھ ہی دے دیتا۔ خالی ہاتھ دھکا مار کے نکال دیا۔''

''ثمینہ..... آ کے روٹی کھا لے پتر.....'' سجو ماسی شور شرابا سن تو رہی تھی۔ ان سنی کر کے مٹھار کر بولی۔

''کوئی روٹی نہ دو اسے..... روٹی پانی بند ہو گی تو مت آئے گی..... مفت کی روٹیاں توڑنا آسان ہوتا ہے۔''

''میں مفت کی روٹیاں نہیں توڑتی..... میں کما کر کھلاتی ہوں..... نوکری پر بھی جاتی ہوں، گھر کا کام بھی خود کرتی ہوں۔ مفت کی روٹیاں تم توڑتے ہو..... کہیں چھوٹی موٹی نوکری ہی کرلو..... زمین کے آٹھ بیگھے تو تمہارے ابا کے ہیں..... وہ کیوں نہیں تم دو بھائیوں ایک بہن میں تقسیم کر دیتے۔''

''تو بے شرم، گھٹیا عورت ہے..... خاوند کو..... بے عزت بولتی ہے۔'' اور بالوں سے جھنجھوڑ کے سر پر کس کے دو چار تھپڑ مارے۔ ''لے تو اسی قابل ہے۔'' ماں کو مار کھاتا دیکھ کر دونوں بچیاں چلّانے رونے لگیں۔ سجو اور نوید شور شرابا بڑھتا پا کر آ گئے۔ نوید، مجید کو پکڑ کر دھکیلنے لگا۔

''چھوڑ مجید..... پاگل ہو گیا ہے..... کیا کر رہا ہے۔''

''چل تو ہی چپ کر جا..... اِدھر آ ایک طرف.....'' سجو، ثمینہ کو ہٹا کر دور کرتے ہوئے بولی..... مردانیت کو ہوا دیتے ایسے مکالمے مجیدے کو مزید جوش و خروش دلا رہے تھے۔

وہ اچھل، اچھل کر بڑھتا اور ثمینہ پر جھپٹتا..... نوید اسے کھینچ کر باہر نکال لے گیا۔ اب ثمینہ دونوں بچیوں کو دائیں، بائیں گھٹنوں پر لے کر زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے بدن پر کپکپاہٹ اور لرزش تھی کہ قابو میں نہ آتی تھی۔ دل کی دھڑکنیں سنبھلتی نہ تھیں۔ لرزتے ہاتھ سے بکھری ہوئی بالوں کی لٹیں سمیٹتی اور کانوں کے پیچھے اڑستی تھی۔

سجو ماسی جو بیٹے کے پیچھے باہر گئی تھی واپس آئی۔

''سردی میں نیچے بیٹھی ہو، اب بس کر..... برا شگون ہوتا ہے مٹی پر بیٹھنا..... چل پانی پی لے۔''

''ہاں، ہاں میں بیوہ ہو گئی ہوں..... یتیم لے کر مٹی پر بیٹھی ہوں۔''

''تو سچ پر مار کھاتی ہے۔ زبان چلاتے آؤ دیکھتی ہے نہ تاؤ..... ڈائن میرے جوان جہان شہتیر پتر کو کھائے گی..... ترا باپ نہ مرجائے۔'' یہ بد دعا اسے نشتر کی طرح لگی۔

''سب کے باپ سب کے خاوند مر جائیں۔'' ثمینہ نے دفع ہو جانے کے اشارے سے کہا۔ اب سجو جتنا کوسے چلّائے اس کی جوتی کو پروا نہیں..... اس کے من کو قرار آ گیا..... وہ اٹھی..... باورچی خانے میں جا کر روٹی دان کھولا..... روٹیاں پڑی تھیں..... چھابی میں نکال کر ان پر تازہ مکھن اور اچار رکھا اور شمامہ کو ساتھ بٹھا کر کھانے لگی۔ امامہ کو دودھ کا فیڈر بھر دیا وہ دودھ پی کر سو گئی..... کھانا کھا کر دودھ پتی بنائی۔ کپ لے کر کمرے میں جا بیٹھی۔ اس دوران میں سجو نے کیا، کیا دہائیاں دیں کیا کہا اس نے گویا کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔

دن خواہ کتوں کی طرح لڑتے بھونکتے گزرا ہو رات کو مجیدا جانور کی طرح حق وصولنے آجاتا تھا۔ اسے مجید سے مار کھانے جوتے کھانے سے اتنی نفرت نہ تھی جتنی اس کے قریب آنے سے ہوتی۔ اگر شامہ، امامہ کو بھی امی سنبھال لیں کسی طرح یہ بھی ٹھیال چلی جائیں تو وہ کبھی مجیدے کے گھر کا رخ نہ کرے..... وہ بہ آسانی کسی دریا میں چھلانگ لگا کر میکے سسرال کو مکتی دے جائے۔

وہ صبح وقت پر مرکزِ صحت پہنچ جاتی..... حالانکہ چاہتی تو مڈوائف اختر بی بی اور وہ باری لگا سکتی تھیں ایک دیر سے آئے دوسری وقت پر پہنچ جائے..... مگر وہ گھر پر رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بسا اوقات وہ اکیلی دفتر میں گھنٹا، گھنٹا خاموشی میں گزار دیتی مگر اسے یہ اچھا لگتا تھا۔ چوکیدار ہی خاکروب تھا۔ وہ شریف بندہ تھا۔ جھاڑو لگاتا، کرسیاں، میزیں جھاڑتا، باہر چھڑکاؤ کرتا پھر باہر بیٹھ کر راہ آتے جاتوں سے گپ شپ کرتا۔

دفتر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی..... ثمینہ نے فون اٹھایا۔

''ثمینہ..... ثمینہ باجی بول رہی ہو؟'' وہ ثانیہ کی آواز تھی۔

''آپ..... تم ثانیہ.....؟'' خوشی بھی کچھ ہوتی تو ہے۔

''ہاں میں ثانیہ ہوں..... تمہاری بہن.....'' اٹکتا ہوا اضطراب۔

''ثا..... نیہ..... خیریت تو ہے ناں؟'' ویسے خیریت ہو نہ ہو کوئی اپنا یہاں تک آواز لایا۔

''ہاں، ہاں سب خیریت ہے۔''

''کہاں ہو؟''

''میں ہاسٹل میں موبائل سے بات کر رہی ہوں..... پرسوں تم امی کی طرف آئی تھیں، تم نے امی سے کہا ثانیہ مجھے یاد نہیں کرتی..... تمہیں کیا معلوم ثانیہ جب، جب اکیلی ہو، کتاب سامنے پڑی رہے مگر تمہیں یاد کرنے کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا..... مجھے تمہاری سب حالتوں کا پتا ہوتا ہے..... مگر میں تم سے بات کرنے لگوں تو سمجھ نہیں آتی کیا بات کروں..... دکھوں کو اِدھر اُدھر کی باتوں سے ٹرخانا مجھ سے نہیں ہوتا..... بلکہ مجھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا..... میں تمہارے جتنی صابر نہیں ہوں۔''

''ہوتا تو مجھ سے بھی کچھ نہیں..... مگر چپ اب نہیں رہتی..... بکواس بھی نہ کروں تو میرا کلیجا پھٹ جائے..... کچھ زندگیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ وہ تماشا گاہ ہوتی ہیں۔''

''ثمینہ باجی..... تم پیسوں کے لیے آئی تھیں، میرے پاس پیسے ہوتے تو میں سارے تمہیں دے دیتی۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پیسے تم نے نہیں مجید نے لینے تھے۔ تو اگر میں دوں تو وہ لے..... امی دیں تو وہ لے..... تبدیلی کیا آنا؟''

''تمہارے پاس اس وقت کوئی ہے تو نہیں۔''

''نہیں.....''

''ثانیہ.....''

''ہاں بولو..... جتنی بڑی بات کہنی ہے کہہ دو۔''

''میرا جینے کو دل نہیں کرتا۔''

''مجھے یہی ڈر تھا..... میں نے تمہیں یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا..... کبھی ایسا مت کرنا..... کبھی ایسا

نہ سوچنا..... برے دن گزر جائیں گے۔''

''میرے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا..... دیکھو جذباتی بن کے جواب نہ دو..... جانتی ہو کتنے کٹھور ہمارے بھائی ہیں..... اظہر بھائی کو کبھی خیال آیا کہ علیشہ کے بھائی نے اس کی بہن کو کیسے رکھا ہوا ہے..... ابا کی تو کیا بات کرنا..... سارا ظلم ہی ابا کا ہے..... وقتی طور پر انہوں نے مجھے ایک سال غصے میں رکھ لیا..... باقی امی کے بس میں رونا ہے' میرے مرنے پر تھوڑے دن روئیں گی جینے پر جانے کب تک روئیں..... تم ہو، تمہارے آگے شاندار مستقبل ہے..... تمہارے خواب ہیں، اللہ تمہیں سب خوشیاں دے..... میرے بیٹے میرے بغیر اچھے سے رہ رہے ہیں..... کسی طرح شامہ، امامہ کو وہیں بھیج دوں..... بس ایک یہی رکاوٹ ہے۔ پھر کوئی رکاوٹ نہیں۔''

''ثمینہ..... تمہاری زندگی تمہارے لیے ہے..... تم اپنے لیے ہو..... آخرت اور دنیا بندہ اپنی آپ جیتا ہے۔ تم نے اگر خودکشی کی..... یاد رکھنا میں بھی خودکشی کرلوں گی..... ماں، باپ کو دکھا دوں گی پایا انہوں نے کچھ نہیں۔''

''پیاری ثانی..... یار تو پاگل ہے، تیرے پاس مرنے کا کیا جواز ہے، تجھ پر ابا نے کوئی ظلم نہیں کیا..... تجھ پر خرچ کر کے پڑھا رہے ہیں اور یہ جو تم مجھے کہہ رہی ہو میں اپنے لیے جیوں..... اپنے لیے جینے کے لیے امنگ کی ضرورت ہوتی ہے..... دل مرگیا ہے، میں اگر نوکری پر نہ آتی تو منہ دھونے کی فرصت ہوتی نہ نوبت ہوتی..... گاؤں میں کوئی بلاوجہ نہاتا دھوتا نہیں..... اچھا اب فون بند کررہی ہوں..... ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں..... بات کرلیا کرو کبھی..... ثانیہ تمہاری آواز نے تازہ ہوا کی کھڑکی کھولی ہے۔''

''ہاں بات کروں گی..... میں تمہیں موبائل خرید کر کسی بھی طرح بھیجوں گی..... اپنا ضرور خیال رکھنا، ثمینہ باجی..... اللہ حافظ.....'' ثمینہ تادیر ثانیہ کی باتوں کو ذہن میں دُہراتی رہی اور خوشی کشید کرتی رہی۔

آج وہ اپنی تنخواہ 11930 روپے وصول کر کے گھر تک پہنچنے کے مختصر وقت تک ان کی ملکیت کی طمانیت محسوس کرتی اپنے دھیان میں کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ سامنے موٹر سائیکل آنے کے سبب اسے کھیت میں اترنا پڑا۔ موٹر سائیکل قریب آئی تو بندہ دیکھا بھالا لگا۔ دوسری نظر میں یاد آگیا۔ ''شہریار جوئیہ۔'' جس نے زبردستی اپنا نام بتایا تھا۔ پہچان کا ایک پل دونوں پر وارد ہوا۔ اس نے رفتار مزید دھیمی کردی۔

''السلام علیکم..... محترمہ ثمینہ۔''

''وعلیکم السلام۔''

''کیسی ہیں آپ؟''

''آپ کی بھابی ٹھیک ہیں؟''

''میری بھی ایک بیٹی ہے میری بھابی کے پاس ہوتی ہے۔''

''آپ کی فیملی ایک جگہ رہتی ہوگی۔''

''جی..... وائف کی ڈیتھ کے بعد.....''

''سن کر افسوس ہوا.....'' اس نے قدم بڑھایا۔

''جی..... پانچ سال ہوگئے۔'' کچھ دیہاتی اسی راستے پر آتے دکھائی دیے۔ ''پھر بات کروں گا.....'' وہ آگے بڑھ گیا۔ ثمینہ کو لمبی بات کرنے پر افسوس ہونے لگا۔ ابھی اور بات کرنے کو کیا ہے مجھے اس کو نظر انداز کرنا ہوگا۔

پھر سے تنخواہ یاد آئی۔ ''شامہ، امامہ کے کپڑے ضروری ہیں بلکہ حاجی بزاز کے ہاں جاتی ہوں، گھر میں گئی تو سارے پیسے مجھ سے اینٹھ لیے جائیں گے۔'' اس کے قدم بازار کی طرف اٹھ گئے۔ حاجی بزاز کی دکان سے موسم کے مطابق بچیوں کے گرم کپڑے کے پیس لیے، سات سو روپے کی سیل والا لینن کا ایک جوڑا اپنے لیے لیا۔ سجو خالہ کے لیے بھی ایک قمیص کا کپڑا لیا ورنہ اس کا مزاج برہم ہوجانا تھا۔ سلائی وہ خود کیا کرتی تھی۔ کیلے اور بچوں کے لیے بسکٹ لیے۔ دیر ہوچکی تھی'

تیز، تیز چلتی گھر پہنچی۔ کل تک جو تم بیزار کرنے والا خاوند دروازے کی دہلیز میں لٹکا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

''اتنی دیر کردی..... کہاں رہ گئی تھیں؟'' آواز میں انتا رعب و دبدبہ گویا اجازت لیے بغیر میلے میں گئی ہو۔

''بتاتی ہوں.....'' وہ اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں شاپر وہ دیکھ چکا تھا۔

''تنخواہ مل گئی.....؟ لاؤ پیسے دو۔ میں نے پرچون والے کے دینے ہیں۔''

''سانس تو لینے دو..... دے دوں گی۔ پرچون والا بھاگا نہیں جارہا۔'' اس نے چادر اتاری..... آواز سن کر سجو اپنے کمرے سے نکلی جملہ کسنے سے اس نے کب باز آنا تھا۔

''اب آرہی ہو ..... مغرب ہونے والی ہے۔'' شامہ دوڑتی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ امامہ پلنگ پر کسمسانے لگی۔ ثانیہ نے شامہ کو کیلا دیا، دو کیلے سجو ماسی کی طرف بڑھائے۔

''میں ذرا حاجی بزاز کے چلی گئی تھی۔ بچیوں کے کپڑے لیر، لیر ہورہے تھے..... یہ لیں آپ کے لیے۔'' سجو، کیلے اور کپڑا پا کر ٹھنڈی ہوگئی مگر مجیدے کو اس کا پیسے خرچ کردینے کا اعتماد آگ لگا رہا تھا۔

''کتنے پیسے پھونک آئی ہو، یہاں اتنے خرچے پڑے ہیں..... تو نے مجھ سے بازار جانے کی اجازت لی تھی..... آج بازار گئی ہو کل بازارِ حسن جاؤ گی۔''

''فضول خرچی نہیں کی..... ضرورت جتنے کپڑے لیے ہیں، بحث نہ بڑھاؤ۔'' پرس کھولتے ہوئے پوچھا۔ ''کتنے دینے ہیں پرچون کے؟''

مجید نے پرس چھین کر بقایا نوٹوں کا رول نکال لیا۔ پرس اچھال کر پلنگ پر ڈالا۔ دو کیلے اٹھائے چھیل کر منہ میں ڈالتا باہر نکل گیا۔

ثمینہ کب تک کس، کس بات پر ماتم کرتی..... اس کے سر میں درد ہورہا تھا۔ وہ بچیوں کو بسکٹ دے کر چائے بنانے چلی گئی۔ چائے لے کر آئی۔ خریدے ہوئے چند کپڑے کھول، کھول کر دیکھتی رہی۔ آنکھوں سے برسات برستی رہی۔ خاموش آنسو آئے چلے جارہے تھے..... کپڑے الماری میں رکھے، پرس کھول کر دیکھا 55 روپے بقایا پڑے تھے اور مہینے کی 2 تاریخ تھی۔

اس کے کمرے کے ساتھ کوٹھری تھی جہاں سے سانپ نکلا تھا جسے اب سفیدی کردیا گیا تھا اس کوٹھری کے آگے چھپر تھا، سوچا آج وہیں چارپائی پر بستر لگالے۔ سردی کی اپنی ذات کے لیے پروا نہ تھی مگر بچیوں نے اس کے پاس آکر سونا تھا۔ ناچار کمرے میں سوئی۔ وہی ہوا جس سے بدک رہی تھی۔ جب ثمینہ نے سختی سے دھکیلا تو منہ سے کباب، پیاز اور سستے نشے کے بھبکے اڑانے لگا۔ وہ غصے میں بیٹھی تھی۔

''خاوند کا حق خاوند کے فرائض کے بعد آتا ہے۔ لاؤ میرا اور بچوں کا خرچہ، نان نفقہ ..... دو کو میرے والدین پال رہے ہیں، دو کو میں پال رہی ہوں..... میری تنخواہ کا ایک، ایک روپیہ چھین کر تم بتانے کے روادار نہیں ہو کہ پیسے کہاں گئے۔''

''(او فحش گالی) موڈ کا ستیا ناس کردیا ہے۔ او (فحش گالی) تجھے چھت دے رکھی ہے۔ عزت سے رہتی ہے، روٹی نہیں ملتی کیا..... بھوکی ننگی پھر رہی ہے..... دفع ہو پرے مر.....'' اس نے اس زور سے کمر میں دھموکا جڑا کہ وہ لڑکھڑا کر بچی پر جا پڑی۔ بچی چیخ کے روئی۔ جسے اٹھا کر وہ بستر سے اتر گئی۔

''مجھے تم سے نفرت ہے مجیدے..... میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔''

''جا ماں کے پاس..... میں نے تجھے طلاق دی۔ نکل جا..... جس سے محبت ہے اس کے پاس جا..... میں بھی اس چخ، چخ سے رج گیا ہوں۔ صورت نہ شکل..... چپی بوتھی.....'' وہ اپنی رضائی اٹھا کر ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ عجب بات یہ ہے کہ اس کے چلے جانے سے ثمینہ کو سکون مل گیا۔ وہ کمرا اندر سے بند کرکے آرام سے سوگئی۔

اختتامی حصہ اگلے ماہ

عورت اور قفل

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار **فرحین اظفر** نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

''آج بہت دن کے بعد ابا میاں کی طرف جانا ہوا۔ کاشفہ بلا رہی تھی کئی دن سے.....'' صائمہ نے رات سونے سے پہلے کے ضروری کام نمٹاتے ہوئے شوہر سے بات شروع کی۔

''اچھا پھر.....'' انہوں نے موبائل پر چلتی نیوز ویڈیو روک کر اسے دیکھا۔

وہ مسکرادی۔ اسے اپنے شوہر کی یہ توجہ دینے والی عادت بہت پسند تھی۔

''پھر کیا..... وہی پرانی روٹین چل رہی تھی۔ پتا نہیں کب کب کے اخبار نکالے ہوئے تھے۔ ترتیب سے لگوا رہے تھے۔ لائٹ تھی نہیں..... اور کشو۔ بیچاری پسینہ، پسینہ ہوئی ایک، ایک تاریخ دیکھ رہی تھی۔''

حامد ایک ہنکارے کے ساتھ ہلکے سے ہنسے۔

''ارے..... آپ کو ہنسی آرہی ہے۔ اس بیچاری پر ترس آرہا ہے۔ پتا نہیں کس کام سے بلایا تھا اس نے مجھے۔ بات تک کرنے کا ٹائم نہیں ملا۔ پہلے اس سے یہ کام کرواتے رہے۔ اتنا نہیں ہوا کہ کشو کو دو گھڑی میرے پاس بیٹھنے دیتے۔ پھر اسے اٹھا کر ستو بنانے پر لگا دیا۔ جب تک میں بیٹھی، لائٹ تو آئی نہیں۔ اس پر ستم اور تھا کہ چنے کی دال چڑھی ہوئی تھی۔ حلوا بن رہا تھا بھئی.....''

صائمہ کی آواز میں اچھی خاصی جلن تھی۔

''آدھے پون گھنٹے میں میری بس ہوگئی۔ میں تو آگئی۔ کشو کو کہہ دیا کوئی ضروری بات ہے تو گھر آ کے کرو۔ یہاں تو بات ہی نہیں ہوسکتی۔''

''کیا بات کرنی ہوگی اسے.....؟''

''پتا نہیں..... ہوسکتا ہے ویسے ہی دل ہلکا کرنے کو بات کرنا چاہ رہی ہو.....'' صائمہ لیٹ چکی تھی۔ دن بھر کے کام اور مصروفیات نے اس پر نیند کا غلبہ طاری کر دیا تھا۔ اب اس کی آواز میں وہ بات کے آغاز والی دلچسپی کے بجائے غنودگی بسی ہوئی تھی۔

حامد نے ہنکارا بھرا۔ وہ پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہونا چاہ رہے تھے..... جب ہی نیند میں جاتی صائمہ ایک دم ہی چونک کے ہوشیار ہوگئی۔

''ارے وہ..... عابد کے لیے لڑکی ملی یا نہیں.....؟''

''ابھی تک تو نہیں۔''

''تو پھر کاشفہ کیسی رہے گی۔'' وہ ایکسائٹمنٹ کی وجہ سے پہلو کے بل ذرا سی اونچی ہوگئی۔

عابد، حامد کا دوست تھا۔ ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ وہ اچھی بھلی عادتوں کا مالک خوش مزاج اور خوش شکل لڑکا تھا۔ لیکن نصیب سے مار کھا گیا کہ شادی ہوئی تو بیوی بے حد خوب صورت لیکن بدسیرت نکلی۔ حد سے زیادہ جھگڑالو، بدزبان اور سسرال والے، دل بھر کے لالچی نکلے۔ اسی دوران ایک بیٹا بھی ہوگیا۔ اس نے حتی الامکان کوشش کی کہ کسی طرح نبھ جائے لیکن کسی صورت بات بن کے نہ دی۔ چارو ناچار اس کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے حامد نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ اس عورت کو طلاق دو اور اللہ کا نام لے کے دوسرا گھر بساؤ..... دل پر پتھر رکھ کے اس نے بیوی کو طلاق دی ورنہ وہ بچے کی وجہ سے ایسا چاہتا نہیں تھا یہی اس کی شرافت تھی کہ اس نے کئی سال ایک بدزبان اور جھگڑالو بیوی کو صرف اولاد کی خاطر برداشت کیا لیکن ہوا کیا کہ وہ جو کورٹ کچہری کا سوچ کے گھبرا رہا تھا کہ بیوی یقیناً بیٹے کو مانگنے کے لیے کیس ویس کرے گی۔ اس نے بچے کا نام تک نہیں لیا۔ بلکہ صاف الفاظ میں اس کے منہ پر مار کے چلی گئی۔

صائمہ کو جب بھی وہ وقت یاد آتا۔ اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں جب ایک رات کے لیے اسے بچے کو اپنے پاس رکھنا پڑا تھا اور وہ دو سالہ بچہ بلک، بلک کے ماں کے پاس جانے کی ضد کرتا رہا تھا۔ آدھی رات کو رو، رو کے نڈھال ہونے کے بعد کہیں اس کی آنکھ لگی تو سوتے میں بھی سسکیاں لیتا رہا تھا۔

''کاشفہ.....!''

حامد اسے خیالوں سے نکال کے خود سوچ میں ڈوب گئے۔

''کیا سوچنے لگے۔ ایک دم پرفیکٹ رہے گی۔ کشو کے لیے بھی اب کنوارے لڑکے کا ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اٹھائیس سے بھی اوپر کی ہو رہی ہے۔ شکل صورت بھی بس عام سی ہی ہے اور اب آہستہ، آہستہ بالکل ہی عورت جیسی ہو رہی ہے.....''

حامد بولے تو کچھ نہیں لیکن ان کے چہرے پر رضامندی کے تاثرات تھے۔ صائمہ باقی باتیں صبح پر ڈال کر سونے کے لیے دوبارہ لیٹ گئی۔

☆☆☆

''آئیڈیا برا نہیں ہے۔ اگر ابا میاں مان جائیں

تو.....'' حامد نے ناشتا کرتے ہوئے خود ہی بات شروع کی۔

صائمہ کو اندازہ ہوا، حامد کو اس کی تجویز پسند آئی تھی۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔ ابا میاں سے بات کرے گا کون؟''

''جی..... بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔''

اس کی ہنسی نکل گئی۔

''بلی یا بلے..... بلکہ باگڑ بلے کے.....'' حامد کو گھورتا ہوا دیکھ کر وہ بات ادھوری چھوڑ کے ہنسنا شروع ہوگئی۔

حامد بھی زیرلب مسکرانے لگے۔

وہ کشو کی شادی کا سوچ کر بڑی ایکسائٹڈ ہوگئی تھی۔ شکل، صورت تو خدا کی دین ہے لیکن کشو ایک بے حد.... تمیز دار اور فرمانبردار لڑکی تھی۔ انتہا کی صابر اور شاکر..... ابا میاں جیسے شخص کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس کے لہجے کی نرمی اور سکون کمال کا تھا۔

ابا میاں بھی اپنی نوعیت کے انوکھے اور اکلوتے انسان ثابت ہوئے تھے۔ رشتے میں حامد کے تایا لگتے تھے۔ تائی امی اللہ کو پیاری ہوچکی تھیں غصے اور وقت بے وقت کسی بھی بات پر بھڑک اٹھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جب جس وقت ان کا دل چاہتا کسی کو بھی بے عزت کرنا اپنا ازلی حق سمجھتے تھے۔

خاندان کے صرف چند ایک لوگ ہی تھے جو اُن کی بزرگی کا خیال کرکے ان سے ملتے جلتے تھے۔ باقی سب کو انہوں نے اپنی ہی عادت کی وجہ سے خود سے دور کردیا تھا۔ بیٹے تھے، بہوئیں تھیں، بیٹیاں، داماد بھی تھے۔ کبھی کسی نے بھی بڑھاپے میں ان کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا۔ ایک ان کی تلخ کلامی اور دوسرے بے تکی فضول خرچی وہ عادات بد تھیں۔ جن کی وجہ سے نہ صرف بیٹے اپنی، اپنی بیویوں کو لے کے الگ ہوگئے۔ چاہے دو، دو کمروں کے بند فلیٹوں میں رہنا پڑا لیکن انہوں نے وہ گوارا کرلیا لیکن اس گھر کے الجھے ہوئے ماحول سے دامن پکڑ کر بھاگ نکلے..... بلکہ بیٹیاں بھی کبھی، کبھی ہی جھانکتی تھیں۔

اب ان کی واحد اولاد صرف کشو ہی ان کے ساتھ تھی۔ جو مناسب وقت پر اچھا رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے اب تک گھر بیٹھی ہوئی تھی یا پھر اُن کا ایک پرانا نمک خوار ملازم جو کبھی، کبھی گھر کا کوئی کام کرنے آجاتا تھا۔ ہر فن مولا آدمی تھا۔ الیکٹریشن سے لے کے پلمبر تک سارے کام اس کو آتے تھے۔ اور بقول خود اس کے، یہ سب اسے ابا میاں نے ہی سکھایا تھا۔ احسان فراموش نہیں تھا اس لیے اب تک ان کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ ورنہ اس ہوش ربا مہنگائی کے دور میں گزارہ کرنا ایک تنخواہ دار آدمی کے لیے ہی... ناممکن تھا تو ابا میاں کہاں سے یہ ایکسٹرا خرچے بھگتتے۔

کبھی صائمہ سوچتی تھی کہ جب کشو کی شادی ہو جائے گی تو پھر ابا میاں کے ساتھ کون رہے گا.....

خیر یہ تو بعد کی بات تھی۔ ابھی تو مسئلہ اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کا تھا۔ اور اب یہ مسئلہ بھی تقریباً حل ہونے والا تھا۔ کیونکہ عابد جیسے اچھے اور شریف آدمی کا رشتہ اچانک ہی اسے مل گیا تھا۔ جیسے بیٹھے بٹھائے اللہ نے کشو کے لیے فرشتہ بھیج دیا تھا۔

عابد کو اب شکل صورت سے زیادہ سیرت سے سروکار تھا۔ اور کشو اس کے بتائے ہوئے سانچے میں بالکل فٹ بیٹھتی تھی۔

وہ اتنی اکسائٹڈ ہوگئی کہ شام تک اس نے بارات، ولیمے میں پہننے والے کپڑوں کا بجٹ بھی سوچ لیا اور اس کے بندوبست کے لیے حامد کی واپسی تک ہلکان بھی ہوگئی۔

''کیا ہوا؟ عابد سے بات کی آپ نے؟'' پانی کا گلاس پکڑاتے ہی اس نے بے چینی کو زبان دے دی۔

''کرلی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں.....''

''ارے تو مجھے تو بتایا ہوتا میں کشو سے تصویر مانگ کر اسی وقت آپ کو دے دیتی ناں..... آپ اسے دکھا دیتے تو اس کی پسند بھی ہوجاتی۔''

حامد ہنس پڑے۔

''تم اس قدر جلدی میں کیوں ہو ابھی ابا میاں سے بات تو کرلینے دو۔ دیکھو تو سہی وہ کیا کہتے ہیں۔''

صائمہ نے پہلو بدلا۔

''اصل مسئلہ اُن ہی کا تو ہے۔''

''آج ویسے بھی اس سے کوئی زیادہ بات نہیں ہو

سکی۔ میں پہلے اس کو ابا میاں کا مزاج تو بتا دوں تاکہ وہ جب بھی وہاں جائے تو سوچ سمجھ کے بات کرے۔ ایسا نہ ہو کہ ابا میاں تو اپنے انداز میں کچھ بھی کہہ جائیں اور اس کو برا لگ جائے۔''

صائمہ نے گہری سانس لے کے خود کو پُرسکون کیا۔

''آپ کیا کہتے ہیں... میں جا کے ابا میاں کو اس کے بارے میں بتا دوں کیا۔ پھر وہ جو بھی فیصلہ کریں۔''

''نہیں ابھی نہیں۔ پہلے ان کو عابد سے مل لینے دو۔ اگر وہ ان کو پسند آ گیا تو وہ اس کا ماضی نظر انداز کر دیں گے۔ اگر پہلے سے ہی کوئی کجی اُن کے سامنے رکھ دی تو ہو سکتا ہے دیگر خوبیوں پر ان کی نظر جائے ہی نہیں۔

وہ دل ہی دل میں شوہر کی فراست کی قائل ہو گئی۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب حامد نے جا کے ابا میاں سے عابد اور کشو کے رشتے کی بات کی۔

''کیا کرتا ہے لڑکا؟''

''میرے ساتھ ہی آفس میں ہوتا ہے۔''

پہلا سوال آیا تھا۔ جواب تسلی بخش تھا لیکن ابا میاں کے لیے نہیں۔

''یہ بات بعض اوقات بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ دو بہنوئی آفس میں ساتھ، ساتھ ہوں تو مقابلے بازی گھر تک آ جاتی ہے..... ہمارے آفس میں ایک صاحب ہوتے تھے.....'' ان کی بات جس قدر بے تکی تھی۔ اس پر صائمہ فی الحال صرف جز بز ہی ہو سکتی تھی۔

ان کا قصہ شروع ہو چکا تھا۔ مزید کچھ پوچھنے بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی..... اپنی طویل قصہ گوئی سے فارغ ہو کر انہوں نے تنخواہ پر غیر اطمینانی کا اظہار کیا اور بات فارغ.....

''عجیب آدمی ہیں..... بیٹی کی عمر نکلی جا رہی ہے ان کو کوئی فکر ہی نہیں۔ آپ..... جا کے عارف بھائی سے بات کریں ان کو سمجھائیں۔ اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے اور کیا چاہیے۔''

حامد کے چہرے پر بھی تشویش کی لہر تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ بیٹی کے باپ ہوتے ہوئے اس قدر بے پروائی ان کو بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

''اونہہ..... ایک سے ایک نمونہ دیکھا ہوگا د... میں..... لیکن ان کا اپنا ہی لیول ہے۔'' گھر آنے تک صائمہ بڑبڑ کرتی رہی..... اس بات پر بچے بھی کھی، کھی کرنے لگے..... تو ان کو ایک گھوری لگائی۔

''قاری صاحب نہیں آئے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم لوگ آج قرآن نہیں پڑھو گے..... جاؤ اب کے پچھلا سبق دُہراؤ.....'' اس نے بچوں کو چلتا کیا پھر منتظر نظروں سے حامد کو دیکھنے لگی۔

''کرتا ہوں بات..... مجھے لگتا ہے ہم فالتو میں کوشش کر رہے ہیں..... ابا میاں کا موڈ نہیں لگتا۔'' ان کے انداز میں عجیب تاسف بھرا تھا۔ جس کو محسوس کر کے صائمہ اور تپ گئی۔

''یہ کسی کی زندگی کا معاملہ ہے کوئی شاپنگ یا فلم نہیں کہ دیکھنے کا موڈ نہیں، کرنے کا موڈ نہیں۔''

حامد چپ رہے۔ وہ زبان سے صائمہ کی تائید کر کے اسے اور غصہ دلانا نہیں چاہتے تھے۔

''اور وہ بھی اپنی سگی اولاد..... کوئی غیر بھی نہیں۔''

ابھی صائمہ کچھ اور بھی کہتی لیکن اسے احساس ہو گیا کہ وہ غلط جگہ بول بول کے اپنے آپ کو ہی تھکا رہی ہے۔ حامد اس کے حامی تھے لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے اور جن کو کرنا تھا وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆

بیٹے، بہوؤں نے زور ڈالا۔ ان کو پتا نہیں کیا کہا کیا نہیں لیکن ابا میاں کے رضامند ہونے سے پہلے ہی حامد اپنے تایا زاد بھائی اور ابا میاں کے بڑے بیٹے یعنی عارف بھائی کو ساتھ لے جا کر عابد سے ملوا لائے۔ عارف بھائی کو بھی عابد بہت پسند آیا۔ وہ تھا ہی اچھی عادات کا مالک..... اگر ایک شادی ناکام ہو ہی گئی تھی تو ضروری تو نہیں تھا کہ دوسری بھی ناکام ہو جاتی یا ضرور عابد میں ہی کوئی کمی خامی ہوتی۔ اس کی عادتوں کے تو خود حامد گواہ تھے۔ اس کی ناکام ازدواجی زندگی کا ہر پہلو اور پھر ساتھ میں کام کرنے کی وجہ سے اس کی سب عادتوں

سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔

عابد اپنی والدہ اور بہن کو بھیجنا چاہتا تھا لیکن ابا میاں کی رضامندی کے بعد ان ہی کے حکم پر ان کے ساتھ ہی آ گیا۔

''ایسا کہاں ہوتا ہے کہ لڑکا پہلے ہی دن بردکھوے کے لیے چل پڑے۔'' صائمہ پتا نہیں کیوں جز بز ہو رہی تھی۔ اس نے شاید بھانپ لیا تھا کہ عابد کی امی اور بہن کو یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔

''اوفوہ بھئی ان کی مرضی۔ بعد میں بھی تو جائے گا ناں تو اچھا ہی ہے پہلے ہی چلا چلے۔ اب تم خواہ مخواہ کی پخ نہ لگاؤ۔ بس شکر کرو ان کو خیال تو آیا۔''

حامد کی بات اپنی جگہ ٹھیک تھی۔

حسب توقع مہمانوں کی تواضع کے لیے اتنے انواع واقسام کے اسنیکس اور پھل منگوا لیے گئے تھے کہ عجیب لگ رہا تھا۔

''آج کل تو لوگ صرف کولڈ ڈرنک یا چائے پر ٹرخانے لگے ہیں اور ان کو دیکھو جیسے بڑی ملیں چل رہی ہیں۔''

چپس، بسکٹ، سموسے، پیسٹریاں، پھل اور مٹھائی دیکھ کے صائمہ کی جان جل گئی۔

''یا تو بلانے کے روادار نہیں تھے اور اب ایسے جیسے رشتہ پکا ہو گیا ہو..... پتا نہیں کب ابا میاں کو.....''

چائے کی ٹرے لاتی ہوئی کشو کو دیکھ کر صائمہ کی سوچ ادھوری رہ گئی۔ کشو آج معمول سے کچھ بہتر حلیے میں تھی۔ نیا لان کا جوڑا، نازک جیولری اور ہلکا پھلکا میک اپ یقیناً اس کی بھابی کی نوازش تھا۔ جن کو لڑ لڑ کر ناک میں دم کر کے ابا میاں نے ہی گھر سے نکالا تھا۔ اور اب شکوہ کرتے تھے کہ ان کے بیٹے ان کے ساتھ نہیں رہے۔

''السلام علیکم۔'' دھیرے سے سلام کر کے جب اس نے ٹرے سامنے رکھی۔ تو اس سے اس کا چہرہ بہت سادہ اور معصوم سا لگا۔

عابد کے ساتھ اس کے جوڑ کو سوچ کے صائمہ کو اس پر بے اختیار پیار آیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ کمرے سے اٹھ کر اس کے پاس کچن میں چلی آئی۔

''نوشے میاں بھی آئے ہیں ساتھ..... کہو تو ایک ملاقات کروا دوں۔''

اس نے سرگوشی میں کشو کو چھیڑا۔

وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

''آؤ ناں..... وہ سامنے ہی بیٹھا ہے۔ ذرا سا پردہ ہٹا کے پہلے میں جھانکوں گی بعد میں تم دیکھ لینا.....''

مرد حضرات الگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ اس لیے اس نے یہ آفر کی تھی۔

''نہیں نہیں۔ بھابی..... پلیز..... ابا میاں کو پتا چل گیا۔ یا ان ہی کی نظر پڑ گئی تو کتنا برا ہوگا۔'' وہ ایک دم گھبرا کے سرخ ہو گئی۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا ڈرپوک۔ تم نے تو تصویر تک نہیں دیکھی۔ آؤ ناں.....''

صائمہ اس کو نہ نہ کرتے، کرتے بھی ڈرائنگ روم کے دروازے تک لے گئی جہاں پردہ پڑا ہوا تھا۔

تمھیں ہم یاد کرتے ہیں

مجھے شہرت ملی ایسی
کہ اب میرے مقدر کے ستارے رقص کرتے ہیں
جنوں کی آخری حد تک مسلسل زندگی
لشکر کی صورت بین کرتی ہے
زمیں پر آدمیت کے کئی قاتل
کسی کے خون کے پیاسے مری شہرت سے جلتے ہیں
مرے حرفوں میں چاہت کے ثمر زندہ بھی رہتے ہیں
مرے لفظوں کی رگ رگ میں
تمہاری یاد کے موسم بکھرتے ہیں
کہیں دل کا نگر آباد کرتے ہیں
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں

کلام: فریدہ جاوید فری یوسفزئی، لاہور

پہلے چپکے سے جھری بنا کے خود جھانکا۔ پھر اسے ہلکا سا دھکا دیا۔

کاشفہ نے جھکے، جھکے سر کے ساتھ بس لمحے بھر کو نگاہ اٹھائی اور فوراً ہی سر جھکا کے ہٹ گئی۔

ایک نظر صائمہ کو دیکھ کے خاموشی سے کچن میں واپس آ گئی۔

صائمہ نے بڑے غور سے اس کا چہرہ کھوجا۔ جہاں دبی، دبی مسکراہٹ اس کی پسندیدگی کی گواہی دے رہی تھی۔ رخسار دہک رہے تھے۔ یعنی عابد اسے بھی پسند آیا تھا۔ عابد کی والدہ اور بہن بھی تقریباً رضامند تھیں۔

صائمہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا.....

''کیسا لگا..... اچھا ہے ناں؟''

کشو نے کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا لیا.....

''جوابا میاں کہیں.....''

صائمہ کے لیے اس کا جواب خلافِ توقع نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی فرمانبرداری اور ابا میاں کی خوش قسمتی پر اس کا دل جھوم گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے ابا میاں کی رضامندی کے آگے عابد کی پہلی شادی کا مسئلہ ایک پہاڑ بن کے کھڑا تھا۔

ابھی اس بارے میں تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

اس نے صدقِ دل سے کاشفہ کے اچھے مستقبل کے لیے دعا مانگی۔

اچانک ہی مہمانوں کی واپسی کا اعلان ہو گیا۔ وہ لوگ کیونکہ عابد کی فیملی کے ساتھ ہی آئے تھے اس لیے صائمہ نے سوچا کہ ساتھ ہی واپسی ہو گی۔ گاڑیاں الگ الگ تھیں لیکن پھر بھی، گھر پر بچے اکیلے تھے۔ اسے بھی جلدی ہی جانا تھا لیکن حامد نے کچن میں آ کر اسے روک دیا۔

ان کے چہرے کی سنجیدگی دیکھتے ہی صائمہ کو ہول اٹھنے لگے۔ کچھ نہ کچھ غلط ہوا تھا۔ یا وقت سے پہلے وہ کچھ ہوا جو ابھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس نے پلٹ کر کشو کا چہرہ دیکھا۔ سنجیدہ سی آنکھوں میں کہیں نہ کہیں کچھ دیر پہلے کی حیا آمیز سرخی ابھی باقی تھی۔ اس کی جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے آثار دلی رضامندی کو پکار رہے تھے۔

اس نے باہر جا کے مہمانوں کو رخصت کیا۔ وہاں بھی غیر معمولی سنجیدگی ہر ایک کے چہرے پر لکھی نظر آئی۔

ابا میاں اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ جہاں سے عابد کی والدہ اور بہن اٹھ کے گئی تھیں۔ انہوں نے مہمانوں کے لیے دروازے تک آ کے خدا حافظ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ صائمہ کے دل کو پنکھے سے لگ گئے۔ دھڑک، دھڑک کے کسی بری خبر کا راگ الاپنے لگا۔

اور خبر تھی بھی بری ہی.....

ابا میاں نے عابد کی پہلی شادی کا سن کر فی الفور انکار کر دیا۔ مزید کوئی بات سنی ہی نہیں اور اب بڑے جلال اور غصے سے اپنے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، جیسے حامد اور عارف کے اندر آنے کے ہی منتظر تھے۔

حامد اور عارف تھکے، تھکے قدموں سے ان کے کمرے میں داخل ہوئے، اور خاموشی سے ان کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے.....

''چائے بنواؤں اگر آپ لوگ.....'' صائمہ کے منہ سے گھبراہٹ میں ایک بہت بے تکی بات نکل گئی۔ ابھی، ابھی تو سب نے چائے پی تھی۔

''رہنے دو جی.....'' ان کا مخصوص دھتکار آمیز لہجہ اس کے سامنے تھا۔

''عارف..... گھر جاؤ تم بچے اکیلے ہوں گے.....''

صاف اشارہ تھا کہ حامد اور صائمہ بھی اب گھر کی راہ لیں۔

اس نے عارف بھائی کی بیگم کی طرف دیکھا۔ جو لوازمات سمیٹنے میں کشو کی مدد کرنے کے بعد ابھی، ابھی اندر آئی تھیں۔

وہ بھی نظریں نہیں ملا رہی تھیں۔

''آپ دیکھ لیں ابا..... لڑکا تو اچھا ہے.....''

عارف بھائی کے منہ سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی..... اور ابا میاں کی توپ کے منہ میں پھنسے گولے کو کسی نے داغ دیا۔

''کیا اچھا ہے اس میں۔ رنڈوا، دوہاجو..... ایک بیوی کو فارغ کر چکا..... بچے کا باپ..... اتنی سی تنخواہ، اپنی اولاد کو کھلائے گا یا میری بیٹی کو.....''

صائمہ اور بھابی کا منہ کھلا رہ گیا۔ یہ دنیا کی آخری بے ڈھنگی بات ہوتی اگر وہ اس کا تصور بھی کر سکتی ہوتیں تو۔

''پہلے بھی بیوی، بچے دونوں کا ہی پورا کرتا تھا......'' حامد نے منمنا کے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''تو پھر علیحدگی کیوں ہوئی......''

صائمہ کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ عارف بھائی کی بیگم ان تماشوں کی عادی بھی تھیں اور ان سے بیزار بھی۔ اس لیے فوراً باہر نکل گئیں۔ غالباً کشو کو بتانے کہ آنے والا رشتہ تمہارے ابا میاں کے اونچے معیار کے مطابق نہیں تھا۔

''وہ تو خود ہی ایسی عادتوں کی......''

''ارے رہنے دو جی......سب دوسروں کی غلطی بتاتے ہیں۔ اپنا عیب کون دکھاتا ہے۔ اس کا بھی کچھ نہ کچھ قصور تو ہوگا ناں۔ یا یہ بالکل ہی دودھ کے دھلے تھے۔ اور تم عارف میاں......تم بھی بالکل ہی بوڑم نکلے تمہیں پہلے سے پتا تھا اس بات کا تو مجھے بجائے بتانے کے منہ اٹھا کے لے کے چلے آئے گھر......میری بیٹی ابھی کنواری ہے......تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ کسی رنڈوے کا رشتہ لے کر آؤ......میرے ساتھ رہتی ہے۔ اچھی بھلی زندگی ہے۔ تم پر بوجھ تو نہیں، جو سر سے اتار پھینکنے کی جلدی ہو......''

عارف بھائی کچھ کہنے کے بجائے گہری سانس بھر کے رہ گئے۔

یہی وہ باتیں اور ہٹ دھرمی تھی۔ اپنے اصول اور نظریات وہ بھی غلط جن کو زندگی بھر ٹھونک بجا کے صحیح گردانتے رہے اور اب بھی کسی کی سننے کو تیار نہیں تھے۔

''کوئی یتیم، لاوارث ہے کیا وہ......جو جس کا دل کرے، جو بھی منہ اٹھا کے ہاتھ مانگنے آجائے اس کے پلے باندھ دوں میں......!''

کمرے میں ایک ناگوار خاموشی پھیل گئی۔ صائمہ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ ابا میاں کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ کشو بھی یقیناً سن رہی ہوگی۔

صائمہ آہستگی سے باہر نکل کے کچن میں آئی۔ بھابی وہاں نہیں تھیں۔ وہ اکیلی ہی کچن میں برتن دھو رہی تھی۔

''سن رہی ہو اپنے ابا کی باتیں......'' وہ نظر جھکا کے کام میں لگی رہی۔

''کشو......تمہاری اپنی بھی تو کوئی مرضی ہوگی......مجھے بتاؤ......اگر تم ایک بار ہاں کر دو تو شاید......''

اس نیم مایوسی سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہیں بھابی......ابا میاں کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔'' اس نے دھیمی سی آواز میں اپنی بات کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

صائمہ کو پتا تھا۔ وہ یہی کہے گی۔ اسے یہی کہنا تھا۔ وہ فرمانبرداری میں اپنے سب بہن بھائیوں سے آگے تھی اور جذباتیت میں بھی۔

صائمہ نے بچوں کا کہہ کر حامد کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہاں سے نکلتے سے اس نے کشو پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ کچھ دیر پہلے تک سرخی سے چمکتا ہوا گندمی رنگ سنولا گیا تھا۔ سلیقے سے بنے ہوئے بال پریشان تھے اور سیدھی مانگ میں سے دو چاندی جیسے تار جھلملاہٹ دینے لگے تھے۔ ایک دم سے بالکل اچانک ہی......

اس کے دل پر آنے والے کئی دنوں تک اوس گرتی رہی۔

☆☆☆

عابد اور اس کے گھر والے اچھے شریف لوگ تھے۔ انہیں کوئی اور لڑکی مل گئی۔ انہوں نے اس کی وہاں شادی کر دی۔

صائمہ بھی گھر کی مصروفیات میں گم ہوگئی۔ سب کی زندگیاں دھیرے، دھیرے آگے بڑھتی گئیں سوائے ابا میاں اور کشو کے۔

حامد نے تو اس دن کے بعد سے توبہ ہی کر لی کہ کبھی کشو کے معاملے میں کچھ کہیں......

اڑتی، اڑتی سنی تھی کہ ایک آدھ جگہ سے اور بھی رشتہ آیا تو ابا میاں نے اس کو بھی کوئی نقص نکال کے رد کر دیا۔

پتا نہیں وہ کس دنیا اور کس خیال میں تھے۔ یا اپنی بیٹی کو اور خود کو کیا سمجھتے تھے کہ ان کو کوئی بندہ اپنے معیار پر اترتا ہوا لگتا ہی نہیں تھا۔

رفتہ، رفتہ وقت گزرتا رہا۔ کشو کے رشتے آنے بالکل ہی بند ہو گئے۔

اور ایک دن بالکل آہستگی اور اچانک سے ابا میاں نے بھی اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں..... جاتے، جاتے وہ اپنا گھر کشو کے نام کر گئے۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

پینتیس کو پار کرتی ہوئی کشو کو مرد کے سہارے کی ضرورت تھی۔ دلی، جذباتی اور جسمانی ہر لحاظ سے..... ناں کہ ان بے جان در و دیوار کی..... وہ اکیلی ان دیواروں سے کیا سر پھوڑتی۔

ابا میاں کے چہلم سے پہلے ہی گھر کو کرائے پر دے کے کشو کی آئندہ رہائش کی چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔

پورے گھر میں بچوں کو برابر کا حصہ دینے کے بجائے صرف کشو کے نام کرنے پر سب بہن بھائی کشو سے ناراض تھے حالانکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اسی لیے اب وہاں اس گھر میں آ کے کوئی رہنے کو بھی تیار نہ تھا۔ کچھ گھر کی حالت بھی خراب تھی اور چونکہ اب وہ کشو کی ملکیت تھا اس لیے اس میں کوئی پیسہ لگانے کو بھی تیار نہ تھا۔

سب ہی اپنی، اپنی جگہ خاموش لیکن منتظر تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے، دیکھیں۔

کشو کو ایک مستقل خاموشی لگی ہوئی تھی۔ سب اسی خاموشی کے ٹوٹنے کے انتظار میں تھے۔ اور جب یہ خاموشی ٹوٹی تو اتنے زور کے دھماکے کے ساتھ کہ صائمہ کے تو اعصاب ہل کے رہ گئے۔

کشو نے افضال سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی تھی اور افضال کون تھا۔ وہی ابا میاں کا پرانا ملازم..... سینتالیس سال کا، معمولی شکل صورت اور اس سے بھی معمولی ترین ہوائی روزی کمانے والا شخص۔

ابھی ابا میاں کا چالیسواں بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک دن عارف بھائی نے فون پر گھبرائے ہوئے سے انداز میں یہ خبر سنائی۔

حامد اور صائمہ دونوں ہی سن کے سکتے میں چلے گئے۔

☆☆☆

آٹھ سال گزر چکے ہیں..... کشو آج بھی اسی گھر میں اپنے اسی شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ دو بچوں کے ساتھ جو افضال کی پہلی بیوی سے تھے۔ دوسرے بچے کی پیدائش کے کچھ دن کے بعد، وہ کسی بیماری میں چل بسی تھی۔

افضال اب بھی ہوائی روزی کماتا ہے کیونکہ پڑھا لکھا نہیں۔ ہنرمند ہے تو کبھی کمائی ہوتی ہے کبھی کام نہیں ملتا۔ ان دنوں کشو سلائیاں کرتی ہے۔ جب حالات بہتر ہوں تو چھوڑ دیتی ہے۔ افضال برا نہیں لیکن بہت اچھا بھی نہیں..... کشو پریشان نہیں تو بہت خوش بھی نہیں۔

دوسری طرف عابد ہے۔ جواب تین بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ مسلسل محنت اور آفس میں ترقی کی بدولت حالات بہت اچھے ہو چکے ہیں۔ اپنی گاڑی لے چکا ہے۔ فلیٹ کی قسطیں بھر رہا ہے۔ بہت جلد اپنے گھر کا بھی مالک ہوگا۔ اس کی بیوی کا دلی سکون اور اطمینان اس کی ہنسی اور باتوں سے جھلکتا ہے۔

صائمہ جب بھی اس کو کھلکھلاتے دیکھتی ہے تو سوچتی ضرور ہے۔

"کاش ابا میاں نے اس قدر عاقبت نا اندیشی سے کام نہ لیا ہوتا تو ان کی پیاری، فرمانبردار بیٹی جو ہر بات میں ان کی مرضی کو مقدم رکھتی تھی۔ آج کتنی بہتر زندگی گزار رہی ہوتی۔"

وقت پر فیصلہ کرتے تو شاید اسے بھی یوں ان کے جانے کے بعد اتنی عجلت میں ایسا فیصلہ نہ کرنا پڑتا۔

وہ اکیلی تھی اور ابا میاں کے بعد بے سہارا سی ہو گئی تھی۔ ابا میاں کی اچانک موت نے اسے لامتناہی اندھیروں میں دھکیل دیا تھا۔ جبھی اسے جو پہلا ہاتھ نظر آیا اس نے اندھوں کی طرح تھام لیا کہ اب کسی جانب سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

زندگی میں کبھی کبھی ہمارے اپنے، ہمارے پیارے ہی ہماری زندگی پر قدغن لگا دیتے ہیں۔ آزادی کو قید کر لیتے ہیں اور جذبات پر قفل لگا دیتے ہیں۔

❁❁❁

بے نام مسافتیں

پروین عزر اتشنہ

وہ اور دونوں بھائی زاہد اور عابد اپنی دادی پر پڑے تھے۔ ان کی ہی طرح لمبے، دبلے، پتلے اور سانولے، اگرچہ اس کے نقوش سب سے خوب صورت تھے لیکن رنگ کی وجہ سے دب کر رہ گئے تھے۔ پھر بھی بڑی، بڑی پُرکشش آنکھیں اور گھنے سیاہ بال ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتے تھے۔ باقی چاروں بہنیں امی کی طرح گوری چٹی اور گول مٹول تھیں، دادی تو جب تک حیات رہیں وہی ان کی چہیتی

پوتی تھی۔ جب اس نے گریجویشن کیا اس وقت تک اس کی دونوں بڑی بہنیں فاطمہ اور صبیحہ بیاہ گھر سدھار چکی تھیں، اب اسی کا نمبر تھا اسی لیے امی نے اسے سمجھایا کہ اب وہ پڑھائی چھوڑ کر گھر داری کی طرف توجہ دے اور کچھ اپنے اوپر بھی۔ لیکن اس کا ارادہ تو آگے پڑھنے کا تھا اس لیے اس نے پڑھائی چھوڑنے سے انکار کر دیا، البتہ گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ ضرور بٹانے لگی تھی۔ اب اس کے لیے بھی رشتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جب بھی لوگ اسے دیکھنے آتے وہ حسبِ روایت تیار ہو کر سر پر آنچل ڈالے انواع و اقسام کی چیزوں سے لدی ٹرالی دھکیلتی شرماتی، لجاتی ان کے سامنے پیش ہو جاتی، جو اسے مختلف زاویوں سے گھور رہے ہوتے، کچھ رشتے تو ایسے گھٹیا ہوتے کہ انہیں ریجیکٹ کرنا پڑتا اور کچھ معقول رشتے خاموشی سے واپس چلے جاتے اور لوٹ کر نہ آتے۔

رشتے تو اسی تسلسل سے آرہے تھے لیکن رفتہ، رفتہ وہ خود آئے دن کی بے مقصد نمائش سے بیزار ہوتی جارہی تھی لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بار اسے امی کی خواہش کے پیشِ نظر ہر نئے آنے والے مہمانوں کے سامنے مسکراتے ہوئے جانا پڑتا پھر یہ ہونے لگا کہ جو لوگ اسے دیکھنے آتے وہ اس کے بجائے چھوٹی بہنوں مہر یا افروز کو پسند کر لیتے تو امی بات ختم کر دیتیں کیونکہ ابھی مہر میٹرک اور افروز نائنتھ میں پڑھ رہی تھیں۔

''اتنی چھوٹی عمر میں تو ہم ان کی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے ابھی تو ہم نے شہزا کی شادی کا ارادہ کیا ہے۔'' امی بڑے رسان سے کہتیں۔

''لیکن ہمیں تو گوری بہو چاہیے آپ کی شہزا کا رنگ تو کافی پکا ہے۔'' وہ اپنے کالے رنگ کی پروا کیے بغیر بڑی نخوت سے کہتیں تو امی کو غصہ تو بہت آتا لیکن خاموش رہ جاتیں، اب وہ شہزا کے لیے پریشان رہنے لگی تھیں کیونکہ فاطمہ اور صبیحہ کی شادی میں تو کوئی مشکل ہی نہیں ہوئی تھی اور مہر اور افروز کے لیے تو ابھی سے رشتے آنے لگے تھے، آتے تو شہزا کے لیے تھے لیکن وہ مہر یا افروز کو پسند کر جاتے۔

''تو کیا یہ سارا چکر صرف رنگ کی وجہ سے ہے؟'' انہیں پہلی مرتبہ اس کی رنگت کا شدت سے احساس ہوا تھا، وہ سوچتیں ''جہاں چار لڑکیاں گوری ہوئی تھیں، یہ بھی گوری ہو جاتی کہ لوگ اور کچھ نہیں صرف گورا رنگ دیکھتے ہیں، وہ چاروں میری طرح گوری ہیں تو ان کے نقوش بھی تو میری طرح بالکل معمولی ہیں اور شہزا گوری نہیں تو کالی بھی تو نہیں، بس سانولی ہے لیکن جوان ہو کر کس قدر پُرکشش شخصیت ہو گئی ہے اس کی... اس کی بڑی، بڑی سیاہ بھنورے جیسی آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں، ستواں ناک اور چھوٹا سا خوب صورت دہانہ، اس کی مسکراہٹ کتنی پیاری ہے اور گھنے لمبے سیاہ بال، ان عورتوں کو یہ سب کچھ کیوں نہیں نظر آتا۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتی رہتیں۔ پانچوں ان کی ہی بیٹیاں تھیں لیکن وہ غیر ارادی طور پر شہزا کا ان چاروں سے موازنہ کرنے لگتیں تو شہزا سب سے الگ اور خوب صورت لگتی..... انہیں ان عورتوں کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگتا اور جب وہ احمد صاحب سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتیں تو وہ انہیں سمجھانے لگتے۔

''شازیہ، اتنی مایوسی کی کیا بات ہے؟ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کا جوڑا بھی تو بنایا ہوگا ناں، یہ سمجھو کہ وہ ابھی یہاں تک پہنچا نہیں یا ابھی اس کی شادی کا وقت نہیں آیا، ضروری تو نہیں کہ ہر ایک کی شادی جلدی ہو جائے، تم اس بات کو اپنے ذہن پر سوار نہ کرو، جب اللہ کو منظور ہوگا اس کی بھی شادی ہو جائے گی۔'' احمد صاحب کتنے مطمئن تھے لیکن ان کی پریشانی میں مزید اضافہ ہونے لگا جب رشتہ لانے والوں نے رنگ کے ساتھ، ساتھ شہزا کی عمر پر بھی اعتراض شروع کر دیا کیونکہ انہیں اسی گھر میں گوری چٹی اور اس سے کم عمر لڑکیاں جو نظر آجاتی تھیں اور شازیہ یہ سوچ کر انہیں انکار کر دیتیں کہ اگر چھوٹیوں کے رشتے پہلے ہو گئے تو ہو سکتا ہے شہزا شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے اور یہ

بات انہیں کسی صورت منظور نہ تھی۔ شہزا بھی اپنے لیے امی کی فکروں سے لاعلم تو نہ تھی اسی لیے ہر ناکامی کے بعد ان کے سامنے کچھ شرمندہ سی ہو جاتی۔ کئی دن امی اور ابو سے نظریں چرائے پھرتی، اسی لیے آج امی سے بات کرنے کا ارادہ کرلیا تھا اور ساری ہمت جمع کر کے ان کے قریب چلی آئی۔

''امی، میں جانتی ہوں مہر اور افروز کے لیے آنے والے اتنے اچھے رشتوں کو آپ میری وجہ سے انکار کرتی رہی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک انجینئر اور ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا تھا جنہیں آپ نے صرف میری وجہ سے انکار کر دیا تھا جس کا مجھے بہت دکھ ہوا، دیکھیے ناں امی، اب وہ دونوں بھی گریجویشن کر چکی ہیں اور آپ کے اصول کے مطابق اب ان کی شادی ہو جانی چاہیے تو پلیز، اب ان کے لیے آنے والے اچھے رشتوں کو آپ منع نہیں کریں گی ورنہ کچھ عرصے بعد ان کے لیے بھی اچھے رشتے آنے بند ہو جائیں گے اور آپ میری بالکل فکر نہ کریں میرا تو ابھی شادی کا ارادہ ہی نہیں ہے، میرا مزاج اور ہے، میں آزاد رہ کر خوش ہوں یہ شادی کی پابندیاں میں نہیں نبھا سکوں گی، بس آپ ان دونوں کے رشتے طے کر دیجیے۔'' اس نے اپنے انداز میں بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن بیٹا میں پہلے تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں، تم پچیس سال کی ہو چکی ہو تو کیا بڑھاپے میں شادی کرو گی؟'' امی کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دیکھیے ناں، اب تک جتنے لوگ آئے سب کالے سانولے ہی آئے ناں، آپ کی طرح کوئی گورے چٹے لوگ تو نہیں آئے ناں۔'' وہ اپنی ہی منطق بتا رہی تھی۔

''ہاں، تو؟'' امی کی سمجھ میں اس کی بے سروپا بات نہیں آئی تھی۔

''تو، امی میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جس طرح آپ اتنی گوری ہو کر کالے خاندان میں بیاہی گئی ہیں تو ہوسکتا ہے میں کالی ہو کر کسی گورے خاندان میں بیاہی جاؤں، کیوں...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟'' اس نے امی کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہوتو سکتا ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟'' اس نے امی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اب ہم گورے لوگوں کا انتظار کریں گے آپ اپنی گوری بیٹیوں کے پہلے کی طرح کالوں میں رشتے کر دیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو امی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

آرٹ ایگزیبیشن لگے اور وہ اور راحت نہ جائیں کیسے ہوسکتا تھا؟ پروگرام بنا کر دونوں ہی پہنچ گئی تھیں۔ بہت اچھے، اچھے آرٹسٹوں کی پینٹنگز بھی رکھی گئی تھیں، دونوں ایک، ایک پینٹنگ کو دلچسپی سے دیکھنے کے ساتھ، ساتھ تبصرہ کرتے ہوئے دھیرے، دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں، اچانک راحت نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

''شہزا، وہاں تو دیکھو۔''

''کہاں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ دیکھو، شاہکار کے سامنے شاہکار۔''

اس نے راحت کی نظروں کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں، نظریں بھی وہیں جا کر رک گئیں۔ جہاں راحت کی نظر ٹکی ہوئی تھی۔ راحت نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت شاندار تھا، دراز قد، بے انتہا سرخ وسفید چہرے پر چھوٹی سی براؤن داڑھی، مونچھیں اور سر کے بال بھی براؤن تھے۔ دونوں اس کا سائڈ پوز ہی دیکھ سکی تھیں۔

''چلو قریب سے اس شاہکار کو دیکھتے ہیں۔'' راحت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''کیا بدتمیزی ہے۔'' اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن راحت اسے گھسیٹتی ہوئی اس شخص کے بالکل قریب جا کر رک گئی جو پورے انہماک سے ایک خوب صورت پینٹنگ دیکھنے میں مصروف تھا۔

''امریکی لگتا ہے۔'' راحت کی آواز اتنی اونچی تھی کہ اس نے فوراً رخ پھیر کر دونوں کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' وہ مسکرا دیا تھا۔ وہ تو راحت کی حرکت کی وجہ سے زمین میں گڑی جارہی تھی۔

''کیا آپ امریکی نہیں ہیں؟'' راحت بھی کھسیائی ہوگئی تھی۔

''جی نہیں، میں پاکستانی پٹھان ہوں، سرحد کا، لیکن رہتا ہوں امریکا میں ہوں۔''

کتنی شستہ اردو بولا تھا وہ۔ شہزا نے دھیرے، دھیرے گھنیری پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تو دو بلوریں پیمانوں کی جنبش سے اسے اپنے دل میں ایک لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس قدر پرکشش آنکھیں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں کچھ دیر تو وہ اپنی آنکھیں ہی نہ ہٹا سکی۔

''آپ شاید بنگالی ہیں؟'' اس نے دلچسپی سے شہزا کا سراپا جانچا۔ ریڈ بارڈر کی کالی ساڑی اور نازک سی کمر پر گھنے سیاہ بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی۔ وہ اسے کسی مصور کا حسین تصور لگی تھی اور وہ اسے اسی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی پینٹنگ کو دیکھ رہا ہو۔

''جی نہیں۔'' شہزا نے مختصر جواب دیا تھا۔

''کیا آپ کا آرٹ سے تعلق ہے؟'' وہ دونوں ہی سے مخاطب تھا۔

''صرف دیکھنے کی حد تک۔'' راحت نے جواب دیا تھا۔

''چلیے، میں آپ کو اپنی فیملی سے ملواؤں۔'' اس نے ایک نظر دونوں پر ڈال کر کہا۔

''فیملی.....'' راحت کا دہانہ پھیل گیا تھا۔

''جی ہاں، میری مدر اور دونوں سسٹرز میوزک ہال میں فنکشن اٹینڈ کررہی ہیں۔'' اس نے انہیں چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیے تو دونوں اس کے پیچھے کھنچی چلی آئیں۔ اس کی دونوں نوعمر بہنیں جینز اور کرتا پہنے تھیں۔ اور بالوں کو اسکارف میں چھپایا ہوا تھا، اس کی مما نے بھی شلوار سوٹ پر بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔''

''کس قدر خوب صورت فیملی ہے۔'' راحت اس کے کان میں گنگنائی تھی تو اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

''مما، رمشہ، زیبا دیکھو میں انہیں آپ سے ملوانے لایا ہوں۔'' اس نے تینوں خواتین کو مخاطب کیا جو بڑے شوق سے میوزک سن رہی تھیں اس کی آواز پر پلٹ کر انہیں دیکھا، دونوں لڑکیاں اٹھ کر گرمجوشی سے ان سے ملی تھیں ان کی والدہ کے لبوں پر بھی دوستانہ مسکراہٹ تھی پھر اس نے سب کا تعارف کروایا تھا۔

''ارباز بھائی یہ آپ کو کہاں ملیں؟'' زیبا نے شہزا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بھائی سے پوچھا۔

''یہیں ایگزیبیشن میں۔'' وہ مسکرا دیا۔

''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے بھائی جیسے آپ کسی آرٹسٹ کی خوب صورت پینٹنگ چرا لائے ہیں۔'' رمشہ نے شہزا کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا تو وہ سرخ پڑ گئی۔

''خوب صورت تو آپ لوگ ہیں اور میری تعریف کر کے مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔'' وہ واقعی شرمندہ سی ہوگئی تھی کیونکہ اس کی تو کبھی کسی نے ایسی تعریف نہیں کی تھی۔

''نہیں، ہم تو عام لوگ ہیں آپ کا حسن الگ سا ہے۔'' دونوں اس کا ایک، ایک ہاتھ تھامے تھیں۔

''بیٹا ہم پٹھانوں کے ہاں زیادہ تر لوگ گورے ہیں اور امریکا میں بھی ہر طرف چٹی چمڑی دیکھ، دیکھ کر ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں اور بیٹا تمہارے سانولے رنگ میں ایک عجیب سی کشش ہے جو ہر سانولے میں نہیں ہوتی۔ اس لیے تم ہمیں بہت اچھی لگی ہو، یوں سمجھو کہ اگر بہت دیر تک صرف میٹھا ہی کھاتے رہیں تو ممکن ہے چکھ کر جو مزہ آتا ہے تو تم سے مل کر ایسا ہی محسوس ہوا۔'' انہوں نے... کچھ ایسے انداز سے بات کی کہ سب کو ہنسی آگئی۔

''لیکن صرف کمپلیکشن کی بات نہیں ہے مما، ان

کی آنکھیں اور بال بھی بہت خوب صورت ہیں۔'' زیبا اسے بہت پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اسے پہلی مرتبہ اپنے حسن کی اتنی تعریفیں سن کر عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس لیے اس نے موضوع بدلتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''آپ دونوں کس کلاس میں پڑھ رہی ہیں؟''

''میں اے لیولز میں اور رمشہ او لیوز میں ہے اور ارباز بھائی انجینئر بن گئے ہیں۔'' زیبا نے ارباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھا چھوٹی بہنوں کی باتوں اور شہزا کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جس کی اٹھتی جھکتی آنکھیں اس کے دل میں اتھل پتھل کر رہی تھیں۔

''اور آپ کیا کرتی ہیں شہزا باجی.....؟'' رمشہ نے پوچھا۔

''میں نے حال ہی میں ماسٹر کیا ہے اور آج کل فری ہوں۔'' شہزا نے شکر کی سانس لی کہ موضوع بدلا۔ پھر دونوں بہنیں شہزا سے مزید باتیں کرتی رہیں۔ . .

''شہزا باجی یہاں ہماری کوئی فرینڈ نہیں ہے اور کچھ دن ہمیں کراچی میں ہی رہنا ہے۔ یہاں ہم گھومنا پھرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم جہاں بھی جائیں گے آپ دونوں ہمارے ساتھ ہوں گی۔ ٹھیک ہے ناں.....''

زیبا نے ان دونوں سے وعدہ لیا اور موبائل نمبروں کا بھی تبادلہ کیا۔ پھر وہ لوگ روزانہ ساتھ ہی وقت گزارتے رہے اور کچھ دنوں میں ہی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ شہزا، ارباز کی آنکھوں میں اپنے لیے کچھ مبہم سے سوال محسوس کر رہی تھی لیکن اس نے اس کے ہاتھوں میں کوئی آس کا جگنو نہیں دیا تھا، پیار سے مہکتے لفظوں کا کوئی پھول نہ دیا تھا پھر بھی اسے دیکھ کر دل کے تاروں میں کوئی لے ابھرتی محسوس ہوتی۔ امی، ابا کو بھی وہ لوگ اچھے لگے تھے۔

وہ تھوڑے عرصے کے لیے کراچی شہر گھومنے آئے تھے اب ان کے جانے کا دن بھی آ گیا تھا۔ اتنے دن اتنی اچھی کمپنی دینے کا شکریہ ادا کر کے مسکراتے

آخری بند

''ابا! سیلاب کا خطرہ کب ٹلے گا؟''

''بیٹا! جب دریا کا زور ٹوٹے گا''

''ابا یہ دریا کو ہوا کیا ہے؟''

اتنے غصے میں پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟''

''بہت ناراض ہے ہم سے''

''وہ کیوں ابو؟''

''ہم اس کے بچوں کی قدر جو نہیں کرتے۔''

''دریا کے بھی کوئی بچے ہوتے ہیں؟''

''دریا کا پانی دریا کا بچہ ہی تو ہوتا ہے، میرے بچے اس کی قدر نہیں کرتے جبھی تو یہ زمینوں تک پہنچ پاتا ہے نہ ہونٹوں تک اور جب غصے میں ہو تو گاؤں کے گاؤں بہالے جاتا ہے۔''

''ابا تیری باتیں، میری سمجھ میں نہیں آتیں۔''

''یہ سادہ باتیں تو بڑے، بڑوں کی سمجھ میں نہیں آتیں، تو

تو پھر بھی بچہ ہے۔''

''بس ابا تو یہ بتا دریا کا زور کب ٹوٹے گا؟''

''بہت جلد میری جان، بہت جلد۔ ایک نہ ایک کو تو ٹوٹنا ہی ہے آخر''

''کیا مطلب؟''

''دریا کا زور ٹوٹے گا یا بستی کا آخری بند''

باپ نے بچے کی آنکھوں میں جھانکا تو اُسے یوں لگا جیسے سیلابی ریلا بیٹے کی چمکدار آنکھوں میں سمٹ آیا ہو

پہلی بار احساس ہوا کہ دریا کی سیلابی

لہروں کے آگے بند باندھنا آسان ہے مگر انسانی

پلکوں کے آگے بند باندھنا بہت مشکل

اور پھر یہ بند ٹوٹ گیا

اور

بوڑھے باپ کو بہالے گیا۔

تحریر: صفدر علی حیدری

ہوئے رخصت ہوگئے۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' اس نے جاتے، جاتے کہا تھا۔ زیبا اور رمشہ سے تو اکثر انٹرنیٹ پر باتیں ہوتی رہتی تھیں اور وہ اپنی چھوٹی، چھوٹی معصوم باتوں میں اسے بہت کچھ بتا جاتیں، آنٹی اور ارباز سے کم ہی بات ہوتی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، اس کے سمجھانے پر امی، ابو نے آنے والے اچھے رشتوں کو مہر اور افروز کے لیے قبول کرلیا تھا پھر وہ امی کے ساتھ ان کی شادی کی شاپنگوں، تیاری میں اس طرح مصروف ہوگئی کہ اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ ان کی رخصتی کے بعد جب کرنے کو کچھ نہ رہا تو وہ سوچ رہی تھی کہ چار ماہ کا عرصہ کس خاموشی سے گزر گیا کہ چار ماہ سے وہ ان لوگوں سے رابطہ بھی نہ کرسکی تھی ..... ذرا فارغ ہوکر آج اس نے چیٹ آن کی تھی تو دیکھا۔ زیبا، رمشہ کے چند مختصر میسج تھے جس میں انہوں نے اسے مس کرنے اور اپنی مصروفیت کا بتایا تھا۔

شہزا نے بھی اپنی بہنوں کی شادی کے متعلق بتایا بہت اچھے ماحول میں بات چیت ہوئی تھی۔ آنٹی نے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تھا۔

آنٹی سے بات کرکے اسے اتنی خوشی ملی تھی کہ سنبھالی نہیں جارہی تھی۔ اس لیے اس خوشی کو شیئر کرنے کے لیے اپنی پیاری دوست راحت کو فون کردیا جو شادی کے بعد لاہور شفٹ ہوچکی تھی اور اس کی ہم راز بھی تو صرف وہی تھی۔ شہزا کی بات سن کر وہ خوشی سے چیخ پڑی اور اسے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ بہت سی مبارک باد دے ڈالی۔ آنٹی نے کچھ مبہم انداز میں اس کے اور ارباز کے رشتے کی بات کی تھی۔

اس کی آنکھوں میں کتنے حسین خواب بس گئے تھے کہ وہ بات بے بات مسکراتی رہتی۔ امی نے بھی اس میں کچھ خوشگوار سی تبدیلی محسوس کی تھی اور وہ انتظار میں تھیں کہ اگر کوئی بات ہوئی تو وہ خود انہیں بتائے گی لیکن ابھی تک اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ روزانہ کافی دیر انٹرنیٹ پر بیٹھی رہتی لیکن کوئی آن لائن ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے کئی میسج بھی دیے تھے لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک ہفتے بھر بعد زیبا لائن پر تھی۔

''کیا بات ہے، تم سب کہاں غائب ہوگئے، میرے میسج بھی نہیں دیکھے؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''شہزا باجی، میرا خود بہت دل چاہ رہا تھا آپ سے بات کرنے کو آپ کو ایک خوشخبری بھی تو دینی تھی ناں لیکن ہم سب کافی مصروف رہے۔ آج مجھے ذرا سا وقت ملا تو آپ کا خیال آگیا کہ خوشخبری سنادوں۔''

''ضرور میرے ویزے کے متعلق کوئی بات ہوگی۔'' اس نے سوچا۔

''ہاں، ہاں خوشخبری سناؤ میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' اس کے لہجے میں شوخیاں بھری تھیں۔

''شہزا باجی۔'' زیبا پھر خاموش ہوگئی تھی۔

''بھئی کیا ہے جلدی سے کہہ دو ناں.....'' وہ ہنس رہی تھی کہ کیا یہ بھی ارباز کی طرح شرما رہی ہے۔

''شہزا باجی ہم سب آپ کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اور اکثر آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، ہم آپ کو یہاں بلانا چاہتے ہیں آخر چار سال سے ہماری دوستی کتنی پرانی اور مضبوط ہوگئی ہے کہ آپ ہمیں بالکل اپنی لگنے لگی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں آجائیں۔ اور بھائی کی بھی خواہش ہے کہ آپ ان کی شادی میں شرکت کریں آپ اتنی اچھی دوست جو ہیں۔'' زیبا اسے بولنے کا موقع دیے بغیر بولتی چلی گئی تھی اور وہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ پتا نہیں زیبا کیا، کیا کہہ رہی تھی۔

''ارباز کی شادی؟'' اس کے اندر زوردار دھماکا ہوا تھا اور پل بھر میں بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔

''جی شہزا باجی، ارباز بھائی کی شادی ہورہی ہے، جب ہماری چھوٹی خالہ کی شادی ہوئی تھی ناں تب ان کی نند سے ارباز بھائی کا رشتہ پکا ہوگیا تھا کافی عرصہ ہوگیا، اب بھائی بہت اچھی جاب پر لگ گئے، اس لیے

ان کی شادی ہورہی ہے، ہماری ہونے والی بھابی بھی اپنی فیملی کے ساتھ امریکا میں ہی رہتی ہیں۔ لیکن شہزا باجی ہمیں تو آپ ہی پسند آئیں، میں اور رمشہ تو اکثر کہتے ہیں کہ اگر بھائی کا وہاں رشتہ نہ ہوا ہوتا تو ہم آپ کو ہی اپنی بھابی بناتے لیکن مما کہتی ہیں کہ شاید جب بھی ایسا نہ ہوتا کیونکہ ہمارے ہاں تو شادی اپنوں میں اور وہ بھی ادلے بدلے میں ہوتی ہے، ہم برسوں سے امریکا میں رہ رہے ہیں لیکن اب بھی اپنی فرسودہ روایتوں کے ہی اسیر ہیں۔'' وہ جانے کیا، کیا کہتی رہی اور کب تک کہتی رہی۔ شہزا تو کچھ سن ہی نہیں رہی تھی، وہ سینے پر ہاتھ رکھے اپنی رکتی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش میں بے حال ہورہی تھی۔ اس کے کپڑے تر بتر تھے اسے اپنا وجود پسینے میں تحلیل ہوتا محسوس ہورہا تھا، وہ جانے کس طرح اور کب کمپیوٹر بند کر کے اپنے بیڈ تک پہنچی تھی صبح اس کا جسم تیز بخار سے پھنک رہا تھا۔

اپنی حالت پر اسے خود حیرانی ہورہی تھی کہ اتنی میچورڈ ہو کر بھی ارباز کی شادی کا سن کر کسی ٹین ایج کی طرح کیوں اپنی یہ حالت بنالی، اس نے کب مجھ سے کبھی اشارتاً بھی اپنی پسند کا اظہار کیا تھا۔ اس نے کب مجھے کوئی امید دلائی تھی، ہمارے درمیان کب کوئی ایسی بات ہوئی جس نے مجھے اتنے عرصے سے خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا تھا، میں تو بس ان سب کی دوست ہوں اور امریکا میں تو اس کی جانے کتنی دوست ہوں گی، ایک سے بڑھ کر ایک حسین و جمیل پھر بھی اس نے شادی تو اسی سے کرنی ہے جو اُن کی اپنی ہے اور اس کی کئی سالہ پرانی محبت ہے اور میں صرف ان بچیوں کی تعریفوں کی وجہ سے اپنے آپ کو جانے کیا سمجھنے لگی حالانکہ میری اہمیت تو ان کے قریب میٹھا کھاتے، کھاتے ذرا سا نمک چکھ لینے کی سی ہے۔ آنٹی کی کہی ہوئی بات یاد آنے پر وہ تلخی سے مسکرادی تھی پھر اس نے سب کچھ اپنے اندر کہیں اتار لیا تھا اور نئے عزم کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

رشتے تو اب تک گاہے بہ گاہے آتے ہی رہتے تھے لیکن وہ انکار کرتی رہی تھی۔ آج کل پھر ایک مہذب فیملی سے ایک سرکاری افسر کا رشتہ آیا ہوا تھا جس کی بیوی دو بچے چھوڑ کر فوت ہوچکی تھی۔ امی، ابو، بہنیں سب ہی اس پر یہ رشتہ قبول کرنے کے لیے زور دے رہے تھے کیونکہ وہ شخص خود بھی نہایت شریف اور مہذب تھا لیکن اس نے سختی سے انکار کردیا۔

''نہیں، میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے، میری اکیلے رہنے کی عادت اتنی پختہ ہوچکی ہے کہ میں کوئی ذمے داری نبھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی، میں اسی طرح بہت خوش ہوں، آئندہ کوئی رشتہ آئے تو پلیز آپ لوگ خود ہی منع کردیجیے گا۔'' اس نے سب کو خاموش کرادیا تھا۔ پھر جلد ہی اسے ایک بڑی فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر جاب مل گئی۔ وہ اپنے آپ میں مگن ہوچکی تھی اس لیے سب نے تھک ہار کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وقت دھیرے، دھیرے گزر رہا تھا اور اس نے تو وقت کا حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

رمشہ اور زیبا اکثر اس سے بات کرتی رہتی تھیں اور اس نے کبھی ان پر اپنی کیفیات آشکار نہیں کی تھیں۔ وہ ہر نئی خبر اسے دینا ضروری سمجھتی تھیں، شادی کے دو سال بعد ارباز کے ہاں بیٹا ہوا تھا جس کا نام شہباز رکھا گیا انہوں نے اس کی کتنی ہی تصویریں اس تک پہنچادی تھیں جس کا اس نے شکریہ ادا کیا تھا۔

آج زیبا کو جانے کیا ہوا تھا وہ بہت دیر سے پرانی باتیں دُہرائے جارہی تھیں۔ شہزا نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ تو نان اسٹاپ بولے جارہی تھی۔

''شہزا باجی، آپ کو پتا ہے ہم ہی نہیں ارباز بھائی بھی آپ کو بہت پسند کرتے ہیں، اور انہوں نے آپ سے شادی کے لیے امی سے بہت دن ضد کی تھی وہ تو پلوشہ بھابی سے شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔'' وہ ہنسی تھی۔ ''میں اور رمشا بھی بھائی کے ساتھ مل گئے تھے لیکن مما نہیں مانیں۔'' اس نے اداسی سے کہا۔ ''وہ کہہ رہی تھیں اگر ہم نے ایسے کیا تو میری بہن میکے آکر بیٹھ جائے گی، اس کا گھر، شوہر اور بچے اس سے چھوٹ

جائیں گے کیا تم لوگ ایسا چاہتے ہو؟ تو پھر خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔'' زیبا نے نا سمجھی میں اتنا عرصے بعد اپنی بات کا کنکر پھینک کر ساکن ہوتی جھیل میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا، شہزا کے دل میں ہوک اٹھی تھی جسے اندر ہی اندر دباتے ہوئے اس نے کہا۔ کیونکہ زیبا شاید سانس لینے کو رکی تھی۔

''زیبا! تمہارے بھائی کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنی بیوی، بچے کے ساتھ خوش ہیں اب تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے، ضروری نہیں انسان کی ہر خواہش پوری ہو، اچھا پھر بات کریں گے۔'' اس نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا، اس نے زیبا کو تو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اپنے دل کو کیسے سمجھاتی جس نے غلط نہیں محسوس کیا تھا، آج اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ ارباز کی آنکھوں میں کیوں مبہم سے سوال رہتے تھے کئی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن وہ تو بات کرتے ہوئے آنکھیں چرا جاتا تھا وہ تو مجبوریوں کے بندھن میں بندھا ہوا تھا اسی لیے کبھی کھل کر اظہارِ محبت نہ کر سکا۔ آج وہ نئے کرب سے گزر رہی تھی۔

''زیبا تم نے اچھا نہیں کیا...... کیا ضرورت تھی اب یہ سب کچھ کہنے کی۔'' وہ سوچ کر رہ گئی...... اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ تو وہیں تہی داماں کھڑی تھی۔ اور وقت اس کے قریب سے گزر کر کتنا آگے جا چکا تھا۔ عابد بھائی اور زاہد بھائی کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھابیوں اور بچوں کی وجہ سے گھر میں ہر وقت رونق رہتی تھی۔ بظاہر تو وہ بھی اس رونق کا حصہ تھی کیونکہ بھابیوں اور بچوں کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی لیکن اپنے آپ میں وہ کتنی تنہا تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرک گیا تھا۔ وقت کہاں رکتا ہے، وہ تو گزرتا ہی رہتا ہے یہ بتائے بغیر کہ اگلے لمحے وہ اپنے دامن سے کیا جھٹکنے والا ہے۔ اور اب اس کے دامن سے ایسا لمحہ گرا تھا جس نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے، ارباز کی کار کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس کے نتیجے میں اس کی بیوی موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی تھی اور وہ خود بھی زخموں سے چور اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا۔ آٹھ گھنٹوں سے اسے ہوش نہیں آیا تھا ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے، شہباز ان کے ساتھ نہیں تھا اس لیے وہ محفوظ تھا۔

''باجی، شہزا باجی، آپ ارباز بھائی کے لیے دعا کیجیے پلیز، ان کی زندگی کے لیے دعا کیجیے ہمارا تو ایک ہی بھائی ہے۔ مما کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے، باجی آپ دعا کیجیے شاید اللہ آپ ہی کی دعا قبول کر لے، دعا کیجیے۔'' رمشا بری طرح رو رہی تھی۔ لیکن وہ تو رو بھی نہ سکی اس کا سارا وجود دعا بن گیا تھا۔ وہ بے اختیار سجدے میں چلی گئی اور اپنے رب سے اس کے لیے دعائیں کر رہی تھی جو اس کا کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے سب کچھ تھا۔ یہ رات کس قدر ویران، کالی اور تنہا تھی بالکل اس کے وجود کی طرح اور وہ تمام رات اپنے بند کمرے میں اپنے رب سے اس رات کی تاریکی کو اجالے میں بدلنے کی التجا کرتی رہی۔ یا اللہ یہ رات زندگی پر محیط نہ ہو جائے۔ یا اللہ اجالا دے دے روشنی دے دے، اس شخص کی ٹوٹتی رگوں میں زندگی دے دے۔ وہ ساری رات کرب کے کس، کس روپ سے اور دعاؤں کی کن، کن منزلوں سے گزرتی رہی تھی کہ اپنے وجود کو زمین و آسمان کے درمیان معلق پا رہی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب تاریکی چھٹی تھی اور اجالا پھیل گیا تھا۔

''شہزا باجی آپ نے ضرور دعائیں کی ہوں ارباز بھائی کے لیے زندگی مانگی ہوگی، وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ انہیں ابھی، ابھی ہوش آیا ہے، ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں ان کی جان خطرے سے باہر ہے۔'' رمشہ اور زیبا خوشی، خوشی اسے بتا رہی تھیں تو وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی کہ دعائیں یوں بھی مستجاب ہو جاتی ہیں۔ رمشہ اور آنٹی اسے روزانہ ہی ارباز کے بارے میں بتا رہی تھیں جو وقت کے ساتھ، ساتھ بہتر ہو رہا تھا۔ ارباز کے گھر شفٹ ہونے کے بعد شہزا نے اس سے اس کی بیوی کے فوت ہو جانے پر گہرے دکھ کا

اظہار کیا تھا، وہ اس اچانک حادثے سے بہت ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ شہزانے اسے بہت حوصلہ دیا تھا، وقت اگر زخم دیتا ہے تو اس کا مرہم بھی خود ہی بن جاتا ہے۔ رفتہ، رفتہ ارباز بالکل ٹھیک ہو کر اپنی جاب پر جانے لگا تھا تو وہ بھی پھر اپنی دنیا میں لوٹ چکی تھی۔ البتہ دل کی ویرانیاں مزید بڑھ چکی تھیں۔

رمشہ ہی اکثر اس سے بات کرلیا کرتی تھی لیکن اس کی شادی کے بعد یہ سلسلہ کم ہوتے، ہوتے ختم ہی ہو چکا تھا۔

☆☆☆

آج کتنے عرصے بعد اچانک ارباز کی آواز سن کر وہ سُن سی ہوگئی تھی جو امریکا سے نہیں بلکہ کراچی سے ہی بات کر رہا تھا۔ اور اس کا لہجہ آج کتنا مضبوط لگ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''شہزا، ہم کل صبح ہی یہاں پہنچے ہیں، بس آپ فوراً آجائیں، باقی باتیں تو ملاقات پر ہوں گی۔'' ہوٹل کا نام بتا کر اس نے فون بند کردیا تھا یعنی اسے پورا یقین تھا کہ شہزا اس کی ایک کال پر ہی دوڑی آئے گی۔

اور ہوا بھی یہی تھا۔ وہ امی کو کسی دوست سے ملنے جانے کا کہہ کر نکل آئی تھی۔ وہ اب زیادہ با اعتماد و خود مختار تھی۔ خود گاڑی ڈرائیو کر کے ہر جگہ آتی جاتی سارے راستے سوچتی رہی تھی کہ ارباز نے اسے فوراً بلایا ہے اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس وقت کم ہے ہوسکتا ہے اسے آج ہی اپنے گاؤں جانا ہو اور یقیناً ارباز وہاں دوسری شادی کرنے کے ارادے سے ہی آیا ہو۔ اس کی بیوی کو بھی فوت ہوئے بھی تو چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اس نے دوبارہ گھر بسانے کا فیصلہ کیا ہے تو بالکل صحیح ہے، یہ بھی ان لوگوں کا خلوص ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے مجھے یاد رکھا اگر مجھ سے ملے بغیر ہی یہاں سے گزر جاتے تو مجھے کون سا علم ہونا تھا۔ وہ اسی نہج پر سوچ رہی تھی کیونکہ اب وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اب تقریباً آٹھ سال بعد وہ ایک دوسرے کو دیکھ

بکار

بہت مانوس لگتے ہیں
بہت سنسان سے رستے
کوئی آواز دیتا ہے
میرے جیون میں آجاؤ

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

شادی کے بعد

میں..... میرا شوہر..... میرے بچے
ایک غلط سوچ ہے جو تمام پرانے رشتے چکنا چور کردیتی ہے۔
اگر آپ باقی تمام پرانے رشتے توڑ چکی ہیں تو آپ عورت نہیں پکی دہشت گرد ہیں۔
اس کو کہتے ہیں گھریلو دہشت گردی۔

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

دکھ

دکھ تو احساس کا نام ہے
آؤ محسوس کرنا چھوڑ دیں
دکھ خود ہی مر جائے گا
مگر اس احساس کو زندہ کرلیں
جو دوسروں کے کام آتا ہے
دل خوشی سے بھر جائے گا

از: کوثر خالد، جڑانوالہ

کھرا سچ

ہر انسان ضرورت، وقت اور مزاج کے مطابق آپ سے رشتہ قائم رکھتا ہے۔ اور جب ضرورت نہ رہے، وقت نہ ہو یا مزاج بدل جائے تو تعلق ختم ہوتے دیر نہیں لگتی۔

حقیقی اور بے لوث تعلق وہ ہوتا ہے جو ان سب کے باوجود بھی قائم رہے۔ مخلص رشتوں کو مجبوری میں بھی ضائع نہ ہونے دیں
کیونکہ.....
مجبوری تو ختم ہو جائے گی لیکن رشتے دوبارہ نہیں ملتے۔

مرسلہ: مہرین ضیا بنگش، کراچی

رہے تھے لیکن ایک دوسرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے وقت نے ان کا کچھ بگاڑا انہیں مزید نکھار دیا ہے، سر کے بالوں اور داڑھی کے ہم رنگ چشمے نے ارباز کے سرخ و سفید چہرے کو اور حسن بخش دیا تھا۔ اتنے سال پہلے دبلی پتلی شہزا اب بھرے، بھرے سڈول جسم کے ساتھ پہلے سے زیادہ اسمارٹ و پُرکشش لگی۔ اس کی آنکھیں اب بھی جادو بھری تھیں، اس کے بال ویسے ہی خوب صورت تھے، آنٹی میں بھی بہت زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ بس چھ سالہ شہباز کو ہی دیکھ کر وقت کی رفتار کا احساس ہوا تھا۔

''یہ بالکل ارباز کا بچپن ہے۔'' آنٹی کہہ رہی تھیں اسے بھی اس میں ارباز کی جھلک نظر آرہی تھی وہ اسے بہت دیر تک پیار کرتی رہی تھی۔ وقت کے گزرنے نے محبتیں کم نہیں کی تھیں اس لیے تینوں حسب مراتب بہت گرمجوشی سے ملے تھے، کچھ دیر پرانی یادیں تازہ ہوتی رہیں جن میں زیبا اور رمشہ کا بہت ذکر رہا۔ انہوں نے اکٹھے ہی ڈنر کیا تھا۔

''تم دونوں باتیں کرو، میں ذرا دیر نیچے لان میں واک کر آؤں۔'' آنٹی نے اٹھتے ہوئے کہا اور شہباز کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئیں۔

''مما ڈنر کے بعد کچھ دیر واک نہ کریں تو رات بھر سو نہیں سکتیں۔'' ارباز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان کے جانے کے بعد دونوں یوں خاموش بیٹھے تھے جیسے ان کے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہ ہو، حالانکہ یہ خاموشی دونوں کو ہی گراں گزر رہی تھی پھر کچھ دیر بعد ارباز نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

''شہزا، تم میرے متعلق ہر بات سے واقف ہو، میری شادی سے پہلے کے میرے خیالات سے بھی اور میری مجبوریوں سے بھی، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ پلوشہ اچھی بیوی نہیں تھی، وہ بہت اچھی تھی اس نے مجھے ہر خوشی دینے کی پوری کوشش کی لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان سب کے باوجود میں تمہیں اپنے دل سے کبھی نہیں نکال سکا، مجھے تو کبھی پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں تھا۔ لیکن کبھی پہلی نظر کی محبت پوری زندگی پر اس بری طرح حاوی ہو جاتی ہے یہ تجربہ تو مجھے اپنی ذات پر ہوا۔'' وہ کچھ دیر رک کر پھر بولا تھا۔

''میں تمہارے جذبات کو اس وقت بھی اچھی طرح سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھ رہا ہوں، میں خود غرض نہیں ہوں یا پھر شاید ہوں، ہو سکتا ہے کہ محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہو لیکن تم یقین جانو کہ اگر اس وقت میرے سامنے اتنی بڑی مجبوری نہ ہوتی تو اس وقت بھی صرف تم ہی میری چوائس تھیں اور آج بھی ہو، اسی لیے آج میں تم سے تمہارا ساتھ مانگ رہا ہوں، اپنی بقیہ زندگی کے لیے اب جتنی بھی ہے تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں لیکن تم اپنے فیصلے میں بالکل آزاد ہو، سوچ لو، اور اگر تمہارا ابھی یہی فیصلہ ہو تو کل ہمیں اپنے گھر انوائٹ کر لینا۔'' اس نے شہزا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات ختم کی جو اتنی دیر سے خاموشی سے سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی اور اب تک جواب میں ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی تو ارباز نے ہی دوبارہ کہا۔

''شہزا پلیز میری باتوں سے پریشان نہ ہونا، تم سے بات کرنے سے پہلے میں نے اپنے ذہن کو تمہارے ہر طرح کے جواب کے لیے تیار کر لیا تھا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ضروری تو نہیں کہ تم اب بھی میری ہم خیال ہو، تمہارے پاس پوری رات ہے سوچنے کے لیے، اچھی طرح سوچ کر اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی بات دُہرائی تو شہزا نے اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ رات گئے تک سوچتی رہی تھی اور صبح اس نے انہیں فون کر کے انہیں انوائٹ کر لیا تھا۔ اس کے بعد امی کو تمام حالات تفصیل سے بتا دیے تھے۔ اس کے اتنے اچھے فیصلے سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

''دیر آید درست آید۔'' ابا نے مسکرا کر کہا تھا۔ کفر ٹوٹا خدا، خدا کر کے، بھابیاں بھی بہت خوش تھیں اور ساس کے ساتھ مل کر مہمانوں کے لیے ڈنر کی

تیاریوں میں مصروف ہوگئیں۔
خواب دیکھنے کی تو نہ کوئی عمر ہوتی ہے اور نہ وقت انسان ہر عمر میں سوتے جاگتے خواب دیکھتا ہے، خوابوں کا تعلق تو وقت کے ساتھ ظہور پزیر ہونے والے حالات اور خیالات سے ہوتا ہے اور یہ وقت ہی ہے جو انسان کو اپنی انگلیوں سے بندھی ڈور سے نچاتا رہتا ہے، انسان وقت کے ہاتھوں کس قدر مجبور ہے، اور آج اسے بھی اتنے عرصے بعد وقت نے دوبارہ خواب دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اپنے کمرے میں لیٹی حسین خوابوں کے تانے بانے بنتی اور ادھیڑتی رہی۔
واقعی غیب کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے ہم تو اگلے لمحے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ کیا ہونے والا ہے، سب کو ہی ارباز اور اس کی مما بہت پسند آئی تھیں، وہ دونوں بھی سب سے مل کر اپنی اتنی پزیرائی پر بہت خوش تھے۔ بہت خوب صورت گول مٹول سا شہباز تو سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور فوراً ہی بچوں میں گھل مل گیا۔ کھانا بہت ہی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے تھے۔
وہ لوگ شہزا کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور نکاح کے بعد ہی اس کا ویزا مل سکتا تھا، اس لیے نکاح دو دن بعد سادگی سے کر دیا گیا تھا اور مشترکہ طور پر دونوں طرف سے پروگرام بنا تھا کہ ایک ماہ بعد رخصتی اور ولیمہ دھوم دھام سے ہوگا پھر کچھ دن کے لیے دونوں پاکستان کے خوب صورت ترین پہاڑی علاقوں پر ہنی مون کے لیے جائیں گے۔ نکاح کے بعد شہزا نے شہباز سے اپنے آپ کو مما کہلانا شروع کر دیا تھا اور اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا، وہ بھی اپنی مما اور اتنے اچھے دوستوں کو چھوڑ کر ہوٹل کے خاموش کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ بہنیں اور بھابیاں اسے چھیڑتی رہتیں کہ وہ یہ راز کب سے اپنے سینے میں دبائے بیٹھی تھی... کسی کو ہوا ہی نہیں لگنے دی اور آنے والے تمام رشتے ٹھکراتی رہی۔
''ارباز بھائی تو ہیں ہی ایسے کہ ان کے لیے تمام زندگی انتظار کیا جاسکتا تھا۔'' ان سب کی تان اسی جملے پر آ کر ٹوٹتی، وہ ان کی باتوں پر مسکراتی رہتی۔
زندگی ایک دم ہی اتنی حسین ہو گئی تھی۔ بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب وہ ارباز کی دلہن بن گئی۔ زندگی کتنی حسین ہو گئی تھی...شادی کے دو ماہ بعد ہی وہ امریکا چلا گیا تھا اور وہاں جا کر اپنی فرم کے ذریعے ویزے کی بھی دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔
وہ بہت خوش اور مطمئن تھا کہ مائیکل کی بھرپور توجہ اور تعاون کرنے کی وجہ سے اس کا کام دو ماہ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ بس اب ویزا اس کے ہاتھ آنا رہ گیا تھا، وہ مائیکل کا بہت ممنون تھا۔ وڈیو کال کے ذریعے وہ شہزا سے رابطے میں تھا۔ شہباز بھی اپنی مما کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔ اس نے شہباز، زیبا اور رمشہ کے لیے بھی بہت شاپنگ کی تھی۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا تھا جب اسے سچ مچ پرائے دیس جانا تھا۔ راحت اس کی عزیز از جان دوست بھی اسے الوداع کہنے آئی تھی۔ ایک طرف تو گھر والے خوش تھے مگر دوسری طرف شہزا کے اتنی دور جانے سے اداس بھی بہت تھے غرضیکہ امی، ابا نے بہت دعاؤں میں اسے رخصت کیا تھا۔ وہ فکرمند بھی تھے کہ اتنی دور کا سفر اکیلے وہ پہلی بار کر رہی تھی۔ ارباز نے اسے تمام ضروری کاغذات، فون نمبرز ایڈریس سب طریقہ کار اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔
بائیس گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے وہ نیویارک کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر کھڑی انکوائری آفس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ پہلی دفعہ آئی تھی گھبرا بھی بہت رہی تھی۔ کئی گھنٹوں کے بعد وہ لاؤنج سے باہر آئی اور ارباز کی منتظر کھڑی تھی کہ اسے دور سے شہباز آتا دکھائی دیا اور یہی وہ وقت تھا کہ جب اس کی خوشیاں بدنصیبی میں بدل رہی تھیں۔ ابھی وہ آگے بڑھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ نامعلوم سمت سے آنے

والی تیز رفتار لوڈڈ ٹرالی سے ٹکرا گئی سامان زیادہ لدا ہونے کے باعث لوڈر درست طریقے سے دیکھ نہ پایا تھا۔ شہزا لڑکھڑا کر گری تھی۔ ہینڈ بیگ چھوٹ کر کہیں دو رجا پڑا تھا۔

اسی اثنا میں شہباز کے ساتھ ارباز بھی اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ یہ کیسی ناگہانی تھی... شہزا سر کے بل گری تھی لوڈڈ ٹرالی کا سامان بھی اس پر آرہا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اپنے خوابوں کی سرزمین پر آتے کے ساتھ ہی اس کے ساتھ کیسا حادثہ پیش آیا تھا کہ گھر والوں کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع بھی نہ دے پائی۔ ارباز اسے لے کر فوری اسپتال کی طرف دوڑا تھا۔ آناً فاناً ایمبولینس اور میڈیکل عملہ آچکا تھا۔

آج اسپتال میں اسے پانچواں دن تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ خطرے سے تو باہر تھی مگر اس کی گردن کی ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ گھر والوں کو فون کر دیا گیا کہ وہ بخیریت پہنچ گئی مگر دو دن آرام کرنے بعد بات کرلے گی مگر آج پانچواں روز گزرنے کے بعد بھی وہ بات کرنے کے قابل نہیں ہو سکی تھی۔ گھر والوں کو طرح، طرح کے وسوسے گھیرے ہوئے تھے۔ آخر ساتویں روز ارباز نے اس کے گھر والوں کو درست صورتِ حال بتا دی تھی اور اسپتال کی وڈیو بھی بنا کر بھیج دی تھی۔ ارباز کی والدہ کا کہنا تھا کہ شہزا کے امی، ابو کو ضرور بتا دو تاکہ وہ اس کے حق کے میں دعائیں تو کریں۔

''امی آخر میرے ہی ساتھ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟'' آج ارباز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا وہ امی کے سامنے سسک پڑا تھا۔

''بیٹا بس یوں سمجھو اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو ہی آزماتا ہے۔''

وہ ارباز جو مسجد کم، کم ہی جاتا تھا اب اس کے دن و رات گویا وہیں بسر ہونے لگے تھے کم سن شہباز بھی اپنے رب کے حضور دعائیں کرنے لگا۔ بالآخر سب کی دعائیں رنگ لے آئیں اور آج شہزا کو فزیوتھراپسٹ نے اٹھا کر بٹھایا تھا اور اس نے قدم بھی زمین پر رکھنے کو کہا..... پندرہ دنوں میں گویا بالکل وہ کملا کر رہ گئی تھی۔

آج رمشہ اور زیبا اسے دیکھنے آئیں تو اسے تیار کیا تھا اور آج ہی اس کی پاکستان میں وڈیو کالنگ کے ذریعے بات بھی کروادی تھی۔ امی اسے دیکھ کر رو پڑی تھیں۔

''شہزا کے ابا میری بچی کا رنگ سانولا ضرور تھا مگر اس کے نصیب اتنے سخت ہوں گے مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔'' وہ اس سے بات کر کے اب گھر والوں کے سامنے رو رہی تھیں مگر یہ آنسو شکر کے آنسو تھے کہ اللہ نے شہزا کو نئی زندگی عطا کی تھی۔

اُدھر رمشہ اور زیبا نے اس کی صحت یابی کے سلسلے میں گھر میں پارٹی کا اہتمام کر رکھا تھا جسے ارباز نے یک دم مسترد کر دیا کہ پہلے گھر میں شکرانے کے نوافل ادا ہوں گے قرآن خوانی اور محفلِ میلاد ہوگی پھر تم لوگوں کا جو دل چاہے کرنا..... امی نے بھی ارباز کی بات کی تائید کی تھی۔

آج ان کے گھر میں عجیب رونق تھی، دو دن پہلے شہزا اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی تھی اور آج اسی سلسلے میں گھر میں شکرانے کی محفل کا اہتمام تھا۔ ان کے قریبی رشتے دار اور دوست احباب جمع تھے۔ شہزا کو دلہن کی طرح دونوں نندوں نے سجایا تھا۔ وہ اپنی سانولی سلونی رنگت میں بھی کسی حور پری سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ جب دلوں میں سچی خوشی کے شادیانے بج رہے ہوں، ہر طرف خلوص و محبت کی برسات ہو اور وفا اور پیار کے رنگ بکھرے ہوئے ہوں تو ظاہری چکا چوند اور خوب صورتی اس سچی خوشی کے آگے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آج وہ سیاہ بخت نہیں بلکہ خوش بخت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بڑی سے بڑی آزمائش سے گزار کر کندن بنا دیا تھا۔ بے نام مسافتیں منزل پا چکی تھیں کہ یقین کی راہوں میں خار تو چننے ہی پڑتے ہیں۔

❁❁❁

میں ایک ملازمت پیشہ عورت ہوں۔ آپ مجھے ایک کامیاب ورکنگ وومن بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں خود کو چند ماہ پہلے تک واقعی ایک کامیاب ملازمت پیشہ عورت سمجھتی تھی لیکن پچھلے کچھ ماہ سے میرا یہ یقین ڈگمگا رہا ہے کہ آیا میں کامیاب ہوں کہ نہیں۔

میں ایک عورت ہوں بلکہ ایک خود مختار عورت۔

آپ کو معلوم ہے کہ خود مختاری ایک عورت کے لیے کیا معنی رکھتی ہے.....؟

خود مختاری ایک نعمت ہے جو ہر عورت کے حصے میں نہیں آتی اور جس عورت کو یہ مل جائے وہ پھر زمین پر نہیں رہتی۔ اس کے قدم زمین سے دو فٹ اونچے ہو جاتے ہیں۔

ایک ہی راہ ہے مسافت کی

فرح بھٹو

ناولٹ

آپ میری تمہید سے الجھ رہے ہوں گے۔ الجھنا بھی چاہیے۔ کیونکہ میری ان باتوں سے آپ کو وہ بات واضح نہیں ہو پا رہی جو میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔

ٹھہریے میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں۔

ہاں تو میں بات کر رہی تھی ایک ورکنگ وومن کی یعنی اپنی..... میں ایمن جنید ایک ملازمت پیشہ اپنی نظر اور دنیا کی نظروں میں ایک کامیاب عورت.....

☆☆☆

میں نے ایک مڈل کلاس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ میری امی ایک عام گھریلو عورت تھیں۔ کم پڑھی لکھی اور بہت زیادہ فرمانبردار۔

ابا ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بہت سخت طبیعت اور غصہ ور۔ وہ اپنی ہیڈ ماسٹری روز اسکول سے گھر لے کر آجاتے تھے۔ ان کے گھر میں قدم رکھتے ہی ہم پانچوں بہن بھائی اور امی بتوں کے مانند گونگے ہو جایا کرتے۔ ابا کو آوازیں اور شور پسند نہ تھا۔ اور امی نے اپنی زبان لپیٹ کر رکھ لی تھی۔ ساتھ ہم بچوں کو بھی چپ کی ایسی گھٹی پلائی کہ ابا کے آگے چوں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ گھر میں ابا کے حکم کا سکہ چلتا تھا۔ ہر کام ان کی مرضی کے مطابق ہوا کرتا۔ وہ کسی جابر حکمران کی طرح ہم چھ جانوں پر مسلط کر دیے گئے تھے۔ وہ دن کو رات کہتے تو ہمیں آسمان پر واقعی تارے دکھائی دیتے۔ اور جس کو نہ نظر آتے اس کو چار چوٹ کی ایسی مار پڑتی کہ آنکھوں کے آگے تارے گھوم جایا کرتے تھے۔

ان کو اس حد تک ہم پر آخر کس چیز نے مسلط کیا تھا؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جو میرے ذہن کو بے چین رکھتا پر مجھے اس کا واضح جواب نہ ملتا۔ میں امی کا آنچل پکڑ کر اکثر اُن سے یہ بات پوچھا کرتی۔

''وہ اس گھر کے سربراہ ہیں۔ روپے کما کر گھر لاتے ہیں۔ ہماری کفالت کرتے ہیں۔ ان کا حق ہے کہ وہ ہم پر رعب جمائیں۔ غصہ کریں۔'' امی دھیمی آواز میں بتایا کرتیں تو میں یہ سن کر سوچ میں پڑ جاتی۔

تو کیا صرف روپے کما کر گھر لانے سے کوئی اس حد تک دوسروں کی جانوں کا مالک بن بیٹھتا ہے کہ ان کے ہنسنے بولنے، اٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ ان کی آتی جاتی سانسوں پر بھی اجارہ داری قائم کر لیتا ہے.....؟ ایسے ہی سوال میرے ذہن میں کلبلاتے۔ مجھے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہماری سانس کا مدھم شور بھی کسی دن ابا کو گراں گزر گیا تو ہم شاید زندگی کی اس نعمت سے بھی محروم کر دیے جائیں گے۔

کچی عمر سے سنِ شعور میں آنے تک میری ذہنی الجھنوں کا سبب ابا کا رویہ رہا۔ میرے دوسرے بہن بھائی اس رویے کے عادی ہو گئے یا کروا دیے گئے لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ردِعمل کے طور پر میرے اندر بغاوت پنپتی رہی۔ میں محکوم بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ میں رعایا کے بجائے فرمانروا بننے کی خواہشمند تھی اور اس کے لیے مجھے خود مختاری چاہیے تھی..... اور خود مختاری کا حصول کیسے ممکن تھا؟

میرا دماغ سراغ لگانے لگا۔ ہاں روپے..... ڈھیر سارے روپے کما کر میں خود مختار بن سکتی تھی۔ جیسے ابا روپے کما کر حاکم بن گئے ہیں۔

یہ سوچ میرے اندر جڑ پکڑ گئی پھر اس سوچ کو تقویت نجو خالہ کو دیکھ کر ملی۔ نجو خالہ میری اماں اور ابا کی سگی چچازاد بہن تھیں۔ خوب صورت، طرح دار اور خود مختار۔ میں نے پہلی بار ایسی رعب دار عورت دیکھی تھی جو میرے ابا کو بھی منٹوں میں خاموش کروا دیتی۔

میرے ابا جو ہمارے گھر کے حکمران تھے۔ جن کے آگے ہماری گھگی بندھ جایا کرتی تھی اور اماں تو ان کے سامنے نظر نہ اٹھا سکتی تھیں بس ہاتھ باندھے کھڑی رہتیں۔ ان کو نجو خالہ کسی گنتی میں نہ لاتیں۔

میرے شعور میں نجو خالہ پہلی بار کراچی سے اماں کو ملنے آئی تھیں۔ پہلی بار میں نے ان کو بغور دیکھا اور پرکھا تھا..... اور پھر مارے حیرت کے دانتوں تلے انگلیاں دبا لی تھیں۔

جدید تراش خراش کے لباس میں ملبوس بالوں کو باب کٹ اسٹائل میں کٹوائے چہرے پر بلا کا اعتماد

سجائے وہ اپنا سفری بیگ لے کر جب ہمارے آنگن میں اتریں تو گویا بہار اتر آئی۔ وہ در و دیوار جو نسوانی ہنسی سے ناآشنا تھے، وہ نسوانی قہقہوں سے گونجنے لگے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بے فکری سے قہقہے لگاتیں نجو خالہ تو کسی اور سیارے سے آئی مخلوق معلوم ہوتیں۔

پہلے تو ہم بچوں سے باری باری ہاتھ ملا کر نام پوچھا پھر اپنے بیگ سے چاکلیٹس اور کھلونے نکال کر ایک، ایک کو دیے۔

''ارے ایمن تو قد نکال کر بہت پیاری ہوگئی ہے میں تو ابھی بچی سمجھ رہی تھی تبھی اس کے لیے باربی ڈول لے آئی۔''

نجو خالہ نے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے میرے لیے لائی ڈول فاطمہ کو دے دی۔

''ہاں تو اتنے سال بیت گئے تمہارے آخری لگائے گئے چکر کو۔ اب وقت ٹھہر جاتا کیا۔'' اماں کی کھنکتی آواز مجھے چونکا گئی۔ وہ مسکرا بھی رہی تھیں، مجھے تعجب ہوا۔

''کس کلاس میں پڑھتی ہو؟'' نجو خالہ نے سوال کیا تو میں نے دسویں جماعت بتا کر ساتھ عادتاً سیکشن بھی بتایا تو انہوں نے ایک قہقہہ لگایا۔

''بہت ہی سادہ ہو ایمن تمہاری عمر کی لڑکیاں تو آج کل پوری فلمیں ہیں۔''

''یہ سادہ ہی اچھی ہے نجو۔ بس اپنی پڑھائی پر دھیان دے۔'' اماں نے کہا تو نجو خالہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگیں۔

''میں اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتی ہوں۔'' میں نے یہ بتا کر ان کی آنکھوں میں اپنے لیے مزید ستائش دیکھنی چاہی۔

''ارے واہ..... منیرہ اب اس کی شادی جلدی نہ کر دینا بہت سارا پڑھانا اس گڑیا کو۔ پتا چلے کہ اپنی طرح بس گھر کی چکی تلے پیس دو بیچاری کو۔''

نجو خالہ نے مجھے ساتھ لگا کر پیار سے کہا تو اُن کے لباس سے اٹھتی پرفیوم کی مہک نے مجھے مسحور سا کر دیا۔

میرے جہیز کی کڑاہی

والد صاحب کا تبادلہ شہر سے چالیس میل دور ہوا تھا۔ وہ اپنے اردلی کے ساتھ اکیلے رہتے اور ضرورت کے مطابق سامان ساتھ لے کر جاتے جس میں ٹین کے ایک بکس میں باورچی خانے کا ضروری سامان ہوتا۔

گرمی کی چھٹیوں میں ہم سب ان کے پاس رہنے کو گئے۔ ڈاک بنگلے میں رہائش کے سب امی نے صرف کپڑے، اسکول کی کتابیں بستر بند وغیرہ ساتھ لیا..... آس پاس چند گھر تھے جہاں بابو قسم کے لوگ رہائش پزیر تھے۔ سارا سامان تھا مگر کڑاہی نہیں تھی۔ ایک روز امی نے پڑوس والوں سے کڑاہی منگوائی تو ساتھ ہی پڑوسن نے یہ تاکید کی کہ یہ میرے جہیز کی کڑاہی ہے اس میں صرف حلوا بنایا جائے، پکوڑے ہرگز نہ تلے جائیں ورنہ خراب ہو جائے گی۔ بیچاری گاؤں کی عورت تھی بولنے کا سلیقہ نہیں تھا ایک آدھ بار کہا بھی کہ اتنے بڑے افسر لوگ ہو اور گھر میں ایک کڑاہی نہیں ہے۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری بہن کا ارادہ پکوڑے تلنے کا تھا اور انہوں نے گرما گرم پکوڑے تلے بھی اور ان خاتون کو بھی کھلائے۔ کھاتے، کھاتے انہیں جیسے بریک لگ گئے۔ ہائے ہائے! کہیں میرے جہیز کی کڑاہی میں پکوڑے تو نہیں تل لیے؟

اس کے بعد ابا کے سامان میں ایک عدد کڑاہی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

مرسلہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

''اب یہ تو اس کے ابا کی مرضی کتنا پڑھنے دیتے ہیں۔ ویسے لڑکی جتنی جلدی اپنے گھر کی ہوا اچھا ہے پکی عمر میں تو رشتے بھی نہیں ملتے۔'' اماں نے سادگی سے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔

''بھائی صاحب کو میں سمجھا دوں گی اور منیرہ تم نے اپنی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا؟ ساتویں پاس کی اور چچی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے سے دُگنی عمر کے مرد سے بیاہ دیا۔ کچی عمر میں کتنے ہی بچے پیدا کر لیے۔ کتنے زندہ رہے کتنے چل بسے۔ نہ گھر چلانے کی عقل نہ بچے سنبھالنے کا شعور۔ پھر بھائی صاحب کا مزاج سونے پر سہاگا، پہلی رات سے تمہیں ایسا دبایا کہ ساری زندگی سر نہ اٹھا سکیں ان کے آگے۔ ارے وہ انسان ہی تو ہیں کوئی جن نہیں جو اتنا ہولتی رہتی ہو۔ بچوں کی حالت بھی پتلی کر رکھی ہے۔ اتنا خوفزدہ ہیں باپ سے جس کی حد نہیں۔ پچھلی بار جب میں آئی تو ایمن سے شیشے کا گلاس غلطی سے گر کر ٹوٹ گیا۔ لڑکی تو پیلی پڑ کر مرنے جیسی ہوگئی کہ ابا کو پتا چلے گا تو کیا ہوگا... اُف توبہ اتنا ڈرا تا خوف.....'' نجو خالہ نے جھرجھری لی تو میں خفت زدہ ہوگئی۔

''ان کی عادت کا تو تمہیں پتا ہے۔'' اماں کھسیا سی گئیں۔

''ہاں پتا ہے ان کی عادت کا اور تمہاری بے جا اطاعت کا بھی۔'' نجو خالہ نے ہاتھ سے مکھی اڑائی۔

''اچھا اب تم منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ کب سے تکلف سے بیٹھی ہو۔'' اماں نے ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کروائی تو نجو خالہ میری ہمراہی میں واش روم کی طرف چلی آئیں۔

''لڑکی تم اپنی ذہانت چولھے میں مت جھونک دینا۔'' وہ میرے ہاتھ سے دھلا تولیا لے کر تاکید سے بولیں تو میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''گڈ گرل!'' وہ مسکرائی تھیں۔

☆☆☆

اور سر ہلا دینے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ میری آگے پڑھنے کی خواہش سے ابا کو زیادہ سروکار نہیں۔ وہ ایک ہیڈ ماسٹر ہونے کے باوجود روایتی ذہنیت رکھتے تھے اور لڑکی ذات کو بٹھائے رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ کوئی مناسب رشتہ کو دیکھ کر جلد ہی مجھے ڈولی چڑھانے کا ان کا ارادہ تھا اور میں نے اپنے خدشات کا اظہار نجو خالہ سے کرتے دیر نہ لگائی۔ وہ مختصر دنوں میں مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکی تھیں۔

''تم فکر نہ کروایمن۔ بس دل لگا کر تعلیم حاصل کرو۔ بھائی صاحب سے میں خود بات کرلوں گی۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔

اور پھر ابا سے میرے آگے تعلیم جاری رکھنے پر ایسا اصرار کیا کہ میٹرک کے بعد انٹر تک میں آرام سے پڑھتی رہی۔

انٹر کا رزلٹ بھی میرا بہت اچھا آیا۔ میں خوشی میں جھوم رہی تھی کہ آگے بہت سارا پڑھوں گی کہ نہ جانے کہاں سے حماد کا رشتہ میرے آنگن میں پہلا بیری کا پتھر بن کر چلا آیا۔

حماد کسی محکمے میں معمولی کلرک تھا۔ آٹھ بہن بھائیوں اور والدین سمیت بھرا پُرا کنبہ تھا۔ اماں تو اس رشتے کے آنے پر سجدۂ شکر بجا لائیں کہ گھر آنگن میں بیریوں کی تعداد زیادہ تھی اور پتھر آنے کے امکان کم۔

''ارے آج کل سفید پوش گھرانوں کی لڑکیوں کو معمولی جہیز کے ساتھ پوچھتا کون ہے۔ لڑکے والے بھی وہاں رشتہ ڈالتے ہیں جہاں سے بھر، بھر جہیز ملے۔''

اماں نے اپنے تئیں حقیقت بتائی تو میں سرخ آنکھوں سے ان کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

پھر میں نے نجو خالہ کو فون پر صورتِ حال بتا کر مدد کرنے کی استدعا کی تو وہ میری رندھی آواز اور ٹوٹے لہجے پر پسیج گئیں اور اگلے ہی دن اپنی ملازمت سے عرضی دے کر دوڑی چلی آئیں۔

ابا کچھ دن ٹھہر کر ہاں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ابھی لڑکے کے متعلق ان کی چھان بین جاری تھی کہ نجو

خالہ درمیان میں آگئیں۔

"بھائی صاحب ایمن بہت ذہین لڑکی ہے اس کو اپنی صلاحیتیں آزمانے تو دیجیے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہوگی تو ایک سے ایک رشتہ مل جائے گا۔ آپ جلد بازی مت کریں۔"

نجو خالہ سینہ ٹھونک کر میدان میں کود پڑی تھیں۔

ابا کی پیشانی پر بل گنتی اماں کا دل ہول سا گیا۔ وہ نجو خالہ کو اشارتاً خاموش کرانے لگیں۔ مگر نجو خالہ چپ رہنے والی تھیں بھلا۔

"اس نے پڑھ لکھ کر کون سا منسٹر لگ جانا ہے۔" ابا نے ناگواری سے آنگن کے پلر کے پیچھے سے لہراتا میرا دوپٹا دیکھ کر کہا۔

"تعلیم شعور دیتی ہے بھائی صاحب اور وقت پڑنے پر سہارا بھی۔ انٹر کو آج کل پوچھتا کون ہے... کم از کم ماسٹرز کرلے لڑکی تو وقت پڑنے پر خود اپنا پیٹ بھرنے جیسی تو ہو۔" انہوں نے رسان سے کہا تو ابا نے گھور کر انہیں دیکھا۔

"میری بیٹی پر لازمی برا وقت آنا ہے۔"

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ آپ کی بیٹی اپنے پیروں پر کھڑی ہوگی تو معاشرے میں ایک مقام حاصل ہوگا اور سسرال میں بھی عزت ملے گی۔ معاف کیجیے گا مگر آج کل جی حضوری کرنے والی خاموش خدمت گار بیوی کو شوہر بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔" نجو خالہ نے سر جھکا کر انگلیاں مروڑتی اماں کو دیکھ کر کہا تو ابا نے ہنکارا بھرا۔

"وہ زمانے لد گئے بھائی صاحب جب سگھڑاپا، سلیقہ شعاری اور خدمت سے دل جیتے جاتے تھے۔ اب تو ان کاموں کے لیے گھریلو ملازمائیں رکھ دی جاتی ہیں۔ اور گھر کی بہو سے کسی کمائی والے ہنر کی توقع کی جاتی ہے۔ جس سے وہ اپنا اور کنبے کا ہاتھ بٹانے میں معاون ثابت ہو اور عزت بھی انہی لڑکیوں کو دی جاتی ہے جو تعلیم یافتہ اپنا کمانے والی ہوں۔" نجو خالہ نے تقریر ہی کر ڈالی تھی۔

"میری زندگی کی ہی مثال لے لیں۔ میاں نے پانچ سال بعد اولاد نہ ہونے کی سزا مجھے اپنی زندگی سے نکال کر دی۔ پیچھے طوطا چشم بھائی مجھے سہارا دینے کو تیار نہ تھے۔ پھر کون کام آیا؟ اللہ کے بعد میری تعلیم نے مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دی اور آج اللہ کے فضل سے میں کسی کی محتاج نہیں۔ کئی رشتوں کو ٹھکرا دیا کہ شادی سے دل ہی اٹھ گیا لیکن پھر بھی مطمئن زندگی گزار رہی ہوں۔ سوچیے تو اگر ہاتھ میں یہ چند ڈگریاں نہ ہوتیں تو اب تک در بدر کی کتنی ٹھوکریں کھا چکی ہوتی میں۔" وہ آخر میں کچھ جذباتی سی ہو کر بولیں۔

ابا خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے۔

"براوقت بتا کر نہیں آتا۔ میں بھی نازوں پلی تھی۔ ابا کے بعد ماں جائے بھی پرائے ہوگئے۔ بھائی صاحب!" وہ نزاکت سے آنکھوں میں آئی نمی ٹشو سے پونچھنے لگیں۔

اماں دم سادھے کھڑی تھیں تو میری سانس بھی رکی ہوئی تھی اور ساعتیں ابا کی متوقع آواز کی طرف لگی تھیں۔

"ایمن اِدھر آؤ۔" یکا یک ابا بلند آواز میں پکارے تو میں حواس باختہ سی پلر کے پیچھے سے باہر نکلی اور دھیمے قدموں سے ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"جی!"

"آگے پڑھنا چاہتی ہو؟" ابا کے غیر متوقع سوال پر میرا منہ کھلا۔

"جی!"

"کیا جی، جی لگا رکھی ہے؟ صاف جواب دو۔" ابا نے ڈانٹا تو میں خائف ہوگئی۔

"جی ابا، میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔"

اب کے کچھ اعتماد سے بولی تو ابا بغور مجھے دیکھتے رہے۔

"بھائی صاحب میں نے ایمن کے اکیڈمک ریکارڈز دیکھے ہیں، ہر جماعت میں اول آئی ہے آگے ضرور پڑھنا چاہتی ہے۔" نجو خالہ نے میرے قریب آکر شانے پر ہاتھ رکھا تو مجھے ڈھارس ہوئی۔

"یہاں ہمارے چھوٹے سے شہر میں تو لڑکیوں کے لیے انٹر تک بمشکل کالج بن سکا ہے آگے کہاں پڑھے گی۔ میں لڑکیوں کے ہاسٹل وغیرہ میں رہنے کے سخت

خلاف ہوں سو یہ بھول جاؤ کہ میں اس کو دوسرے شہر کی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لینے دوں گا۔'' ابا نے اچانک تیز آواز میں نکتہ اٹھایا تو میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

''ہاسٹل کیوں میرا گھر حاضر ہے اپنی بچی کے لیے۔''

نجو خالہ فوراً بولیں تو ابا نے ابرو اٹھا کر انہیں دیکھا۔ میں اور اماں بھی حیران رہ گئے۔

''اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ آپ کو اپنی بچی میرے ہمراہ بھیجنے میں تحفظات ہیں۔ سارا خاندان گواہ ہے میرے اخلاق و کردار کا۔ آج تک کسی کو خود پر انگلی نہیں اٹھانے دی۔ مردوں کے اس معاشرے میں سر اٹھا کر اور عزت بچا کر جی رہی ہوں بھائی صاحب..... اور آج سے نہیں پچھلے پندرہ سالوں سے الحمدللہ!''

نجو خالہ کا اعتماد دیدنی تھا۔ اماں لرزتی ہوئی جل تو جلال تو کا ورد کیے جا رہی تھیں۔

''ہم.....م.....'' ابا ہنکارا بھر کر کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ اس دوران میں شدت سے اللہ سے دعا گو رہی کہ ابا کا جواب اثبات میں ہو۔

''نجو باتیں خوب کر لیتی ہو۔'' ابا نے بالآخر خاموشی توڑی۔

''صرف باتیں نہیں سولہ آنے سچی باتیں۔'' نجو خالہ نے دھڑلے سے جتایا۔

ابا نے پُرسوچ انداز میں اپنی چچیری بہن کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے، لے دیتے ہیں ایمن کو یونیورسٹی میں داخلہ۔'' ابا کے الفاظ تھے کہ خوشی کی بانسری سے بہتا سنگیت۔ میں بے ساختہ جھوم اٹھی۔

نجو خالہ نے بھی مسکرا کر پُرسکون سانس کھینچی۔

اماں نے حیرت و خوشی کے ملے جلے انداز میں اپنے سرتاج کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

سپنے اس طرح بھی حقیقت کا روپ دھار سکتے ہیں۔ میں یونیورسٹی میں پہلے دن اس طویل و عریض اور خوب صورت عمارت کی دیواروں کو نامحسوس انداز میں ہاتھوں سے چھو کر سوچتی رہی۔ میں ایمن عمران ایک چھوٹے سے شہر کے دبے دبائے ماحول میں پرورش پانے والی ایک قدرے مخصوص ذہن کی عام سی لڑکی..... ابا کی اجازت کے بعد دوسرے مرحلے آسانی سے طے ہو گئے۔ نجو خالہ مجھے اگلے دن ہی اپنے ساتھ شہر لے آئیں۔ ساتویں منزل پر بنا ان کا جدید انداز کا لگژری فلیٹ جس تک پہنچنے کے لیے خود کار لفٹ استعمال کرنی پڑتی تھی مجھے بہت اچھا لگا لیکن افراد بہت تھوڑے یعنی میں، نجو خالہ اور ایک کل وقتی نوعمر ملازم۔

شروع میں مجھے عجیب سی بے آرامی محسوس ہوئی۔ کہاں بھرا پُرا گھر اور کہاں ہم ڈھائی بندے۔ پھر جلد ہی میں یونیورسٹی کے ٹیسٹ کی تیاری میں جت گئی جس کے بغیر داخلہ ناممکن تھا۔

نجو خالہ کسی بینک میں اچھے عہدے پر ملازم تھیں۔ وہ صبح نو بجے سے گھر سے نکلتی تو شام کو ہی واپس آتیں۔

میں سارا دن پڑھتی رہتی اور پھر دوپہر کا کھانا بنا لیا کرتی جو رات میں بھی ہم دونوں کے کام آجاتا۔ نجو خالہ میرے ہاتھ کے ذائقے کی معترف تھیں ان کے بقول اماں سے مجھے ورثے میں اچھا پکانے کا ہنر ملا تھا۔

بہرحال مجموعی طور پر ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش تھے۔ نجو خالہ اتوار کو مجھے باہر گھمانے بھی لے جاتیں۔ ہم آدھا دن گھوم پھر کر آخر میں ڈنر کر کے گھر لوٹتے۔ انہوں نے مجھے نئے تراش خراش کے کپڑے بھی لے کر دیے تھے جو کافی آنا کانی کے بعد میں نے رکھ لیے تھے۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں داخلہ ملنے کے بعد زندگی یک دم ہی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ یہاں ایک الگ دنیا میرے سامنے تھی جس میں نئے رنگ تھے نئی آگہی تھی۔

دورِ جدید سے ہم آہنگ شاگرد اور استاد، آزادی، فیشن اور تعلیم ساتھ ساتھ۔

میں دل ہی دل میں ان نئے رنگوں کو دیکھ کر خوب ہی حیران ہوئی پھر میں نے اپنی ترجیحات کا تعین کرنا شروع کیا۔ میں نے اپنی اول ترجیح صرف اپنی تعلیم کو

بنالیا کہ بہرحال میں ایک نچلے متوسط طبقے کی ایسی لڑکی تھی جو نہ مہنگے، مہنگے کپڑے افورڈ کرسکتی تھی نہ آزادی کے نام پر غیر لڑکوں سے دوستیاں کرکے اپنے ابا کی عزت کو مٹی کرسکتی تھی۔ اور اس تعین کے بعد میں مطمئن ہوکر اپنی پڑھائی میں مگن ہوگئی۔

میری ذہانت اور تعلیم پر توجہ نے رفتہ، رفتہ کئی استادوں کے دلوں میں میرے لیے قدر پیدا کردی اور اپنے ڈپارٹمنٹ میں، میں ایک اچھی شاگرد کے طور پر جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

☆☆☆

وقت پانی کی روانی سے بہتا چلا گیا اور میں تعلیم کے مزید چار سال مکمل کرکے عمدہ رزلٹ کے ساتھ یونیورسٹی سے فارغ ہوگئی۔

ان چار سالوں میں، میں بہت کم اپنے ابا اماں سے ملنے گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب میرا دل وہاں لگتا ہی نہ تھا۔ مجھے شہر کی رنگ و بُو نے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا میں اس ماحول کی عادی ہوگئی تھی۔ یہ آرام دہ فلیٹ جس میں ہم ڈیڑھ بندے آرام وسکون سے رہتے تھے ابا کے دو کمروں اور بڑے دالان والے گھر سے مجھے کئی گنا اچھا لگنے لگا تھا۔ جہاں میری سانسوں پر ابا کے خوف کا بوجھ دھرا تھا۔ میں مارے باندھے اماں کے بے حد اصرار پر ایک آدھ دن کے لیے وہاں چلی بھی جاتی تو عجیب بے چینی میں وقت گزرتا اور رسیاں تڑوا کر واپس شہر بھاگ آنے کی جلدی ہوتی سو اپنے بہن بھائیوں سے بھی ان چار سالوں میں عجیب سی دوری ہوگئی تھی۔

میرے اور ان کے بیچ ایک تکلف در آیا تھا۔ اماں بھی مجھ سے کچھ کھنچ گئی تھیں، ان کو گلہ رہتا کہ میں شہر جاکر بہت بدل گئی ہوں اور ان کی پہلے والی ایمن نہیں رہی۔ ابا کو البتہ میں ویسا ہی پاتی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے حال احوال کرتے، پڑھائی کی تلقین کے ساتھ رعب سے کی گئی ان کی کئی نصیحتیں میں بظاہر سر جھکا کر سنتی تھی۔

اور اب تعلیم مکمل کرنے کے بعد جبکہ میں نے پوری طرح سے اس ماحول کو اپنا لیا تھا تو فطری طور پر آگے بھی شہر میں رہنے کی خواہشمند تھی۔ نجو خالہ کے مشورے پر میں نے بینک کی ملازمت کے لیے عرضی دے دی اور جلد ہی مجھے انٹرویو کال آگئی۔

انٹرویو کا نتیجہ حسب توقع اچھا رہا اور یوں مجھے نجو خالہ کی طرح بینک میں جاب مل گئی۔ اور اس دن میری خوشی آسمان تک پہنچی ہوئی تھی جب میں نے خودمختاری کی طرف پہلا قدم بڑھایا تھا۔ ایک عجیب سرمستی سی میں اپنے رگ وپے میں دوڑتی محسوس کررہی تھی۔ اب میں اپنا روپیہ خود کما سکتی تھی۔ اب میں بھی حکمرانی کے قابل بن گئی تھی۔

میں اپنی پہلی تنخواہ ملتے ہی مٹھائی اور تحفے تحائف لے کر اپنے گھر گئی تو میری خوشی دیکھنے والی تھی۔ اماں اور بھائی بہنوں میں تحائف بانٹ کر میں خود کو معتبر سا محسوس کرتی رہی۔ اس بار واقعی وہ سب مجھ سے مرعوب نظر آئے۔ چھوٹی بہنیں بھی رشک آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ بس ایک ابا کا رویہ ویسا ہی تھا۔ جیسے ان کو میری ملازمت یا خودمختاری سے کوئی فرق نہ پڑا ہو مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ لیکن میں نے ان کے رویے پر دل میلا نہیں کیا۔ میں بہت خوش تھی اور اس خوشی کو پھیکا نہیں کرنا چاہتی تھی سو ایک یادگار دن گزار کر نجو خالہ کے شہر واپس چلی آئی۔

☆☆☆

زندگی ایک معمول سے چلنے لگی۔ صبح سے شام تک بس کام، کام اور کام۔ میں نہایت لگن اور ایمانداری سے اپنی ملازمت انجام دے رہی تھی۔

دوسری طرف اماں پھر سے میری شادی کے لیے تیار بیٹھی تھیں اس بار میں نے قطعی انکار کردیا... میں فی الحال اپنا مستقبل بنانے کی تگ ودو میں لگی تھی اس وقت میں شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اماں نے اصرار کیا پھر مایوس ہوگئیں۔

کچھ عرصے بعد میری چھوٹی بہن کا بیاہ کردیا گیا۔ پھر دوسری کا۔ میں نے کافی سمجھایا کہ آگے

پڑھنے دیں پر کچھ اُن کو شوق نہ تھا کچھ اماں میری من مانی سے خائف ہوگئی تھیں سو کہنے لگیں "مجھے اپنے سر کے بوجھ اتارنے دو، بیچ میں مت پڑو۔"

میں خاموش سی ہوگئی بہرحال دونوں کی شادی پر بھاری تحائف اپنی طرف سے دے دیے۔

☆☆☆

وقت کے کاسے میں سالوں کے سکے تیزی سے گرتے چلے گئے۔ میں ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی برانچ منیجر کے عہدے تک جا پہنچی تھی۔

وہ بھی معمول کے دنوں جیسا ایک دن تھا جب جنید خان کسی کام سے میرے آفس میں چلا آیا۔ وہ ایک دراز قد اور وجیہہ بندہ تھا۔ کسی مقامی کالج میں ریاضی کا استاد۔ میرے سامنے آنکھیں جھکائے ادب سے میڈم، میڈم کی رٹ لگاتا جنید نہ جانے کیوں مجھے اچھا لگا۔

میں جس سیٹ پر بیٹھی تھی وہاں روزانہ کئی مردوں سے کام کے معاملات کے حوالے سے میرا واسطہ پڑتا تھا۔ میں مردوں کی نظروں اور ان کے انداز سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھی۔

ایک عورت کے لیے ان کے لہجوں میں لاکھ عزت سہی پر نگاہوں میں بہت کم عزت دیکھی تھی میں نے۔ لیکن جنید خان ان سے منفرد نظر آیا اور بعد کی دو تین ملاقاتوں میں یہ بات ثابت ہوگئی۔ وہ نرم لہجے میں اتنے احترام سے مجھ سے مخاطب ہوتا کہ میں حیران رہ جاتی۔ میں اس کے لیے اپنے دل میں انوکھے جذبے محسوس کرنے لگی تھی اور میرے آفس میں بہانے، بہانے سے لگنے والے اس کے چکر بھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ یہ آگ یک طرفہ نہیں۔

وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ریاضی میں ماسٹرز کرکے اب اپنی علمی پیاس دوسروں کو علم بانٹ کر بجھا رہا تھا۔ والدین اور دو بھائی گاؤں میں رہائش پزیر تھے، یہ اکیلا شہر میں رہ رہا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ مجھ سے بے تکلف ہونے لگا اور آخر ایک دن جھجکتے ہوئے اس نے مجھے شادی کا پیغام دے دیا۔ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی اور اس کو اپنے ابا کے گھر رشتہ لے کر آنے کو کہہ دیا۔

☆☆☆

پھر بعد کے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے کہ اماں تو پہلے ہی میرے بیاہ کے لیے فکرمند تھیں اور ابا کو تو لائق فائق دھیمے مزاج کا جنید بے حد پسند آیا تھا۔ نجو خالہ البتہ کافی خفا ہوئیں ان کے خیال میں مجھے اپنے عہدے کی ٹکر والا کوئی ہائی کلاس بندہ چننا چاہیے تھا ایسا رشتہ میرے قابل نہ تھا۔ میں بظاہر ان کو ہنس کر مناتی رہی، اپنے دل کی بات کیسے بتاتی کہ مجھے تو اسی طرح کا شریکِ سفر چاہیے جو مجھ سے سوشل اسٹیٹس میں کمتر ہو۔

آپ تو جانتے ہیں ناں کہ میں ایمن عمران ایسا کیوں چاہتی تھی؟

☆☆☆

جنید کے ساتھ نئی زندگی بہت خوشگوار انداز میں شروع ہوئی۔ وہ ایک چاہنے والا اور بے حد خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ مگر میں نے عام بیوی بننے کے بجائے اپنا میڈم والا رویہ برقرار رکھا۔ کچھ ہماری عمروں میں بھی تین چار سال کا فرق تھا۔ سو میں نے اپنا بڑا پن قائم رکھنے میں دیر نہیں لگائی۔

ہماری شادی سے پہلے وہ ایک کرایے کے فلیٹ میں رہائش پزیر تھا جس کو چار دوست شیئر کرتے تھے۔ شادی کے بعد ہم دونوں میرے خریدے گئے فلیٹ میں شفٹ ہوگئے تھے۔

زندگی اس نئی نہج پر بہت خوشگوار گزرنے لگی۔

میری زندگی میں جلد ہی نئے مہمان کی آمد کی خوشخبری ہم دونوں کو ہی خوش کرگئی۔ اب وہ میرا اور زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ میری پہلی پریگنینسی تھی اسی لیے میں عجیب کیفیات کا شکار تھی۔ پینک میں سارا وقت جی متلاتا رہتا۔ سستی ایسی کہ کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں چڑچڑی ہوگئی تھی۔ ایسے میں جنید سے بھی روکھی ہو جاتی پر وہ برا نہ مانتا۔

پھر الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہوا کہ میرے بطن میں

جڑواں بچے پل رہے ہیں اور یہ بات ہمارے لیے کسی سرپرائز سے کم نہ تھی۔

دن تیزی سے گزرتے گئے اور پھر وہ دن بھی آیا جب ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال میں، میں نے دو صحت مند جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ اس دن جنید کی خوشی قابلِ دید تھی۔ اس نے سارے اسٹاف کو خرچیاں دیں اور مٹھائیاں بانٹی تھیں۔

☆☆☆

دو بچوں کو اپنے وجود میں سینچنا جتنا مشکل تھا ان کی پیدائش کے بعد ان کو سنبھالنا اس سے زیادہ مشکل..... میری راتوں کی نیندیں اُڑ گئی تھیں۔ بھوک بھی دونوں کو ساتھ لگتی اور کپڑے بھی بار، بار خراب کرتے۔ میں نے اتنے سالوں سے کسی چھوٹے بچے کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ پہلے چھوٹے بہن بھائی بہلا لیتی تھی تاکہ اماں کام وغیرہ کرسکیں۔ لیکن بچے بہلانا الگ بات ہے اور ان کو چوبیس گھنٹے سنبھالنا ایک الگ بات۔

جنید نے اس معاملے میں بھی میرا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ ہر ممکن حد تک بچوں کو سنبھالنے میں میری مدد کرتا۔

اس کی اماں چلنے پھرنے سے معذور تھیں اور بہنیں بیاہی ہوئی۔ سو سسرال سے مجھے کسی قسم کی سہولت نہ مل سکی تھی۔

بچے راتوں کو جاگتے اور دن میں کچھ گھنٹے سونے کی روٹین اپنائے ہوئے تھے اور میں سر درد اور..... بے آرامی کی شکایت لیے آدھی پاگل ہو چکی تھی۔

اس رات بھی بچوں کو فیڈ کروا کر میں دونوں کو اپنی گود میں باری، باری لوری دیتے تھک کر چور ہوگئی تھی کہ پیاس محسوس ہونے پر بچوں کو بستر پر لٹایا اور خود دبے قدموں ڈسپنسر کی طرف بڑھی کہ نیم اندھیرے میں سامنے نظر پڑی تو الجھے بالوں والی ایک بھوتنی کو دیکھ کر زوردار چیخ ماری..... پھر بغور دیکھا تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں میرا ہی عکس تھا۔ بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ جنید بھی میری چیخ پر جاگ اٹھا تھا اور اب ہونق بنا مجھے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

میں نے ہنسی روک کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پانی پینے لگی۔

☆☆☆

میری چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں پھر سے جاب پر جانا شروع ہوگئی۔ بچوں کے لیے ایک آیا کا انتظام کرلیا تھا۔ اوپر کا دودھ بھی میں نے ان کو جلد شروع کروا دیا تھا کہ میری غیر موجودگی میں وہ اسی پر گزارہ کریں۔ جنید اور میں صبح ایک ساتھ گھر سے نکلتے۔ وہ دو بجے تک اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوجاتا اور گھر جا کر بچوں کی خبر گیری کرلیتا جبکہ میں شام پانچ بجے تک واپس آتی۔

جنید دوسری وقتی ماسیوں سے بھی اپنی موجودگی میں کام کرواتا تھا۔ باقی سالن میں رات میں بنا لیتی جو اگلے دن کام آجاتا۔ کبھی تھکن سے نہ بنا پاتی تو جنید بخوشی دوپہر میں لذیذ کھانا تیار کرلیتا تھا۔ اس کی یہ خوبی مجھے شادی کے بعد پتا چلی تھی۔ میرے لیے تو بہرحال یہ خوبی ہی تھی۔ مجھے اس کے کھانے پینے یا اس کے ذاتی کاموں کے لیے کبھی تردد نہیں کرنا پڑا۔ وہ اپنے کام خود کرنے کا عادی تھا اور میں نے اس کی یہ عادت خراب نہیں کی تھی۔

☆☆☆

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل رہی تھی۔ بچے اب اسکول جانے لگے تھے۔ ان کو اسکول چھوڑ کر آنے اور گھر لانے کی ذمّے داری بھی جنید کی تھی۔ ان چار پانچ سالوں کے دوران تین آیا رکھیں اور وہ کسی نہ کسی وجہ سے ٹک نہ سکیں سو بچوں کی زیادہ تر ذمّے داری جنید پر رہی وہ بخوشی ان کا ہر کام کرلیتا، بچے بھی مجھ سے زیادہ اس سے ہل گئے تھے۔

میں تو بینک سے واپس آکر پڑ رہتی اور آٹھ بجے نیند سے اٹھتی پھر کچھ بنانے کا موڈ ہوتا تو بناتی ورنہ آن لائن آرڈر پر کھانا منگوا لیتی یا پھر ہم باہر ڈنر وغیرہ کرلیتے تھے۔

یہ ایک طرح سے میرا اپنی اصل ذمّے داریوں سے جان چھڑانے کا طریقہ تھا۔ میرے پاس اپنے کمائے ہوئے روپے تھے اور میں ان کو اپنے آرام کے لیے خرچ کرنے میں دیر نہ لگاتی۔

ایک چھٹی والا دن مجھے ملتا تو اس میں بھی چھ دنوں کے کام کی تھکن اتارنے کو میں کسلمندی سے بستر میں گھسی ہوئی پائی جاتی۔

جنید اور بچوں کی آوازیں باہر سے مجھ تک پہنچتیں تو میں کانوں پر تکیہ رکھ لیتی۔ دونوں بچے مجھ سے اتنے بھی بے تکلف نہ تھے کہ میرے پاس آکر مجھے جگانے کی کوشش کرتے۔ وہ باپ کے ساتھ ہی خوش رہتے اور ان کا باپ عام شوہروں کی طرح بیوی کو بستر سے نکال کر گھر اور بچوں کو سنبھالنے کا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں گویا اس گھر کی حکمران تھی جنید سے دُگنا کماتی تھی۔ یہ گھر میرے روپے سے چل رہا تھا۔ بچوں کو شہر کے سب سے مہنگے اسکول میں میری پُرکشش تنخواہ کی بدولت ایڈمشن ملا تھا جو جنید کی کمائی سے کئی گنا تھی۔ وہ تو اپنی آدھی تنخواہ اپنے والدین کو بھجوا دیتا اور اپنے ذاتی اخراجات کے لیے بھی زیادہ تر مجھ پر انحصار کرتا تھا۔

تو آپ انصاف سے بتائیں کیا اب بھی میرا حق حکمرانی کا نہ تھا؟

☆☆☆

دن اپنی رفتار سے گزرتے گئے اور کب بچے بچپنے کی حدود سے نکل کر نوجوانی کی سرحد پر پہنچے پتا ہی نہ چلا۔ ہم فلیٹ سے اٹھ کر بنگلے میں شفٹ ہو چکے تھے۔ دو گاڑیاں بھی خرید لی تھیں۔ ہمارا سوشل اسٹیٹس بھی پہلے سے اور بہتر ہو گیا تھا۔ میں نے ایک دوست کے ساتھ پارٹنر شپ میں بوتیک کھولا تھا جو اتنے سالوں میں اب خوب نام کما چکا تھا حتیٰ کہ ہم نے ایک ہی شہر میں اس کی کئی برانچیں کھول لی تھیں۔

سو میرا ملازمت سے بچا ہوا وقت اب بوتیک کی نذر ہو جاتا۔ گھر میں میری موجودگی کسی مہمان کی طرح ہوتی۔ ابھی آئی ابھی گئی۔ اس کے باوجود گھر کی بابت چھوٹے بڑے سارے فیصلے میرے ہی ہوتے تھے۔

☆☆☆

''زونیرا کالج ٹرپ پر مری جانا چاہتی ہے۔'' جنید نے ایک دن مجھے میری بیٹی کی خواہش بتائی تو میں نے فوراً سے پیشتر انکار کر دیا۔

''ایک ہفتے کا ٹرپ ہے جانے دو سمیع اور ناظم کی بیٹیاں بھی جا رہی ہیں۔''

اس نے ہمارے فیملی فرینڈز کا حوالہ دیا تو میں نے کڑی نظر سے جنید کو دیکھ کر اپنا نظر کا چشمہ لگایا اور موبائل اٹھا لیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ میں مزید بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی تھی زونیرا کے اصرار پر جنید اگلے کئی دنوں تک مجھ سے دبے لفظوں میں اس کی حمایت کرتا رہا۔

مجھے ویسے بھی گھر میں گزارنے کو کم ٹائم ملتا تھا اس تھوڑے وقت میں جنید کا بار، بار ایک ہی بات دُہرانا مجھے غصہ دلا گیا۔

''ایک دفعہ کا انکار سمجھ میں نہیں آیا جو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔'' میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو وہ لب بھینچ گیا سچ تو یہ ہے اس نے آج تک کبھی ایک بار کے انکار پر آگے بات بڑھائی نہ تھی لیکن اس بار..... شاید بیٹی نے زیادہ ہی ضد باندھ لی تھی۔

''کہاں ہے زونیرا ذرا بلاؤ اسے۔ اپنے بابا کے ہاتھ مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

میں نے لاؤنج کے دروازے پر اس کا لہراتا دوپٹا دیکھ لیا تھا۔

''زونیرا اِدھر آؤ۔'' جنید کی آواز پر وہ اندر آ گئی۔ نازک لمبی اور خوب صورت زونیرا۔ چہرے پر نوعمری کا بانکپن سجائے میرے سامنے تھی۔

مجھے ایک دم نوجوانی کی ایمن یاد آ گئی۔ وہ بالکل مجھ پر پڑی تھی۔

''کیا بات ہے..... تم کیوں مری جانے کے لیے اتنی ضد کر رہی ہو؟ میں نے انکار کر دیا ناں تو بات ختم۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ خائف سی ہو گئی۔

''وہ ممی میری سب فرینڈز جا رہی ہیں تو.....''

''میرا تمہاری فرینڈز وغیرہ سے کوئی واسطہ نہیں میری بیٹی تم ہو اور میں اپنی بیٹی کو اتنی دور فیملی کے بغیر بھیجنے

پر رضامند نہیں ہوں ویٹس اٹ۔اب اس موضوع پر مجھے تم دونوں سے مزید کچھ نہیں سننا۔'' میں نے زونیرا کی بات کاٹ کر تنبیہہ کی تو وہ لب کاٹتی مجھے شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''اب کیوں کھڑی ہو۔جاؤ جا کر اپنی اسٹڈی کرو میں شہر کے ٹاپ اسکول سے تمہیں اس لیے اولیول نہیں کروا رہی کہ تم فضول خرافات میں پڑ کر اپنی تعلیم پر توجہ نہ دو۔'' میں غصے سے بولی تو میرا پارہ دیکھ کر جنید نے زونیرا کو باہر نکل جانے کا اشارہ دیا تھا۔

وہ پیر پٹختی چلی گئی۔

اس دن کے بعد سے زونیرا کا منہ مجھے دیکھ کر پھول جاتا وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر چہرے کے تاثرات صاف ناراضی ظاہر کرتے۔

میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔یہ کوئی آج کی بات نہ تھی بچوں کی اس طرح کی بے جا فرمائشوں کو میں پہلے بھی سختی سے رد کرتی رہی تھی۔

زویر نے بھی پچھلے ماہ ہیوی بائیک کی فرمائش کی تھی جس پر میں نے اس کو خوب ڈانٹ پلائی تھی۔اب وہ بھی بہن کے ساتھ مجھ سے خفا خفا سا نظر آ رہا تھا۔

بچوں کے ساتھ میری ملاقات صبح کے ناشتے یا رات کے کھانے پر ہوتی۔وہ دونوں پہلے بھی مجھ سے زیادہ بے تکلف نہ تھے مگر اب تو باقاعدہ منہ کے زاویے بگاڑ کر مجھے دیکھنے لگے تھے۔مجھے نہ جانے کیوں عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔

آپ ہی بتائیں اس میں میں اتنا خفا ہونے کی کیا بات تھی؟ کیا تھی.....

☆☆☆

اس دن میرے سر میں شدید قسم کا درد اٹھا ایسا درد کہ آفس میں بیٹھنا محال ہو گیا۔سو میں مجبوراً ہاف لیو لے کر گھر آنے کے ارادے سے باہر نکل آئی۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے میں نے ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے گاڑی روکی اور کار سے اتر کر وہاں سے اپنی میڈیسن لینے لگی۔اسٹور والے نے کچھ گولیوں کا شارٹ فال بتایا مگر میرے اصرار پر آس پاس کے دوسرے ڈرگ اسٹورز سے پتا کرنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

میں ٹائم پاس کرنے کو روڈ کی طرف آتی جاتی ٹریفک اور لوگوں کو دیکھنے لگی کہ اچانک میری نظر سامنے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ کے دروازے پر جم سی گئی۔جس میں سے جنید کسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ہنس کر باتیں کرتا باہر نکل رہا تھا۔

ان کی بے تکلفی بتاتی تھی کہ یہ تعلق نیا نہیں۔

میں لب بھینچ کر ان کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھتی رہی۔جنید کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی بلکہ اس کی نظر اور کسی کی طرف اٹھی ہی نہیں۔وہ صرف اس لڑکی کو ہی دیکھ رہا تھا۔مسکرا کر محویت سے۔لڑکی فرنٹ سیٹ پر جنید کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

میری آنکھوں پر دھند سی چھانے لگی۔میں نہ جانے کیسے ڈرائیو کرتی گھر تک پہنچی تھی۔میرے سر درد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

رہ رہ کر وہ منظر آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔

جنید کے حوالے سے ایسی بات کا میں تصور تک نہیں کر سکتی تھی چہ جائیکہ یوں اپنے سامنے دیکھنا۔

وہ ایک پیار کرنے والا فرمانبردار شوہر تھا۔اور وقت کے ساتھ اس کی فرمانبرداری میں اضافہ ہی ہوا تھا۔وہ میری کسی بات سے اختلاف نہیں کرتا تھا۔بچوں اور گھر کے متعلق تمام فیصلے میرے ہوتے تھے۔جنہیں وہ بلا چون و چرا مان لیا کرتا تھا۔

میں اس کی فرمانبرداری کو اپنی کمائی کی مرہونِ منت سمجھتی تھی۔ظاہر ہے گھر کا سارا خرچ میں چلاتی اور اس کی ضرورتوں کو بھی میں ہی پورا کرتی تھی۔جن میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوا تھا۔پھر وہ فرمانبردار کیسے نہ ہوتا۔اپنی تنخواہ وہ اب بھی آدھی گاؤں بھجوا دیتا اور بقیہ آدھی کا میں نے کبھی پوچھا ہی نہ تھا۔دراصل گزرے چند سالوں میں مجھ پر جیسے ہن برسنے لگا تھا۔میری اچھی خاصی تنخواہ پھر بوتیک کا پھلا پھولا کاروبار سو میں اپنی کمائی میں ہی مگن ہو گئی تھی۔

لیکن فرمانبرداری کے ساتھ جو پیار تھا وہ کہاں اور کب غائب ہوا اس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔

اب سوچنے لگی تو یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے درمیان تو صرف حاکم اور محکوم کا رشتہ رہ گیا تھا۔ پیار تو کہیں تھا ہی نہیں۔

لیکن اب میرا محکوم مجھ سے باغی ہوگیا تھا۔ اور میں ایمن جنید اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں متامل تھی۔

☆☆☆

میرا سر درد شدید بخار میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اور مجھے ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کر مجبوراً بیڈ ریسٹ لینا پڑا کہ چیسٹ انفیکشن مجھے جب بھی ہوتا اتنا ہی شدید ہوا کرتا تھا۔

جنید میری بیماری سے ہمیشہ کی طرح پریشانی ظاہر کررہا تھا یا واقعی فکرمند تھا میں سمجھ نہ پائی۔ اس سے سختی سے باز پرس کرنے کا خیال میرے بخار نے... فی الحال مجھ سے ملتوی کروادیا تھا۔

میں دو دن بخار میں پھنکتی رہی لیکن بچے مجھے پوچھنے تک میرے کمرے میں نہ آئے۔ تیسرے دن میں نے جنید سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ چپ سا ہوگیا۔

''وہ تم سے خفا ہیں۔'' اس نے دبے لفظوں میں بتایا۔

''اماں بخار سے بستر پر پڑی ہے اور ان کو اپنی خفگی کی پڑی ہے۔'' میں نے کھانستے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ جنید خاموش رہا۔

''اس گھر میں سب مطلبی اور خود غرض ہوتے جارہے ہیں۔'' میں نے سرخ آنکھیں جنید پر جما کر کہا تو وہ کچھ چونک سا گیا۔

''تمہارا وہم ہے۔'' اس نے کندھے اچکا کر.... بے پروائی ظاہر کی۔

میں تلخی سے ہنس دی۔

''میں ان کو لے کر آتا ہوں تمہارے پاس۔'' اس نے غالباً میدان چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی۔

میں بیڈ سے نقاہت کے ساتھ اتری اور جنید کے پیچھے چل پڑی۔

لاؤنج تک پہنچتے پہنچتے میری سانس پھول چکی تھی۔

اندر سے جنید اور بچوں کی آوازیں مجھے وہیں دروازے پر ٹھہرنے پر مجبور کر گئیں۔

''ہمارے بیمار ہونے پر ممانے کبھی ہمارا خیال رکھا پاپا؟ ہمیشہ آپ کے پاس ہمیں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ ان کے لیے تو اپنے بچوں سے زیادہ اپنی جاب اہم ہے۔ آپ بھی تو کالج سے آف لے لیتے ہیں ناں تو کیا قیامت آجاتی ہے دو چار دن چھٹیاں لینے پر؟'' یہ زونیرا کی آواز تھی خفگی سے بھرپور آگ جیسی تپش لیے۔

میں بھڑ بھڑ جلنے لگی۔

''انہیں ہمارا احساس ہی نہیں ان کو صرف اپنی جاب، اپنا اسٹیٹس اور اپنا شوآف پیارا ہے۔ کبھی دیکھا ہے ہم سے نرمی سے بات کرتے انہیں؟'' یہ زوہیر تھا بھاری لہجے میں بولتا ہوا۔

میں جھلنے لگی۔

جنید بالکل خاموش تھا مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ آخر میرے حق میں کیوں نہیں بول رہا۔ اس کو وضاحت دینی چاہیے میری مصروفیت کی۔ میں جو دن رات کولہو کی بیل بن کر کما رہی تھی آخر کس کے لیے۔ بچوں کے لیے ہی ناں۔

''وہ صرف اپنے لیے جیتی ہیں۔ ہماری ذات سے ان کو ذرہ بھر دلچسپی نہیں۔ انہوں نے ہمیں پیدا اس لیے کیا ہے کہ ہم پر رعب جما سکیں۔ ہمیں اپنی رعایا کی طرح سمجھ کر ہم پر حکمرانی کریں۔ جب دل چاہے ہماری خواہشات کی نفی کرسکیں۔''

زونیرا کے اندر دبی نفرت آج چیخ، چیخ کر بول رہی تھی۔

میں نے لڑکھڑا کر دروازے کا پردہ تھام لیا۔

''یا خدا یہ سب سننے سے بہتر تھا کہ میرے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل دیا جاتا۔ میں اتنی اذیت کا شکار تو نہ ہوتی جتنی اذیت مجھے میرے پیارے بچوں کے زہر میں بجھے الفاظ سے ملی....'' میں ایمن جنید جو اپنی کامیاب زندگی اور خود مختاری پر نازاں تھی۔ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ ان چند دنوں میں جیسے بے رحمی سے

سخت تپتی زمین پر پٹخی گئی تھی۔

میں اپنے ہارے ہوئے وجود کو گھسیٹتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

زندگی کو برت کر اس کے راز سے واقف ہوئی
میں خاموش ہوئی تو ہر آواز سے واقف ہوئی

میں عجیب سے حزن و ملال کی کیفیت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

وجود کی تپش تو وقت کے ساتھ معمول پر آ گئی لیکن سینے کے اندر کی تپش مجھے انگاروں کی طرح سلگاتی رہی۔ میرے اپنے بچوں نے جو آئینہ مجھے دکھایا تھا اس میں میری ذات بہت بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔ دل کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور آنکھوں کے سوتے خشک تھے۔ نہ جانے کیوں میں رو بھی نہیں پا رہی تھی۔ بیماری اور ڈپریشن کی وجہ سے جاب پر جانے کا بھی من نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک عرصے بعد چھٹیاں لے لی تھیں۔

ایسے ہی ایک دن اپنی زہریلی تنہائی سے گھبرا کر میں نجو خالہ کے پاس چلی آئی۔

نجو خالہ مجھے ایک عرصے بعد سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میں ان سے گلے لگ کر کافی دیر تک ان کے وجود کا خلوص اپنے اندر اتارتی رہی۔ اور وہ بنا کسی گلے شکوے کے میری پیٹھ تھپکتی رہی۔

میں اپنی مصروفیات میں اپنی اس خیر خواہ کو بھی بھلا بیٹھی تھی پر انہوں نے ایک لفظ شکوے کا نہ بولا۔ مجھے عجیب شرمندگی محسوس ہوتی رہی۔

''آج صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔ میں جان گئی کہ مجھے ملنے میرا کوئی اپنا آنے والا ہے۔'' وہ میری پیشانی چوم کر بولی تھیں۔

وقت کے بے رحم پنجوں نے ان کی جوانی کو نوچ کر ادھیڑ عمری میں بدل دیا تھا۔ بینک سے ریٹائرڈ ہو کر وہ ایک این جی او سے منسلک ہو کر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی تھیں۔

''فریدہ میری بیٹی کے لیے اچھا سا لنچ بناؤ وہ کھانا کھا کر جائے گی۔'' وہ اپنی ملازمہ سے مخاطب ہوئیں پھر مجھے لے کر اپنے بیڈ روم میں چلی آئیں۔

''ہاں تو اب بتاؤ تمہارا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے۔ کیا میاں سے کوئی کھٹ پٹ ہوگئی ہے۔'' ان کی جہاندیدہ نظروں نے بہت کچھ بھانپ لیا تھا وہ محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے پوچھنے لگیں تو میرا ضبط ٹوٹنے لگا۔

''نجو خالہ بس یوں سمجھیں کہ میں وہ مسافر ہوں جس کا سفر رائگاں گیا جس کو منزل سمجھتی رہی وہ سراب نکلا۔'' میں نے لب کاٹتے گلوگیر لہجے میں کہا تو انہوں نے تشویش سے مجھے دیکھا۔

''ایسا کیا ہوگیا ایمن بیٹا؟'' ان کے سوال پر میں پھٹ پڑی۔

''نہ شوہر میرا رہا ہے، نجو خالہ اور نہ ہی بچے۔ میرے سالوں کی ریاضت پر پانی پھر چکا ہے۔ میں نے اپنا آرام و سکون تج کر جن کے لیے روپیہ بنایا وہ مجھ سے ہی بدگمان ہیں..... آپ ہی بتائیں ان گزرے سالوں میں کیا کچھ نہیں کیا میں نے جنید اور بچوں کے لیے۔ پھر بھی... پھر بھی خالہ میں بے حیثیت ٹھہری۔'' میری آواز میں دکھ ہی دکھ تھا۔ میں نے مختصراً بچوں کے رویّے کے متعلق ان کو بتایا۔

نجو خالہ نے یہ سن کر ہمدردی سے مجھے دیکھا تھا۔

''میں ایک بات کہوں بیٹا۔ ماں کی حیثیت بچوں کی نظر میں روپے سے نہیں بنتی۔ وہ ماں کو محبت اور شفقت کے پیمانے پر پرکھتے ہیں.....'' نجو خالہ نے نرمی سے کہا تو میں چونک اٹھی۔

''ایک ماں اپنی ذات کی نفی کرتی ہے تبھی وہ جنت کو اپنے قدموں میں رکھ پانے کے قابل ہوتی ہے۔ تم نے اپنے بچوں کو اچھا کھلایا پہنایا، اچھے اسکولوں میں پڑھایا ان سب کو سہولتیں دیں پر ان کو اپنی محبت اور توجہ تم نہ دے سکیں۔ تم نے جنید کو ان کی ماں بنا دیا۔ اور خود ان کا باپ بن گئیں۔ فطرت کو جب ہم دوسرے رخ پر بدلتے ہیں تو سب کچھ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اللہ نے ماں کو اپنی الگ ذمے داریاں دی ہیں اور باپ کو الگ۔ یہ

خدائے واحد کی تقسیم ہے جو خالق دو جہاں ہے۔ہم اس کی تقسیم کو بدل نہیں سکتے۔اور اگر ایسی کوشش کریں تو تہی داماں رہ جاتے ہیں۔'' وہ خاموش ہوئیں تو میں چند لمحوں تک کچھ نہ بول سکی۔

''مجھے دیکھو بچوں کی نعمت تو ملی ہی نہیں۔ہر ایک تو خوش قسمت نہیں ہوا کرتا ناں۔تمہیں ایک ساتھ رب نے دو بچے نواز دیے قدر کرتیں ان کی۔'' نجو خالہ کے لہجے میں حسرتیں کراہنے لگیں۔

''اور جنید تو مرد ہے۔اس کو بیوی سارا دن میسر ہی نہیں ہوگی تو وہ تو بگڑے گا ہی۔مرد کو اپنی زندگی کی خالی جگہیں پُر کرنا آتی ہیں۔'' وہ بات کرتے، کرتے تلخ ہوگئی تھیں۔

''لیکن ایمن بیٹا تمہارا اپنا رویہ بھی اس کے ساتھ کبھی محبت والا نہیں رہا۔میں نے کئی بار تم کو خود میں لچک دکھانے کا مشورہ دیا مگر تم نے میری بات نظر انداز کردی۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولیں تو میں نے نظریں جھکالیں۔

''میری جان، عورت جتنی بھی خود مختار ہو جائے چاہے آکاش پر اڑنے لگے اس کے قدموں کو ہمیشہ ایک ایسی زمین کی ضرورت رہتی ہے جس پر وہ اپنی گرہستی کی بنیاد رکھتی ہے۔عورت کا خمیر ممتا اور محبت سے اٹھایا گیا ہے۔اس کی اولاد اس کا محور ہے، اس کا میاں اس کا مرکز ہے۔وہ اس محور و مرکز سے جتنا دور ہوتی جائے گی اس کی زندگی میں بے سکونی بڑھتی جائے گی۔'' وہ نرمی سے میرا ہاتھ تھام کر سمجھاتی رہیں اور میں ان کے الفاظ اپنے دل میں اتارتی رہی۔

''انسانوں پر حکومت محبت سے کی جاتی ہے ایمن روپے سے نہیں...مانا کہ روپے میں بہت طاقت ہے۔لیکن آپ اس سے نہ کسی کے پُرخلوص جذبات خرید سکتے ہیں نہ ہی سچا پیار۔''

وہ جیسے میرے اندر تک اتر کر مجھے جان گئی تھیں۔ میں شرمندگی سے عرق، عرق ہونے لگی۔

''میری زندگی سے ہی سبق سیکھ لو تنہائی کا زہر قطرہ، قطرہ میرے اندر سرایت کر چکا ہے اور اس زہر کا تریاق کہیں نہیں۔ باہر لوگ میری ذہانت میری خود مختار حیثیت دیکھ کر رشک و حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن میری سونی گود اور اکیلی زندگی کیسے مجھے زیر بار کرتی ہے یہ تو میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔جوانی تو مصروفیت کے دھوکے میں گزر جاتی ہے ایمن مگر بڑھاپا نہیں کٹتا۔''

وہ نم آواز میں بولیں تو میں نے حیرت سے سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔نجو خالہ آج بہت ٹوٹی ہوئی نظر آئیں۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا ایمن.....تم چاہو تو حالات کو اپنے موافق کر سکتی ہو.....اور کر بھی لو گی مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔آج سے اپنی باہر والی حیثیت باہر والوں کے لیے رکھو اور اپنے گھر میں تم خالص بیوی اور ماں کی حیثیت سے رہو کیا سمجھیں!''

وہ مجھے نئی راہ دکھانے لگی تھیں۔میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

نجو خالہ کے گھر سے واپس آتے ہوئے وہ بے کلی جو میرے وجود کو کئی دنوں سے کچوکے لگا رہی تھی کسی حد تک کم ہوئی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوئی تو دونوں بچے لاؤنج میں بڑی بے پروائی سے صوفوں پر بیٹھے اپنے، اپنے موبائل ہاتھوں میں لیے نگٹس کھانے میں مصروف تھے۔سامنے لگی ساٹھ انچ کی ٹی وی اسکرین پر کوئی انگلش مووی لگی ہوئی تھی.....لیکن دونوں ہی اس کی طرف متوجہ نہ تھے۔

میں دھیرے، دھیرے قدم بڑھاتی ان کے قریب آئی۔

زونیرا کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ چونک گئی پھر فوراً سے پیشتر اس نے ٹی وی آف کیا اور نگٹس کی پلیٹ اپنی گود سے اٹھا کر سینٹر ٹیبل پر رکھی۔زویر جو ٹیبل پر ٹانگیں رکھے صوفے پر تقریباً لیٹا ہوا تھا اپنی نشست سے سیدھا ہو بیٹھا۔

دونوں جیسے یک دم تکلف کے جامے میں آگئے تھے۔

میں بائیں طرف کے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

''کیسے ہو بچوں...پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

میں نے لہجے کو بشاش بنا کر پوچھا۔
''فائن ممی!'' زویر دو لفظ کہہ کر خاموش ہوگیا زونیرا نے یہ بھی کہنے کا تکلف نہ کیا۔
''اور سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے ناں۔'' میں نے پھر ایک ٹوٹی پھوٹی سی کوشش کی۔
''یس!'' دونوں نے سر ہلا دیا۔
''اب کیا پوچھوں.... ؟'' میں سوچ میں پڑ گئی۔
ہم تینوں کے درمیان ماں اور بچوں والی کوئی بات محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
ایک تکلف تھا۔ ایک دیوار تھی میرے اور بچوں کے بیچ...... بہت سخت اور مضبوط۔
''اوکے ممی ہماری کوچنگ کا ٹائم ہوگیا ہے۔'' زویر نے وال کلاک پر نظر دوڑا کر کہا جو شام کے چھ بجا رہا تھا۔
زونیرا بھی اٹھنے کو پر تولنے لگی۔
''بیٹا ایک بات سنو۔'' میں بے اختیار کہہ بیٹھی۔
دونوں نے استفہامیہ نظریں مجھ پر ٹکا دیں۔
ان آنکھوں میں بہت اجنبیت اور بیزاری کا تاثر تھا۔ جیسے وہ جلد از جلد میری قربت سے دور بھاگ جانا چاہتے ہوں۔
میرے اندر سناٹے اترنے لگے۔ مجھے لگا زونیرا اور زویر کی جگہ میں اور میرے پانچ بھائی بہن ہیں اور میری جگہ میرے ابا بیٹھے ہیں۔
ایسی ہی اجنبیت اور بیزاری ہمیں بھی ان کی موجودگی میں ہوا کرتی تھی۔ ہم بھی فوراً سے پیشتر ان کی نظروں سے دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔
''تو کیا میں ابا بننے میں کامیاب ہو چکی تھی؟'' میں نے اذیت سے سوچا۔
''ہاں تو میری خواہش بھی ابا کی طرح بننے کی تھی ناں پھر آج میں اب خوش کیوں نہ تھی میرا دل کیوں دکھی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے گزرے رویوں پر کیوں شرمندگی ہو رہی تھی۔''
میں نے اپنا سر ہاتھوں پر گرا لیا تھا۔ بچے تو کب کے مجھے خاموش دیکھ کر منظر سے غائب ہوگئے تھے۔

☆☆☆

مجھے غم و خوشی کی موسیقی میں نہ تھی تمیز
خود پر گزری تو دونوں کے ساز سے واقف ہوئی

اور بھلا اپنے ہاتھوں سے اجنبیت کی اٹھائی جانے والی دیوار کیسے گرائی جاتی ہے؟ میری برسوں کی تعمیر...... کیسے لمحوں میں مسمار ہو سکتی تھی۔
میں نے بینک سے لانگ لیو لے لی تھی۔ اپنے بزنس کو بھی پارٹنر کے آسرے چھوڑ دیا تھا۔ مہناز میری دوست بھی تھی اور پارٹنر بھی۔ میری روز بروز عجیب ہوتی حالت پر اس نے ہی مجھے ریسٹ لینے کا مشورہ دیا جو میں نے بخوشی مان لیا۔
اب چوبیس گھنٹے میں گھر پر ہوتی۔ آفیشل موبائل نمبر بھی آف کر رکھا تھا۔ اپنے تئیں میں اب مکمل ہاؤس وائف کی طرح اپنا سارا وقت میاں اور بچوں کو دینے کے لیے تیار تھی لیکن اب وہ میرا وقت مجھ سے لینے کو تیار نہ تھے کیونکہ ان سب کی اپنی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ ان تینوں کی اپنی ایک الگ روٹین بن گئی تھی جس میں میری جگہ کہیں نہیں نکلتی تھی۔
میں ایمن جنید ٹوٹ رہی تھی، مایوس ہو رہی تھی۔
میں نے اتنے سالوں میں اپنی سوچ سے بڑھ کر روپے کمائے تھے اور صرف روپے ہی کمائے تھے۔ کسی کا پیار نہ کما سکی تھی۔ اسی لیے آج بالکل تہی دست تھی۔
''ایمن اب تو تمہاری طبیعت اسٹیبل ہے پھر تم نے اتنے دنوں سے آف کیوں لیا ہوا ہے؟'' اس دن جنید نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا بھی تو کیا۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔
''بے فکر رہو میری تنخواہ نہیں رکے گی۔ روپے آتے رہیں گے۔'' میں تلخی سے بولی تھی۔
''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ تم اتنی ایکٹو اور رسپانسبل ہو اپنی جاب اور بزنس کے حوالے سے تو اب تمہیں یوں فارغ رہنا بور کرتا ہوگا ناں۔'' وہ خفیف انداز میں وضاحت دینے لگا۔
''ہاں میں روپے کمانے کے لیے اتنی رسپانسبل

اور ایکٹو ہوگئی تھی کہ اپنے میاں کے شب و روز سے..... بے خبر رہ گئی۔''

میں نے کڑی نظریں اس پر جمادیں تو وہ گڑبڑا گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ کھسیا کر پوچھنے لگا۔

''وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

تم اتنی سینئی (جذباتی) کیوں ہو رہی ہو ڈیئر۔ چلو کہیں چند دنوں کے لیے گھوم آتے ہیں۔ تمہارا مائنڈ بھی فریش ہو جائے گا اور بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔''

جنید نے خوش دلی سے مشورہ دیا تو میں سوچ میں پڑ گئی۔ واقعی اس نازک موڑ پر مجھے اپنے بچوں کے ساتھ وقت بتانے اور قریب ہونے کا یہ اچھا موقع مل سکتا تھا۔

☆☆☆

پھر جنید نے خود ہی انتظامات کر لیے اور ہم ہفتہ بھر کے لیے شمالی علاقہ جات گھومنے چلے آئے۔

میں نے برسوں بعد جیسے کھلی فضا میں سانس لی تھی۔ پُرسکون ماحول اور فطرت کے حسین نظاروں نے میری ذہنی پراگندگی کو کسی حد تک پرے دھکیل دیا تھا۔ بچے بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کو اس طرح گھومنے پھرنے کا موقع کم ہی ملا تھا۔ میں اپنی مصروفیات میں نہ خود کہیں نکلتی نہ ان کو جانے دیتی۔ میرا سارا زور بس ان کو اچھی تعلیم دلانے پر تھا۔

یہاں آ کر چونکہ ہم سب کو فراغت تھی سو میں بچوں سے رابطے بڑھانے کے لیے ان کے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ دونوں جس جگہ سیر کو نکلتے بس سیلفیز بنانے کی دُھن سوار ہوتی۔ خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ دھڑا دھڑ تصویریں اتار کر فیس بک پر ڈالتے رہنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں بھی ان کی سیلفیز کا حصہ بننے لگی۔

شروعات میں دونوں تھوڑا جھجکے مگر پھر جنید کو بھی گروپ فوٹو میں شامل کر کے فیملی پکس کا ہیش ٹیگ لگا کر پوسٹس لگانے لگے۔ ان تصاویر میں ہماری مکمل اور ہنستی مسکراتی فیملی دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی خوشی حاصل ہوتی تھی۔

جنید سے تو بچے ویسے ہی بے تکلف تھے لیکن میرے اور ان کے بیچ جو اَن دیکھا فاصلہ تھا میں اس کو مٹانے کی کوشش میں لگی تھی۔

اور وہ دونوں میرا بدلتا رویہ محسوس بھی کر رہے تھے۔

☆☆☆

صبح سویرے ناشتا کر کے زویر اور زونیرا جوگرز پہن کر کاغان کی حسین وادی میں باہر ہوا خوری کو نکل پڑتے۔ جنید کو نیند پیاری تھی سو وہ دس بجے تک اٹھتے تھا۔ تب تک یہ بہن بھائی واپس آ جاتے اور لنچ کے بعد ہم چاروں کا دوسرا پروگرام بنتا۔

تیسرے دن میں نے بھی ناشتے کے بعد جاگرز پہن کر جب ان کے ساتھ باہر جانے کا ارادہ کیا تو وہ اچھنبے میں پڑ گئے۔

''کیوں، میں نہیں چل سکتی کیا تم لوگوں کے ساتھ؟'' میں نے ان کی حیرت دیکھ کر سوال کیا تو زویر نے کندھے اچکا دیے۔

''نو ممی..... موسٹ ویلکم۔'' وہ خوشدلی سے بولا تھا۔

پھر میں اپنے نوجوان بچوں کے ساتھ پہاڑی علاقے کے قدرے مشکل راستوں پر نکل پڑی۔ یہ جس کو ہلکی پھلکی ہائکنگ کا نام دے رہے تھے اس نے مجھے اچھا خاصا ہانپنے پر مجبور کر دیا۔ بچوں کے تیز قدموں کا ساتھ دینا آسان نہ تھا۔ میں نے ایک جگہ آگے بڑھ کر زویر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تو اس کو میری اتھل پتھل ہوتی سانسوں کا ادراک ہوا۔

''زونیرا آہستہ چلو، ممی تھک رہی ہیں۔'' وہ بہن سے بولا تو زونیرا نے سر ہلا دیا۔

دونوں بہن بھائیوں میں غضب کی ہم آہنگی تھی۔

''بس بیٹا تھوڑا ریسٹ کر لوں پھر آگے چلتے ہیں۔'' تھوڑی دور جا کر میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی تو بچوں کو بھی اپنا چلنا موقوف کرنا پڑا۔

''یہ لیں ممی پانی پی لیں۔'' زونیرا نے فلاسک سے پانی نکال کر میری طرف بڑھایا تو میں نے خوشگوار

احساس سے تھام لیا۔

''تمہاری ممی اب بوڑھی ہو چلی ہیں۔'' میں گھونٹ، گھونٹ پانی پیتے ہوئے بولی۔

''نہیں ممی آپ تو اب بھی بہت ینگ ہیں' ایٹ لیسٹ میرے فرینڈز کی مدرز کے مقابلے بہت اسمارٹ اور ایکٹیو۔'' زویر بھی میرے برابر میں بیٹھ کر بے لاگ بولا تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''لیکن دوسروں کی مدرز کے مقابلے آپ بہت کم کیئرنگ اور لونگ ہیں۔''

زونیرا نے منہ بنا کر کہا تو میرا دل بیٹھ سا گیا۔ میری یہ بیٹی دل دکھانے کی حد تک صاف گو تھی۔

''ہاں یہ خامی تو ہے مجھ میں۔'' میں نے دھیمی آواز میں اعتراف کیا۔

''لیکن اب میں اپنی اس خامی کو دور کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس کام میں میری ہیلپ کرو گی۔''

میں نے زونیرا کو قدرے امید بھری نظروں سے دیکھا جو سگریٹ پینٹ کے ساتھ بلیو کلر کی کرتی میں ملبوس گلے میں مفلر ڈالے قدرے بے پروا انداز میں چیونگم چبا رہی تھی۔

میری بات پر اس کا چلتا منہ کچھ کھل سا گیا تھا۔

''میں آج سے تم دونوں کی ممی پلس فرینڈ بننا چاہتی ہوں۔ ممی جو کیئرنگ ہوتی ہے فرینڈ جو لونگ ہوتی ہے۔ بولو منظور ہے میری دوستی۔'' میں نے ہلکے، پھلکے انداز میں ہاتھ بڑھایا تو زویر نے خوش ہو کر گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا جبکہ زونیرا کچھ دیر خاموش سوچتی رہی۔

میں بدستور پُرامید نگاہیں اس پر جمائے بیٹھی تھی۔

آخر کچھ جھجکتے اس نے اپنا نازک سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

مجھے جیسے سفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔

میں نے بے اختیار بھیگی آنکھوں سے دونوں کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

''میں جانتی ہوں بیٹا کہ تم دونوں کو مجھ سے بہت سی شکایات ہیں۔ مجھ سے اپنے گھر اور بچوں کو نظر انداز کرنے کی بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔'' میں نے بھیگی آواز میں کہتے بغور انہیں دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر سایہ سا لہرا گیا تھا۔

میں شرمندگی کے سمندر میں غرق ہو گئی۔

''لیکن اب ایسا نہیں ہوگا میرے بچوں..... میں گزرے وقت کا ازالہ تو نہیں کر سکتی لیکن حاضر وقت کو ضرور تم لوگوں کے ساتھ ہنسی خوشی گزارنا چاہتی ہوں۔ آج کے بعد میری جاب اہم ہے نہ میرا بزنس۔ میرے لیے اہم ہو تم دونوں، میرا گھر اور تمہارے پاپا..... بس۔'' میرے آنسو لڑیوں کی صورت میرے رخساروں پر بہنے لگے۔ میں نے دونوں بچوں کو کھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

باتیں جانب میری گردن گیلی ہونے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ زونیرا بھی رو رہی تھی۔ اور یہ آنسو دلوں کی ساری کثافتیں اور شکایات بہا کر لے گئے تھے۔

ہم تینوں جب واپس ہوٹل کے کمرے میں آئے تو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوش باش مسکرا رہے تھے۔

جنید نیند سے اٹھ چکا تھا۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' وہ قدرے حیرت سے میرے کھلتے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''بہت دور چلی گئی تھی میں..... لیکن اب تو واپس آ گئی ہوں ناں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے فون پر ناشتے کا آرڈر دینے لگا۔

''اور اب تمہیں واپس لانا ہے جنید۔'' میں نے اس کو دیکھ کر سوچا تھا۔

''اور یہ کام بھی ناممکن نہیں۔'' میں کچھ سوچ کر زیر لب مسکرا دی تھی۔

''آپ کیا کہتے ہیں، اب تو میں نے صحیح کیا ناں..... روپے کے بجائے رشتوں کو اہمیت دینے لگی ہوں۔''

میری بات پر جنید نے چونک کر مجھے دیکھا تھا اور اس کے چہرے پر آتی حیرت بھری خوشی مجھے اندر تک پُرسکون کر گئی تھی۔

❁❁❁

تیسرا اور آخری حصہ

مکمل ناول

پریوں کا دیس

مدیحہ شاہد

''کیا؟ سالار.....؟'' وہ دم بخود رہ گئی.....حواس باختگی کے عالم میں کچھ دیر کے لیے تو اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ دوسری طرف ازمیر اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے قدرے حیران ہوا۔

''ہیلو.....! کیا ہوا آپی؟ خاموش کیوں ہوگئیں؟''

ظاہر ہے کہ وہ اس کی کیفیات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ سالار کی کہانی سے یکسر انجان تھا۔ ارمانے اپنے حواس یکجا کیے، حیرت کدے سے باہر آنے میں اسے تھوڑا وقت لگا۔

''دراصل میں اچانک یہ بات سن کر حیران رہ گئی ہوں.....تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وہ لڑکا سالار کون ہے، کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے.....؟ دیکھنے میں کیسا ہے؟'' اس نے بدقت خود کو سنبھالتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''لڑکے کے بارے میں تفصیلات کے متعلق مجھے زیادہ علم نہیں ہے مگر سنا ہے کہ نانی کو وہ لوگ بہت پسند آئے ہیں اور وہ انہیں ہاں کہنے والی ہیں، انہوں نے امی

اور ابا کو بھی راضی کرلیا ہے۔'' ازمیر نے اسے بتایا۔

''تو تم تفصیلات کے بارے میں معلوم کرو ناں..... پتا کر کے بتاؤ کہ وہ لڑکا سالار کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے اور یہ رشتہ کس کے توسط سے آیا ہے۔'' ارما نے بے قراری سے اصرار کیا۔ ازمیر کے لیے اس کا یہ ردِعمل حیران کن تھا۔

''اچھا میں کوشش کرتا ہوں..... ابھی تو میں آم کے باغ میں ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھا ہوں..... فضا میں آموں کی خوشبو رچی بسی ہے۔ درخت کی شاخوں میں سے پرندے جھانک رہے ہیں۔ گھر میں ہونے والی خاندانی سازشوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے میں اکثر یہاں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس معاملے کے متعلق تو مجھے بھی بڑا تجسس ہے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے..... یہ سب اچانک کیوں اور کیسے ہوگیا۔ جانوروں کے ڈاکٹر صاحب اچانک منظر سے کیسے غائب ہوگئے..... اور سالار صاحب کی دھماکے دار انٹری کس طرح ہوئی ہے۔'' ازمیر نے کچھ سوچتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہا۔ وہ اس وقت اپنے گھر کے قریب آم کے باغ میں درخت کی چھاؤں تلے بیٹھا ارما سے فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ اکثر یہاں آکر اپنا وقت گزارتا تھا۔ اس کا مزاج بھی ارما سے ملتا جلتا تھا، وہ بھی اکثر ارما کی طرح اپنے والدین سے نالاں رہتا تھا۔ خاندانی سازشوں اور گھریلو سیاستوں سے اسے وحشت ہوتی تھی۔

ارما سوچ میں پڑ گئی۔

''میں لاہور جانے کی تیاری کرتی ہوں..... تمہیں جیسے ہی کوئی نئی خبر ملے مجھے فوراً بتانا۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ پھر اس نے چند مزید باتوں کے بعد فون بند کردیا۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں سالار نام کا صرف ایک شخص ہی تو نہیں ہے۔ اور لوگوں کا بھی یہ نام ہوسکتا ہے۔

شاید وہ کوئی اور ہوگا۔ اس کے واہموں نے سرگوشی کی۔ شاید یہ اس کے اندر کا خوف اور اداسی تھی جس نے اسے کبھی خوش فہم نہیں ہونے دیا تھا۔

اس نے کمرے میں آکر عائلہ کو اس بارے میں بتایا۔ عائلہ یہ سن کر خوش اور ایکسائٹڈ ہوگئی۔

''واؤ..... تمہارے لیے پروپوزل آیا ہے، شاید یہاں بات بن جائے۔ کیا پتا تمہارا نصیب اسی شخص کے ساتھ لکھا ہو۔'' عائلہ نے ساری بات سننے کے بعد جوش و خروش کے عالم میں کہا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ ارما کا گھر آباد ہوجائے۔ ارما جس ڈپریشن سے گزری تھی اس خوفناک ماضی کو بھلانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے کسی محبت کرنے والے ہم سفر کا ساتھ ملتا۔ محبت ماضی کے دکھ بھلا دیتی ہے اور بے وفائی کے زخم پر مرہم رکھ دیتی ہے۔

''ازمیر نے بتایا ہے کہ اس لڑکے کا نام سالار ہے۔'' ارما کچھ دیر خاموشی سے عائلہ کو دیکھتی رہی پھر اس نے چونکانے والے انداز میں انکشاف کیا۔

''کیا.. سالار؟'' عائلہ نے بے ساختہ چیخ ماری۔

''آہستہ بولو..... سالار نام کا دنیا میں صرف ایک شخص ہی تو نہیں ہے کسی اور کا نام بھی تو سالار ہوسکتا ہے ناں.....'' ارما نے بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر اسے آواز دھیمی رکھنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ والا کمرا عالیان کا تھا اور شاید وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہی موجود تھا۔

''ہاں، ہوتو سکتا ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وہی سالار ہو جو ہمیں ناران کے بازار میں، نورمحل اور دربار محل میں ملا تھا۔ اب ہمیں یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ کون سا سالار ہے، ٹھہرو میں اسے فون کر کے دیکھتی ہوں۔'' عائلہ نے ایکسائٹڈ انداز میں کہتے ہوئے میز سے موبائل اٹھالیا۔ ارما نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

''رہنے دو..... اگر وہ سالار نہ ہوا تو پتا نہیں وہ ہمارے بارے میں کیا سوچے گا۔'' اس نے بوکھلا کر کہا۔ عائلہ نے اس کی بات نہیں سنی اور سالار کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''ٹرائی تو کرنے دو..... حال چال پوچھنے کے بہانے سے ہی بات کرلوں گی اگر یہ وہی سالار ہوا تو فوراً بتادے گا۔'' عائلہ نے کال ملائی مگر حیرت انگیز طور پر سالار کا نمبر بند جارہا تھا۔

''اس کا نمبر پتا نہیں کیوں آف جارہا ہے۔ ابھی تو وہ یہیں بہاول پور میں تھا۔ اچانک کہاں چلا گیا۔ جہاں موبائل کے سگنل ہی نہیں آرہے..... اس بندے کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ کبھی کہاں ہوتا ہے تو کبھی کہاں.....'' وہ حیران ہوکر بولی۔ اسے اس کا نمبر آف جانے پر مایوسی ہوئی تھی۔ اب یہ راز بھلا کیسے ظاہر ہوگا۔

''اپنے کسی ٹرپ کے ساتھ گیا ہوگا۔'' ارما نے امکان ظاہر کیا۔ عائلہ ٹھٹک گئی۔

''مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ شمالی علاقہ جات میں لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے اس نے اپنے ٹورز کینسل کردیے ہیں اور موبائل سگنل کا مسئلہ تو صرف شمالی علاقوں میں ہی ہوتا ہے۔'' عائلہ نے اسے یاد دلایا۔ اور موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''عجیب پُراسرار سا بندہ ہے، اب یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ کون سا والا سالار ہے۔'' عائلہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ارما بھی ایک کنفیوژن میں گھری بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔

''اس بارے میں تو اب لاہور جا کر ہی پتا چلے گا۔'' ارما نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر چلتے ہیں لاہور۔'' عائلہ نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر کہا۔

''ہاں.....!'' ارما نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں عائلہ کی خالہ کے کمرے میں موجود تھیں۔ عالیان بھی وہاں آگیا تھا۔ عائلہ نے خالہ کو ساری بات سے آگاہ کیا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں تم لوگوں کو نہیں روکوں گی۔ میری تو دعا ہے کہ ارما کا رشتہ خیریت کے ساتھ طے ہوجائے۔ سب بچیوں کے نصیب اچھے ہوں۔'' انہوں نے ارما کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ارما مسکرادی۔ ایسی شفقت اور محبت اس کی کمزوری تھی۔ عالیان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کن انکھیوں سے عائلہ کی طرف دیکھا۔

''امی..... ارما کی سہیلی کو بھی ایسی اچھی دعا دے دیں۔'' وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

عائلہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ رنگ میں بھنگ

ڈالنے میں ماہر تھا۔

''ارے کیوں نہیں..... میں تو عائلہ کے لیے بھی بہت دعا کرتی ہوں۔ پڑھائی بھی مکمل ہوگئی، نوکری کے شوق بھی پورے ہوگئے اور دنیا بھی گھوم لی۔ بس اب عائلہ کا گھر بھی آباد ہوجائے اور یہ بھی پیا دیس سدھارے۔'' انہوں نے محبت بھرے انداز میں دعا دی۔

''آپ عالیان کی شادی کیوں نہیں کرتیں خالہ! اس کا گھر بھی بس جائے گا اور آپ کا دل بھی بہو کے ساتھ لگ جائے گا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ تو آپ کو کوئی لفٹ ہی نہیں کرواتا۔ بس اپنے ہی کاموں میں مصروف رہتا ہے۔'' عائلہ نے عالیان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ارے میں تو اسے کہتی ہوں کہ خود ہی کوئی لڑکی پسند کرلے..... مجھے لوگوں کے گھروں میں جا کر لڑکیاں دیکھتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ میں تو اس رواج کے ہی خلاف ہوں۔ بیٹی والوں کی بھی تو عزتِ نفس ہوتی ہے پھر زندگی اسی نے گزارنی ہے، اچھا ہے اپنی پسند سے ہی شادی کرلے۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

''کیوں عالیان! کیا تمہیں اپنے اسکول میں کوئی ٹیچر پسند نہیں آئی؟ یا پھر کسی لڑکی نے اب تک تمہیں پسند نہیں کیا۔'' عائلہ نے اسے چھیڑا۔

''دوسری بات درست ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا پھر مسکرایا۔

''کسی سے بات کر کے تو دیکھو، کیا خبر کوئی لڑکی مان ہی جائے۔'' عائلہ نے اسے مشورہ دیا۔

''کیوں مجھے اسکول سے نکلوانا چاہتی ہو، ویسے بھی میرے اسکول کی ٹیچرز کے خواب بہت اونچے ہیں۔ وہ کسی اسکول ٹیچر سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ میں خواہ مخواہ مفت میں بدنام ہوجاؤں گا۔'' وہ ہنسا۔

''ارے یہ تو یونہی بولتا رہتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ خوش قسمتی تو یہ ہے کہ آج کل حق حلال کمانے والے شریف اور عزت دار لڑکے کا رشتہ مل جائے۔ مگر اب تو لوگوں کے معیار ہی بدل چکے ہیں۔'' خالہ نے نرمی سے ٹوکا۔

''جی ہاں، اب لوگ صرف دولت اور اسٹیٹس کو ہی دیکھتے ہیں، باقی چیزیں تو بس سیکنڈری ہو کر رہ گئی ہیں۔'' عالیان کی صاف گوئی اس کی خصوصیت تھی۔ خالہ اس کی اسی صاف گوئی کی عادت سے نالاں رہتی تھیں۔

''بات ارما کے رشتے کی ہو رہی ہے۔ ہمیں اچھا گمان رکھنا چاہیے۔ ارما بیٹا..... مجھے فون کر کے خوشخبری ضرور سنانا۔ میں انتظار کروں گی۔'' خالہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

''جی ضرور.....'' اس کے لہجے میں خالہ کے لیے بے حد احترام تھا۔ عالیان نے یک دم ارما کی طرف دیکھا۔

''کہیں یہ اس بندے کا پروپوزل تو نہیں ہے جو ہمیں نور محل اور دربار محل میں ملا تھا۔''

عالیان کی بات پر وہ دونوں یک دم اچھلیں۔ عائلہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ارما بھی اپنی جگہ دم بخود رہ گئی۔ اس کے اعصاب ایک لمحے کے لیے سن رہ گئے۔ اُف وہ کس قدر زیرک تھا اور عقاب جیسی تیز نگاہیں رکھتا تھا۔ اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ اگر سالار پُراسرار تھا تو عالیان خطرناک تھا۔

''کون ہے وہ بندہ.....؟ کس کی بات کر رہے ہو تم لوگ؟'' خالہ انجان تھیں۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگیں۔

''کوئی نہیں خالہ! عالیان تو یونہی بھونڈے قسم کے مذاق کرتا رہتا ہے۔'' عائلہ نے بوکھلا کر کہا پھر اس نے عالیان کو آنکھیں دکھائیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ خالہ کے سامنے ایسی فضول گوئی سے باز آجائے، ابھی تو یہ بھی کنفرم نہیں تھا کہ یہ وہی سالار تھا یا نہیں.....

''مذاق میں کی گئی باتیں اکثر سچ بھی ہوجایا کرتی ہیں۔'' وہ جتاتی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑایا۔ ارما گھبرا گئی۔ عائلہ نے بھی گڑبڑا کر اسے نظروں ہی نظروں میں تنبیہہ کی مگر اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ خالہ نے ان دونوں کے بدلتے تاثرات دیکھ کر اسے ٹوکا۔

''عالیان! بچی کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ یہ معاملہ مذاق والا نہیں ہے۔'' اس کے سابقہ ریکارڈ کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس بات کو مذاق ہی سمجھا مگر انہیں یہ مذاق بے حد عجیب لگا تھا۔ ارما کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا مگر وہ چپ چاپ مسکراتا رہا یوں جیسے اسے اپنی بات پر سو فیصد یقین تھا۔ اسے یوں مسکراتے دیکھ کر عائلہ نے بات بدل دی اور یہی بہتر تھا۔

''ہمارے کل صبح کے ٹکٹ لے آنا۔ ویک اینڈ ہے

ناں.....رش ہوتا ہے ہر جگہ، ٹائم پر سیٹ نہیں ملتی۔'' عائلہ نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی۔

''ہاں ضرور.....عالیان ٹکٹ لے آئے گا۔ تم لوگ اپنی پیکنگ کرلو، ارما اپنے گھر والوں کو ہمارا بہت سلام دینا۔ تم دونوں کے یہاں آنے سے ہمارے گھر میں کتنی رونق ہوگئی تھی۔ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں جس گھر میں ہوتی ہیں وہ گھر خوب صورت ہوجاتے ہیں۔ پھر کبھی موقع ملے تو دوبارہ ضرور چکر لگانا۔ بس یہ یاد رکھنا کہ یہ شہر اور ہم لوگ تمہارا انتظار کررہے ہیں۔'' خالہ نے کچھ ایسی محبت سے کہا کہ ارما کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''خالہ! اگر ارما کی شادی ہو بھی گئی تھی تو میں تو ضرور آپ کے پاس آؤں گی۔'' عائلہ نے خالہ کی محبت کا احساس کرتے ہوئے وعدہ کرلیا۔

''اپنا وعدہ یاد رکھنا۔'' عالیان معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا پھر اس نے عائلہ کی بوکھلاہٹ اور ارما کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے دانستہ بات بدل دی اور کوئی اور موضوع چھیڑ دیا کچھ دیر بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں عالیان کے اندازے پر بری طرح حیران تھیں۔ بھلا دو ملاقاتوں میں اس نے سالار کے بارے میں یہ اندازہ کیسے لگالیا تھا۔ وہ تو سالار کو پہلے سے جانتا بھی نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہوا کہ یا تو وہ غیر معمولی ذہانت کا حامل تھا یا پھر اس کی قوتِ مشاہدہ زبردست تھی یا پھر تاش کے پتوں کے کرتب کی طرح یہ بھی اس کی کوئی ٹرک تھی۔ کوئی تو بات تھی جس سے وہ دونوں بے خبر تھیں۔ کچھ بھی تھا مگر اس نے ان دونوں کو حیران کرنے کے ساتھ، ساتھ خوفزدہ بھی کردیا تھا۔ انہیں احساس ہوا کہ وہ چھپا رستم تھا۔

جب وہ عائلہ کو بس کے ٹکٹ دینے کے لیے آیا تو عائلہ نے اس کی خوب خبر لی۔ وہ ٹکٹس ہاتھ میں تھامے اسے سیڑھیوں کے پاس ملا تھا۔

''خالہ کے سامنے تم کیسی فضول قسم کی باتیں کررہے تھے۔ محل میں ملنے والے بندے کا بھلا ارما کے پروپوزل سے کیا تعلق.....؟'' عائلہ نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے اور اپنے انداز کو بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے خفا سے انداز میں کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دھیمے سے انداز میں مسکرایا۔

''بس یونہی مجھے اِک خیال آیا تو میں نے اس کا اظہار کردیا۔''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ اس کے گندمی چہرے پر کوئی انوکھا سا تاثر تھا اور ریت کے شہر میں بسنے والے لوگوں جیسی صحرائی آنکھوں میں معنی خیزی چمک تھی۔

''ایسا فضول خیال تمہیں آیا ہی کیوں؟'' بظاہر اس نے ناراض انداز میں کہا مگر وہ دل ہی دل میں اس کے اندازے پر حیران بھی تھی۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ بھلا دو ملاقاتوں میں اس نے یہ اندازہ کیسے لگالیا مگر وہ پوچھ نہ پائی۔

''کچھ لوگ مجھے فلاسفر سمجھتے ہیں اور کچھ لوگوں کو مجھ پر کسی ماہرِ نفسیات کا گمان ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگوں کے خیال میں، میں فرہاد علی تیمور کی طرح ٹیلی پیتھی کا ماہر ہوں۔ فرہاد علی تیمور کو جانتی ہو؟ نہیں ناں خیر.....بچپن میں، میں بھی تمہاری دوست کی طرح کہانیاں پڑھتا تھا۔ اِک میری پسندیدہ سیریز تھی۔ جس میں کہانی کا ہیرو فرہاد علی تیمور ٹیلی پیتھی کا ماہر ہوتا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکراتی آواز میں بولا۔ اس کی آواز میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ وہ دل میں خوفزدہ ہوگئی۔ اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ اس نے مزید اسے کیا کہنا تھا۔

''تمہاری دوست کو چاہیے کہ اپنی شادی پر مجھے ضرور انوائٹ کرے۔ آخر میں اتنے دنوں تک اپنی نوکری داؤ پر لگا کر تم لوگوں کا گائڈ بنا رہا ہوں۔ تم لوگوں کی خدمتیں کرتا رہا ہوں، مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا پھر اس نے ساکت کھڑی عائلہ کے ہاتھ میں بس کے ٹکٹ تھمائے۔ عائلہ کا چہرہ جیسے کھلی کتاب تھا جسے وہ بہ آسانی پڑھ سکتا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنا کوئی بھی تاثر اس سے چھپا نہیں سکتی تھی۔

''ہاں کیوں نہیں.....مگر ابھی تو کچھ کنفرم بھی نہیں ہے، یہ تو لاہور جا کر ہی تفصیلات کے بارے میں پتا چلے گا۔'' عائلہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے بے ربط سے انداز میں جواب دیا۔

''میں بتا رہا ہوں کہ یہ شادی کنفرم ہی ہے۔ دیکھ لینا، میں عشق کی خوشبو کو دور سے ہی پہچان لیتا ہوں، تمہاری دوست بیوقوف لڑکی ہے جو مقابل کی نظروں کو پڑھ نہیں سکتی۔'' اسی نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ آنکھیں پھیلائے اسے دیکھنے لگی۔ وہ الجبرا کے سوالوں جیسی الجھی ہوئی باتیں کرتا تھا۔

وہ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پر گہرے نیلے رنگ کا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھی۔ سیاہ چمکدار بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کبھی، کبھی وہ اسے کسی گڑیا کی طرح لگتی۔ نازک اور خوب صورت..... وہ اس پر اِک گہری نظر ڈالتے ہوئے دو سیڑھیاں چڑھا پھر مڑا۔

''تم اس بات کا مطلب نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ تمہیں بھی نظریں پڑھنے کا فن نہیں آتا۔'' ذومعنی سے انداز میں کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

وہ ہاتھوں میں ٹکٹ تھامے سیڑھی پر کھڑی اسے بلندی کی طرف جاتا دیکھتی رہی۔ اس لمحے عالیان اسے بے حد عجیب لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ واقعی ٹیلی پیتھی جانتا تھا۔

☆☆☆

بہاول پور سے لاہور آنے کے بعد حالات یکسر مختلف تھے۔ نانی پُرسکون اور مطمئن تھیں۔ ارما ان سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی تھی مگر انہوں نے اس پروپوزل کے حوالے سے کوئی خاص بات نہیں کی۔

وہ دونوں رات کو لاہور پہنچی تھیں۔ کھانے کی میز پر بڑی روایتی اور نارمل سی باتیں ہوتی رہیں۔ بہاول پور شہر کی تاریخ، وہاں کی سوغاتیں، محلات اور فنِ تعمیر کی تعریفیں، نوابوں کی کہانیاں، وہاں کا کلچر اور روایتیں اور عائلہ کی خالہ کے گھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ نانی نے سالار کے پروپوزل والا موضوع نہیں چھیڑا، ارما کو خود اس رشتے کے حوالے سے کچھ پوچھتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ عائلہ نے بہانے سے بات کرنے کی کوشش کی مگر نانی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ پھر نانی سونے کے لیے چلی گئیں اور سالار والا جگسا پزل حل ہی نہیں ہوا۔

اگلے دن جب وہ دونوں ناشتے کے بعد لاؤنج میں آئیں تو شبو خالہ بے حد خوشگوار موڈ میں نانی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

ارما نے تو ہمیشہ انہیں گلے شکوے کرتے اور اپنے حالات کا رونا روتے ہی دیکھا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ آج شیفون کے نفیس لباس میں ملبوس تھیں۔ ہمیشہ کی طرح الجھے بال آج سلجھے ہوئے انداز میں بندھے ہوئے تھے۔ نانی کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ تھی۔ وہ گہرے نیلے بارڈر والی گرے رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھیں اور انہوں نے سفید بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ ان کی نرم انگلیوں میں قیمتی پتھروں سے مزین انگوٹھیاں دمک رہی تھیں۔

ارما اور عائلہ کو لاؤنج میں آتے دیکھ کر شبو خالہ نے پُرجوش مسکراہٹ کے ساتھ ان کے سلام کا جواب دیا۔ ارما ان کے اس انداز پر حیران ہوتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ شبو خالہ اور یہ انداز..... بھلا یہ کیا ماجرا تھا۔ وہ اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے عائلہ کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

سینٹر ٹیبل پر چائے کے ساتھ براؤن بریڈ کے سینڈوچز کی ٹرے بھی رکھی تھی۔ شبو خالہ ہاتھ میں پلیٹ تھامے سینڈوچ کھاتے ہوئے نانی کے ساتھ بات چیت بھی کر رہی تھیں۔ ٹیبل پر چائے کا کپ بھی دھرا تھا جس میں سے اٹھتا دھواں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ چائے ابھی گرم اور تازہ تھی۔ نانی، شبو خالہ کی بات سنتے ہوئے آہستگی سے گھونٹ بھرتے ہوئے چائے پی رہی تھیں۔ کھڑکی سے اندر آتی دھوپ نے سارے کمرے کو روشن کیا ہوا تھا۔

''اماں آپ یقین کریں کہ میں نے تو ارما کے رشتے کے لیے بڑی دعائیں کی تھیں۔ دیکھ لیں کیا اچھا رشتہ آیا ہے۔ امیر، کاروباری اور خاندانی لوگ ہیں۔ پھر لڑکا ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، پڑھا لکھا ہے اور ایسا خوبرو جوان کہ اسے دیکھ کر میں نے دل میں سوچا کہ کہیں اسے میری ہی نظر نہ لگ جائے۔ یوں سمجھیں کہ ارما کی تو قسمت ہی کھل گئی۔'' شبو خالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارما ان کی اس خوش دلی پر حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی ہوگئی اور بے حد حیرت سے ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھنے لگی۔ ہمیشہ اس سے خار کھانے والی شبو خالہ کی یہ خوش اخلاقی ایک معما ہی تو تھی۔ عائلہ بھی ہکا بکا سی بیٹھی تھی۔ کچھ دن پہلے تک تو ارما کے رشتے داروں کے انداز ہی اور تھے۔

''کیا لڑکا بھی یہاں آیا تھا؟'' عائلہ نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ جس دن تم لوگ بہاول پور کے لیے نکلے تھے۔ وہ لوگ اسی شام کو آئے تھے۔ سویرا اور کمال سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نے انہیں بتا دیا کہ تم اپنی سہیلی کے ساتھ بہاول پور گئی ہوئی ہو۔ اب وہ لوگ دوبارہ آئیں گے۔ مجھے تو وہ لڑکا سالار بہت ہی پسند آیا ہے۔ اونچا، لمبا، خوبرو، جوان میں نے تو اسے دیکھتے ہی سوچ لیا تھا کہ ارما کی شادی اسی سے ہوگی۔'' نانی نے پُرسکون مسکراہٹ کے ساتھ اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

ارما اور عائلہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نانی کی بتائی گئی description تو اسی سالار سے ملتی جلتی تھی۔ ارما کنفیوژن کا شکار تھی کہ نہ جانے یہ کون سا والا سالار ہے۔ اس بات کا فیصلہ تو لڑکے سے ملنے کے بعد ہی کیا جاسکتا تھا۔ اس نے نانی کے مسکراتے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ نانیاں، دادیاں کتنی معصوم ہوتی ہیں، بہت کم لوگوں کو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ بڑھاپا سفید بالوں اور جھریوں کے ساتھ معصومیت بھی عطا کرتا ہے۔ نانی خوش ہو کر مسکراتیں تو ان کی بوڑھی آنکھیں بھی بچوں کی طرح مسکرانے لگتیں۔

''پہلے تو سویرا اور کمال بھائی مان ہی نہیں رہے تھے مگر بعد میں اماں نے انہیں منا کر ہی دم لیا۔ یہ ہم سب کی ماں ہیں، انہیں سب کو منانے کے گُر آتے ہیں۔ پھر ہم سب نے بھی یہی سوچا کہ ہمیں ارما کے لیے وہی فیصلہ کرنا چاہیے جو اس کے مستقبل کے لیے بہتر ہو۔'' شبو خالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نہ جانے شبو خالہ کس بات پر اتنی خوش تھیں کہ انہوں نے برسوں کی عداوتیں بھی بھلا دی تھیں۔

''اور پھر یہ رشتہ میری ایک جاننے والی کے توسط سے آیا ہے۔ اس حوالے سے بھی مجھے تسلی اور اطمینان ہے۔'' نانی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔ شبو خالہ کو یک دم یاد آیا۔

''اماں، افتخار کہہ رہے تھے کہ ان کا کوئی دوست ڈھاکا جا رہا ہے۔ انہوں نے اس سے خاص آپ کے لیے بنگلہ دیش کی ساڑیاں منگوائی ہیں۔'' شبو خالہ نے سینڈوچ کھاتے ہوئے مسکرا کر خوش دلی سے کہا۔

ارما گومگو کی حالت میں شبو خالہ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگی۔ ہمیشہ نانی کی برائیاں کرنے والے افتخار خالو کو بھلا کب سے نانی کی پسند و ناپسند کا خیال ہونے لگا۔ اتنے برسوں بعد اُن کی فطرت اور عادات اچانک کیسے بدل گئیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ نانی کی ڈکٹیٹر شپ سے کس قدر نالاں رہتے تھے۔ اب یک دم انہیں نانی کے لیے بنگلہ دیش سے ساڑیاں منگوانے کا خیال کیسے آگیا تھا۔ شبو خالہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ارما کو حیران کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

''وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ارما کی شادی کی تیاریوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ آخر لڑکے والوں کو بھی تو پتا چلے کہ ہماری ارما پورے خاندان کی چہیتی ہے۔'' افتخار خالو کے اس اعلان پر تو ارما غش کھاتے، کھاتے بچی..... افتخار خالو نے تو ہمیشہ اسے ناپسند کیا تھا اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ عائلہ بھی اس کایا پلٹ پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ اسے شبو خالہ کسی اسٹیج ڈرامے کی فنکارہ کی طرح لگیں جو روپ بدلنے میں ماہر تھیں۔

''ارما! بہاول پور سے جو چیزیں لے کر آئی ہو وہ اپنی شادی کے لیے سنبھال کر رکھ لو..... اب میں تمہاری شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتی ہوں..... اب وہ لوگ جب آئیں گے تو میں تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دوں گی۔ زیادہ دھوم دھڑکے کی ضرورت نہیں ہے اور نکاح سادگی سے ہوگا۔'' نانی کا انداز حتمی اور فیصلہ کن تھا۔

''نانی.....! کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ پہلے ارما لڑکے کو دیکھ لے، اس سے مل لے۔'' عائلہ نے جب بیٹھی ارما کو دیکھ کر دھیمی سی آواز میں کہا۔ نانی نے نرم مگر مستحکم آواز میں اسے ٹوک دیا۔

''ہم نے لڑکے کو پسند کر لیا ہے، اس کا خاندان دیکھ اور پرکھ لیا ہے، بس کافی ہے۔ ارما فرمانبردار اور تابعدار لڑکی ہے۔ اسے ہماری پسند اور فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے بھی لڑکیوں کی شادی کا فیصلہ گھر کے بڑے بزرگ ہی طے کرتے ہیں۔ شبو کی نند کا بوتیک ہے، میں نے اس سے کہہ دیا ہے وہ دس بارہ جوڑے فوراً تیار کروا دے گی۔ زیور میرے پاس موجود ہے، باقی لڑکے کے گھر والوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ انہیں جہیز کی

ضرورت نہیں ہے۔ باقی شاپنگ تم دونوں شبو کے ساتھ جا کر کر لینا۔ میرے دل کو انجانے خدشات اور واہمے خوفزدہ کیے رکھتے ہیں۔ میں ارما کی شادی میں اب دیر نہیں کرنا چاہتی ہوں۔'' نانی کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔ سب فیصلے ہو چکے تھے۔ ارما کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

''اور خوشی کی بات تو یہ ہے کہ عائلہ بھی اپنی سہیلی کی شادی اٹینڈ کر لے گی۔'' شبو خالہ ہنس کر بولیں۔

عائلہ کو بھی اخلاقاً مسکرانا پڑا۔ پچھلی بار کی بداخلاقی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے ان کی یہ خوش خلقی مصنوعی سی لگی۔

''جی بالکل......'' عائلہ کو مسکرا کر کہنا پڑا۔

ارما خاموشی سے یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ اس کے بہاول پور جانے کے بعد آخر یہاں ایسا کیا ہوا تھا جو حالات اور افراد سب یک دم بدل گئے تھے۔ نانی اس کی شادی کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ جب فرحان کے ساتھ اس کی بات چیت ختم ہوئی تھی تو وہ خوفناک قسم کے ڈپریشن سے گزر رہی تھی۔ اس نے اپنی شادی کا اختیار نانی کو ہی دے دیا تھا اور اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جہاں چاہیں اس کا رشتہ طے کر دیں۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ اپنے لیے خود ہم سفر چننے کا نتیجہ دیکھ چکی تھی۔ فرحان فلرٹ تھا اور اس نے ارما کو دھوکا دیا تھا۔ اس نے دھوکے کی تکلیف بھی اٹھائی تھی اور نانی کے سامنے شرمندہ بھی ہوئی تھی۔ وہ فرحان کو اور اس کے ساتھ گزرے وقت کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

نانی نے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ ارما کے پاس ان کی بات مان لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اب اسے لڑکے والوں کی آمد کا انتظار تھا۔ وہ اس لڑکے سے ملنا چاہتی تھی تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ کون سا والا سالار تھا۔

اس کا دل کہتا کہ کیا خبر یہ وہی سالار ہو جس سے وہ پہاڑوں پر ملی تھی پھر وہ اسے نور محل اور دربار محل میں نظر آیا تھا۔ سرخ وسفید رنگت، چاکلیٹ براؤن بالوں اور سنہری آنکھوں والا جو نوابوں جیسی شان و شوکت اور شہزادوں جیسی آن بان رکھتا تھا۔

''بھلا وہ یہاں تک کیسے آ سکتا ہے، اسے نہ تو میرا ایڈریس پتا ہے نہ ہی میرا فون نمبر...... بس کبھی کبھار کسی انجان راستے پر یونہی مل جایا کرتا ہے۔ کبھی کسی مسافر کی طرح...... کبھی کسی سیاح کے روپ میں......'' وہ سوچتی کہ وہ کسی دیس کی شہزادی تو نہیں تھی جسے وہ لمبی مسافتیں طے کرنے کے بعد ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آجاتا۔ دو پل کی ملاقات میں کوئی اتنا اہم فیصلہ تو کر نہیں سکتا۔ اس نے دل ہی دل میں خوش فہمیوں سے نگاہ چراتے ہوئے سوچا۔

''دو پل کی ملاقاتوں میں ہی تم، اسے دل دے بیٹھی تھیں ارما......'' اس کے اندر سے آواز آئی۔ وہ یک دم خوفزدہ ہو گئی۔

وہ اس راز سے انجان نہیں تھی مگر اسے تسلیم کرنے سے ڈرتی تھی۔ دھوکا کھانے والی لڑکیاں پھر کسی پر اعتبار نہیں کر سکتیں۔ یہ تو کسی بہادر اور جی دار آدمی کا ہی کمال ہوتا ہے جو ان کے ٹوٹے ہوئے اعتبار کو دوبارہ سے جوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اور...... سالار وہی آدمی تھا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے وہ لوگ ارما کے گھر آئے تھے۔ نانی صبح سے تیاریاں کروا رہی تھیں اور کھانے بنوا رہی تھیں۔ شبو خالہ بھی شور مچاتے ہوئے سائرہ سے کام کروا رہی تھیں۔ عائلہ نے ارما کو نانی کی ہدایات پر تیار کیا۔ جب شام کو وہ لوگ آئے تو نانی نے ان کا پُرتپاک استقبال کیا۔

وہ وہی تھا سیاہ پینٹ اور اسکائی بلیو شرٹ پہنے ہوئے، وہ ان کے ڈرائنگ روم میں بڑی شان اور وقار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کلائی میں وہی مخصوص سلور رنگ کی گھڑی چمک رہی تھی۔ چاکلیٹ براؤن بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ سرخ وسفید چہرے پر تازگی تھی اور سنہری آنکھوں میں الوہی روشنی سی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے والدین بیٹھے تھے۔ گورے چٹے اس ہی کی طرح سنہری آنکھوں والے...... اس کے والد کا قد درمیانہ تھا اور وہ آف وائٹ شلوار قمیص پر براؤن رنگ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھے۔ والدہ سرخ وسفید رنگت کی حامل فربہی مائل خاتون تھیں۔ ریشمی لباس اور سونے کے زیورات پہنے ہوئے تھیں۔ وہ خاندانی اور خوشحال لوگ نظر آرہے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے اندر کا سارا منظر دیکھ چکی تھی۔ اس کے پیچھے کھڑی عائلہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس رہی تھی۔

''تو یہ وہی سالار ہے۔'' وہ خوشی سے بولی۔ ارما کی پلکیں جھک گئیں۔

ناران، کاغان کی وادیوں سے نور محل اور دربار محل تک.....اور پھر اس کے گھر تک آنا اسی سالار کا کمال ہوسکتا تھا۔ ناران کی سرسبز وادیوں میں اس کی سنہری آنکھوں میں اس کے لیے واضح پیغام تھا۔

''ہم پھر ملیں گے.....میں ضرور آؤں گا.....

تمہاری زندگی میں.....تمہارے قریب.....چھپ، چھپ کر آنسو بہانے والی لڑکی کے لیے اجالوں کا تحفہ لے کر آؤں گا۔'' اس وقت وہ اس پیغام کو سمجھ نہیں سکی تھی مگر پتا نہیں کیسے، اچانک وہ اس کے دل میں آباد ہوگیا تھا۔ وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ واقعی تمہارا اس سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔'' اندر آکر عائلہ نے اس سے ایکسائٹڈ انداز میں کہا۔

''یقین کرو میرا اس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بے شک میرا موبائل چیک کرلو۔'' وہ دونوں ڈرائنگ روم سے ذرا فاصلے پر بنے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئیں۔

''پھر وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟'' عائلہ نے تجسس آمیز انداز میں کہا۔

''میں تو اس بار خود حیران ہوں، مجھے واقعی نہیں معلوم کہ وہ یہاں تک کیسے آگیا۔'' ارما نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''مجھے تو یہ سب کسی فیری ٹیل جیسا لگ رہا ہے، تم اس سے پوچھنا تو سہی کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ اس نے یہاں کا ایڈریس کیسے لیا اور اس نے یہ فیصلہ آخر کب کیا۔ جب وہ ہمیں بہاول پور میں ملا تھا تب تو اس نے ایسی کسی بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔'' عائلہ کو یہ سب کچھ کسی کہانی کی طرح لگ رہا تھا۔

''پوچھ لوں گی، کیا پتا وہ خود ہی بتادے۔'' وہ گود میں رکھے پرس کی زنجیر انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

''خوش ہونے کا اعتراف نہیں کروگی؟'' عائلہ نے شوخی سے اسے کہنی ماری۔ اس نے اسے چھیڑا۔

ارما بے ساختہ ہنسی.....ہنسی کی چھنکار میں خوشی کی کھنک تھی۔ اسے لفظوں میں اس بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جواب تو اس کے چہرے پر لکھا تھا اور اس کی ہنسی کی جھنکار میں موجود تھا۔

''عالیان کا اندازہ درست تھا۔ ضرور وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہوگا۔'' عائلہ کو عالیان یاد آیا۔ عالیان کے اندازے کی درستگی کا اعتراف تو ارما کو بھی تھا۔

یک دم افتاں وخیزاں شبو خالہ لاؤنج میں آئیں۔

''ارما! تمہارا میک اپ تو نہیں خراب ہوا ناں.....؟'' انہوں نے ارما کے پاس آکر اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے عجیب سی فکرمندی سے کہا۔ پھر وہ اس کے بال ٹھیک کرنے لگیں۔

''سالار تم سے ملنا چاہتا ہے۔ اماں نے تم دونوں کو بات چیت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اماں بھی یک دم ماڈرن ہوگئی ہیں۔ سالار کے گھر والوں کے آتے ہی اُن کے برسوں پرانے خیالات بدل کر رہ گئے ہیں۔ میں نے لان میں کرسیاں لگوادی ہیں، تم دونوں وہاں بیٹھ کر بات چیت کرلینا مگر اپنے گھر اور خاندان کے بارے میں تفصیلات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کوشش کرنا کہ کم بات چیت ہو۔'' انہوں نے بھاری بھرکم دوپٹے کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ ایسی ہی ہوتی تھی۔ اعتراضات، مشوروں اور تنقید کا مجموعہ..... ارما بوکھلا گئی۔

''مگر میں اس سے کیا بات کروں گی۔'' اس کی گھبراہٹ عروج پر تھی۔

''اب کیا یہ بھی میں بتاؤں.....؟'' انہوں نے ابرو اچکا کر اسے عجیب سے انداز میں دیکھا۔

ہلکے گلابی لباس میں لمبے کھلے بالوں کے ساتھ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سنہری رنگت والے چہرے پر ہلکا، ہلکا میک اپ دمک رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس خاندان کی خوب صورت ترین لڑکی تھی۔

''اس میں گھبرانے والی کیا بات ہے.....تم اب میٹرک میں پڑھنے والی چھوٹی موٹی سی لڑکی تو نہیں ہو ارما.....یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھی ہوئی ہو، جاب کرتی رہی ہو، دنیا گھومنے پھرنے والی خود مختار لڑکی ہو۔'' شبو خالہ نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ خوش اخلاقی کے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ذرا دیر کے لیے لڑ کھڑائی تھیں۔ ارما چپ ہوگئی مگر عائلہ سے چپ نہ رہا گیا۔

''آنٹی! کیا یونیورسٹی میں پڑھنے والی، جاب کرنے والی خود مختار لڑکیاں اپنی شادی کے ذکر پر اور اپنے ہونے والے ہم سفر سے ملنے کی بات پر شرما نہیں سکتیں۔''

شبو خالہ کو جیسے کوئی کرنٹ لگا۔ ان کے چہرے کا رنگ یک دم بدلا۔ ان کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں عائلہ کی بات کس قدر بری لگی ہے۔ انہیں تو کسی کی تنقید سننے کی عادت ہی نہیں تھی۔

ارما اس وقت اِک نئی بحث چھڑنے کے خوف سے گھبرا گئی اور پرس اٹھا کر ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''چلیں خالہ لان میں چلتے ہیں۔'' وہ دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں بولی۔

''ہاں چلو.....'' شبو خالہ نے ایک تیز نگاہ پُراعتماد انداز میں بیٹھی عائلہ پر ڈالی پھر بگڑے تیوروں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھیں۔ نہ جانے کس مصلحت کی وجہ سے وہ چپ ہوگئی تھیں۔ ورنہ ان سے زیادہ لڑاکا اور جھگڑالو خاتون ان کے پورے خاندان میں نہیں تھی۔

ارما، شبو خالہ کے ساتھ لان میں آگئی۔ پھولوں سے بھرے باغ کے وسط میں سفید رنگ کی کرسیاں پڑی تھیں۔

خالہ نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''یہ یاد رکھنا کہ اماں تمہارا رشتہ طے کر چکی ہیں..... تم نے سالار کے ساتھ صرف بات چیت کرنی ہے، فیصلہ نہیں کرنا، فیصلہ ہو چکا ہے۔'' وہ سنجیدہ اور سخت سے انداز میں بولیں پھر اندر چلی گئیں۔

ارما خاموش بیٹھی اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کرنے لگی پھر وہ پھولوں کے گرد اڑتی رنگین تتلی کو دیکھنے لگی۔ کچھ منظر اتنے خوب صورت ہوتے ہیں کہ انسان انہیں دیکھتے ہوئے بے اختیار محو ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ دھیمے مگر مضبوط قدموں سے چلتا ہوا لان پار کرتے ہوئے اس کی طرف آیا۔ ارما کو محسوس ہوا کہ وہ قریب آرہا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں پھر اس کے اردگرد مانوس سی خوشبو پھیل گئی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' وہی سحر انگیز مردانہ آواز جس کے سراب نے اسے کب سے قید کر رکھا تھا اور وہ اس سراب کی اسیر تھی۔ وہ خوش دلی اور بشاشت سے کہتے ہوئے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر روشن مسکراہٹ اور آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ آج کس قدر خوش تھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے بس مسکرا دی۔ یہ بھی ایک جواب ہی تھا۔

''مجھے یہاں دیکھ کر حیران رہ گئیں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ارما نے بمشکل اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں پر قابو پایا اور اس بات کا جواب بھی صرف مسکراہٹ سے ہی دیا۔

''اسی طرح جس طرح تم مجھے نور محل میں اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔'' وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

وہ بول نہ سکی۔ وہ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتا رہا۔

''کچھ بولو گی نہیں؟'' وہ اپنائیت بھرے انداز میں نرمی سے اس سے بات کر رہا تھا تاکہ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا سکے۔ ارما کے ذہن سے سب باتیں نکل گئیں۔ وہ سارے سوال جو وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی اور جن کے بارے میں وہ اتنے دنوں سے سوچ رہی تھی وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے گہری آواز میں کہا۔

''جانتی ہو تمہارے گھر آنے کا فیصلہ میں نے کب کیا تھا؟'' اس کی آواز میں محبت کی آنچ تھی۔ وہ اس کے دل میں موجود سب سوالوں کا جواب دینا چاہتا تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ناران کے بازار میں بادام کی دکان پر؟'' وہ مدھم آواز میں بولی۔ وہی کومل آواز جو خوابوں میں اکثر اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔ سالار کی مسکراہٹ دلفریب ہوگئی۔

''نہیں..... اس وقت میں نے تمہیں دیکھا ضرور تھا اور تم مجھے اچھی بھی لگی تھیں اور میں تمہاری طرف اٹریکٹ ضرور ہوا تھا مگر.....'' وہ چند لمحے رکا..... پھر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ فیصلہ میں نے اس وقت کیا تھا جب میں نے تمہیں ناران کے بازار میں زیورات والی دکان پر دیکھا تھا۔ میری نظر آئینے پر پڑی اور چاندی کے زیور پہننے والی لڑکی کے خوب صورت عکس پر ٹھہر گئی۔ جس کے سیاہ بالوں پر چمکتے ہوئے موتیوں کی لڑیاں جگمگا رہی تھیں۔ ماتھے پر

بندیا سجی تھی اور گلے میں چاندی کا ہار تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں اس عکس پر سے نظریں نہیں ہٹا پایا تھا۔ میں سو تے، جاگتے اس عکس کے ٹرانس میں رہنے لگا۔ مجھے خوابوں میں چاندی کے زیور پہنے وہی حسین لڑکی نظر آتی اور میں اس کے تعاقب میں بھاگتا رہتا۔ مجھے یوں لگتا کہ شاید وہ پرانی کہانیوں والا جادوئی آئینہ تھا اور اس میں نظر آتا عکس کسی پری کا تھا جسے بھلانا میرے اختیار سے باہر کی بات تھی۔ میں اس کا اسیر ہو چکا تھا۔ پھر میں نے تمہیں صبح کے چمکتے اجالے میں بادلوں کے سائے تلے برف پوش پہاڑوں میں گھری جھیل سیف الملوک پر دیکھا۔ تم کشتی میں بیٹھی تھیں اور کشتی سبز پانی میں تیرتے ہوئے دور جا رہی تھی۔ میں جھیل کنارے یوں کھڑا تھا جیسے پنا ٹائر ہو گیا ہوں۔ پھر تم مجھے مگن سے انداز میں زمرد، فیروزہ اور یاقوت دیکھتے ہوئے قیمتی پتھروں کی دکان پر نظر آئیں۔ میں وہاں ایک رنگ لینے گیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ تم سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ موقع ایسا نہیں تھا پھر تم بھیڑ میں کہیں گم ہو گئیں مگر میرے دل پر تمہارا عکس نقش ہو گیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ پلکیں اٹھاتے، گراتے خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔ وہ خوش بھی تھی، حیران بھی اور دم بخود بھی.... سالار کے ایسے جذبات اور کیفیات کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ تو بس اس کے بارے میں سوچتی تھی، وہ اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتا ہے اس بارے میں تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

چاندی کے زیور، جادوئی آئینہ، لکڑی کی کشتی، سبز پانی کی جھیل، برف پوش پہاڑ..... وہ چپ چاپ حیران آنکھوں کے ساتھ اس کی بات سنتے ہوئے جیسے کسی فیری لینڈ میں گم ہو گئی، کہانیاں پڑھنے والی لڑکی کے لیے عشق کی یہ داستان حیرت کدہ ہی تو تھی۔

سالار نے ذرا دیر رکنے کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔

''میرے والدین کا تعلق کاغان سے ہے مگر ہم بہت عرصے سے لاہور میں ہی سیٹلڈ ہیں۔ اس لیے میں اکثر ناران، کاغان آتا جاتا رہتا ہوں اور پشتو سمجھ اور بول سکتا ہوں۔ میں بادام والی دکان پر تم لوگوں کے ساتھ لالا پربت نارانی کو دیکھ چکا تھا جب وہ پشتو میں دکاندار سے کہہ رہا تھا کہ یہ مہمان ہمارے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، انہیں اچھا والا ڈرائی فروٹ دکھاؤ اور رعایت بھی دو۔ وہ میرا جاننے والا تھا پھر میں نے اس سے بہانے سے تم لوگوں کا فون نمبر بھی لے لیا تھا۔ تمہارے ٹور گائڈ اختر بھائی کو بھی میں جانتا تھا۔ اب بھی اکثر میرا ان لوگوں سے آمنا سامنا ہوتا رہتا ہے۔''

ارما کو یاد آیا کہ اس نے اور عائلہ نے لالا نارانی کو اپنے فون نمبرز دیے تھے تاکہ وہ بوقتِ ضرورت ناران سے چیزیں منگوا سکیں۔ اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ ناران کی سرسبز اور دلکش وادی، بارونق بازار، دریائے کنہار، چاق و چوبند مہمان نواز لالا نارانی، ہر طرف بھاگتے دوڑتے اختر بھائی گروپ کے دیگر لوگ خوب صورت جھیل سیف الملوک..... وہ ایک یادگار ٹرپ تھا..... سرسبز وادی کے اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے اسے ایک اجنبی سے محبت ہو گئی تھی۔

سالار مدھم مگر بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔

''ہوٹل میں مہمانوں کے آئی ڈی کارڈز کی کاپی موجود ہوتی ہے۔ میں نے وہیں سے تمہارے آئی ڈی کارڈ کی کاپی لی، اس پر اس گھر کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ پھر میں نے اختر بھائی سے یہ ایڈریس کنفرم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے تم لوگوں کو ناران سے واپس لاہور آ کر اسی ایڈریس پر ڈراپ کیا تھا پھر میں نے اپنے والدین سے بات کی۔ وہ بہت عرصے سے مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ انہوں نے کہا ہوا تھا کہ کوئی لڑکی اچھی لگے تو فوراً بتا دینا مگر میں نے اس حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ جب مجھے تم نظر آئیں تو فیصلہ بھی فوراً ہو گیا۔ ہم لوگ تمہارے گھر آئے تو پتا چلا کہ تم بہاول پور گئی ہوئی ہو اور اگلے دن میں بھی بہاول پور میں ہی تھا۔ میں نے عائلہ کے فون نمبر پر اس کا status دیکھ لیا تھا جس پر لکھا تھا چیک ان ٹو نور محل پھر میں بھی پانچ منٹ میں نور محل پہنچ گیا۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا، لیمپ کی روشنی میں چمکتے ہوئے ٹائم پیس کے قریب کھڑے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے اس عالیشان محل میں کوئی شہزادی کھڑی ہے۔ محو، حیران اور خوب صورت..... میں چاہتے ہوئے بھی تم سے زیادہ بات نہیں کر پایا تھا کیونکہ تمہاری دوست اور اس کا کزن

وہاں آگئے تھے.....پھر تم سے میری ملاقات دربار محل میں ہوئی۔ تم طویل راہداری کے کونے میں کھڑی تھیں۔ میری نظر تم پر پڑی تو یوں لگا جیسے محل کی راہداری میں اجالا ہوگیا ہو۔'' وہ اک جذب کے عالم میں بولا۔

ارما کے چہرے پر دھنک کے رنگ تھے جنہیں وہ چاہنے کے باوجود چھپا نہ پائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ حیرت کدے کے محل میں کھڑی پریوں کے دیس میں رہنے والی کوئی شہزادی تھی جو ہر طرف لگے آئینوں میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا اس کی گود میں موتیوں والا چھوٹا سا پرس رکھا تھا۔

''میں آپ کو اک تحفہ دینا چاہتی ہوں۔'' چند لمحوں بعد اس نے یونہی سر جھکائے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ یک دم چونکا۔

ارما نے دھیرے سے پرس کھول کر اس میں سے تین رنگوں والی چاندی کی انگوٹھی نکال کر سالار کی طرف بڑھائی۔

''یہ انگوٹھی تو میری ہی ہے۔'' اب کی بار وہ حیران ہوا۔

وہ ذرا آگے جھکا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر حیران کن انداز میں وہ انگوٹھی تھام لی۔ وہ اسے پہچان چکا تھا۔ وہ اسی کی تھی۔

''مگر یہ تو کسی شندور خان کی ہے۔'' ارما نے.... بے ساختہ کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملی؟'' اس نے حیران مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

وہ بہاول پور میں بھی ارما کے منہ سے شندور خان کا نام سن چکا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ اس بارے میں سوچتا رہا کہ بھلا ارما، شندور خان کو کیسے جانتی ہے اور یہاں آتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس سے اس بارے میں ضرور پوچھے گا۔

''ہم لوگ ناران سے واپس آتے ہوئے ایک لینڈ سلائڈنگ میں پھنس گئے تھے۔ اس دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور زبردست طوفان تھا پھر ہم نے وادیٔ کاغان میں پہاڑی چشمے کے پاس بنے لکڑی کے گھر میں کچھ دیر کے لیے پناہ لی تھی۔ وہاں سرخ بالوں والی ایک معمر خاتون تھیں۔ جنہیں سب بی بی جان کہتے تھے۔ ایک نوعمر لڑکی زرینہ تھی جو چادر پر رنگین دھاگوں سے کڑھائی کرتی اور موتیوں والے مکرامے بناتی تھی۔ لکڑی اور پتھروں سے بنا وہ گھر مجھے اب بھی یاد آتا ہے۔ جہاں آتش دان میں لکڑیاں سلگتی تھیں اور کھڑکی کے پاس دیا روشن ہوتا تھا۔ جنگلی پھولوں سے مہکتے باغ میں تتلیاں رقص کرتی تھیں اور خوبانی کے درخت کی شاخ سے لٹکا جھولا ہوا کے دوش پر لہراتا تھا۔ مجھے یہ انگوٹھی اسی گھر میں گری ہوئی ملی.....میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہ وہی انگوٹھی تھی جسے ہم نے قیمتی پتھروں والی دکان پر دیکھا تھا۔ میں نے بی بی جان سے پوچھا کہ یہ انگوٹھی کس کی ہے تو انہوں نے بتایا کہ یہ ان کے کسی رشتے دار کی ہے جس کا نام شندور خان ہے اور وہ کوئی ٹرک ڈرائیور ہے۔''

سالار اس کی بات توجہ سے سنتے ہوئے اس کی آخری بات پر یک دم ہنسا۔

''ویسے تو میں بھی ٹرک چلا لیتا ہوں۔'' وہ انگوٹھی پہنتے ہوئے محظوظ ہوتے انداز میں بولا۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔

''کیا آپ شندور خان کو جانتے ہیں؟'' اس نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں جانتا ہوں مگر اب یہ انگوٹھی میری ہے اور بہت قیمتی بھی ہے کیونکہ یہ میری منگیتر نے مجھے تحفے میں دی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا.....اس کی نگاہوں میں اس کے لیے وارفتگی تھی۔

ارما کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ خود مختار اور دنیا گھومنے پھرنے والی لڑکی یک دم شرما گئی تھی۔

☆☆☆

نانی نے ارما اور سالار کا رشتہ طے کر دیا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ اس شادی میں دیر نہ ہو۔ سالار سے ملاقات کے بعد شبو خالہ، ارما کو سالار کے والدین کے پاس ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔ وہ لوگ ارما کے ساتھ بے حد ...محبت بھرے انداز میں پیش آئے۔

مہمانوں کے جانے کے بعد بھی گھر میں بڑی گہما گہمی تھی۔ شبو خالہ سینٹر ٹیبل پر پڑے تحائف سنبھالنے میں مصروف تھیں جو لڑکے والے ارما کے لیے لے کر آئے

تھے۔ وہ ہر تحفے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ سب ہی تحائف قیمتی تھے۔ وہ یہ تحفے لے کر نانی کے کمرے میں چلی گئیں۔

نانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ انہوں نے ایک اہم اعلان کرتے ہوئے ارما کو سرپرائز دیا۔

''ارما بیٹا! میں آج اتنی خوش ہوں کہ اس خوشی کا اظہار لفظوں میں نہیں کرسکتی۔ میں منگنی وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی ہوں، ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کی وجہ سے میرا دل ڈرتا ہے۔ میں نے سالار کے والدین سے بات کرلی ہے۔ ہم لوگ اگلے جمعے کو سادگی سے نکاح کرلیں گے۔ وہ لوگ بھی رضامند ہیں، میں جلد از جلد تمہارے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے فیصلہ کُن اور حتمی انداز میں کہا۔ وہ نانی کے سامنے مشرقی لڑکی کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اتنی جلدی؟ اگلے جمعے میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں نانی.....؟'' اس نے سر اٹھا کر بے ساختہ کہا۔

وہ سمجھ نہ پائی کہ نانی اتنی جلدی اس کا نکاح کیوں کرنا چاہتی ہیں مگر اسے اندازہ تھا کہ اگر نانی ایسا چاہ رہی ہیں تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی۔ ماضی میں ہونے والے واقعات کا عفریت انہیں خوفزدہ کیے رکھتا تھا۔

''تم نہیں جانتی ارما..... یہ کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے۔ آج جو لوگ ہمیں خوشی ہمیں مبارک بادیں دے رہے ہیں کل وہ کب بدل جائیں پتا ہی نہیں چلے گا۔ منگنی کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے۔ اس میں حقوق و فرائض کی قدغن نہیں ہوتی۔ تحفظ کا سہارا نہیں ہوتا۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہارا اور سالار کا نکاح ہوجائے۔ شوہر کا سائبان، عورت کو زمانے کی دھوپ سے بچالیتا ہے۔ لوگوں کو بھی پتا ہوگا کہ اب تم اکیلی نہیں ہو، تمہارا شوہر تمہارے ساتھ ہے۔ نکاح سادگی سے ہوگا، زیادہ لوگوں کو بلانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ سالار کے گھر والوں نے میری بات سمجھ لی ہے اور وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' نانی نے سنجیدگی سے حتمی انداز میں کہا۔ وہ دور اندیش خاتون تھیں ضرور انہوں نے بے حد سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ ارما سمجھ نہ سکی کہ اُن کا اشارہ کن لوگوں کی طرف تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے سنجیدہ چہرے کے ساتھ مدھم آواز میں کہا۔

''نانی کیا آپ نے انہیں بتادیا ہے کہ.....'' اس کی آواز میں اندیشوں کے سائے تھے اور چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

انہوں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

''ہاں بتادیا ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اچھے لوگ ہیں، انہیں ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ان کے لہجے میں اطمینان تھا۔ پھر انہوں نے اندر آتی عائلہ کو دیکھا اور مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

''عائلہ بیٹا! اگلے جمعے کو ارما کا نکاح ہے، تم اپنی خالہ سے میری بات کروانا..... میں انہیں اور ان کی فیملی کو خود انوائٹ کروں گی۔'' عائلہ کے کہنے سے پیشتر نانی نے خود ہی کہہ دیا۔

''او کے نانی، میں فون پر خالہ سے آپ کی بات کروا دوں گی۔'' وہ خوشی سے بولی پھر ارما کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اسے نانی کی اس وضع داری نے خوش کردیا تھا کہ انہوں نے عائلہ کے ساتھ، ساتھ اس کی فیملی کو بھی اہمیت دی تھی۔

''ارما کے نکاح کے بہت سارے کام تم نے کرنے ہیں شہو، پارلر سے بیوٹیشن کو گھر لے آئے گی، وہ ارما کو تیار کردے گی۔ مہندی لگانے والی لڑکی نکاح سے ایک دن پہلے آکر ارما کو مہندی لگا جائے گی۔ بس تم ارما کے ساتھ، ساتھ رہنا..... زیور اور نکاح کا جوڑا لڑکے والوں کی طرف سے آئے گا۔ ان لوگوں کی خواہش ہے کہ اس موقع پر ارما ان کے علاقے کا روایتی لباس اور زیورات پہنے اور روایتی دلہن کی طرح تیار ہو، انہوں نے ہماری بات مانی ہے تو ہمیں بھی ان کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ کھانے اور کیٹرنگ کا انتظام شہو اور افتخار دیکھ لیں گے۔ ویسے بھی زیادہ لوگوں کو میں نے نہیں بلانا ہے۔ صرف چند افراد ہی ہوں گے۔ سویرا، کمال اور ازمیر بھی جمعرات کی رات کو پہنچ جائیں گے۔ نکاح ہوجائے پھر سارے رشتے داروں کو اطلاع دے دیں گے۔'' نانی نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ وہ یہ سارے معاملات طے کرچکی تھیں۔ عائلہ نے انہیں اس حوالے سے تسلی دی۔

''نانی آپ فکر نہ کریں۔ سب انتظامات اور تیاریاں وقت پر ہوجائیں گی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اور میری ایک بات یاد رکھنا عائلہ بیٹا..... سوشل

میڈیا پر ارما اور سالار کے نکاح کی تصویریں ہرگز نہ لگانا۔ کہیں کسی کی بری نظر ہی نہ لگ جائے۔ اپنی خوشیوں کا لوگوں کے سامنے اشتہار نہیں لگانا چاہیے۔ میں تو اس چیز کے سخت خلاف ہوں..... آج کل دوست اور دشمن کو پہچاننا بہت مشکل ہے اور پھر اپنی ذاتی زندگی کے یادگار لمحے پبلک کے ساتھ شیئر نہیں کرنے چاہئیں۔'' نانی نے سمجھاتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے نانی، میں بھی ان باتوں کو سمجھتی ہوں۔'' عائلہ بے ساختہ بولی۔ وہ نانی کی محتاط طبیعت کو اب سمجھنے لگی تھی۔

''تم لوگ کل بازار جا کر اپنی شاپنگ کر لینا عائلہ بیٹا تم بھی اپنے لیے ریڈی میڈ سوٹ لے لینا اور ضروری چیزوں کی لسٹ بنا لینا، اس طرح شاپنگ میں آسانی رہتی ہے۔''

''جی ہاں، نانی، کل تو ہم صبح ہی شاپنگ کے لیے نکل جائیں گے۔'' عائلہ نے کہا۔

ارما مدھم مسکراہٹ کے ساتھ چپ بیٹھی ہی باتیں سنتی رہی۔ کچھ دیر بعد شبو خالہ بھی آ گئیں۔ بظاہر تو وہ مسکرا، مسکرا کر باتیں کر رہی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں کوئی عجیب سا تاثر تھا۔ وہ بار، بار سالار کی تعریفیں کرتیں۔ وہ کتنا خوبرو اور ہینڈسم تھا۔ اس کے والدین کو سراہتیں جنہوں نے فوراً ہی نانی کی بات مان لی اور اگلے جمعے نکاح کے لیے بھی راضی ہو گئے تھے۔ ان کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا۔ وہ امیر اور خوشحال ہونے کے ساتھ، ساتھ سادہ مزاج لوگ بھی تھے۔ شبو خالہ کی آنکھیں دیکھ کر ارما کو اندازہ ہوا کہ وہ خوش نہیں تھیں۔ صرف خوش نظر آنے کا ڈراما کر رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے انہیں خود بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کس قسم کے ردِعمل کا اظہار کریں۔ ارما حیران تھی کہ آخر ایسی کیا مجبوری تھی جو وہ ایسی خوش خلقی کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں اور نانی کی ہر بات مانتی جا رہی تھیں۔ پتا نہیں ارما کے بہاول پور جانے کے بعد یہاں ایسا کیا ہوا تھا کہ سب کے رویّے، انداز اور خیالات یکسر بدل گئے تھے۔

نانی تو اسی شام برسوں سے سیف میں بند زیورات پالش کروانے کے لیے جیولر کو دے آئیں۔ پھر رات تک وہ فون لیے بیٹھی رہیں۔ پہلے انہوں نے ارما کے والدین

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس
100 روپے
ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے
بھیج کر سالانہ خریدار اور
750 روپے ادا کر کے 6 ماہ
کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں
اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کو فون کیا پھر عائلہ کی خالہ سے بات کی پھر بیوٹیشن، کیٹرنگ والے، بوتیک والی غرض ایک لمبی لسٹ تھی۔ نانی کیا سارا گھر ہی ایک دم سے مصروف ہوگیا تھا۔

ارما بہت خوش تھی، عائلہ شوخی سے اسے چھیڑ رہی تھی۔ سالار سے ملنے اور اس سے بات کرنے کے بعد وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ قسمت سے سارے گلے شکوے دور ہوگئے تھے۔ وہ وہی تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ وہ پہاڑوں پر سالار سے ملی تھی تو صرف وہ ہی اس سے متاثر نہیں ہوئی تھی بلکہ سالار بھی اس کا اسیر ہوگیا تھا۔ یہ احساس خوش کُن تھا۔ وہ ماضی کو بھول چکی تھی۔ ماضی کے قدموں کے نشان مدھم پڑتے ہوئے اس کے ذہن سے غائب ہوگئے تھے۔ اب وہ خوب صورت اور تابناک مستقبل کی منتظر تھی۔

رات کو سالار کے نمبر سے عائلہ کو ایک میسج آیا۔ اس نے اسے فرحان کا نمبر سینڈ کیا تھا۔ عائلہ وہ میسج پڑھ کر تذبذب میں پڑ گئی۔ حالات اتنی تیزی سے بدلے تھے کہ فرحان اور اس کی داستان ماضی کا قصّۂ پارینہ بن چکے تھے اور عائلہ کا تجسس بھی ختم ہوگیا تھا۔ اس نے بیزاری سے سوچا کہ اب بھلا اس نے اس نمبر کا کیا کرنا تھا۔ اس نے فرحان کے نمبر کو کسی فالتو چیز کی طرح نظر انداز کردیا اور یہی بہتر تھا۔

تیاریوں میں دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اگلا جمعہ بھی آگیا۔ ارما کے امی، ابا اور ازمیر جمعرات کی رات کو ہی پہنچ گئے تھے اور حیرت انگیز طور پر وہ ارما اور نانی کے لیے ملتان سے بہت سے تحائف لے کر آئے تھے اور بے پناہ خوشی کا اظہار بھی کررہے تھے۔ عائلہ کی خالہ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے نہیں آسکیں مگر عالیان ہشاش بشاش اور تازہ دم انداز میں جمعہ کی صبح کو ہی پہنچ گیا تھا۔ شبو خالہ بھی صبح سویرے بیوٹیشن کو لے آئیں جو ارما کو... تیار کرنے لگی۔ لڑکے والوں نے نکاح کا جوڑا اور زیور بھی صبح ہی بھجوادیے تھے۔ عائلہ نے جوڑے کا ڈبا کھولا۔ وہ ہاتھ کے کام سے مزین گوٹے کناری والا سرخ جوڑا تھا۔ دوپٹے کے کنارے گوٹے کے پھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ موتیوں کی لڑیوں اور رنگین پتھروں والے چاندی کے زیور تھے۔

''ٹریڈیشنل ڈریس اینڈ جیولری.....'' عائلہ نے بے ساختہ تعریفی انداز میں کہا پھر اسے یاد آیا۔

''جب ہم ناران کاغان گئے تھے تو ہمیں وہاں کی روایتی دلہن دیکھنے کا کتنا شوق تھا مگر ہمیں موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب ٹریڈیشنل برائڈ گھر میں ہی تیار ہورہی ہے۔'' اس نے کلائیوں میں چوڑیاں پہنتے ہوئے کہا۔

ارما جوڑا پہن چکی تھی۔ بیوٹیشن اس کا میک اپ کرنے میں مصروف تھی۔ شبو خالہ یک دم کمرے میں آئیں تو ارما کو دیکھ کر مسکرائیں۔

''ارما تو بالکل کسی پہاڑی علاقے کی دلہن لگ رہی ہے۔ ایسے لباس اور زیورات تو اب شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتے ہیں، فیشن اور اسٹائل کے مقابلوں نے روایات کو خاصا نقصان پہنچایا ہے اور سچ پوچھو تو فیشن کے نام پر لوگ صرف پیسے ہی ضائع کرتے ہیں۔'' وہ ارما کے پاس آتے ہوئے بولیں۔ وہ ارما کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ارما کو ان کی آنکھوں کے تاثر نے چونکا دیا تھا۔

''ارما کو تیار ہونے میں مزید کتنا وقت لگے گا۔ لڑکے والے آتے ہی ہوں گے۔ پھر نکاح ہونے میں بھی اچھا خاصا وقت لگ جانا ہے۔'' وہ اب سپاٹ سے انداز میں بیوٹیشن سے پوچھ رہی تھیں۔

''جی بس تھوڑا سا ٹائم اور لگے گا۔'' بیوٹیشن نے ارما کو چاندی کا گلوبند پہناتے ہوئے جواب دیا۔

شبو خالہ پورے کمرے پر اک طائرانہ نظر ڈال کر باہر چلی گئیں۔ پھر ازمیر پھولوں کے گجرے دینے آیا۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی پھر وہ دو قدم اندر آیا اور اندر کا منظر دیکھتے ساتھ ہی چونکا۔

''واہ، واہ! میری بہن تو پہاڑوں میں کسی جھیل کنارے گھنے جنگل میں بنے محل میں رہنے والی کوئی شہزادی لگ رہی ہے، شہزادی صاحبہ، یہ گجرے بھی پہن لیں، یہ آپ کے حسن کو چار چاند لگادیں گے۔'' وہ مسکرا کر کہتے ہوئے آگے بڑھا پھر اس نے پھولوں کے گجرے ارما کے ہاتھوں میں پہنادیے۔ ارما نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

''نظر نہ لگادینا۔'' عائلہ نے پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے شوخی سے کہا۔

''یہ جسارت بھلا میں کیسے کرسکتا ہوں، ویسے یہ

عجیب اتفاق ہے کہ کچھ عرصے پہلے آپ لوگ ناران، کاغان سیر و تفریح کرنے گئیں اور دولھا بھائی کا تعلق بھی کاغان سے ہی ہے، میرا خیال ہے کہ ان دونوں باتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

وہ کہانی ساز تھا، کڑیاں جوڑ، جوڑ کر کہانیاں بُنتا رہتا۔ عائلہ اور ارمانے بری طرح ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ ارما کیوں بھول گئی تھی کہ وہ اِک جاسوس بھی تھا۔

''یہ ایک اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔'' عائلہ نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ویسے ایسے اتفاقات کہانیوں، فلموں اور ڈراموں میں ہوتے ہیں۔'' وہ بھی ایک کائیاں تھا۔

''بہت سے حیرت انگیز اتفاقات اصل زندگی میں بھی رونما ہوتے ہیں، ناران، کاغان کو پریوں کا دیس بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ علاقے عشق و محبت کی داستانوں کی وجہ سے بھی مشہور ہیں، وہاں محبت کرنے والے امن پسند لوگ رہتے ہیں، اچھا ہوتا کہ تم بھی اس ٹرپ پر ہمیں جوائن کر لیتے۔'' عائلہ نے مسکرا کر کہتے ہوئے گھما پھرا کر بات کا رخ موڑ دیا۔

''کیا پتا مجھے بھی وہاں کوئی حسین و جمیل پری مل جاتی۔ جیسے آپی کو سالار صاحب مل گئے۔'' وہ شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا، یہ راز اب راز نہیں رہا تھا۔ جھمکے پہنتی ارما ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔ عائلہ نے بھی بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ کل رات تو وہ یہاں پہنچا تھا اور آج اسے اس لو اسٹوری کے بارے میں بھی پتا چل چکا تھا۔ ایڈونچرز اور جاسوسی کرتے ہوئے پتا نہیں اس نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ وہ ان دونوں کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنسا۔ یک دم دروازہ کھلا، سلک کی سبز ساڑی پہنے، سفید بالوں کے جوڑے کے گرد گجرا لپیٹے نانی عجلت بھرے انداز میں اندر آئیں۔

''لڑکے والے آگئے ہیں، ازمیر تم جا کر مہمانوں کے پاس بیٹھو، دیکھو مولوی صاحب بھی بس پہنچنے والے ہوں گے۔'' انہوں نے ازمیر سے کہا پھر وہ ارما کے پاس آئیں۔ ازمیر فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ بیوٹیشن ارما کو تیار کر چکی تھی۔

''شکر ہے کہ آج ہمیں یہ دن بھی دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اس دن کو دیکھنے کے لیے میں نے کتنی دعائیں مانگیں۔ آج میرے دل پر سے ذمّے داریوں کا بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہو رہا ہے، میری شادی ڈھاکا میں ہوئی تھی اور میں نے سرخ رنگ کی بنارسی ساڑی پہنی تھی۔ میری ماں نے میرے بالوں میں پھولوں کے گجرے لگاتے ہوئے کہا تھا کہ تم مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان جا رہی ہو۔ وہاں کی ہر چیز ہم لوگوں سے مختلف ہوگی۔ رہن سہن، کھانے، زبان، رسم و رواج مگر محبت کا رشتہ نبھانے کے لیے انسان ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بس عورت کو قربانی دینا سیکھ لینا چاہیے۔ میں بھی آج تمہیں یہی باتیں کہوں گی۔ رشتے بنانے آسان مگر نبھانے مشکل ہوتے ہیں۔ محبت خوب صورت ہوتی ہے مگر وقت کے ساتھ اس کا حسن بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ تم نے اپنا گھر بنانا ہے، نئے رشتے نبھانے ہیں، اپنے شوہر اور اس کے خاندان کی عزت کرنی ہے۔ اپنے دل میں یہ عزم کر لینا کہ چاہے جیسے بھی حالات ہوں تم کبھی اپنے شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔ مرد کو محبت تو بہت سی عورتوں سے ہو جایا کرتی ہے مگر وہ قدر اسی عورت کی کرتا ہے جس کی وفا پر اسے یقین ہوتا ہے، جس نے مشکل حالات میں اور زمانے کے سرد و گرم میں اس کا ساتھ نبھایا ہوتا ہے، ساتھ نبھانے والا ہم سفر بھی قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔''

نانی نے اس کے کندھے کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انہوں نے اس کی پرورش کی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ان کے ساتھ رہتی تھی۔ جب وہ چھوٹی بچی تھی تو عام بچوں سے بہت مختلف تھی۔ خاموش، اداس اور گم صم رہا کرتی۔ کبھی اپنے والدین کے پاس جانے کی ضد نہیں کرتی تھی۔ اسکول سے واپس آ کر کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے کہانیوں کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ جب وہ بڑی ہوئی تو خاموش اور سنجیدہ رہتی۔ بہت کم لوگوں سے دوستی کرتی۔ اس نے نانی کو کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کے بہت سارے دشمن تھے، لوگ اس سے حسد کرتے، اسے ناپسند کرتے، وہ حساس تھی، اس بات کو سمجھتی تھی کہ یہ حسد کرنے والے لوگ دراصل دوسروں کی خوبیوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور یہ خوف انہیں کبھی خوش نہیں ہونے دیتا۔

آج ارما کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر نانی خوش تھیں اور اداس بھی.....

''اماں، جلدی آجائیں، قاضی صاحب آگئے ہیں۔'' شبو خالہ نے باہر سے آواز دی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے نم پڑتی آنکھوں کے کنارے صاف کیے پھر باہر آگئیں۔ انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ ارما کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

جمعے کی نماز کے بعد ان دونوں کا نکاح ہوا۔ وسیع و عریض لاؤنج میں ارما اور سالار ساتھ، ساتھ بیٹھے تھے۔ گوٹے والا سرخ جوڑا اور چاندی کے زیور پہنے شرمیلی مسکان چہرے پر سجائے وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کانوں میں جھمکے اور گلے میں گلوبند تھا۔ بالوں پر چاندی کی ماتھا پٹی اس طرح سجی تھی کہ ماتھے پر موتیوں کی لڑیاں نظر آرہی تھیں۔ سالار آف وائٹ شلوار قمیص پہنے ہوئے نظر لگ جانے کی حد تک ہینڈسم لگ رہا تھا۔ خوشی کے عکس نے اس کے چہرے کو روشن کر رکھا تھا۔ ازمیر فوٹو گرافی میں مصروف تھا اور بار، باران دونوں کو چھیڑ رہا تھا۔ ارما کے والدین بھی خوش دلی سے سالار کے والدین کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ گہرے نیلے کُرتے شلوار میں ملبوس عالیان نکاح کے چھوہارے کھاتے ہوئے پھولوں کی لڑیوں کے پاس کھڑی عائلہ کے قریب چلا آیا۔ وہ کاسنی رنگ کا کامدار لباس پہنے ہوئے تھی۔ سلور رنگ کے نگینے سارے لباس پر چمک رہے تھے۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ یہ وہی بندہ ہوگا جو نور محل اور دربار محل میں ملا تھا اور یہ شادی بھی کنفرم ہوگی۔'' وہ جتانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ عائلہ نے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کا اندازہ تو درست ثابت ہوا تھا۔

''آخر یہ اندازہ تم نے کس طرح لگایا؟'' اس نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔ عالیان کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''مجھے تو اسی وقت پتا چلا گیا تھا جب میں نے سالار کو ارما کے ساتھ نور محل میں کھڑے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جن محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کسی بھی دیکھنے والے شخص کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ یہ بندہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے۔ پھر وہ ہمیں دربار محل میں بھی ملا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ ہم لوگ اس دن اور اس وقت دربار محل میں آئیں گے۔ یہ لگن کے کمال ہوتے ہیں مس عائلہ۔'' وہ مسکراتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔

''خطرناک آدمی ہو تم.....'' وہ اپنے بال پیچھے کرتے ہوئے بے ساختہ بولی۔ اس کے ہاتھ میں پہنی چوڑیاں یک دم چھنک اٹھیں۔

''میں خطرناک اور سالار پُراسرار..... ہر ایک کے بارے میں تم لوگوں کی رائے خاصی عجیب ہے۔'' وہ محظوظ ہوتے انداز میں بولا۔ عائلہ کو کرنٹ لگا۔

''اچھا! تو تم چھپ، چھپ کر ہماری باتیں سنتے تھے۔'' وہ خفا ہوئی۔

''چھوٹے سے گھر میں بلند آواز سے کی گئی باتیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بہ آسانی سنائی دیتی ہیں۔'' اس نے چھوہارے کھاتے ہوئے جواب دیا۔

عائلہ کو یاد آیا کہ ان کے ساتھ والا کمرا عالیان کا ہی تو تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ کون، کون سے قصے اور کہانیاں سن چکا تھا۔ وہ عجیب سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے خاموش ہوگئی۔

''خیر اچھی بات ہے کہ تمہاری دوست کا گھر آباد ہو رہا ہے۔ سالار صاحب بھی اپنی دُھن کے پکے نکلے۔ ناران کی وادی سے بہاول پور کے نور محل تک پہنچے اور پھر ارما کے گھر تک..... یہ پُرخلوص اور وفادار لوگوں کی نشانی ہوتی ہے، تمہاری سنجیدہ مزاج اور گم صم رہنے والی سہیلی کے لیے وہ ایک اچھا لائف پارٹنر ثابت ہوگا۔ ارما کی نانی بھی اچھی اور وضع دار خاتون ہیں مگر.....'' وہ کہتے ہوئے ذرا رکا۔

''ارما کے والد کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''ارما کی والدہ تو خوب صورت ہیں ناں..... ارما اپنی والدہ پر گئی ہے۔'' عائلہ نے کہا۔

''بات خوب صورتی کی نہیں ہے، میں کچھ دیر ارما کے والد کے ساتھ بیٹھا رہا ہوں، ارما کی والدہ اور نانی تو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ہیں جبکہ ارما کے والد تو کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں ہیں، ہاں ارما کا بھائی شکل صورت میں اپنے والد سے مشابہہ ہے۔'' اس نے سنجیدہ انداز میں ذرا

فاصلے پر کھڑے تصویریں بناتے ازمیر کی طرف دیکھا۔ وہ دبلا پتلا کھڑے نقوش والا سانولے رنگ کا لڑکا تھا۔

''یہ لو میرج بھی تو ہو سکتی ہے۔'' عائلہ نے امکان ظاہر کیا۔

''یہ کسی صورت لو میرج نہیں ہو سکتی۔'' عالیان نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے لہجے میں یقین تھا۔

یہ ساری باتیں عائلہ بھی سوچتی تھی مگر وہ کسی کے سامنے ان باتوں کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عالیان کتنا زیرک نگاہ ہے، اس کی قوتِ مشاہدہ غضب کی ہے۔

''کیا تم جانتی ہو کہ ارما کے والد کیا کام کرتے ہیں؟'' پھر عالیان نے یک دم عائلہ سے پوچھا۔

''ان کے آم کے باغات ہیں، وہ زمیندار ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں شاید ہوں گے مگر اپنی بیٹی کے نکاح پر ان کا رویہ کافی سرد اور عجیب سا ہے۔ وہ مہمان بن کر بیٹھے ہوئے ہیں، پدرانہ شفقت اور جذبات تو کہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔'' عالیان تدھم آواز میں صاف گوئی سے بولا۔

عائلہ نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں یہ باتیں کسی کی سماعتوں تک تو نہیں پہنچ گئیں۔

''عالیان! ہمیں کسی کی ذاتی زندگی کو ڈسکس نہیں کرنا چاہیے۔ ہم یہاں مہمان ہیں اور ہمیں ارما کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔'' عائلہ نے فوراً اسے ٹوکا۔ عالیان کو بھی احساس ہوا کہ ان باتوں کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے..... خیر..... یہ بتاؤ کہ تم آسٹریلیا کب جا رہی ہو؟'' اپنے ہاتھ میں تھامے چھوٹے سے پیکٹ سے چھوہارے نکالتے ہوئے اس نے دانستہ بات بدل دی۔

''ابھی کچھ پتا نہیں ہے، ٹکٹ بھی کنفرم نہیں کروائے۔ سوچ رہی ہوں کہ ارما کی شادی کے بعد ہی واپس جاؤں۔'' عائلہ نے جواب دیا۔

''مجھے بتانا..... میں لاہور ائیر پورٹ پر تمہیں سی آف کرنے کے لیے آؤں گا۔'' اس نے فراخ دلی سے کہا۔

''تم آ کر کیا کرو گے، رہنے دو پہلے بھی ہماری وجہ سے تمہارے اسکول کا بہت حرج ہوا ہے۔'' عائلہ نے متامل انداز میں کہا۔

''خیر ہے..... اگر اسکول سے جواب بھی مل گیا تو پروا نہیں..... میں یہ جاب چھوڑ دوں گا اور کیا خبر کہ میں بھی آسٹریلیا آ جاؤں، خالہ تو مجھے اور امی کو بلاتی رہتی ہیں..... میں ہی باہر جانے کے لیے کبھی سیریس نہیں ہوا تھا مگر اب سوچ رہا ہوں کہ خالہ کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' عالیان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کافی بدل گئے ہو تم.....؟'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے چونک کر بولی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ ذومعنی انداز میں مسکرایا۔

وہ چونک کر الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ وہ واقعی بدل گیا تھا اور اِک نئی شخصیت کے روپ میں اس کے سامنے آیا تھا۔

پھر وہ اس کے کانوں میں موجود سنہری موتیوں والی بالیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ وہی بالیاں ہیں ناں جو تم نے بہاول پور کے بازار سے لی تھیں۔'' اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ وہ بھی تو اس وقت اس کے ساتھ وہیں موجود تھا۔

''ہاں، تمہیں یاد ہے؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

''میری یادداشت بہت اچھی ہے اور کچھ لوگوں کے معاملے میں تو یہ حیرت انگیز طور پر زبردست ہے۔'' وہی ذومعنی انداز جس نے عائلہ کو الجھایا تھا۔

اتنے میں ازمیر انہیں کھانے کے لیے بلانے آ گیا۔ ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

ارما کے نکاح کی تقریب خیریت سے اختتام پزیر ہوئی۔ سب خوش تھے اور جو لوگ خوش نہیں تھے وہ خوش نظر آنے کی اداکاری کر رہے تھے۔ نانی مطمئن تھیں، ارما خوش تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ سالار نے اسے اپنا لیا تھا۔ اسے محبت مل گئی تھی۔

☆☆☆

وادیِ کاغان کے اس گھر میں آج بڑی رونق تھی۔ باغیچے کے ساتھ بنے صحن میں گھر کے افراد شدور خان کو گھیرے بیٹھے تھے۔

بی بی جان کے چہرے پر خوشی دمک رہی تھی۔ لکڑی

کی میز پر ایک بڑی سی ٹوکری میں مٹھائیاں رکھی تھیں۔ اخروٹ کی برفی، سوجی کے لڈو اور گڑ کی مٹھائی جو بی بی جان نے سرخوشی کے عالم میں گھنٹوں کی محنت اور مشقت کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔ فضا میں جنگلی پھولوں کی مہک اور مٹھائیوں کی خوشبو رچی بسی تھی۔

''نکاح کی بہت مبارک ہو شندور خان۔'' حکم خان نے اسے گرم جوشی سے گلے لگاتے ہوئے مبارک باد دی۔

''شکریہ لالا۔'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

کھدر کے کرتے شلوار میں ملبوس سفید داڑھی والے معمر سے خان بابا بھی آج نرمی سے مسکرا رہے تھے۔ آج ان کے چہرے پر ہمیشہ والی کرختگی نہیں تھی۔

''شندور خان کا نکاح ہو گیا اور اگلے ماہ زرینہ کی بھی شادی ہے۔ پھر ہم حکم خان کے بارے میں بھی سوچیں گے۔ اب اس کا گھر بھی آباد ہو جانا چاہیے۔'' خان بابا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ان کی پیشانی پر ہمیشہ نظر آنے والی سلوٹیں آج مدھم سی پڑ گئی تھیں۔

''جی بالکل، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' حکم خان اخروٹ کی برفی اٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ شندور خان نے شوخی سے اس کا نشانہ تھپتھپایا۔

''موقع اچھا ہے حکم لالا! دل کی بات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

خان بابا ہولے سے مسکرائے۔

''عالم خان سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شندور خان شہر میں پلا بڑھا ہے، وہیں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے پھر اس کا کاروبار بھی ادھر ہی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ شہر میں ہی اس کی شادی کر دیں۔ ہم نے بھی کہا ٹھیک ہے۔ جیسے تم لوگوں کی مرضی پھر اس نے بتایا کہ لڑکی والوں کو نکاح کی جلدی تھی اس لیے وہ لوگ بھی نکاح کے لیے راضی ہو گئے۔'' خان بابا نے کہا۔ وہ لکڑی کے تخت پر بیٹھے تھے جس پر رنگین چادر بچھی ہوئی تھی۔

''دراصل لڑکی والوں کے مہمان باہر سے آئے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے سوچا کہ ان کی موجودگی میں ہی نکاح کا فنکشن ہو جائے۔'' وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''چلو اچھا ہی ہوا، ہر کام کا ایک مخصوص وقت مقرر ہوتا ہے۔ تم دریا خان کے گھر بھی چلے جانا، وہ لوگ بھی تمہارا پوچھ رہے تھے۔ سارے خاندان والوں اور گاؤں والوں کو تمہارے نکاح کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ تمہاری بی بی جان نے سب رشتے داروں کے گھر مٹھائیاں بھجوائی ہیں۔'' آج خان بابا نرم لہجے میں بات کر رہے تھے۔ شندور خان نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ کونے میں رنگین پیڑھی پر بیٹھی زرینہ مسکراتے ہوئے یہ باتیں سن رہی تھی۔

''خان بابا! شندور لالا کی شادی میں تو ہم سب جائیں گے ناں.....؟'' زرینہ نے بڑی آس سے پوچھا۔ گھر کے سب فیصلوں کا اختیار خان بابا ہی کے پاس تھا۔ وہ یک دم چونک گئے۔ ایک لمحے کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

''کہیں عالم لالا کو ہمارے آنے پر اعتراض نہیں ہو۔'' کچھ دیر بعد بی بی جان نے جھجکتے ہوئے مدھم انداز میں اندیشوں سے بھری آواز میں کہا۔

''بی بی جان! بابا جان اور اماں جان کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے، میں اس معاملے پر ان سے بات کر چکا ہوں، میری شادی پر آپ سب لوگوں نے ضرور آنا ہے۔'' شندور خان نے فوراً جواب دیا۔

''ورنہ تم سہرا نہیں باندھو گے؟'' سنجیدہ ہوتے ماحول میں حکم خان نے شوخی کا پٹاخا چھوڑا۔

''ہمارا شندور خان سہرا بھی باندھے گا اور گھوڑے پر سوار ہو کر بارات بھی لے کر جائے گا۔'' بی بی جان فوراً بولیں۔

''اور ساتھ ہم سب بھی جائیں گے، بتائیں ناں خان بابا۔'' زرینہ نے بے ساختہ کہا اور بڑی آس سے خان بابا کی طرف دیکھا۔ بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ سخت مزاج خان بابا کو بھی نرم انداز اختیار کرنا پڑا۔

''ہاں، عالم خان نے ہم سب کو بلایا ہے۔ لڑکی والوں کو بھی شادی کی جلدی ہے، ہم سب لاہور جائیں گے۔'' انہیں مانتے ہی بنی۔

زرینہ اور بی بی جان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ حکم خان نے بھی فاتحانہ انداز میں شندور خان کو دیکھا۔

''تو پھر ہم ابھی سے تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔'' بی بی جان نے خوشی سے معمور آواز میں کہا۔

''جی ضرور.....'' یہ جواب شندور خان نے دیا تھا۔ بہت عرصے بعد اس گھر میں خوشی کا اجالا اترا تھا۔ ہنستی مسکراتی باتوں میں خوشیوں کی کھنک تھی۔ کچھ دیر بعد خان بابا اپنے کمرے میں چلے گئے اور حکم خان بکریوں کو چراگاہ لے گیا۔ صحن میں بی بی جان، شندور خان اور زرینہ ہی رہ گئے۔

''شندور لالا! دلہن کی تصویر تو دکھائیں ناں! فون پر آپ نے کہا تھا کہ یہاں آکر خود ہمیں اس کی تصویریں دکھائیں گے۔'' زرینہ نے اشتیاق بھرے انداز میں کہا پھر اپنی پیڑھی اٹھا کر تخت کے قریب لے آئی۔

''ہاں بچے..... دلہن کی تصویر تو دکھاؤ، یہ بتاؤ کہ دلہن کو نکاح کا جوڑا تو پسند آیا تھا ناں.....؟ میں نے وہ جوڑا خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا اور چاندی کے زیور تو کب سے تمہاری دلہن کے لیے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے مگر پھر میں نے سوچا کہ شہر کی لڑکی ہے، معلوم نہیں ہمارا بنایا ہوا جوڑا اسے پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔'' بی بی جان نے نرم لہجے میں کہا۔ شندور خان کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''دلہن کو اور اس کے گھر والوں کو نکاح کا جوڑا اور زیور بہت پسند آئے تھے۔ شہر کی لڑکی ہے مگر اسے روایات اور اقدار کی پاسداری کرنی آتی ہے، اس نے بنا نخرے کیے خوشی، خوشی وہ لباس پہن لیا تھا کیونکہ یہ میری خواہش تھی اور اسے دوسروں کی خواہشات کا مان رکھنا آتا ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''مجھے تو اب اس دن کا انتظار ہے جب ہم اپنی بھابی سے ملیں گے۔ انہیں قریب سے دیکھیں گے۔'' زرینہ نے اشتیاق بھرے انداز میں کہا۔

''آپ لوگوں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔'' وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ چونکاتے ہوئے انداز میں بولا۔ وہ دونوں بری طرح چونکیں۔

''کب؟ کہاں.....؟'' زرینہ نے حیرت سے کہا۔

بی بی جان بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''ایک بار وہ یہاں آئی تھیں۔ ناران سے واپسی پر وہ لوگ ایک لینڈ سلائڈنگ میں پھنس گئے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور زبردست طوفان آیا ہوا تھا، اس لیے انہوں نے اس گھر میں پناہ لی تھی۔'' شندور خان نے انہیں یاد دلایا۔

بی بی جان کو وہ طوفانی بارش کا دن یاد آگیا۔

''ہاں، یہ کچھ عرصے پہلے کی بات ہے، حکم خان کچھ لوگوں کو یہاں لایا تھا مگر وہ تو بہت سی لڑکیاں تھیں، تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' بی بی جان نے سوچتے ہوئے کہا۔

شندور خان نے موبائل میں ارما کی تصویر دکھائی..... یہ نکاح کی تصویر تھی جس میں وہ سرخ گوٹے کناری والے جوڑے میں ملبوس چاندی کے زیور پہنے اس کے قریب بیٹھی سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر موتیوں کی لڑیاں چمک رہی تھیں۔

''ارے یہ لڑکی.....!'' زرینہ نے تصویر دیکھتے ہوئے بے ساختہ جوش و خروش کے عالم میں کہا۔

''اس کا نام ارما ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''یہ تو وہی لڑکی ہے جو روٹیاں بناتے وقت میرے ساتھ تندور کے پاس بیٹھی تھی اور جسے تمہاری انگوٹھی پسند آگئی تھی۔ ہم نے بھی کہا کہ انگوٹھی پسند آگئی ہے تو رکھ لو، مہمان سے بھلا کیا سودے بازی کرنی۔'' بی بی جان کو یاد آیا۔

شندور خان نے جیب سے وہ انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں پہن لی۔ اس انگوٹھی کے وسط میں لگا تین رنگوں والا قیمتی پتھر دن کے اجالے میں چمک رہا تھا۔

زرینہ اور بی بی جان نے اس انگوٹھی کو فوراً پہچان لیا۔

''یہ انگوٹھی اس نے مجھے تحفے میں دی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''لالا! کیا وہ آپ کو پہلے سے جانتی تھی؟'' زرینہ نے پوچھا۔

''یہ کیوں پوچھا تم نے؟'' وہ چونکا۔

''وہ یہ انگوٹھی لینے کے لیے اصرار جو کر رہی تھی۔'' زرینہ نے شوخی سے کہا۔ وہ ہنس دیا۔

''اچھا واقعی؟'' وہ اس بات پر محظوظ ہوا تھا۔

''جی ہاں ہم نے بھی اس کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور یہ انگوٹھی اسے تحفتاً دے دی۔'' زرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور تم لوگوں نے اس سے کہہ دیا کہ میں ایک ٹرک ڈرائیور ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ بی بی جان اور زرینہ بھی ہنس دیں۔

''وہ تو ہم نے اس سے مذاق کیا تھا ہمیں کیا معلوم

تھا کہ وہ اس بات کو سنجیدگی سے لے، لے گی۔'' زرینہ نے شوخی سے کہا۔

''ارے وہ پوچھ رہی تھی کہ یہ انگوٹھی کس کی ہے، ہم نے بتا دیا کہ شندور خان کی ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہ شندور خان کون ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اس بات کا کیا جواب دوں، تمہارے خان بابا بھی آنے والے تھے پھر یہ بحث لمبی ہو جاتی اس لیے ہم نے یونہی کہہ دیا کہ وہ ہمارا رشتے دار ہے..... پھر وہ پوچھنے لگی کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو ہم نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ ٹرک چلاتا ہے۔ بھلا میں اجنبی مہمانوں کو اپنے خاندان کے قصے کہانیاں تو نہیں سنا سکتی تھی ناں۔'' بی بی جان نے کہا پھر زرینہ نے ان کا جملہ مکمل کیا۔

''پھر وہ لڑکی حیران ہو کر خاموش ہو گئی۔'' زرینہ کو اس کے تاثرات یاد آئے۔

''وہ مجھے ناران میں ملی تھی۔ میں ایک دکان سے یہ انگوٹھی خرید رہا تھا اس لیے اس نے اس انگوٹھی کو پہچان لیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ انگوٹھی میری ہے۔''

''تب ہی تو وہ اس انگوٹھی کو لینے کے لیے اتنا اصرار کر رہی تھی۔ اب میں سمجھی کہ یہ ٹانکا ناران میں فٹ ہوا تھا۔''

وہ ہنسی تو موتیوں جیسے سفید دانت جگمگاتے ہوئے نظر آئے۔

شندور خان کی آنکھوں میں اس کی منکوحہ کی محبت کا عکس واضح نظر آ رہا تھا۔

''وہ اس لیے حیران تھی کہ وہ جانتی تھی کہ میرا نام شندور خان نہیں بلکہ سالار خان ہے۔'' اس نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تو تم اسے بتا دیتے کہ سالار خان ہی دراصل شندور خان ہے۔'' بی بی جان مسکرا کر بولیں۔

یہ ایک راز تھا جسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ سالار خان ہی اصل میں شندور خان تھا۔

شندور خان اور سالار خان دراصل ایک ہی شخص کے دو نام تھے مگر اس بات سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ وادیِ کاغان کے دامن میں واقع لکڑی کے اس گھر میں قدم رکھتے ہی وہ شندور خان بن جاتا اور لاہور جیسے بڑے شہر میں آتے ہی لوگ اسے سالار خان کہنے لگتے۔ یہ ایک شخص کے دو ناموں کا راز تھا اور راز پُراسرار ہوتے ہیں، ہر ایک کے سامنے آشکار نہیں کیے جاتے۔

☆☆☆

ارما کھانے کے بعد لان میں واک کر رہی تھی۔ چاندنی کی روپہلی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لان میں ہر وقت اڑتی تتلیاں پھولوں کی گود میں سو رہی تھیں اور فضا پھولوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی کہ دفعتاً رات کی خاموشی اور سناٹے میں موبائل پر آتی کال کی آواز گونجی۔ یہ ازمیر کا فون تھا۔ ارما نے چلتے ہوئے ذرا رک کر فون اٹھایا۔

''کیسی ہیں آپ آپی؟ مزاج کیسے ہیں؟ نکاح کے بعد تو لوگ کسی کو لفٹ ہی نہیں کرواتے ہیں، ایسی بھی کیا بے رخی؟'' ازمیر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ وہ مسکرائی پھر دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے واک کرنے لگی۔

''لوگ مصروف جو ہو گئے ہیں۔ شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں، تم کچھ دنوں کے لیے یہاں آ جاؤ اور تیاریوں میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ تاکہ ہمیں بھی کچھ سہولت ہو، آخر یہ بھی تو تمہارا فرض ہے۔'' وہ آسمان کے کنارے پر چمکتے چاند کو دیکھتے ہوئے شگفتگی سے بولی۔ ازمیر اس کی آواز کی کھنک سن کر خوش ہوا۔

''کافی خوش مزاج ہو گئی ہیں آپ۔ ورنہ پہلے تو میں جب بھی فون کرتا تھا گلے شکوے اور دکھڑے ہی سننے کو ملتے تھے۔ یہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے میں بھی سوچ رہا تھا کہ لاہور کا چکر لگا لوں۔ کالج میں سیمسٹر اسٹارٹ ہو گیا ہے مگر میں ویک اینڈ پر آنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تو میں نے ایک بہت ضروری بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔'' خوش دلی سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ پُراسرار ہو گیا۔

''پیسے چاہئیں؟'' اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا مگر حیرت انگیز طور پر اس بار ازمیر نے انکار کر دیا۔

''ارے نہیں، آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ کیا میں آپ کو صرف پیسوں کے لیے ہی فون کرتا ہوں۔'' وہ ذرا برا مان گیا۔

''پھر.....؟ نیا لیپ ٹاپ، گھڑی یا کوئی اور فرمائش؟ بتا دو، میں تمہیں پارسل کر دوں گی۔'' اس نے شاید پہلی دفعہ خوشی، خوشی ایسی سخاوت کا اظہار کیا تھا۔

''حیران کُن بات یہ ہے کہ مجھے اس بار آپ سے کوئی بھی چیز نہیں چاہیے بلکہ میں تو آپ کو ایک اہم خبر سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، مجھے ایک گہرے راز کے بارے میں علم ہوا ہے۔'' اس نے چونکاتے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ اس کی اس قسم کی باتوں اور نت نئے ایڈونچرز کی کہانیاں سننے کی عادی تھی اس لیے اس نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔

''کون سی خبر..... کیسا راز؟'' اس نے آہستگی سے قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

ازمیر کا لہجہ سنسنی خیز ہوگیا۔ آواز مدھم ہوگئی۔

''مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ امی، ابا نے جانوروں کے ڈاکٹر کے رشتے سے کیوں انکار کیا تھا اور آپ کے اور سالار بھائی کے نکاح کے لیے یک دم کیوں مان گئے۔'' اس نے رازداری سے کہا۔

''ازمیر، میں ماضی میں اور پرانی باتوں میں بالکل انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ اب میں مسز سالار ہوں اور پرانے پروپوزلز جیسے قصوں میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتی ہوں۔'' ارمانے بیزاری سے اسے ٹوک دیا۔

''میری بات تو سنیں، اس راز کا تعلق آپ کے اور سالار بھائی کے نکاح ہی سے تو ہے۔'' وہ سنسنی خیز آواز میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' وہ الجھ گئی۔ آسمان کے کنارے پر چمکتے چاند کو دیکھتے ہوئے وہ بے ساختہ رک گئی۔

''مطلب یہ کہ نانی نے اپنی چار دکانیں اور نہر والی زمین امی، ابا، شبو خالہ اور یاور ماموں کے نام کر کے انہیں سالار بھائی کا رشتہ قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے ورنہ امی، ابا تو اس ادھیڑ عمر ڈاکٹر کے ساتھ آپ کی بات تقریباً طے کر چکے تھے اور انہوں نے سالار کے والدین کو انکار بھی کر دیا تھا، یوں نانی نے آخر میں ترپ کا پتا پھینکا اور پھر ساری بازی ہی پلٹ گئی۔'' ازمیر نے انکشاف کیا۔

''کیا؟'' وہ ایک لمحے کے لیے سن رہ گئی۔ یکلخت چاندنی مدھم پڑ گئی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک ہولناک انکشاف تھا۔ یہ فیصلہ ایک سودے بازی کے نتیجے میں طے پایا تھا اسے اس بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ بہاول پور سے واپس آ کر اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے وہ لاعلم تھی۔ لوگوں کے رویّے، چہرے، انداز، عادات حتیٰ کہ پورا ماحول بدلا ہوا تھا مگر وہ اس بات کے پس منظر کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اب ازمیر کے انکشاف کو سن کر بہت سی باتیں، بہت سے واقعات اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ شاید اسی لیے نانی نے اس کا نکاح فوراً ہی کر دیا تھا۔ وہ فون کان سے لگائے ساکت و صامت کھڑی رہی۔ اسے امی، ابا سے اتنے گھٹیا پن کی توقع نہیں تھی۔

''ہیلو آپی!'' ازمیر نے اسے پکارا تھا مگر اس نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ اس میں اب مزید کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اندر آئی۔ اسس کا رخ نانی کے کمرے کی طرف تھا۔ اس کے لیے ایک، ایک قدم اٹھانا دوبھر ہوگیا تھا۔ وہ نانی کے کمرے میں آئی تو خاموش، سنجیدہ اور گم صم تھی۔ نانی سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں، اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھیں۔

''آؤ ارما۔'' انہوں نے اس کے سنجیدہ اور خاموش چہرے کو دیکھ کر کہا۔ وہ خاموشی سے ان کے پاس آخر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟ ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' انہیں اس کا چہرہ دیکھ کر کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں نانی۔'' اس نے سنجیدہ اور رنجیدہ آواز میں کہا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''ہاں کہو۔'' وہ متوجہ ہوئیں۔ وہ چند لمحے یونہی ہتھیلیاں دیکھتی رہی۔

''جب میں ناران، کاغان گئی تھی تو میں سالار سے بھی وہیں ملی تھی۔'' اس نے مدھم اور سنجیدہ آواز میں انکشاف کیا۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہاں کوئی حیرت نہیں تھی۔ وہ یک دم سر اٹھا کر انہیں حیران نظروں سے دیکھنے لگی۔

''آپ کیسے جانتی ہیں؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔ آج کل اسے ہر بندے پر ٹیلی پیتھی کے ماہر ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

''سالار نے بتایا تھا مجھے۔'' انہوں نے تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

''سالار نے کب بتایا؟'' وہ ساکت رہ گئی۔ ایک اور جگسا پزل اس کے سامنے آ موجود ہوا تھا۔ نانی کا

اطمینان قابلِ دید تھا۔

''بس بتا دیا تھا۔'' وہ ذرا سا مسکرائیں۔

وہ پلکیں جھپکائے بغیر اُن کا چہرہ دیکھتی رہی۔ نانی نے شفیق سے انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''ارما! تمہارے اور سالار کے نکاح کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ مجھے تمہارے لیے ایسے محبت کرنے والے جیون ساتھی کی خواہش تھی جو تمہیں محبت کے ساتھ عزت بھی دے، میں نے تمہاری بہترین پرورش کرنے کی کوشش کی مگر بڑھاپا، خاندان کی ذمّے داریاں، کاروبار کی فکریں، لوگوں کی نکتہ چینی اور طعنے..... حالات ایسے ہوگئے کہ میں تمہیں پوری توجہ نہ دے سکی۔ تم نے بھی بچپن میں ہی ہر چیز پر سمجھوتا کرنا سیکھ لیا تھا۔ انسان کی زندگی کے حالات اس کے لاشعور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں باوجود کوشش کے تمہارے لاشعور سے اندیشوں اور محرومیوں کو نکال نہیں پائی۔'' وہ سنجیدہ آواز میں بولیں۔ اس نے بے اختیار ان کا بوڑھا نرم ہاتھ تھام لیا۔

''نانی آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے، اتنا کچھ تو والدین بھی اولاد کے لیے نہیں کر پاتے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنی دکانیں اور نہر والی زمین امی، ابو، شبو خالہ اور یاور ماموں کے نام کر دی۔ صرف اس لیے کہ وہ لوگ اس ادھیڑ عمر ڈاکٹر سے میری شادی نہ کریں اور سالار کا رشتہ قبول کر لیں۔ میں بھی اتنے دنوں سے اس بات پر حیران تھی کہ آخر سب لوگ اچانک اس رشتے کو قبول کرنے کے لیے کیسے راضی ہو گئے ہیں اور سب کے رویّے خصوصاً شبو خالہ کا رویّہ یک دم کیسے بدل گیا۔ اتنے سالوں میں بھی میں اپنے رشتے داروں کو سمجھ کیوں نہ سکی کہ اتنے سال مجھ سے نفرت کرنے والے لوگ میرے ساتھ مخلص کیسے ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کو لالچ اٹریکٹ کرتا ہے، رشتوں کی محبت اٹریکٹ نہیں کرتی۔ آپ چونکہ ان لوگوں کی فطرت سے واقف تھیں اسی لیے آپ نے ان سے یہ ڈیل کر لی۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ اسے یہ بات سن کر دکھ کے ساتھ صدمہ بھی ہوا تھا۔

نانی کو علم ہو گیا کہ یہ بات ارما کو ضرور از میر نے ہی بتائی ہوگی۔ آج نہیں تو کل اسے اس بات کا علم ہو ہی جانا تھا۔ انہوں نے بے اختیار گہری سانس لی۔

''ارما بیٹا! مجھے ان چیزوں کے چلے جانے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ دو دکانیں ابھی میرے نام ہیں۔ ان کا کرایہ آتا رہے گا اور گزر بسر بھی ہو جائے گی۔ تمہاری شادی کے بعد میں اوپر والا پورشن نورین کے بیٹے کو کرایے پر دے دوں گی۔ میں نے اتنا بڑا گھر کیا کرنا ہے۔ نورین کے بیٹے کا ٹرانسفر اگلے ماہ اسلام آباد سے لاہور ہو رہا ہے۔ نورین نے مجھ سے بات کر لی ہے، میں بھی رضامند ہوں۔ اتنے اخراجات نہیں ہیں جتنی آمدنی ہے۔ سویرا، شبو اور یاور خوش رہیں گے تو میں بھی خوش رہوں گی۔ وہ آج تک اپنی ماں کو نہیں سمجھ سکے۔ دراصل تمہارے نانا اپنے زمانے میں بڑے آزاد خیال اور ماڈرن آدمی تھے۔ دولت مند بھی تھے۔ اپنے ہم مزاج اور ہم خیال لوگوں میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہوں نے بچوں کو بھی یہی ماحول دیا۔ اسی لیے ہمارے تینوں بچے ہماری تہذیب، تمدن اور روایتی ماحول سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ رکھ سکے۔ بیٹیاں مشنری اسکول میں اور بیٹا بورڈنگ میں پڑھا۔ وہ ماں، باپ اور بزرگوں کو اہمیت نہ دے سکے۔ وہ ایلیٹ کلاس کے لائف اسٹائل کے اتنے عادی ہو گئے کہ انہوں نے اسے قائم رکھنے کی کوشش میں اپنا سارا روپیہ پیسہ اڑا دیا اور جب تنگی ترشی میں گزارہ کرنا پڑا تو ان کی نظر میرے اثاثوں پر ٹھہر گئی۔ میں تو اب بہت سکون محسوس کر رہی ہوں۔ اچھا ہے دولت اور جائداد کا وبال ختم ہوا۔ میرے بچے بھی خوش ہیں اور میں بھی مطمئن ہوں۔'' انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تاکہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔

''میں آپ سے ملنے آتی رہا کروں گی نانی۔'' اس کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے رخ موڑ کر آنکھوں کی نمی چھپائی۔ نانی اداسی سے مسکرائیں۔

''ارے پگلی! سسرال سے روز، روز میکے تو نہیں آیا جاتا ناں۔'' انہوں نے اپنی اداسی چھپانے کی کوشش کی پھر انہوں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

''تم بالکل فکر نہ کرو بیٹا، سویرا اور کمال کی طرف سے بھی اپنا دل میلا نہ کرو، آخر وہ تمہارے والدین ہیں۔''

ارما نے یک دم سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا اور سرد سے انداز میں ان کی بات کاٹ دی۔

''والدین؟ نہیں نانی..... میری صرف والدہ ہیں اور ان کے شوہر میرے سوتیلے والد ہیں اور ہمیشہ سوتیلے ہی رہے۔ انہوں نے مجھے کبھی اپنی بیٹی نہیں سمجھا۔'' اس کی آواز سرد اور اداس تھی۔

نانی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئیں پھر انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔

''مگر اس بات سے بہت کم لوگ باخبر ہیں۔ میں نے سالار اور اس کے گھر والوں کو اس بات کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اچھے اور وضع دار لوگ ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور مجھے سالار نے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ آنے والے لوگ اس کے حقیقی والدین نہیں ہیں۔ وہ ایک لے پالک بچہ تھا۔ اس کے حقیقی والدین کاغان میں رہتے ہیں اور وہ کبھی کبھار ان سے ملنے آتا رہتا ہے۔''

ارما کے ذہن میں یک دم جھماکا سا ہوا۔ اسے کاغان کا وہ گھر یاد آیا جہاں بی بی جان اور زرینہ رہتی تھیں۔ جہاں شام ہوتے ہی دیا روشن ہوتا تھا اور آتش دان میں لکڑیاں سلگتی تھیں۔ پنیر کی روٹیاں، خوشبودار چائے، موتیوں کے مکرامے، بارش میں بھیگتا باغیچہ، خوبانی کا درخت، جنگلی پھولوں کی مہک اور شندور خان کی انگوٹھی..... وہ جیسے کسی کہانی کے باب ترتیب دینے میں مصروف ہوگئی۔

''شندور خان۔'' وہ خواب کے عالم میں بڑبڑائی۔

''کون شندور خان؟'' نانی نے چونک کر حیرت سے کہا۔

''نہیں، کوئی نہیں..... بس یونہی اِک کہانی پڑھتے ہوئے اِک کردار مجھے یاد رہ گیا۔'' اس نے بے خیالی سے چونک کر بات بنائی۔ یہ تو اس کی عادت تھی کہ کہانیاں پڑھتے ہوئے ان کے کرداروں کا ذکر کرتی رہتی۔

''اس وقت تمہیں کون سی کہانی یاد آگئی بیٹا؟'' وہ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولیں۔

''بس تھی اِک کہانی، بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز..... اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ نے سالار سے اتنی ساری باتیں کب کر لیں؟'' اس نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔ نانی اس بات پر مسکرائیں۔

''جس دن تم بہاول پور گئی تھیں تو وہ لوگ اسی شام کو آگئے تھے۔ میں تو اس رشتے کے آنے سے بہت خوش تھی۔ سویرا، کمال، شہبو سب گھر پر تھے مگر سویرا اور کمال نے ان لوگوں کو انکار کر دیا۔ میں ڈھکے چھپے الفاظ میں روکتی ہی رہ گئی۔ وہ وضع دار لوگ تھے۔ انہوں نے برا منائے بغیر کہا کہ ہم لوگ اچھی طرح سوچ کر جواب دے دیں وہ لوگ انتظار کر لیں گے۔ انہوں نے اپنا فون نمبر بھی دیا مگر سویرا اور کمال اس بارے میں کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے مگر سالار مجھے اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا اچھا رشتہ ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔ میں نے رات کو ان کے گھر فون کیا تو سالار نے فون اٹھایا اور بڑے شائستہ انداز میں میرے ساتھ بات کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس انکار سے بہت اپ سیٹ ہوگیا ہے۔ اس نے مجھے ساری کہانی سنائی کہ وہ کس طرح ناران کی وادیوں میں تم سے ملا تھا اور تمہیں ڈھونڈتے ہوئے کیسے یہاں تک پہنچا۔ میں اس کی محبت، جستجو اور خلوص سے بے حد... متاثر ہوئی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں تم لوگوں کی مدد ضرور کروں گی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ تمہارے والد بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے اور کمال تمہارے سوتیلے والد ہیں اور تمہیں میں نے اور تمہارے مرحوم نانا نے پالا پوسا ہے۔ اس نے بھی اپنے بارے میں سچ بتا دیا کہ اس کے حقیقی والدین کاغان میں رہتے ہیں۔ بچپن میں اس کے فوسٹر پیرنٹس نے اسے ایڈاپٹ کر لیا تھا مگر وہ اپنے والدین سے ملتا رہتا ہے۔ ایک سچ میں نے بولا اور ایک سچ اس نے..... سچ بھی تو ہر ایک کے سامنے نہیں بولا جاسکتا۔ کیونکہ سچ سننے کا حوصلہ کسی، کسی میں ہوتا ہے۔ میں نے سویرا اور کمال سے بات کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سویرا دل سے تو چاہتی تھی کہ تمہاری شادی سالار سے ہو جائے مگر وہ کمال کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی پھر میں نے ان کے سامنے یہ آپشن رکھا اگر انہیں جائداد چاہیے تو انہیں تمہارے کے لیے سالار کا رشتہ قبول کرنا پڑے گا۔ اس بات پر سب راضی ہو گئے اور اس طرح یہ معاملہ انجام کو پہنچا۔'' نانی نے سنجیدگی سے بتایا۔

وہ گم صم انداز میں اپنی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی یہ باتیں سن رہی تھی۔

''ارما، جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ، تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ اپنی شادی کی تیاریاں کرو۔ سالار تمہارا شوہر ہے۔ ایسا شوہر قسمت والوں کو ملتا ہے۔ سالار کی محبت میں رشتوں کی کمی کو بھول جاؤ ارما'' نانی نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

وہ نانی کا دل رکھنے کے لیے مسکرا دی۔ اس کے ماضی میں ایسے تاریک پہلو تھے جنہیں وہ کبھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ماضی..... جو الجھا ہوا بھی تھا..... اور عجیب بھی..... جس سے بھاگتے، بھاگتے اس نے لوگوں سے بھاگنا شروع کر دیا تھا پھر وہ کہانیوں کی کتابوں میں پناہ لیتی گئی اور آہستہ، آہستہ تنہائی پسند ہوتی گئی مگر اس تنہائی میں سکون تھا۔

☆☆☆

برسوں پرانی بات ہے کراچی کے ایک پوش علاقے میں ثروت بیگ اپنے خاندان کے ساتھ آباد تھے۔ ان کا کنسٹرکشن کا کاروبار تھا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ وہ کراچی کی ماڈرن سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھتے تھے اور خود بھی خاصے ماڈرن آدمی تھے۔ ان کی بیگم کرن بیگ کا تعلق بنگال سے تھا اور وہ ڈھاکا سے بیاہ کر کراچی آئی تھیں، وہ ریشمی ساڑیاں پہنتیں، بالوں میں گجرا لگاتیں اور جواہرات سے مزین زیورات پہنتیں، ان کے تینوں بچے والد کی روش پر چلتے ہوئے ماڈرن ازم کا شکار تھے۔ بیٹیاں سویرا اور شبنم مشنری اسکول میں پڑھتیں۔ بیٹا یاور پرائمری کے بعد بورڈنگ میں چلا گیا۔ ان بچوں کو اپنی ماں کی سنائی گئی بنگال کی کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چٹاگانگ کے باغات، ڈھاکا کی شامیں، مچھلی چاول، کاٹن کی ساڑیاں، سائیکل رکشے، بنگال کے قصے اور داستانیں ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔

کرن نے بھی نئے زمانے کے رواجوں کے ساتھ سمجھوتا کر لیا وقت گزرتا رہا۔ جب سویرا نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تو شبنم کالج میں تھی۔ یاور بورڈنگ میں پڑھتا تھا اور وہ دوستوں کی دنیا میں اتنا گم تھا کہ شاذ و نادر ہی گھر آتا۔

یونیورسٹی میں سویرا کی ملاقات کمال سکندر سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ کمال سکندر کا تعلق بے حد روایت پسند اور کٹر گھرانے سے تھا۔ اس کے گھر والے کسی صورت سویرا کو بہو بنانے پر راضی نہ ہوئے۔ جوانی کے جوش میں ان دونوں نے کورٹ میرج کا فیصلہ کیا اور نادان لڑکیوں کی طرح سویرا نے کمال سکندر سے کورٹ میرج کر لی۔ کمال کے والدین نے پھر بھی اسے بہو تسلیم نہ کیا۔ ثروت بیگ اور کرن بیگ جس سوسائٹی میں رہتے تھے وہاں لڑکیوں کا افیئرز چلانا اور کورٹ میرج کرنا معیوب تو نہیں سمجھا جاتا تھا مگر پھر بھی وہ سویرا کے اس اقدام سے بہت ہرٹ ہوئے۔ جب سویرا امید سے ہوئی تو ثروت بیگ نے خود جا کر کمال کے والدین سے بات کی مگر بے سود۔ بیٹی کے باپ تھے مجبور ہو کر واپس آ گئے۔ اس دن انہوں نے خود کو شرمندہ اور لاچار محسوس کیا۔ کمال سکندر کی محبت کا دم خم بھی چند ماہ میں ختم ہو گیا۔ وہ اپنے خاندان کے سامنے سویرا کے لیے اسٹینڈ نہ لے سکا۔ سویرا اور اس کے درمیان لڑائیاں ہونے لگیں پھر وہی ہوا جو ایسی کہانیوں کا انجام ہوتا ہے۔ کمال سکندر، سویرا کو بزدلوں کی طرح چھوڑ کر اپنے گھر واپس چلا گیا۔ ارما کی پیدائش سے کچھ پہلے ایک حادثے میں کمال سکندر کا انتقال ہو گیا پھر ثروت بیگ کراچی سے لاہور شفٹ ہو گئے۔

سویرا کے ساتھ بیتے حادثے نے انہیں اتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ لاہور آ کر انہوں نے فوراً ہی شبنم کی شادی کر دی۔ یاور پڑھنے کے لیے امریکا چلا گیا۔ اسے ویسے بھی اپنی فیملی سے خاص دلچسپی نہیں تھی پھر وہ وہیں میموں سے دوستی کے چکر میں پڑ گیا اور اپنی تعلیم بھی مکمل نہ کر پایا۔

ثروت بیگ اور کرن بیگ نے سویرا کی دوسری شادی کی کوشش کی مگر ہر بار کچھ ایسا ہو جاتا کہ کہیں بات نہ بن پاتی۔ کبھی کسی کو ارما پر اعتراض ہوتا، کبھی کسی کو سویرا کی پہلی شادی اور پہلے شوہر کے متعلق تجسس ہوتا۔ کرید، کرید کر سوالات پوچھے جاتے کہ ارما کے دادا، دادی اس سے ملنے کیوں نہیں آتے۔ سویرا کی عمر بھی ڈھلتی جا رہی تھی۔ اور اکیلے رہ کر تنگ آ چکی تھی۔ گھر کا ماحول بھی بدل چکا تھا۔ ایسے میں دور دراز کے علاقے ملتان سے کمال امجد کا رشتہ آیا تو ثروت بیگ نے سوچ بچار کے بعد یہ رشتہ طے کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ارما کمال کے نام کے ساتھ کمال امجد کا نام لگتا تو کسی کو علم بھی نہ ہو پاتا کہ ارما، کمال امجد کی سوتیلی بیٹی

ہے۔ سویرا کو شوہر اور ارما کو باپ کی شفقت مل جاتی۔

سانولے، سلونے کمال امجد کو دیکھ کر سویرا نے بہت احتجاج کیا مگر ثروت بیگ نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس حادثے نے انہیں بے حد سخت گیر بنا دیا تھا۔ سویرا بھی اپنی من مانی کرنے کا نتیجہ دیکھ ہی چکی تھی۔ کمال امجد زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ خاندان بھی معاشی طور پر مستحکم نہیں تھا۔

ثروت بیگ کو یہ اطمینان تھا کہ یہ لوگ ساری عمر ان کے زیر نگر ہی رہیں گے۔ آخر بیٹی اور نواسی کے مستقبل کا سوال تھا۔ انہوں نے جہیز میں سویرا کو گھر اور آم کے باغات دیے تاکہ کمال امجد اپنی گزر بسر کر سکے اور آمدنی کا ذریعہ بھی بنا رہے۔ کمال امجد کا خاندان تو ثروت بیگ کا بے حد شکر گزار رہا۔ کمال امجد کو بھی اس کے گھر والوں نے جائداد کے لالچ میں ایک بیوہ سے شادی کرنے پر راضی کر ہی لیا پھر جب اس نے سویرا کو دیکھا تو وہ اس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا مگر وہ اتنا اعلیٰ ظرف نہ بن سکا کہ ارما کو بھی دل سے قبول کر لیتا۔ وہ شروع سے ہی ارما سے نفرت کرتا تھا اور یہ نفرت اس کے دل کے نہاں خانے میں چھپی رہی کہ وہ اس نفرت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

وہ چار سال کی تھی جب سویرا اور کمال کی شادی ہوئی تھی۔ وہ نانا، نانی کے ساتھ اتنی اٹیچڈ تھی کہ نانی نے اسے سویرا کے ساتھ ملتان نہ جانے دیا۔

کمال امجد نہایت چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ معمولی شکل صورت، بے روزگاری اور کم پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اس کے خاندان میں کسی نے بھی اسے رشتہ نہ دیا۔ سویرا سے شادی کرنے کے بعد اس کے اور اس کے خاندان کے وارے نیارے ہو گئے۔ سویرا اپنے ساتھ گھر جائداد، آم کے باغات، آمدنی اور خوش حالی لے کر آئی تھی۔ کمال امجد اور اس کے گھر والے سویرا کی چاپلوسی اور خوشامد کرتے ہوئے اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے۔ سویرا اس خوشامد سے بہل گئی۔ کمال امجد جانتا تھا کہ سویرا کے ساتھ شادی نبھانا کتنا ضروری تھا۔ یوں تو وہ ایسی باکمال شخصیت کا مالک نہیں تھا مگر اپنی ہوشیاری، چرب زبانی اور چاپلوسی کی وجہ سے اس نے رفتہ رفتہ سویرا کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔

ماڈرن سوسائٹی کی عادی سویرا صرف ایک ہاؤس وائف بن کر رہ گئی۔ کمال نے اپنی خوبیاں اس طرح اجاگر کیں کہ اسے کمال کی خامیاں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ کمال کو معلوم تھا کہ اس کا فائدہ اس شادی کو نبھانے میں ہی ہے، اسی لیے اس نے ہمیشہ سویرا کو خوش رکھنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ سویرا اس کی احسان مند بھی تھی کہ اس نے سویرا کو اس کے ماضی کے ساتھ قبول کیا ہے مگر کمال، ارما کو دل سے قبول نہ کر پایا۔ ارما جب بھی نانی، نانا کے ساتھ ملتان جاتی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی اجنبی کے گھر آ گئی ہے۔ سویرا اور کمال، ازمیر کے ساتھ ہی مصروف رہتے، اس کی شرارتوں کو انجوائے کرتے، ارما تو ہمیشہ سے ہی ایک یتیم مسکین بچی تھی اور اس معاشرے کے جاہل لوگوں کے خیال میں یتیم، بچوں کو شرارتیں کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا۔ کبھی تو کمال اس کی ہر معصوم شرارت پر انتہائی حیرت کا اظہار کیا کرتا۔ سویرا بھی بیٹے کے ساتھ ایسی مصروف رہی کہ ارما صرف ازمیر کی بڑی بہن ہی بن کر رہ گئی۔ ثروت بیگ جب تک حیات رہے سویرا کی مالی مدد کرتے رہے۔

ارما کا پورا نام ارما کمال تھا۔ آس پاس رہنے والے لوگ یہی جانتے تھے کہ ارما، سویرا اور کمال امجد کی بیٹی ہے اور اپنے نانا، نانی کے ساتھ بہت اٹیچڈ ہے اس لیے انہی کے ساتھ رہتی ہے۔

ثروت بیگ کے انتقال کے بعد ان کی جائداد ان کے تینوں بچوں میں تقسیم ہو گئی تھی مگر ثروت بیگ کی جائداد کا بیشتر حصہ کرن بیگ کے نام تھا۔ سقوط ڈھاکا کے بعد وہ کبھی اپنے شہر ڈھاکا نہیں گئیں۔ انہوں نے ساری زندگی ثروت بیگ کے ساتھ ہی گزار دی۔

ان کے بچے عیش و عشرت میں زندگی گزارنے کے عادی تھے، باپ کی جائداد سے آیا پیسہ انہوں نے چند سالوں میں ہی اڑا دیا جبکہ کرن بیگ سمجھدار اور حکمت والی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے اثاثے سنبھال کر رکھے، وقت کے ساتھ ان کے بچے تنگ دستی کا شکار ہوئے تو ان کی نظر ماں کی جائداد پر رہنے لگی۔ شبو اور یاور کا خیال تھا کہ ان کی ماں ارما پر بے تحاشا پیسے خرچ کرتی ہے۔ ان کے بچوں کے ساتھ تو کرن بیگ نے کبھی اتنا پیار نہیں کیا۔ وہ اس معاملے میں انصاف نہیں کر سکیں۔ شبو

اور یاور کو خوف تھا کہ کہیں وہ اپنی ساری جائداد ارما کے نام ہی نہ کردیں۔ اپنی ماں کی ارما کے ساتھ اس درجہ محبت اور انسیت کی وجہ سے وہ دونوں ہمیشہ ارما کو ناپسند کرتے رہے اور یہ ناپسندیدگی نفرت میں بدلتی گئی۔ کمال کی باتوں نے سویرا کو بھی بیٹی سے دور کردیا۔ کرن بیگ اپنے تینوں بچوں کی فطرت سے واقف تھیں کہ وہ تینوں خودغرض اور مفاد پرست تھے۔ انہوں نے ساری زندگی صرف اپنے بارے میں ہی سوچا انہیں دوسروں کے لیے قربانی دینا آتا ہی نہیں تھا۔

ارما ان حالات میں بڑی ہوئی کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کو کبھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر پائی۔ اسے لوگوں سے خوف آتا تھا۔ وہ کسی کے پوچھے ایک سوال کا جواب دینے کے لیے کئی، کئی جواب سوچتی۔ کبھی، کبھی تو اسے سمجھ ہی نہیں آتا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔ وہ لوگوں سے کترانے لگی، خاموش رہنے لگی۔ لوگ سمجھتے کہ وہ کم گو ہے۔ اس نے کہانیوں کی دنیا میں پناہ لے لی اور لائبریری سے اِک رشتہ بنالیا۔ وہ اپنا قیمتی وقت لائبریری کو دینے لگی۔ کتابوں کی دوستی میں سکون تھا۔ سوالات کی کسوٹی نہیں تھی۔ اسے کسی کے آگے وضاحتیں نہیں پیش کرنی پڑتیں۔ وہ اس دنیا میں خوش تھی۔ امیر کبیر نانا، نانی کی محبت کی وجہ سے خاندان کے لوگ اسے ناپسند کرتے تھے۔ نانی کی شفقت کے باوجود وہ اپنے خاندان میں وہ اسٹیٹس حاصل نہ کرسکی جو دوسرے بچوں کو حاصل تھا۔

اسکول میں اس کی سب سے زیادہ دوستی عائلہ کے ساتھ تھی۔ وہ عائلہ کو کہانیاں سنایا کرتی، پریوں اور شہزادیوں کی کہانی، پہاڑوں پر بنے ایک محل میں رہنے والی لڑکی کی کہانی، چارلس ڈکنز کے ناول oliver Twist کی کہانی جو ایک یتیم بچے کے گرد گھومتی ہے۔ ایک پودے میں رہنے والی لڑکی Princess Aubergine کی کہانی، گل صنوبر کی کہانی، عالیہ فہمی کی کہانی، ایسی بے شمار کہانیاں تھیں جن کے نام بھی اب اس کے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔

عائلہ کو کہانیاں سنانے والی یہ لڑکی بہت اچھی لگتی۔ رفتہ، رفتہ یہ دوستی مضبوط ہوتی گئی۔ ارما کو بھی عائلہ کی صورت میں ایک سامع مل گیا جو اس سے سوالات پوچھنے کے بجائے اس کی کہانیاں سننے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ پھر عائلہ کے والدین اپنی فیملی سمیت آسٹریلیا شفٹ ہو گئے مگر ارما اور عائلہ کی دوستی ویسے ہی قائم رہی۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ نے رابطوں کو آسان کردیا۔

ارما نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاب کی تو اسے معلوم ہوا کہ خودمختار ہو کر انسان کتنا پُراعتماد ہو جاتا ہے۔

اسے ایک کارپوریٹ کمپنی میں اچھی جاب ملی تھی وہیں اس کی ملاقات فرحان سے ہوئی۔ وہ سانولے رنگ کا خوش مزاج لڑکا تھا۔ پہلی خصوصیت جس نے ارما کو اٹریکٹ کیا تھا، اس کی خوش مزاجی تھی۔ تنہائی کو اپنا ساتھی بنانے والی لڑکی کے لیے ایسی خوش مزاجی صحرا میں کھلتے پھول کی طرح تھی۔ اپنی خوش مزاجی اور زندہ دلی کی وجہ سے وہ لوگوں کو ہنساتا رہتا۔ ارما کو بھی ہنستے رہنے اور خوش ہونے کی خواہش تھی۔ فرحان کو یہ سنجیدہ مزاج اور گم صم رہنے والی خوب صورت لڑکی اچھی لگنے لگی۔ علیک سلیک، دوستی میں بدل گئی اور دوستی محبت میں...... مسئلہ ہی سارا محبت سے شروع ہوتا ہے۔ فرحان نے اس سے بہت سارے وعدے کیے، محبت کے بلند و بانگ دعوے بھی کیے۔ وہ کسی پروانے کی طرح ارما کے گرد منڈلاتا رہتا اور اس کی ہر بات پر فدا ہوتا رہتا۔ ارما نے نانی کو فرحان کے بارے میں بتادیا۔ نانی بھی اب ارما کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔

محبت کے سفر میں انسان اعتبار کا پل بھی جلد ہی پار کر لیتا ہے۔ ارما نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتا دیا۔ اس کے والد اس کی پیدائش سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے اور ان کے خاندان والوں نے کبھی ارما اور اس کی والدہ کو قبول نہیں کیا تھا۔ کمال امجد دراصل اس کے سوتیلے باپ ہیں۔ فرحان ماضی کی اس کہانی کو سن کر خاموش ہوگیا پھر آہستہ، آہستہ اسے بے شمار اعتراضات ہونے لگے۔ کبھی وہ ارما کی والدہ پر تنقید کرتا، کبھی ارما کے نانا، نانی کی تربیت پر اعتراض اٹھاتا، کبھی اسے کمال امجد بھی لالچی... اور حریص لگتے اور پھر جب اس نے یہ ساری باتیں اپنے گھر والوں کو بتائیں تو ان سب کا متفقہ خیال یہی تھا کہ ارما کا تو خاندان ہی اچھا نہیں ہے۔

آہستہ، آہستہ اسے بہت سی باتوں کے بارے میں علم ہوتا گیا، وہ جان گیا کہ ارما اسکول میں اس کی خالہ زاد صدف

کی کلاس فیلو رہی تھی اور اس کی خالہ مسز مسعود کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ارما کو بھی معلوم ہوگیا کہ وہ صدف کا کزن ہے۔

فرحان اور صدف بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر خاندانی رنجشوں اور صدف کے ابو کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے ان دونوں کا رشتہ طے نہ ہو سکا۔ صدف نے بھی اپنے والد کی بات مان لی اور فرحان سے کنارہ کرلیا۔ فرحان اسے منانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اور اس کی والدہ بار، باران کے گھر جاتے رہے مگر صدف کے والد کی نہ ہاں میں نہ بدلی بلکہ انہوں نے فرحان کی خوب بے عزتی بھی کی۔ فرحان کے گھر والے بھی ناراض ہوگئے۔ فرحان نے بھی جذباتی ہوکر صدف کے ساتھ تمام تعلقات ختم کرلیے۔ اسے غصہ تھا کہ صدف نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ محبت کے وعدے جھوٹے تھے، وفا اِک ڈھونگ اور ناٹک تھی۔ دونوں نے ہی ماضی کی محبت کا باب بند کردیا مگر اس محبت کو دل سے نہ نکال پائے۔

اس کے بعد فرحان کی ملاقات ارما سے ہوئی تھی اور وہ اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرچکا تھا مگر ارما کے والدین کے ماضی کو جان کر وہ خائف ہوگیا تھا۔ جب صدف کو یہ معلوم ہوا کہ فرحان اس کی پرانی کلاس فیلو ارما سے شادی کررہا ہے تو وہ اس بات کو برداشت نہ کرپائی۔ وہ ارما کو اس کی خوب صورتی کی وجہ سے پہلے ہی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس بات نے اسے دوبارہ فرحان کی طرف متوجہ کیا۔ فرحان کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ محبت تو اسے صدف سے ہی تھی۔ زمانہ چاہے کچھ بھی کہتا، چاہے وہ خود بھی انکار کرتا مگر سچ تو یہی تھا۔ گم صم رہنے والی ارما خوب صورت تو تھی مگر وہ صدف کی طرح شوخ و چنچل لڑکی نہیں تھی۔ نہ اسے خود ہنسنا آتا تھا اور نہ وہ دوسروں کو ہنسا سکتی تھی۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنے والی لڑکی تھی۔ فرحان ہلا گلا کرنے والا من موجی سا لڑکا تھا۔ مزاج کے یہ تضادات جلد واضح ہو گئے مگر جہاں محبت ہو وہاں مزاج کے تضاد اتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ اہمیت تو وفا اور خلوص کی ہوتی ہے۔ اہمیت تو ساتھ نبھانے والے اور سہارا بننے والے انسان کی ہوتی ہے۔

فرحان اور صدف کا دوبارہ آپس میں رابطہ ہوا تو ارما پس منظر میں چلی گئی۔ تین لوگوں کی تکون میں تیسرا شخص

نظم

احساس سے عاری لوگوں کو
نہ درد کسی کا ہوتا ہے
وہ اپنی ذات کے دھوکے میں
لوگوں کو درد ہی دیتے ہیں
باقی کیا کرنا ہے ان کو
صرف درد نچونا ہوتا ہے
اور درد بھی ایسا درد کہ جو
دل سے لے کر، ہر ہر نس میں
وہ نیلا زہر انڈیلتا ہے
جب سانس تو چلتی رہتی ہے
پر جینا مشکل ہوتا ہے
احساس سے عاری لوگوں کو
نہ درد کسی کا ہوتا ہے

شاعرہ: نبیلہ خان
ڈیرا اسماعیل خان

ہمیشہ پس منظر میں ہی چلا جاتا ہے اور یہی ارما کے ساتھ ہوا۔ فرحان کی محبت لاتعلقی اور سرد مہری میں بدل گئی۔

ارما خوب صورت تو تھی مگر وہ فیشن اور گلیمر میں صدف کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ صدف کے حسن کی چکا چوند کے سامنے ارما کی سادگی ماند پڑگئی۔ سادگی کو سراہنے کے لیے جس دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے فرحان اس سے محروم تھا۔ صدف اور فرحان کا ٹانکا جڑ گیا اور ارما صرف ایک آؤٹ سائڈر یا تماش بین بن کر رہ گئی۔

فرحان نے اس سے معذرت کر لی اور اس بریک اپ کا ذمّے دار اس نے ارما اور اس کے خاندان والوں کو ہی ٹھہرایا۔ ارما کی ماں کی دوسری شادی، اس کے سوتیلے والد، ارما کی محرومیاں، اس کا خاموش مزاج، اس نے ساری وجوہات کو ارما کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ارما خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی یوں جیسے انسان کسی اجنبی کی باتیں سن رہا ہوتا ہے۔ وہ تو وہ فرحان تھا ہی نہیں جسے وہ جانتی اور

پہچانتی تھی۔ وہ تو بس صدف کا پرانا عاشق تھا جو شاید صرف دل لگی کے لیے ارما کی طرف بڑھا تھا۔ دل لگی کا کھیل ختم ہوا تو فرحان کا روپ بھی بدل گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بہروپیا تھا۔ وہ ہی اسے پہچان نہیں پائی تھی۔

سارے قصور ارما کے حصے میں ڈال کر فرحان نے خود کو ہر چیز اور ہر الزام سے بری الذمہ کر دیا۔ اس نے ارما کے سامنے صدف سے محبت کا اعتراف بھی کیا۔ اس کے اور صدف کے خاندان کی برسوں پرانی خاندانی رنجشیں یکلخت ختم ہوگئی تھیں۔ خاندانی رنجشوں کی یہی مسٹری ہوتی ہے کہ وہ کب شروع ہوکر کب ختم ہوجاتی ہیں، پتا ہی نہیں چلتا۔ ارما کی نفرت اور فرحان کی محبت نے صدف کو وہ قوت عطا کی کہ وہ فرحان سے شادی کرنے کے لیے اپنے والدین کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

پھر ارما کو فرحان اور صدف کی شادی کی خبر ملی۔ اس نے فرحان کو اپنے دل سے نکال دیا اور ماضی کا وہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ کون سا یہ اس دنیا کا پہلا واقعہ تھا جب کسی مرد نے کسی عورت کو دھوکا دیا تھا۔

فرحان نے اپنے دل کو تسلی دی کہ اسے تو کبھی ارما سے محبت تھی ہی نہیں۔ وہ تو صرف اس کی طرف وقتی اٹریکٹ ہوا تھا۔ محبت تو اسے ہمیشہ سے صرف صدف سے ہی تھی جہاں وہ دونوں جاب کرتے تھے ارما نے وہاں سے جاب چھوڑ دی اور فرحان بھی اپنے آبائی شہر چلا گیا۔ محبت، دھوکے اور دل لگی کا ایک باب ختم ہوا۔

☆☆☆

پھر برسوں بعد عائلہ آسٹریلیا سے آئی تو ارما اس کے ساتھ پہاڑوں کے سفر پر نکلی۔ ناران میں اس کی ملاقات سالار سے ہوئی اور وہ ملاقات اِک یاد بن کر اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے قید ہوگئی اور آج وہ مسز سالار تھی اور خوش اور مطمئن تھی۔ قسمت سے سب گلے، شکوے دور ہو چکے تھے۔

سالار بھی خوش تھا اور اسی خوشی کے عالم میں وہ کاغان اپنے حقیقی والدین سے ملنے آیا تھا دور رہنے کے باوجود اس کی خوشیاں اس گھر سے جڑی تھیں۔ اس کے حقیقی رشتے یہیں تھے۔ یہ وادی اس کی تھی۔ یہ گھر اس کا تھا اور اس گھر میں رہنے والے لوگ بھی اس کے تھے۔ وہ بی بی جان اور خان بابا کا بیٹا تھا جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اسے ایک رشتے دار فیملی نے ایڈاپٹ کر لیا تھا۔

عالم خان اس کے والد زریاب خان کے رشتے دار تھے۔ زریاب خان کو سب خان بابا کہہ کر پکارتے، زریاب خان پر برا وقت آیا تو عالم خان نے رشتے دار ہونے کے ناتے اس کی مدد کی۔ زریاب خان کا سارا قرض عالم خان نے ادا کیا۔ عالم خان برسوں گزر جانے کے بعد بھی بےاولاد تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔

زریاب خان کے پہلے دو، بیٹے دریا خان اور حکم خان تھے۔ بعد میں ہونے والا زریاب خان نے اپنا تیسرا بیٹا شندرہ خان، عالم خان کی جھولی میں ڈال دیا جس کا نام بعد میں سالار خان رکھ دیا گیا۔ عالم خان اور اس کی بیوی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

عالم خان ہر ہفتے کاروبار کے سلسلے میں لاہور آتا جاتا تھا۔ اس نے ٹرانسپورٹ کا کاروبار شروع کیا جو دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا پھر اس نے لاہور میں ہی رہائش اختیار کر لی۔

چونکہ عالم خان اور زریاب خان کا خاندان ایک ہی تھا تو سالار سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ اس کے حقیقی والدین کاغان میں رہتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار عالم خان کے ساتھ کاغان جاتا اور اپنے حقیقی والدین سے ملتا۔ وہ.... بےاختیار بی بی جان کی طرف کھنچا چلا آتا۔ وہ اس کی اصل ماں تھیں اور ماں کی عظمت کا اعتراف تو خود خدا نے بھی کیا ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ایک بچہ اپنی ماں سے دور رہے، وہ بی بی جان سے ملنے جاتا تو انہی کے پاس بیٹھا رہتا۔

عالم خان اور اس کی بیوی کو سالار کا بی بی جان کی طرف جھکاؤ برا لگتا۔ رفتہ، رفتہ انہوں نے اس کا کاغان جانا بند کر دیا۔ سالار پڑھائی میں مصروف رہتا، گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی مگر اس کے لاشعور میں کہیں یہ احساس تھا کہ وہ لے پالک اولاد ہے۔ یہ سب کچھ اس کا نہیں ہے۔ اگر آج یہ سب کچھ اس کے پاس ہے تو شاید کل کو نہ رہے۔

وہ دل ہی دل میں کاغان کی وادی میں واقع اس لکڑی کے گھر کو یاد کرتا جہاں بی بی جان رہتی تھیں۔ وہ جب اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی تھیں تو اسے یوں لگتا تھا

دنیا میں ان سے زیادہ خوب صورت آنکھیں کسی کی ہیں ہی نہیں۔ وہ اسے پیار اور شفقت سے پکارتیں تو اس کا دل موم بن جاتا، اس کے پالنے والے والدین نے بھی اسے بہت محنت اور محبت سے پالا تھا مگر کسی ماں کی ممتا اور پیار کا نعم البدل تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ چاہتا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تاکہ اسے کوئی زنجیر روک نہ سکے۔ یہی اس معاشرے کا المیہ ہے کہ لوگ لے پالک بچوں کو غلاموں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ ایم بی اے کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ عالم خان کا کاروبار سنبھالا پھر اس نے اپنی ایک ٹریول کمپنی کھول لی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جب وہ خود مختار ہوا پھر وہ اکثر کاغان بی بی جان سے ملنے جاتا رہتا۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے بہت پیار تھا۔

دریا خان نے تو شادی کے بعد الگ رہائش اختیار کر لی تھی۔ حکم خان اور زرینہ، سالار کی آمد کا انتظار کرتے رہتے۔ ان کے لیے وہ ہمیشہ سے شندور خان ہی تھا۔

جب اس کا آنا جانا اس طرف زیادہ بڑھا تو عالم خان اور اس کی بیوی کو اعتراض ہونے لگا۔ زریاب خان کو کہا کہ وہ سالار کے کاغان آنے جانے پر روک ٹوک کریں۔ زریاب خان نے برسوں پرانے کیے گئے وعدے کی لاج رکھی اور سالار کو سختی سے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا مگر سالار جب بھی کسی ٹوڑ گروپ کے ساتھ کاغان جاتا تو... چھپ، چھپ کر بی بی جان سے ملنے بھی چلا آتا۔ اسے رکاوٹوں اور زنجیروں کی پروا نہیں تھی۔

جب اس دفعہ وہ اپنے ٹوڑ گروپ کے ساتھ کاغان گیا تھا تو وہیں اس کی ملاقات ارما سے ہوئی تھی۔ جب وہ سے زیورات کی دکان پر نظر آئی۔ وہ دکان میں نصب آئینے میں زیورات پہن کر دیکھ رہی تھی۔ سالار کی نظر چاندی کے زیور پہننے والی لڑکی کے عکس پر پڑی تو وہ بہوت رہ گیا۔ اس خوب صورت عکس کو دیکھ کر جیسے وہ پناٹائز ہو گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ لڑکی کون تھی جس نے سالار جیسے بندے کو متاثر کر لیا تھا۔ پھر وہ اسے جھیل سیف الملوک پر بھی نظر آئی تھی۔ لکڑی کی کشتی میں بیٹھی ہوئی، ہاتھ سے پانی اچھالتے ہوئے اپنی سہیلی کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی، وہ کتنی مگن تھی۔ وہ جھیل کنارے کھڑا سورج کی کرنوں میں چمکتے سبز شفاف پانی میں سُبک رفتاری سے تیرتی ہوئی کشتی کو دور جاتا دیکھتا رہا پھر وہ اسے gem stones کی دکان پر ملی تھی جہاں سے سالار نے چاندی کی انگوٹھی خریدی تھی۔ وہ جب بھی اسے نظر آتی اس کی نگاہ اس پر ٹھہر جایا کرتی تھی۔ اس کا ٹوڑ گروپ طے شدہ پلان کے مطابق واپس آ گیا مگر وہ دو دن وہیں ٹھہر گیا تھا پھر راستے میں وہ طوفان میں پھنس گیا اور پھر اس نے بی بی جان کے گھر پناہ لی تھی۔ اس رات وہ بارش میں بھیگتے ہوئے رات کے اندھیرے میں بی بی جان کے گھر آیا تھا اور صبح ہوتے ہی واپس لاہور چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی وہیں کمرے میں کہیں گر گئی تھی۔

جب ارما اور عائلہ کا گروپ لینڈ سلائڈنگ میں پھنس گیا تھا تو انہوں نے کاغان میں بی بی جان کے گھر پناہ لی تھی۔ وہیں ارما کو وہ انگوٹھی گری ہوئی ملی جسے اس نے پہچان لیا۔ وہ وہی انگوٹھی تھی جو اس نے دکان پر سالار کے پاس دیکھی تھی۔

قسمت نے سالار اور ارما کو ملا دیا۔ جہاں محبت ہو وہاں بہت سارے سمجھوتے خود بخود ہو جایا کرتے ہیں۔ سالار کی نیت سچی تھی سو اس نے ارما کو ڈھونڈ ہی لیا۔

عالم خان اور اس کی بیوی بہت عرصے سے سالار پر شادی کے لیے زور دے رہے تھے مگر سالار اپنے بزنس میں مصروف رہا۔ لاہور واپس آ کر سالار نے ان دونوں کو ارما کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ دونوں سالار کی خوشی کی خاطر فوراً ارما کی نانی کے گھر رشتہ لے کر آ گئے مگر وہاں موجود سویرا اور کمال نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ سالار یہ ماجرا دیکھ کر بے حد اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ مگر بعد میں ارما کی نانی نے فون کر کے اسے یقین دلایا کہ سویرا اور کمال کے انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سالار کی شادی ارما ہی سے ہوگی۔ سالار نے انہیں بتا دیا کہ وہ ارما سے ناران، کاغان میں ملا تھا۔ نانی خوش تھیں کہ ارما کو ایک محبت کرنے والے شخص کا ساتھ میسر ہوگا۔

سالار نے دوبارہ اپنے پالنے والے والدین سے بات کی۔ عالم خان کی بیگم نے نانی کو فون کیا۔ نانی نے ان سے تھوڑا وقت مانگا اور اس دوران انہوں نے اپنی جائداد کا کچھ حصہ اپنے بچوں کے نام کر کے انہیں ارما اور

سالار کے رشتے کے لیے راضی کیا۔

عالم خان اور اس کی بیگم کی بھی یہی خواہش تھی کہ سالار کی شادی لاہور میں ہو۔ وہ لوگ کاغان میں اس کی شادی کرنا بھی نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح اس کا روز، روز کاغان جانا ہوتا۔ سالار نے اپنے پالنے والے والدین کو یقین دلایا کہ وہ ان ہی کا بیٹا ہے اور اب وہ شادی شدہ ہونے والا ہے، اس خوشی کے موقع پر وہ کاغان اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔ کبھی کبھار اپنے حقیقی والدین سے بھی ملنا چاہتا ہے۔

عالم خان اور اس کی بیوی کو بھی احساس ہوا کہ اب بہو گھر میں آرہی ہے تو بیٹے کے فرار کے راستے بند ہو چکے تھے۔ خوشی کا موقع تھا اسی لیے انہوں نے سالار کے کاغان جانے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

ارمانے یہ ساری باتیں عائلہ کو بتائیں تو کتنی ہی دیر وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔

سالار خان ہی اصل شندور خان تھا۔ وہ کاغان میں رہنے والی بی بی جان کا بیٹا تھا۔ جس گھر میں انہوں نے پناہ لی تھی، وہ سالار ہی تھا اور بہاول پور بھی وہ اتفاقاً نہیں آیا بلکہ ارما کا تعاقب کرتے وہاں پہنچا تھا۔ عائلہ کو یہ کہانی اتنی حیرت انگیز اور دلچسپ لگی کہ وہ بار، بار ان واقعات کا ذکر کرتی۔

سالار کی محبت سچی تھی اور سچی محبت اپنے راستے خود بنا لیتی ہے۔ اب وہ لوگ ارما کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس ویک اینڈ پر ازمیر بھی لاہور آگیا۔ نانی کو اطمینان تھا کہ انہوں نے بروقت صحیح فیصلہ کرلیا تھا۔ اب انہیں ارما کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔

☆☆☆

اس شام سالار چلا آیا۔ نانی تو اسے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ ازمیر ''دولھا بھائی آگئے'' کا شور مچاتا ہوا خوشی کے عالم میں سالار سے گلے ملا۔

''مسٹر ہینڈسم! اچھا ہوا کہ تم سے بھی ملاقات ہو گئی۔'' سالار خوش دلی سے بولا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبرو لگ رہا تھا۔ نیلی جینز پر سفید شرٹ پہنے، سلیقے سے بال بنائے وہ فریش اور تازہ دم لگ رہا تھا۔

''آپ کی شادی خانہ آبادی کی تیاریوں کے سلسلے میں آیا ہوں۔ آخر آپ کی منکوحہ کا اکلوتا بھائی ہوں۔ اسی لیے آج کل بڑی مصروفیت ہے۔ آپ سنائیں، آج آپ نے ہمارے اس غریب خانے کو کیسے رونق بخشی؟'' وہ اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے شگفتگی سے بولا۔ عائلہ نے فوراً ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔

''اب دولھا بھائی کہیں گے کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کیوں نہ سسرال والوں کو سلام ہی کرتا جاؤں۔'' عائلہ دروازے کے پاس کھڑی استقبال کرنے والے انداز میں شرارت سے بولی۔

''اب تو یہ اس راستے سے اکثر گزرا کریں گے۔'' ازمیر نے شوخ لہجے میں کہا۔

''روزانہ۔'' عائلہ نے برجستہ کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''میں سائرہ سے کہتی ہوں کہ کھانے کا انتظام کرے۔'' نانی نے کہا۔ سالار نے شائستگی سے انہیں روک دیا۔

''نانی! کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو بس تھوڑی دیر کے لیے آیا ہوں، کھانے تک نہیں رکوں گا۔'' اس کے لہجے میں تکلف تھا مگر نانی نے اس کی ایک نہ سنی۔

''ارے بھئی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ داماد گھر آیا ہے اور کھانا کھائے بغیر ہی چلا جائے۔'' وہ کہتے ہوئے سالار کا جواب سنے بغیر باہر چلی گئیں۔

''اس وی آئی پی پروٹوکول کو دیکھ کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی شادی کرلوں اور کسی کا داماد بن جاؤں۔'' ازمیر نے مسکرا کر کہا۔

''پہلے سیمسٹر تو کلیئر کرلو۔'' عائلہ نے اسے ٹہوکا دیا۔

''ارے بھئی سیمسٹر بھی کلیئر ہو ہی جائے گا۔ میں نے کون سی نوکری کرنی ہے، اپنی زمین اور آم کے باغات ہی سنبھالنے ہیں ناں۔ اور کیا خبر کہ میری امیر کبیر رئیس نانی اپنی آدھی جائداد میرے نام کردیں کہ جا ازمیر بیٹا! یہ آدھی جائداد میں نے تیری خدمات کے صلے میں تیرے نام کردی ہے۔'' باتوں میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

''خیالی پلاؤ پکانے سے جائدادیں نہیں ملا کرتیں۔

خیر، جا کر ارما کو تو خبر کرو جس کے لیے دولھا بھائی اتنی دور سے چل کر یہاں آئے ہیں۔'' عائلہ نے شوخی سے کہا۔

''انہیں خبر ہو چکی ہے۔'' ازمیر دروازے کی اوٹ میں سے ارما کا آنچل دیکھ چکا تھا۔

عائلہ اٹھ کر باہر گئی اور ارما کا ہاتھ تھام کر اسے ڈرائنگ روم میں لے کر آئی۔ سالار اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔ وہ بھی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

نکاح کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ رشتہ بدلا تو سوچنے اور دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا۔ خاموشی میں اقرار تھا اور خاموشی کی زبان میں بہت سے راز آشکار ہو جاتے ہیں۔

''دولھا بھائی یہاں سے گزر رہے تھے تو انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ راستے میں رک کر سسرال والوں کے در پر حاضری دے دیں اور اپنی بیگم کا دیدار بھی کر لیں۔'' عائلہ نے شرارت سے کہا۔

ارما جھینپ کر مسکرا دی۔

''اسے دولھا بھائی کا محض بہانہ نہ سمجھا جائے۔ ویسے یہ بات سچ بھی ہو سکتی ہے۔'' ازمیر چہکا۔

سالار یہ چھیڑ خانی بے حد انجوائے کر رہا تھا۔ ازمیر اور عائلہ ہنستے مسکراتے شوخی اور شرارت بھری باتیں کیے جا رہے تھے۔ اس گھر میں رونقیں تھیں۔ محبت اور اپنائیت کا احساس تھا۔ اسی وجہ سے وہ یہاں بے اختیار کھنچا چلا آتا۔ پھر عجلت میں کھانے کا انتظام کرتی سائرہ کو اچانک کچن میں تین چار چیزوں کی عدم موجودگی کا علم ہوا تو ازمیر کو فوراً بازار دوڑایا۔ نانی کچن میں اور عائلہ شوکیس میں سے کراکری نکالنے میں مصروف ہو گئی۔

''اپنی وجہ سے مجھے تمہارے گھر والوں کو تکلیف دینا بالکل اچھا نہیں لگ رہا، میں یہاں خاطر تواضع کروانے نہیں بلکہ صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔'' وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں نئے سورج اتر آئے تھے۔

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ محبت کے اظہار کے کئی انداز ہوتے ہیں بعض دفعہ ایک شرمیلی مسکراہٹ سے بہتر اظہار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

''اچھا، واقعی۔'' اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیوں، تمہیں میرے جذبات پر کوئی شک ہے؟'' وہ صوفے کی بیک پر بازو پھیلاتے ہوئے مدھم مگر مسکراتی آواز میں بولا۔

''نہیں۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''تمہارے گھر والوں سے تو میں نے یہ نہیں کہا کہ میں یہاں صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا ہوں مگر انہوں نے یہ بات بغیر کہے ہی سمجھ لی۔ واہ بھئی سب عقلمند لوگ ہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''بس صرف تم ہی میری بات بغیر کہے نہیں سمجھی تھیں پھر میں نے بھی سوچا کہ محبت کو اظہار اور اقرار کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اظہار، اقرار اور دیدار کی.....'' اس نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔

دفعتاً عائلہ چائے کی ٹرالی لیے ڈرائنگ روم میں آئی۔

''مہمان، مہمانوں کی خاطر داری کر رہے ہیں۔'' اس نے ٹرالی میں سجی نفیس پیالیوں کو دیکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''میں مہمان نہیں، اب گھر کی فرد بن گئی ہوں۔'' عائلہ چائے بنانے لگی۔ پھر اس کی نظر سالار کے ہاتھ میں پہنی ہوئی رنگوں والے پتھر کی انگوٹھی پر پڑی۔

''ویسے شندور خان اور سالار خان کی کہانی مجھے بڑی عجیب لگی۔ ہم تو کافی عرصے تک شندور خان کو کوئی ٹرک ڈرائیور ہی سمجھتے رہے تھے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ آپ ہی دراصل شندور خان ہیں۔'' وہ چائے بناتے ہوئے بولی۔ تو وہ مسکرایا۔

''میرے بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ شوخ لہجے میں ابرو اچکا کر بولا۔

''مجھے اس بات سے اتفاق ہے۔ ناران کی وادیوں میں آپ ہمیں بے حد پُراسرار لگا کرتے تھے۔ اِدھر نظر آتے، اُدھر غائب ہو جاتے۔'' وہ بھی مسکرا کر بولی۔

''حالانکہ میں ادھر ہی ہوتا تھا۔ بس آپ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو جاتا۔'' وہ چائے کی پیالی تھامتے ہوئے گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اوہ واقعی.....!'' وہ دونوں ایک ساتھ چونکیں۔

وہ یونہی مسکراتا رہا۔

''وہ بھی ایک زبردست ایڈونچر تھا جس میں رومانس کا رنگ بھی شامل ہوگیا۔ mysterious ایڈونچر، رومانٹک ایڈونچر بن گیا اور سادگی کا عالم ملاحظہ فرمائیں کہ ساتھ رہنے والے مسافر کو خبر تک نہ ہوسکی۔''

سالار اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ ارما بھی چائے کی پیالی میں چینی ملاتے ہوئے مسکرادی۔

''تو اس میں قصور ساتھ رہنے والے مسافر کی... بے خبری کا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ارما اور عائلہ... بے ساختہ ہنس دیں۔

نانی ڈرائنگ روم میں آئیں تو باتوں کا رخ بدل گیا۔ سالار، نانی سے باتیں کرتے ہوئے چپکے، چپکے ارما کو دیکھتا رہا۔ وہ آیا بھی اسی لیے تھا۔ کچھ دیر بعد ازمیر بھی آگیا۔ عائلہ اور ازمیر کے شوخ و شریر فقروں نے محفل کو زعفران بنادیا۔

سالار کو کھانے تک رکنا ہی پڑا۔ وہ اس گھر کا خاص مہمان تھا۔ سب لوگوں کی کوشش تھی کہ اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ رہ پائے۔ پروٹوکول اس کی ڈیمانڈ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ وہ سادہ مزاج تھا۔ اس کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی تھی کہ لوگ اس کے آگے پیچھے پھرتے رہیں مگر ارما کے گھر والوں کی محبت، خلوص اور اپنائیت کے احساس نے اسے گرویدہ بنالیا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں سچے اور خالص رشتوں کی خواہش تھی۔ اسے ایسی محبتوں کی طلب تھی جو زنجیروں سے آزاد ہوں۔

☆☆☆

نکاح کے بعد ارما کے خاندان میں جیسے خاموشی چھا گئی تھی۔ ہر کوئی اپنے گھر میں مصروف تھا۔ امی، ابا کبھی کبھار فون کرتے۔ شبو خالہ نے بھی نکاح کے بعد چکر نہیں لگایا تھا۔ نانی سارا دن فون پر مصروف رہتیں۔ عائلہ انہیں نمبر ملا، ملا کر دیتی جاتی، کبھی کیٹرنگ والے کو فون، کبھی ہال کی بکنگ کرانے والے کو، کبھی بوتیک والی ڈیزائنر کو تو کبھی پارلر والی، فوٹو گرافر، مووی میکرز، غرض ایک لمبی لسٹ تھی۔

عائلہ اور ازمیر صبح بازاروں کے چکر لگاتے، شام کو مہندی کے ڈانس کی پریکٹس کرتے۔ یہ تو عائلہ اور ازمیر ہی تھے جو اس شادی پر سب سے زیادہ خوش اور ایکسائٹڈ تھے۔

ارما بہت پہلے لوگوں کی باتوں اور نظروں کو نظر انداز کرنا سیکھ چکی تھی اور اب تو وہ اپنی زندگی میں اتنی خوش اور مطمئن تھی کہ اسے لوگوں کی پروا ہی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد نانی نماز پڑھنے چلی گئیں۔ ازمیر قریبی مارکیٹ سے میٹھے پان لینے چلا گیا۔ ارما کھانے کی میز سے برتن اٹھوانے میں مصروف ہوگئی۔ سالار کچھ دیر واک کرنے کی غرض سے لان میں چلا آیا۔

''دولھا بھائی، آپ گرین ٹی پئیں گے؟'' دروازہ کھول کر لان میں آتی عائلہ نے اس سے پوچھا۔

وہ ٹھہر گیا پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے عائلہ کی طرف آیا۔

''ہاں، ضرور..... مگر لیمن فلیور کے ساتھ۔'' وہ عائلہ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

وہ مسکرا کر پلٹنے لگی تو سالار کے اگلے جملے نے اسے روک لیا۔ ''میں نے آپ کے فون نمبر پر مسٹر فرحان کا فون نمبر سینڈ کردیا تھا۔''

وہ چونک کر مڑی۔ سالار کو یہ بات یاد تھی۔ وہ اس بات کا ذکر کررہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے لیے یہ عام اور غیر اہم سی بات نہیں تھی۔ وہ بے اختیار پچھتائی کہ آخر اس نے اس سے وہ نمبر مانگا ہی کیوں تھا۔

''اوہ ہاں، وہ نمبر مجھے مل گیا تھا مگر میں نے اسے ڈیلیٹ کردیا۔'' وہ بوکھلا گئی۔

''کیوں؟'' سالار نے بے اختیار ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ تفصیل جاننے کا خواہاں ہے۔

عائلہ نے گھبراہٹ کے عالم میں دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں اس نے فوراً دماغ میں کوئی کہانی سوچی۔

''وہ..... دراصل..... مسٹر فرحان کی بیوی میری پرانی جاننے والی تھیں مگر اس کے ساتھ میرے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ خود پسند اور مغرور لڑکی تھی۔ پاکستان آکر میں نے سوچا کہ اس سے رابطہ کرتی ہوں پھر میں نے فیس بک پر اس کی اور اس کے شوہر کی تصویریں دیکھیں اسی لیے آپ سے مسٹر فرحان کا نمبر مانگا تھا مگر بعد میں، میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔'' اس نے آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے بہانہ بنایا۔

''تو کیا ارما، مسز فرحان کو پسند نہیں کرتیں؟'' سالار نے ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

اُف یہ سوالات..... عائلہ عاجز آ گئی۔ سالار کو ٹالنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس نے حواس باختگی کے عالم میں بہانے سوچنے شروع کیے۔

''ہاں..... نہیں..... بس وہ اس قسم کی فضول اور احمقانہ باتیں پسند نہیں کرتی، اس نے مجھے منع کر دیا تھا کہ ایسی لڑکی سے رابطہ کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے جو مجھے پسند ہی نہیں کرتی، مجھے کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی..... بس یونہی..... کوئی خاص بات نہیں تھی۔'' اس نے بوکھلا کر بات سمیٹنے کی کوشش کی۔

''اوہ آئی سی۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''میں ارما کو جا کر بتا دوں کہ سب کے لیے گرین ٹی بنا دے۔'' اسے وہاں سے ہٹنے کا بہانہ سوجھ گیا۔

''اُف یہ اس سے کیا بلنڈر ہو گیا تھا۔'' اس نے اندر آتے ہوئے سوچا۔ ''شکر ہے کہ بات سمٹ گئی۔'' اس نے کہانی گھڑ لی۔ بہانے بنا دیے اور بات کو ٹال دیا۔ ورنہ تو اس کی ذرا سی غلطی سالار کو مشکوک کر سکتی تھی۔ مرد اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوتا کہ عورت کی پرانی محبت کو قبول کر کے اسے معاف کرنے کا حوصلہ رکھتا۔ مرد کو ایسی آزمائش میں ڈالنا ہی نہیں چاہیے۔ پرانی محبتوں اور کچی عمر کی بیوقوفیوں پر پردہ ہی پڑا رہنا چاہیے۔ ارما، فرحان کو بھول چکی تھی۔ اچھا ہوتا یہ بات بھولی بسری کہانی ہی بن جاتی۔ بھلا یاد رکھنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔

☆☆☆

پھر وقت اور دن پر لگا کر گزر گئے۔ ارما اور سالار کی شادی کا دن آ گیا۔

نانی نے بہت کم لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ نکاح ہو چکا تھا۔ بارات سادگی سے آئی۔ ہاں ولیمہ شاندار تھا۔ شادی پر کاغان سے بھی کافی مہمان آئے ہوئے تھے۔ بی بی جان اور ان کی ساری فیملی موجود تھی۔

ارما کی شادی کے بعد عائلہ کی خالہ نے عالیان کے لیے عائلہ کا رشتہ مانگ لیا۔ طے یہ پایا کہ شادی کے بعد خالہ اور عالیان آسٹریلیا شفٹ ہو جائیں گے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ عالیان اور عائلہ کا نکاح ہو جاتا کہ

محبت زندگی

محبت کیا ہے؟
عجب جذبہ دلی سکون کا
اور یہی سبب ہے کہ
صرف اسی کے گرد
گزرتی ہے زندگی
پل، پل جیتی ہے زندگی
پر لوگ سمجھتے نہیں
اسے پرکھتے نہیں
پر لوگ یقین کرتے نہیں
اعتبار، دلی سکون اور محبت
یہی مقصد زندگی ہے
پر لوگ یقین کرتے نہیں

شاعرہ: نرمین سرھیو، حیدرآباد

کشمیر کی پکار

اجڑتی رہی ہیں میرے خوابوں کی بستیاں
کہیں گونجتی ہیں، چناروں کی سسکیاں
میرا سفر تھکا دینے کا سفر ہے
کہ میری آغوش میں آرزوؤں کی قبر ہے
ظلمت کے مجھ پر چھائے رہتے ہیں بادل
میں قدم، قدم پر ہوں، لہو، لہو اور گھائل
میری زندگی جنتوں سی حسین وادی ہے
میرے لبوں پر جو گیت ہے وہ آزادی ہے
مجھ کو پیرہن اشکوں کا پہنا دیتے ہیں
مجھ کو روز لہو میں نہلا دیتے ہیں
غم کی تال پر ہچکیوں کا ساز ہوں میں
اتنا کیوں آزماتے ہو، کیا بے آواز ہوں میں

شاعرہ: سعدی آرائیں، گولارچی

☆☆☆

عائلہ کے پاس آسٹریلیا کی نیشنلٹی تھی۔ عائلہ کے ممی، پاپا آسٹریلیا سے آئے اور ایک سادہ سی تقریب میں عائلہ اور عالیان کا نکاح ہوگیا۔

اس کے والدین دور پرے کے رشتے داروں کی طرف ٹھہرے ہوئے تھے۔ ارما کی شادی کے بعد نانی نے اوپر کا پورشن اپنی رشتے دار خاتون کے بیٹے کو کرایے پر دے دیا تھا۔

ارما، سالار کے ساتھ خوش تھی۔ اس کے ساس، سسر اچھے تھے۔ ارما اور سالار شادی کے بعد ہونے والی دعوتوں میں مصروف تھے کہ انہی دنوں ان کی پرانی کلاس فیلو فاخرہ کی شادی آگئی۔ فاخرہ، صدف کی بیسٹ فرینڈ تھی۔

عالیان ان دنوں پاسپورٹ اور ویزے کے کام کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا۔ عائلہ اسی کے ساتھ فاخرہ کی شادی پر گئی۔ وہاں صدف بھی اپنے شوہر فرحان کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ وہ دیکھنے میں بہت عام سا لڑکا تھا۔ گندمی رنگت اور درمیانے قد کا حامل، اس کے پہلو میں بیٹھی صدف خوب دمک رہی تھی۔ سرخ کامدار لباس پہنے، گہرے میک اپ اور بھاری جیولری کے ساتھ وہ بھی نئی نویلی دلہن نظر آرہی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی، خوب صورت، گلیمرس اور فیشن ایبل، بس ذرا فربہی مائل ہوگئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ باقی لوگوں سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔

عائلہ اپنی پرانی کلاس فیلوز سے عرصے بعد ملی۔ اسکول کی یادیں، ٹیچرز کے قصے، بورڈ کے ایگزامز کے خوف، سینئرز اور جونیئرز کی باتیں، کارڈیور کے ہنگامے، پرنسپل کا ڈنڈا، اسکول بیگ کا بوجھ، اس بوجھ کو اٹھا کر آج دنیا کے سارے بوجھ اٹھانے کے قابل تھے۔

پرانے دوستوں سے ملنے کے بعد انسان کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ کھانے کے بعد عائلہ ساڑی کا پلو سنبھالتے ہوئے کونے میں بیٹھی صدف کی طرف چلی آئی۔

یہ پرپل رنگ کی ساڑی اور قیمتی پتھروں کی جیولری اسے ارما کی نانی نے اس کے نکاح پر تحفتاً دی تھی۔

''کیسی ہو صدف آفٹر آلانگ ٹائم..... اسکول کے بعد اب ہماری ملاقات ہورہی ہے۔'' وہ اِک شان سے چلتی ہوئی صدف کے پاس آکر رک گئی۔

صدف کے ساتھ، ساتھ اس کا شوہر بھی اسے دیکھ کر چونکا تھا۔

''ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟ تم لوگ تو سالوں پہلے آسٹریلیا شفٹ ہوگئے تھے ناں؟'' وہاں کوئی گرم جوشی نہیں تھی جو برسوں بعد اسکول کی پرانی کلاس فیلو سے ملتے وقت ہوتی ہے۔ عائلہ یونہی مسکراتے ہوئے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ہاں، بس ارما کی شادی اٹینڈ کرنے کے لیے آئی تھی۔ اس کی شادی ہوگئی اب میں بھی واپس چلی جاؤں گی۔'' اس نے کان میں پہنے جھمکے کو ہولے سے چھوتے ہوئے اِک ادا سے جواب دیا۔

''ارما کی شادی؟'' صدف استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

فرحان نے بھی بے اختیار پہلو بدلا۔ اس کی آنکھوں میں یک دم ایک انجانا سا تاثر ابھرا تھا۔

''ہاں، بہت ہی اچھے اور امیر گھرانے میں ارما کی شادی ہوئی ہے۔ اس کا ہزبینڈ تو اتنا ہینڈسم اور ڈیشنگ ہے کہ کیا بتاؤں؟ بالکل ہالی ووڈ کا ہیرو لگتا ہے۔ لو میرج ہے دونوں کی..... کچھ دنوں تک وہ دونوں ہنی مون کے لیے اٹلی جانے والے ہیں۔ یہ دیکھو ارما کی شادی کی تصویر..... بہت ہی روپ آیا تھا اس پر، بالکل شہزادی لگ رہی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے موبائل میں ارما کی شادی کی تصویر دکھائی جس میں عائلہ کے ساتھ ارما دلہن بنی بیٹھی تھی۔ لمحے بھر کی بات تھی۔ موبائل کی روشنی بجھتے ہی شہزادی کا عکس غائب ہوگیا مگر فرحان کے دل کی دنیا میں اِک طوفان برپا ہوچکا تھا۔ صدف کا موڈ بھی آف ہوچکا تھا۔

''چلو اچھی بات ہے یہ ارما کی شادی بھی ہوگئی۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ پہلے میرے ہزبینڈ فرحان کو پسند کرتی تھی مگر فرحان نے مجھے پرپوز کیا۔'' صدف نے مغرورانہ انداز میں کہتے ہوئے ساتھ بیٹھے فرحان کا بازو تھام لیا۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ مغرور اور بددماغ اور خود کو مس ورلڈ سمجھنے والی۔ اپنے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر وہ یوں ری ایکٹ کررہی تھی جیسے اس کا شوہر دنیا کا خوب صورت ترین شخص ہو۔

"dont tell me" عائلہ زور سے ہنسی یوں جیسے اس نے اس بات کو مذاق سمجھا تھا۔

صدف اور فرحان حیرت سے اسے دیکھنے لگے کہ

ایسے سنجیدہ انکشاف پر یوں ہنسنے کی کوئی تُک تو نہیں بنتی تھی۔

''تمہارے میاں نے ضرور تم سے کوئی مذاق کیا ہو گا۔ ارما جیسی امیر کبیر اور خوب صورت لڑکی بھلا تمہارے شوہر کو کیوں پسند کرتی؟ اس نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا کہ فرحان صاحب اس کے پیچھے پڑے رہتے تھے، ہر وقت اسے فون کرتے، میسج کرتے، تحفے دیتے، کسی زمانے میں یہ ارما کے عشق میں بری طرح گرفتار تھے۔ ارما نے تو کبھی ان میں کوئی انٹرسٹ ہی نہیں شو کیا تھا۔ پھر ارما نے نہ جانے کون سی کہانیاں سنا کر ان سے جان چھڑائی۔ ارما کی رئیس فیملی کسی مڈل کلاس آدمی کے ساتھ اس کی شادی کے لیے کبھی رضامند نہ ہوتی۔ اب فرحان صاحب اپنے بارے میں اتنے زیادہ سچ تو بول نہیں سکتے ہوں گے اسی لیے انہوں نے سارے قصور ارما کے کھاتے میں ڈال دیے مگر ارما کو بھلا ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ارما نے فرحان صاحب کو خود ریجیکٹ کر دیا تھا اور یہ اپنا ٹوٹا ہوا دل لے کر تمہارے پاس چلے آئے اور تم ان کی جھوٹی سچی باتوں پر یقین کر بیٹھیں۔ ویسے تم اتنی بیوقوف تو کبھی نہیں رہی تھیں صدف۔'' عائلہ نے جتاتے ہوئے کہا۔

فرحان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ صدف کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔ عائلہ کی ایسی صاف گوئی نے صدف کو شاکڈ اور ساکت کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بولنا بھول گئی۔ ذرا دور کھڑا عالیان، صدف اور فرحان کے تاثرات کو دیکھ کر صورتِ حال بھانپ چکا تھا۔

''عائلہ!'' اس نے قریب آتے ہوئے اسے اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں پکارا۔

''میرے ہزبینڈ مجھے بلا رہے ہیں۔'' وہ پرس اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''ہزبینڈ۔'' صدف کو دوسرا دھچکا لگا۔ ساڑی، زیور، میک اپ..... اس نے عائلہ کو غور سے دیکھا۔

عائلہ تیز، تیز قدم اٹھاتی مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے وہاں سے جاتے ہی صدف جیسے ہوش میں آئی۔

''چلیں۔'' عالیان جیب سے چابی نکالتے ہوئے بولا۔

''ہاں، چلو۔'' وہ اطمینان سے مسکرا دی۔

عالیان نے ایک نظر دور بیٹھے صدف اور فرحان کے لال بھبوکا چہروں کو دیکھا۔

''وہ لوگ تو تمہیں یوں دیکھ رہے ہیں جیسے تم سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔'' وہ زیرک تھا۔ لوگوں کے تاثرات دیکھ کر ان کی سوچ پڑھ لیتا تھا پھر اس نے شعلے اگلتی آنکھوں اور لال بھبوکا چہرے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھتی صدف کو دیکھا تو فوراً عائلہ کا ہاتھ تھام کر تیز، تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر کی طرف چل دیا۔

''وہ عورت شاید تم سے لڑنے آ رہی ہے کسی کی شادی میں یوں تماشا کھڑا ہو جائے گا۔ شکل اور انداز سے ہی وہ بڑی لڑاکا لگ رہی ہے۔ جلدی چلو..... پنسل ہیل کے ساتھ چلتے ہوئے وہ ہماری رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔'' وہ یک دم گھبرا گیا۔

عائلہ کے اطمینان میں فرق نہیں آیا۔ وہ یونہی مسکراتی رہی۔ صدف جارحانہ انداز میں ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عائلہ کی باتیں سن کر چند لمحوں کے لیے وہ سکتے میں چلی گئی تھی، جب سکتہ ٹوٹا اور اسے ہوش آیا تو وہ غضب ناک ہو کر اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

''آخر تم نے اسے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟'' عالیان کو عائلہ کا رویہ بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

پارکنگ میں پہنچ کر اس نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ عائلہ بھی فوراً ہی اندر بیٹھ گئی۔ صدف بگڑے ہوئے تاثرات کے ساتھ ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ فرحان نے اسپیڈ پکڑی اور فوراً گاڑی روڈ پر لے آیا۔ عائلہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ وہ چشم تصور میں صدف اور فرحان کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

''کیوں ہنس رہی ہو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔'' وہ گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے خفا ہوا۔

''میں اس لیے ہنس رہی ہوں کیونکہ آج مجھے دلی سکون اور اطمینان ملا ہے۔ میں نے صدف اور فرحان کو وہ سب کچھ کہہ دیا جو کافی عرصے سے کہنا چاہتی تھی۔ اب چاہے انہیں برا لگے یا غصہ آئے، مجھے پروا نہیں ہے۔'' دل کا غبار نکالنے کے بعد اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

وہ لب بھینچے خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ اگر وہ

بروقت عائلہ کو وہاں سے نہ لے آتا تو شاید اسے اپنی زندگی کے بدترین ایڈونچر کا سامنا کرنا پڑتا۔

''کیا یہ وہی مسٹر فرحان ہے جس کا فون نمبر تم سالار سے مانگ رہی تھیں؟'' چند لمحوں بعد وہ سنجیدہ انداز میں بولا۔

عائلہ کو جھٹکا لگا۔ اس نے شاک کے عالم میں عالیان کو دیکھا۔ اسے بہاول پور کی وہ چاندنی رات یاد آئی جب وہ ٹیرس پر کھڑی سالار سے فون پر بات کر رہی تھی۔

''تم میری جاسوسی کرتے ہو؟'' اس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے حیرت اور خفگی سے کہا۔

''ہاں۔'' وہ اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے ہولے سے مسکرا دیا۔

''چھپے رستم ہو تم۔'' عائلہ نے بے ساختہ اس کے شانے پر مکا مارا۔

''اب مجھے اس بات کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ، اگر یہ ہنگامہ نہ ہوتا تو میں دل کھول کر تمہاری تعریف کرتا۔ ساڑی پہننے والی لڑکی کے حسن پر شعر کہتا مگر اس جنگجو لڑکی نے موقع ہی نہ دیا۔ شکر ہے کہ ہم موقع پر وہاں سے نکل آئے ورنہ تو اس موٹی لڑکی نے تماشا کھڑا کر دینا تھا۔''

عائلہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی پھر اسے ساری بات بتاتے ہی بنی۔ وہ لوگ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔ سڑکوں پر گھومتے، پھرتے رہے۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا اور حیران ہوتا رہا پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد گھر کے پورچ میں گاڑی روکتے ہوئے وہ سنجیدہ آواز میں بولا۔

''یہ تمہاری بچکانا حرکت تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے احساس دلانے سے وہ شرمندہ ہو جائے گا اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔ بے حس لوگوں سے ایسی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ ایسے لوگ وہی سبق سیکھ پاتے ہیں جو وقت انہیں سکھاتا ہے۔ اب یقیناً اسے اس بات کا احساس ہو گیا ہوگا کہ اس نے ارما کو چھوڑ کر غلطی کی ہے، زندگی مکافاتِ عمل کا نام ہے۔ کانٹے بونے والے لوگوں کو پھولوں کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔''

''بس مجھے اس شخص پر بہت غصہ تھا۔ اسے یوں صدف کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھ کر میں اپنا غصہ کنٹرول نہ کر سکی۔'' عائلہ نے گہری سانس لی۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔

''ارما کو دیکھو، اس نے جلنے کڑھنے اور غصہ کرنے کے بجائے اس آدمی کو فراموش کر دیا۔ اپنا راستہ بدل لیا اور آج وہ کتنی خوش ہے۔ ایسے لوگوں سے کنارہ کر لینا چاہیے۔'' اس نے گاڑی لاک کر کے گیٹ بند کیا پھر اندر آتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''بات تو سچ تھی۔'' عائلہ نے سوچا۔

اور ارما نے تو دوبارہ کبھی فرحان کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اسے اپنی یادوں اور باتوں سے بھی نکال پھینکا تھا۔ وہ فرحان کو بھول گئی تھی کیونکہ اس نے اسے بھول جانے کی کوشش کی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ فرحان کے ساتھ اس کا مستقبل نہیں جڑ سکتا کیونکہ وہ اس کے ساتھ مخلص بھی نہیں تھا اور اسے اس سے محبت بھی نہیں تھی، وہ سب تو بس وقت گزاری کے کھیل تماشے تھے۔

''عقل مندی کی ارما نے۔'' عائلہ نے سوچا۔

اور عقل مندی کا ثبوت تو عائلہ نے بھی دیا تھا۔ عالیان کا پروپوزل قبول کر کے۔ جب اس کی خالہ نے اس کے والدین سے اس کا رشتہ مانگا تو اس کے والد سوچ میں پڑ گئے تھے۔

عالیان کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ وہ پڑھا لکھا تو تھا مگر اس کے پاس اچھی جاب نہیں تھی، اسے اپنا کیریئر بنانے اور سیٹل ہونے میں سالوں لگ جاتے مگر عائلہ نے اپنی والدہ کو رضامندی دے دی تھی۔ وہ آسٹریلیا میں خود مختار زندگی گزارنے کے باوجود اپنے لیے ایک اچھا لائف پارٹنر نہیں ڈھونڈ سکی تھی۔ وہاں شادی کرنے کا اتنا رواج بھی نہیں تھا۔ لوگ پارٹنر کی طرح ساتھ رہتے اور چند مہینوں یا سالوں بعد ہنسی خوشی الگ ہو کر اک نیا پارٹنر تلاش کر لیتے۔

اپارٹمنٹ کا کرایہ آدھا، آدھا شیئر کرتے، اپنے، اپنے حصے کا بوجھ اٹھاتے۔ وہ پردیس میں رہنے کے باوجود مشرقی لڑکی تھی۔ اس کے بھی وہی روایتی سے خواب تھے۔ گھر، شوہر، شادی، بچے، فیملی..... وہ جانتی تھی کہ عالیان اسے پسند کرتا ہے اور اس سے محبت کرنے لگا ہے، وہ بھی

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

کب تک یونہی گھومتی پھرتی اور ٹریولنگ کے شوق پورے کرتی رہتی۔ اس کے والدین نے فیصلہ کیا کہ عالیان اور اس کی والدہ کو آسٹریلیا بلا لیا جائے اور یوں یہ معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے اور عالیان کو عائلہ مل گئی۔

☆☆☆

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ فرحان ابھی تک جاگ رہا تھا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کتنے عرصے سے وہ بے خوابی کا شکار تھا۔ ایک زبردست جھگڑے کے بعد صدف کروٹ لیے کمبل اوڑھے سو رہی تھی اور وہ جاگ رہا تھا۔

یہ سچ تھا کہ اس نے ارما کے ساتھ فلرٹ کیا تھا۔ اسے دھوکا دیا تھا۔ وہ سب باتیں جھوٹی تھیں جو وہ اس سے کرتا رہا تھا۔ آج کل تو سب لڑکے ایسا کرتے ہیں، وہ کون سا ان سے الگ تھا۔ اسے پچھتاوا بھی نہیں تھا نہ احساسِ جرم تھا۔ معصوم لڑکیوں کو دھوکا دینے والوں کو پچھتاوا ہوتا بھی نہیں ہے۔ بے حسی انہیں احساس جرم محسوس ہی نہیں کرنے دیتی۔ بظاہر وہ لوگ اپنی زندگی میں خوش باش نظر آتے ہیں۔ شادی بھی کر لیتے ہیں، گھر بھی بسا لیتے ہیں مگر ان کی زندگی میں اِک خلا رہ جاتا ہے جسے وہ خود بھی سمجھ نہیں پاتے۔

ارما کی شادی کا سن کر اسے برا لگا تھا۔ اب وہ ایک امیر کبیر اور ہینڈسم آدمی کی بیوی تھی پھر اس نے خود کو تسلی دی۔ ظاہر ہے شادی تو اس کی ہونی ہی تھی۔ آج کل کون کسی کی خاطر جوگ لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں کانٹا سا چبھا۔ دل کا ملال کم نہ ہوا۔

وہ بھی بدتمیز تھا، صدف بھی لڑاکا تھی، گزارہ کیسے ہوتا۔ ہنی مون کے سیر سپاٹے، مشک پوری کی پھولوں بھری پہاڑی پر گزارے خوشبو بھرے دن، وادیِ نیلم میں بتائی سہانی شامیں، وہ خوشیوں بھرے لمحے بڑی جلدی گزر گئے۔ جو بھی اُن کے ہنی مون کی تصویریں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ان سے زیادہ خوش باش کپل تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ تصویروں کے پیچھے چھپی حقیقتوں پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ وہ بھی اپنی زندگی میں بے سکونی محسوس کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ ارما کو بھول چکا ہے مگر اب اس پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ اسے بھولا نہیں تھا۔ مرد کی یادداشت بھی عجیب ہوتی ہے۔ کب کسے بھلا دے، کب کسے یاد کر بیٹھے پتا ہی نہیں چلتا۔ تھک ہار کر اس نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ اس بے خوابی، بے سکونی اور کشمکش سے تنگ آچکا تھا۔ آخر سچے اور جھوٹے لوگوں کی زندگی میں فرق تو ہوتا ہے ناں!

☆☆☆

سالار اور ارما ہنی مون کے لیے ناران، کاغان آئے ہوئے تھے تو وہ دو تین دن کے لیے بی بی جان کے گھر بھی رک گئے۔

زرینہ کی شادی ہو چکی تھی مگر وہ بھائی، بھابی کے آنے کی خوشی میں صبح، صبح ہی پہنچ جاتی۔ بی بی جان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ دنیا جہان کی نعمتیں بیٹے اور بہو کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ خان بابا بھی ارما کے ساتھ شفقت سے پیش آتے۔

بیٹا پیدا ہوتے ہی عالم خان کو دے دیا تھا پھر وعدے اور زبان کا پاس رکھا مگر دل میں تو یہی خیال رہتا کہ بیٹا تو انہی کا ہے۔ دریا خان بھی اپنی فیملی کے ساتھ آجاتا۔ گھر میں ہر وقت رونق سی لگی رہتی۔ کاغان کے لوگوں نے ارما کا شاندار استقبال کیا۔

ارما کے لیے یہ خلوص اور محبت اِک نیا تجربہ تھا۔ وہ کمرے میں آتی تو لوگ کھڑے ہو جاتے۔ کوئی اس کے لیے گاؤ تکیہ درست کرتا، کوئی چائے کا کپ لے کر آتا۔ کوئی منٹوں میں دسترخوان سجا دیتا، وہ گرم علاقے سے آئی تھی اسے سردی زیادہ لگتی تھی کوئی اس کے آرام کے خیال سے آتش دان میں لکڑیاں روشن کرتا۔

اسے زندگی میں محبت بھرے رشتوں کی ہی تو خواہش تھی۔ سالار اس کے ساتھ، ساتھ رہتا۔ اسے اس علاقے کی روایات کے بارے میں بتاتا رہتا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہتی۔ زرینہ صبح، صبح آکر اسے تیار کرتی۔ گوٹے کناری والے کپڑے، چاندی کے زیور، کڑھائی والی چادر، وہ اس کے ہاتھوں میں تازہ پھولوں کے گجرے پہناتی، گاؤں کے لوگ اس خوب صورت دلہن کو دیکھ، دیکھ کر خوش ہوتے، تالیاں بجاتے ہوتے پہاڑی گیت گاتے اور اپنی خوشی اور محبت کا اظہار کرتے۔

ارما کو یہ سب کچھ نیا اور انوکھا لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دنیا کے شور ہنگاموں سے دور کسی فینٹسی ورلڈ

میں چلی آئی ہے۔ کمرے کی دیوار پر سلور فریم والا ایک آئینہ نصب تھا۔ وہ چاندی کے زیور اور پھولوں کے گجرے پہن کر اس آئینے میں اپنا عکس دیکھتی تو سالار بھی اس کے قریب کھڑا ہو جاتا۔ وہ اب بھی آئینے میں اس کا عکس دیکھ کر مبہوت رہ جاتا۔

ارما مسکراتی، اسے یوں لگتا وہ شاید سنو وائٹ کی کہانی جیسا آئینہ تھا جس میں وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی کا عکس دیکھ پاتی تھی۔ وہ خوش تھی اور خوشیوں کی برسات نے اسے سیراب کر دیا تھا۔

اس دن اس کی آنکھ صبح، صبح ہی کھل گئی۔ باغ میں صبح کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ خوبانی کے درخت کی شاخوں میں چھپے پرندے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف تھے۔ پھولوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ کندھوں پر شال پھیلائے باہر آئی۔ پہاڑی علاقوں کی صبح کتنی خوب صورت ہوتی ہے۔ صبح تو ہر جگہ کی حسین ہوتی ہے، ہم لوگ نیند کے آرام میں صبح کی خوب صورتی اور حسن کو بھول جاتے ہیں۔

وہ دور پہاڑوں پر پھیلی روشنی کی کرنوں کو دیکھتے ہوئے باغ میں چلی آئی۔ نیلے آسمان پر بادلوں کا ڈیرا تھا اور ٹھنڈی ہوا میں تازگی کا احساس تھا۔ ایک رنگ برنگی تتلی جنگلی پھولوں کے گرد چکر لگا رہی تھی اور دور کہیں چشمے سے پانی گرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے جھولے پر بیٹھ گئی۔

''آج اتنی جلدی اٹھ گئیں ہے'' اسے اپنی پشت پر سالار کی آواز سنائی دی پھر وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ گیا۔ سرمئی شلوار قمیص میں ملبوس سر پر چترالی ٹوپی پہنے وہ یہاں کا لوکل باشندہ لگ رہا تھا۔

''ہاں آج میری آنکھ اتفاقاً ہی جلدی کھل گئی۔ شاید میں یہاں کے لائف اسٹائل کی عادی ہو رہی ہوں۔'' وہ آہستگی سے جھولا لیتے ہوئے مسکرائی۔

''یہاں سے ذرا فاصلے پر میں نے زمین خریدی ہے اور ہم وہاں ایسا ہی لکڑی کا کاٹیج بنائیں گے اور گرمیوں میں چھٹیاں گزارنے وہاں آیا کریں گے۔ ایسا ہی جنگلی پھولوں سے بھرا خوب صورت باغ ہوگا جہاں پرندے، تتلیاں اور جگنو بھی رہتے ہوں گے۔''

''واقعی؟'' وہ حیران اور خوش ہوئی۔ یہ اس کے لیے ایک خوشگوار سرپرائز تھا۔

''ہاں اور وہ گھر میری طرف سے تمہارے لیے شادی کا تحفہ ہوگا۔'' وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گہرے لہجے میں بولا۔

ارما نے چونک کر اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ وہ اسے گھر دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ زمین خرید چکا تھا گھر کا آرکیٹیکچر بھی سوچ چکا تھا اور اس پر کام بھی شروع کرنے والا تھا۔

محبت کا اظہار کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں، گھر دینے والا کروڑوں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے۔ ارما کو ہمیشہ سے ایک گھر کی خواہش تھی۔ ملتان والا گھر اس کے سوتیلے ابو کا تھا، ان کے بعد ازمیر کا ہوتا، لاہور والا گھر نانی کا تھا۔ وہ دونوں گھروں کی مسافر بن گئی تھی۔ لوگ اسے حق دار نہیں سمجھتے تھے اسی لیے تو اس پر سو، سو اعتراضات کیا کرتے۔ یہ اس کی وہ خواہش تھی جو اس نے ازمیر اور عائلہ سے بھی شیئر نہیں کی تھی مگر رب تو جانتا تھا۔ حکم بھی اسی کا چلتا ہے..... کیا خواہشیں یوں بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں بن کہے، بن سوچے..... یک دم..... اچانک..... وہ حیران تھی..... خوش بھی..... اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر وہ مسکرا رہی تھی۔

سالار نے گلابی رنگ کا پھول توڑ کر اس کے بالوں میں لگایا۔ تاریکی میں چھپ، چھپ کر رونے والی لڑکی صبح کے چمکتے اجالوں میں مسکرا رہی تھی۔ سالار نے اس کی پلکوں میں اٹکے آنسو کو انگلی کی پور سے چھوا۔

''میں اب کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا ہوں ارما'' اس نے مدھم، بھاری اور جذبات سے بوجھل آواز میں کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

ہاں شاید یہ پریوں کا دیس تھا جہاں اس نے اپنے شہزادے کو پا لیا تھا۔

اس نے اپنے بالوں میں لگے پھول کو چھوتے ہوئے مسکرا کر سالار کو دیکھا۔ وہ بھی وارفتگی سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مہکتی ہوا بھی گنگنائی اور اردگرد روشن اجالے بھی مسکرا دیے۔

(ختم شد)

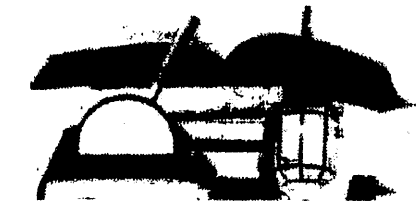

شمع ہدایت

اختر شجاعت

حُبِ مال...... آزمائشِ الٰہی

تمام تر حمد و ثنا صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے لیے ہے۔ ہم اسی کے نام سے ابتدا کرتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں...... اللہ تعالیٰ نور ہے، آسمانوں اور زمین کا...... جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔

میرا رب جو مالکِ الملک اور فضل و کمال والی ذات ہے۔ نعمتوں کے عطا کرنے والی ذات ہے۔ جو تعریف اور بڑائی کا حقیقی حقدار ہے۔

وہ عظیم رب تعریف کرنے والوں کی تعریف سے بالاتر ہے اسی کے لیے شکر اور اسی کے لیے فضل و کمال اور اسی کے لیے تعریف کہ وہ آسمانوں اور زمین اور ان میں رہنے والوں کا رب ہے۔

ہم اس عظیم رب کے پیارے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں کہ انہوں نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ ہمیں ہمارے رب کی پہچان کرائی اور اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔

درود و سلام پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؓ پر اور ان کے اصحابؓ پر......

آج ہمارا موضوع حُبِ مال ہے یعنی مال کی محبت...... جس کے لغوی معنی ہیں، دھن، دولت، جائداد سوداگری کی چیزیں، مویشی، لذیذ کھانا، قیمتی طعام وغیرہ......

دنیا کے فتنے انتہائی وسیع اور لاتعداد ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا فتنہ مال ہے۔ کوئی شخص مال سے بے نیاز نہیں رہ سکتا اگر مال حاصل ہو جائے تو اس کی آفات سے محفوظ رہنا بھی بڑا دشوار ہے۔ مال سے محروم ہونا فقر ہے اور مال دار ہونا سرکشی کا باعث ہے جس کا انجام خسارے اور نقصان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تو مال میں فوائد بھی ہیں اور آفات بھی...... لہٰذا ان کی معرفت ضروری ہے تاکہ اس سے بچنے اور فائدے کے موافق اس کی جستجو یعنی کوشش کرے۔

مال کی کمی باعث تکالیف اور ذلت ہے اور اس کی کثرت وجۂ فتنہ ہے۔ اس لیے اسلام نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔ یعنی ضرورت کے مطابق مال حاصل کیا جائے جو بچ جائے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ اس طرح انسان کی دنیا اور آخرت مال کے فتنوں سے محفوظ رہے گی۔ مال و دولت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے اگرچہ ایک بڑی اہم نعمت ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانی زندگی کی گزر اوقات ناممکن ہے مگر اس کی کثرت اللہ تعالیٰ سے غفلت پیدا کرتی ہے اور بڑے، بڑے گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس لیے صوفیا نے اللہ تعالیٰ کا راستہ اختیار کرنے کے لیے مال کی کثرت کے فتنوں سے بچنے پر بہت زور دیا ہے کیونکہ بہت زیادہ مال کو پا کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے مطابق خرچ کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی نہ کسی بات سے انسان اصل راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے طالبوں نے صرف اتنے مال پر اکتفا کیا جس سے کھانا پینا، لباس اور رہائش کی گزر اوقات ہو سکے کیونکہ ان کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے مگر مال کی کثرت خطرات سے خالی نہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''سو اس سے نہ ہوسکا کہ گھاٹی میں داخل ہوتا اور کیا سمجھا کہ گھاٹی ہے کیا کسی گردن (غلام، کنیز) کو آزاد کرانا یا بھوک والے دن کھانا کھلانا۔'' (سورۂ بلد)

مال کا فتنہ سب سے عظیم ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کا نام عقبہ رکھا ہے۔ عقبہ کا مطلب دشوار گزار راستہ ہے جو بلندی کی طرف پہاڑوں سے ہوتا ہوا جائے تو عقبہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی جس میں مال کی کثرت ہو وہ بڑی دشوار گزار ہے۔ صاحبِ حیثیت ہو کر اپنے آپ کو عیش و عشرت سے بچانا بڑا مشکل کام ہے۔ ایسے میں مال کی کثرت گناہوں میں مبتلا کر دیتی ہے غرضیکہ مال دشوار گزار گھاٹی کے مانند ہے جو اس کی آزمائش سے بچ کر نکل جائے وہی بلندی پر پہنچ جائے گا۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کریں گے وہ لوگ بڑے ہی خسارے میں ہیں۔'' (سورۂ منافقون)

مال اور اولاد یادِ الٰہی سے غفلت کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے اولاد کی طرف حد سے زیادہ رغبت کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ (ہاں اس کی شرعی احکام کے مطابق تربیت بے حد ضروری ہے)

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''زیادتی کی چاہت (لالچ) نے تمہیں غافل کر دیا...... یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے...... پس عنقریب جان لو گے۔'' (سورۂ تکاثر)

دنیا نے مال و دولت کو بڑھانے کے لالچ نے انسان کو نیک اعمال سے غافل کر رکھا ہے حتیٰ کہ اسی لالچ اور ہوس میں انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اسے موت آ جاتی ہے اور وہ قبرستان پہنچ جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ دنیادار کی پہچان یہ ہے کہ دنیادار مال اور اولاد کی کثرت کی ہوس میں موت تک کو بھول جاتا ہے۔ اللہ کی معرفت صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جو مال کے لالچ کو دل سے نکال پھینکتا ہے۔ کیونکہ مال کی ہوس انسان میں حلال و حرام کی تمیز ختم کرا دیتی ہے۔

دولت کا لالچ انسان کی عاقبت کو تباہ کر دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ......

''بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا، غیبت کرنے والا ہو جو مال کو جمع کرتا جائے اور گنتا جائے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا...... ہرگز نہیں، یہ تو ضرور توڑ پھوڑ دینے والی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔'' (سورۂ ھمزہ)

مال و دولت کو جمع کر کے رکھنا تاکہ کثرت رہے حکمِ الٰہی کے سراسر خلاف ہے۔ انسان کی یہ سوچ کہ مال ہمیشہ اس کے پاس ہی رہے گا یہ اس کی خام خیالی ہے کیونکہ دولت ہمیشہ کسی ایک کے پاس نہیں رہتی، یہ بھی آگے چلی جاتی ہے لہٰذا جو چیز آگے چلی جائے اسے لالچ کے ساتھ جمع کرنا صوفیا کی سوچ کے منافی ہے۔ یہی بہترین سوچ ہے کہ ضرورت کے مطابق لے لو اور اگر زیادہ دولت مل جائے تو اسے اللہ کی راہ میں دے دو...... کیونکہ کثرتِ مال باعث عذاب ہوگا۔ مرنے کے بعد قیامت تک یعنی عالم برزخ میں بھی عذاب ہوگا اور قیامت کے بعد بھی جہنم کا عذاب ہوگا۔

جو لوگ اللہ کی تعالیٰ کی مرضی کے خلاف دولت کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے وہ اپنے لیے خود عذابِ الٰہی خریدتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام میں بھی خرچ نہیں کرتے، انہیں بلاشبہ جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عذاب سے بچائے۔ آمین!

مال و دولت سے اللہ تعالیٰ کی ''رحمت'' بہت بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ایسی بھی ہیں جو دولت سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ خاص کر اللہ تعالیٰ کا روحانی فضل و کرم یہ ایسی خاص رحمت ہے کہ اللہ جسے چاہے عطا کرے وہ مال و دولت سے اسے نہیں خرید سکتا۔

☆☆☆

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ''مال و جاہ کی محبت دل میں نفاق کو اس طرح نشوونما دیتی ہے جس طرح پانی سبزی کو......''

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ”دو بھوکے بھیڑیے، بکریوں کے ریوڑ میں ایسی تباہی نہیں مچاتے جتنا مال و جان کی محبت مردِ مومن کے دین میں تباہی مچاتی ہے۔“

ارشاد فرمایا کہ ”دنیا کو اہلِ دنیا کے پاس چھوڑ دو جو کوئی اس کو اپنی ضرورت سے زیادہ لے گا وہ اس کی ہلاکت کا باعث بنے گی اور اس کو خبر بھی نہیں ہوگی۔“

کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں کیا کروں کہ میرے پاس کسی طرح کا زاد...... آخرت نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... تمہارے پاس مال ہے؟ انہوں نے کہا ہاں..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... تم اس کو اپنے آگے بھیج دو یعنی صدقہ کردو کہ انسان کا دل مال کے ساتھ لگا رہتا ہے اگر اس نے مال کو چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں رہے اس کے لیے ذخیرۂ آخرت بن سکے گا...... اور صدقہ وخیرات سے اپنے آگے بھیج دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے پاس رہے گا۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہر امت کے لیے آزمائش کے لیے کوئی چیز ہوتی ہے اور میری امت کی آزمائش کی چیز مال ہے۔“

”جب کسی قوم پر دنیا کی دولت وسیع ہوئی تو اس میں بُغض وعداوت کا بیج ڈال دیا گیا۔“

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”عنقریب تمہارے بعد ایک قوم آنے والی ہے جو دنیا کی خوش رنگ نعمتیں کھائیں گے، خوش قدم گھوڑوں پر سوار ہوں گے، بہترین حسین عورتوں سے نکاح کریں گے، بہترین رنگوں والے کپڑے پہنیں گے، ان کے معمولی پیٹ کبھی نہیں بھریں گے۔ ان کے دل کثیر دولت پر بھی قناعت نہیں کریں گے صبح وشام دنیا کو معبود سمجھ کر عبادت کریں گے، اسے اپنا رب سمجھیں گے اسی کے کاموں میں مگن اور اسی کی پیروی میں گامزن رہیں گے جو شخص ان لوگوں کے زمانے کو پائے اسے میں محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وصیت ہے کہ وہ انہیں سلام نہ کرے۔ بیماری.... میں ان کی عیادت نہ کرے ان کے جنازوں میں شامل نہ ہو اور ان کے سرداروں کی عزت نہ کرے اور جس شخص نے ایسا کیا اس نے اسلام کو مٹانے میں ان سے تعاون کیا۔“

ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کے بدترین امتی کون لوگ ہیں؟ فرمایا..... ”اہلِ مال و دولت......“

ارشاد فرمایا۔ ”انسان میرا مال، میرا مال کرتا ہے، تمہارے مال سے وہ جو تم نے کھالیا وہ جبھی ختم ہو گیا اور پہن لیا وہ پرانا ہو گیا اور جو راہِ خدا میں خرچ کیا وہی باقی رہا۔ اور یہی تمہارا ہے..... باقی تو اولاد یا پیچھے رہنے والے جیسے چاہے استعمال کریں گے۔“

جب دینار ودرہم کے سکے بنائے گئے تو ابلیس نے ان کو آنکھوں سے لگایا اور بوسہ دیا اور کہا ”جو تجھے پیار کرے گا اور محبوب رکھے گا وہ میرا غلام ہے۔“

☆☆☆

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ پانی پر چل سکتے ہیں، ہم میں یہ طاقت وقدرت نہیں اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ مال وزر تمہاری نظر میں کیسا ہے؟ انہوں نے کہا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اور میری نظر میں خاک وزر دونوں برابر ہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے پانی پر چلنے کی قدرت وقوت عطا کی ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ”انسان اس وقت تک صالح نہیں ہوتا جب تک اس کے نزدیک سونا اور مٹی یکساں نہ ہو جائے۔“

حضرت علیؓ ایک درہم دست مبارک پر رکھ کر فرمانے لگے کہ ”اے درہم! تو وہ چیز ہے کہ جب تک میرے پاس سے نہیں جائے گا مجھے کسی قسم کا نفع نہیں پہنچا سکتا۔“

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا قول ہے کہ ”روپیہ، پیسہ

بچھو ہیں اگر تمہیں اس کے کاٹے کا منتر نہیں آتا ہو تو اسے ہاتھ نہ لگاؤ اگر اس نے تجھے ڈنک مار دیا تو اس کا زہر تجھے ہلاک کر دے گا۔'' پوچھا گیا کہ پھر اس کا منتر کا کیا ہے؟ آپؒ نے فرمایا۔'' حلال طریقے سے کمانا اور صحیح کام میں خرچ کرنا۔''

حضرت محمد بن کعب القرظیؒ کو کہیں سے بہت سی دولت مل گئی۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپؒ اپنی اولاد کے لیے کچھ جمع کر دیجیے..... آپؒ نے فرمایا۔'' میں اسے اپنے لیے اللہ کے پاس جمع کروں گا اور اپنے رب کو اپنی اولاد کے لیے چھوڑ جاؤں گا۔''

☆☆☆

ایک بزرگ لکڑیاں خریدنے جا رہے تھے راستے میں مسجد آئی اذان ہوئی تو آپ فوراً مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ مسجد کے راستے میں ایک تھیلی اشرفیوں کی پڑی دکھائی دی۔ ان بزرگ نے سوچا کہ اس کی طرف توجہ کرنے سے نماز میں حرج ہو گا۔ تکبیر اولیٰ رہ جائے گی، یہ شیطانی رکاوٹ ہے لہٰذا آپ تیز، تیز قدم اٹھاتے مسجد میں چلے گئے۔ نماز پڑھی اور نماز کے بعد لکڑیاں خرید کر گھر کی راہ لی۔ راستے میں اس مال کا ان کو خیال تک نہیں آیا۔ جب مکان میں پہنچے اور لکڑیاں کھول کر ڈالیں تو وہی اشرفیوں کی تھیلی آپ کی لکڑیوں کے اندر سے برآمد ہوئی۔ سخت حیران ہوئے اور حیرت سے بولے'' یا الٰہی! یہ تھیلی کہاں سے آئی؟'' آواز آئی'' تو نے ہمارے لیے دنیا کو چھوڑا ہم نے تیرے لیے تھیلی کو لکڑیوں سے باندھ دیا۔'' سبحان اللہ۔

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ ایک رات تہجد کی نماز پڑھ کر سوئیں خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا درخت ہے۔ جس کی خوشبو پاکیزہ اور پھل۔ سورج اور چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ حیرت سے پوچھا کہ یہ کس کا درخت ہے؟ جواب ملا کہ یہ آپ کا ہی ہے اور یہ آپؒ کی نماز تہجد کا ثواب ہے۔ یہ سن کر آپ اس درخت کے نیچے تشریف لے گئیں پھر جو دوبارہ نظر اٹھا کر درخت کی طرف دیکھا تو سارے پھل درخت کے نیچے گرے پڑے نظر آئے۔ افسردہ ہو کر فرمایا..... کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ پھل درخت پر لگے رہتے۔ جواب ملا یہ پھل درخت پر لگے ہوئے تھے لیکن آپ کی وجہ سے نیچے گر پڑے۔ وجہ یہ ہے کہ رات کو نماز تہجد پڑھتے ہوئے عین نماز کے اندر یہ خیال آیا تھا کہ وہ جو آٹا میں نے گوندھ کر رکھا ہے خدا جانے وہ خمیر ہو گیا یا نہیں..... بس اس خیال کے آتے ہی سارے پھل درخت سے نیچے گر گئے..... (ذرا سا خیال دنیا کا آیا..... ان کو متنبہ کیا گیا کہ دنیا کے امور کا خیال بھی نہ کرو..... سچ ہے جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے)

☆☆☆

حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ ہرات میں تھے ان پر سخت افلاس کا عالم تھا ان کے پاس صرف ایک قبا تھی جو جگہ، جگہ سے پھٹ گئی تھی مگر آپؒ وقت نہایت صبر و شکر سے گزارتے تھے۔ کبھی، کبھی وہ حضرت قاسم تبریزیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے وہ بڑے خدا ترس بزرگ ..... تھے۔ آپ پر بہت شفقت فرماتے اور کہتے کہ اے عبید اللہ! ان شاء اللہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب تیرا افلاس دور ہو جائے گا کچھ عرصے بعد خواجہ احرار تاشقند تشریف لے گئے وہاں ایک زمیندار کے ساتھ شرکت کر کے زراعت کا کام شروع کیا..... اللہ تعالیٰ نے اس کام میں اتنی برکت دی تھی کہ ان کے مزارعین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور ان کی زمین کا عشر ہزاروں من غلہ تک پہنچ گیا۔

اسی زمانے میں حضرت مولانا عبد الرحمن جامیؒ (صاحب نفحات الانس) ان کی زیارت کے لیے تاشقند آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہزاروں من غلہ باہر جا رہا تھا لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ غلہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا ہے۔ یہ جان کر حضرت جامیؒ کے دل میں خواجہ صاحب سے بدظنی پیدا ہو گئی..... کہ میں تو ان کے فقر کا شہرہ سن کر ملنے آیا ہوں مگر یہ تو دولت میں کھیل رہے ہیں چنانچہ انہوں نے واپس جانے کا ارادہ کیا مگر پھر خیال آیا کہ اتنی دور سے آیا ہوں ان سے مل لینے میں کیا حرج ہے اسی خیال کے تحت خواجہ صاحب کی خانقاہ میں پہنچے

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

آپ وہاں موجود نہ تھے..... مولانا جامیؒ بہت تھکے ہوئے تھے لہٰذا خواجہ صاحب کے انتظار میں لیٹ گئے اور بہت جلد نیند کی آغوش میں پہنچ گئے خواب میں دیکھا کہ حشر کے میدان میں ہیں اور ایک شخص ان سے اپنا قرض مانگ رہا ہے لیکن ان کے پاس کچھ نہ تھا چنانچہ وہ ان کو دوزخ کی طرف گھسیٹنے لگتا ہے..... اسی دوران خواجہ احرارؒ تشریف لاتے ہیں اور ان کا قرض اپنی جیب سے ادا کر کے رہائی دلاتے ہیں..... اس کے فوراً بعد مولانا جامیؒ کی آنکھ کھل گئی دیکھا کہ خواجہ عبیداللہ احرارؒ ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ اور فرما رہے ہیں کہ ''میرا مال اسی لیے ہے کہ آپ جیسوں کو قرض سے نجات دلاؤں۔'' مولانا جامیؒ آپ کی بات سن کر ششدر رہ گئے اور اسی وقت آپؒ کی بیعت کر لی۔

☆☆☆

مال میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی..... انسان اگر اس مال کو اپنی عبادت یا ضروریات عبادت میں خرچ کرے۔ جیسے حج اور جہاد وغیرہ..... اور لوگوں پر خرچ کرے جو مستحقین ہیں..... کیونکہ صدقات کا ثواب دین و دنیا دونوں میں بہت ہے۔ اس مال سے لوگوں کے حقوق ادا کرے اور دین کے معاملات میں خرچ کرے۔

اس کے برعکس اس کی آفات زیادہ ہیں۔ کیونکہ مال فسق و فجور اور معصیت میں معاون و مددگار رہوگا۔

مال کی زیادتی ہر حال میں پریشان کن ہے جو اس کو ذکر اللہ سے غافل کرتی ہے۔ اور وہ فکر آخرت سے دور ہو جاتا ہے مگر اللہ کے سچے بندے اسے فتنہ نہیں بناتے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''انسان کی تمام چیزوں پر بڑھاپا آتا ہے لیکن اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں۔

1۔ طویل عمر کی آرزو

2۔ مال کی محبت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''آسودہ ہے وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی راہ دکھلائی اور بقدر حاجت اس کو مال دیا اور اس نے اس مال پر قناعت کی۔''

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''خدا کی قسم..... جو مال و زر کو عزیز رکھے گا حق تعالیٰ اس کو ذلیل و خوار کرے گا۔''

مال ایک ایسی آفت اور آزمائش ہے کہ بس وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچائے بہر حال انسان گناہوں سے بچے۔ مشتبہ مال سے محفوظ رہے۔ حقیقت میں پارسا وہ ہے جو حلال مال حاصل کرتا ہے اور اسے راہ خدا میں خرچ کرتا ہے..... اور یہ کس میں قدرت ہے کہ دولت مندی میں جو کی روٹی کھائے اور موٹا کپڑا پہنے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سلطنت اور بادشاہت کے باوجود بہت معمولی اور موٹا کپڑا پہنتے اور بہت ہی معمولی غذا استعمال کرتے تھے۔

☆☆☆

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک بار ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کی خدمت میں کچھ رقم بھیجی۔ انہوں نے پوچھا یہ کیسی رقم ہے؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے آپ کی خدمت میں رقم بھیجی ہے آپؓ بولیں۔ ''اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحمت فرمائے۔'' پھر ایک پردہ لے کر اس کے ٹکڑے کر کے تھیلیاں بنائیں اور وہ تمام رقم ان تھیلیوں میں ڈال کر تمام کی تمام رشتے داروں اور یتیموں میں تقسیم کر دیں اور پھر ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی..... اے اللہ..... ! آئندہ سال میرے پاس حضرت عمرؓ کی ایسی ہی رقم (عطیہ) نہ ملے۔'' چنانچہ ازواج مطہرات میں آپؓ کے پردہ فرمانے کے بعد سب سے پہلے حضرت زینبؓ ہی فوت ہوئیں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔ بخدا جو شخص مال کی عزت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کرتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا۔ ایک دولت مند شخص ہمیشہ فقیروں کو اپنا مال دیا کرتا تھا جو علم اور خدمت خلق میں مشغول رہتے تھے کچھ عرصے بعد وہ شخص خود محتاج ہو گیا جب حضرت جنیدؒ نے سنا تو اپنا مال اس کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ یہ شخص مستحق لوگوں کو بلا قیمت اپنا

مال دیتا تھا تو اسے اس تجارت (دینی راہ میں) میں نقصان نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

جو شخص دنیا کو قدرت کفایت سے زائد لیتا ہے وہ گویا غیر شعوری طور پر اپنی موت کو آواز دیتا ہے..... زائد مال لینا خطرے سے خالی نہیں ہے اسی لیے انبیائے کرام نے مال کے شر سے پناہ مانگی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے کہ ''اے اللہ.....! تو آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روزی بقدر کفایت کر۔''

ایک اور دعا..... ''اے اللہ! مجھے مسکین زندہ رکھ مسکینی کی حالت میں موت دے اور مساکین کے زمرے میں اٹھا۔''

غور کیجیے کہ مال کتنی بڑی آزمائش ہے تو اس مال کو زہر قرار دیا گیا ہے اور تریاق صرف اسی صورت میں ہے کہ اسے گزر بسر کا ذریعہ سمجھا جائے۔ اور زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

''اے ابو ہریرہ.....! جب تجھے بھوک زیادہ ستائے تو ایک چپاتی کھالے اور ایک پیالہ پانی پی لے دنیا پر لعنت بھیج۔''

حضرت محمد بن الواسعؒ خشک روٹی پانی سے بھگو کر کھالیا کرتے تھے..... اور کہا کرتے تھے کہ ''جو اس رزق پر قناعت کرے گا وہ کسی کا محتاج نہیں ہوگا۔''

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ''تمہاری دنیا اس وقت تک بہتر ہے جب تک تم اس میں مبتلا نہ ہو اور جس چیز میں تم مبتلا ہو وہ اتنی ہی بہتر ہے جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ فرشتہ ہر روز یہ اعلان کرتا ہے کہ ''اے ابن آدم! تھوڑی چیز بقدر کفایت ملنا اس سے بہتر ہے کہ زیادہ ملے اور تجھے سرکش بنا دے۔''

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''جو شخص میانہ روی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مالدار کرتا ہے جو فضول خرچی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے محتاج کر دیتا ہے اور جو اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔''

☆☆☆

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی ساری زندگی فقر و فاقہ میں بسر کی کبھی اعلیٰ رہائش یا خوراک کی خواہش نہیں کی۔ جو مل گیا اسی پر گزر اوقات کر لی۔ ایک بار بنو ثقیف کا ایک شخص حضرت علیؓ کے پاس ظہر کے وقت آیا تو آپؓ کے پاس کوئی دربان نہ پایا جو اس کو روکتا..... اس نے دیکھا کہ آپؓ کے پاس ایک پیالہ اور ایک کوزہ پانی کا تھا اس کے بعد ایک چھوٹی سی تھیلی منگوائی اس تھیلی پر مہر لگی ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ نے اس مہر کو توڑا اس میں ستو تھے وہ پیالے میں الٹے اور اس پر پانی ڈالا خود پیا اور مجھے پلایا..... یہ دیکھ کر مجھے صبر نہ ہوا اور بالآخر میں نے ان سے کہہ ہی دیا کہ اے امیر المومنین.....! آپؓ ایسا کام اور عراق میں کرتے ہیں؟ حالانکہ عراق کا کھانا بہت بڑھیا ہے۔''

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''تجھے معلوم ہونا چاہیے..... خدا کی قسم.....! میں نے اس تھیلی پر مہر بخل کرنے کی وجہ سے نہیں لگائی لیکن میں اتنی مقدار خرید لیتا ہوں جو میرے لیے کفایت کرے مجھے ڈر رہتا ہے کہ کہیں رل مل جائے تو اس تھیلی کے علاوہ دوسری تھیلی سے کہیں ستو تیار نہ کیا جائے؟ یہ کام میرا شدتِ احتیاط کی وجہ سے ہے کہ جو بھی کھانا میرے پیٹ میں داخل ہو وہ مال طیب ہو۔''

☆☆☆

آیئے اب ذرا ہم اپنا تو جائزہ لیں کہ ہمارے معاملات .... مال کی محبت اور مال کی ہوس میں کس حد تک گرفتار ہیں؟ اس معاشرے کا ہر فرد اوپر سے لے کر نیچے تک مال کی محبت میں پور، پور ڈوب چکا ہے۔

اس مال کی محبت نے ہمارے ضمیر کو اتنا سلا دیا ہے کہ جائز اور ناجائز کا فرق تو ختم کر ہی دیا ہے بلکہ ہم اخلاقی لحاظ سے بھی گراوٹ کی انتہا پر پہنچ چکے ہیں..... ایسے، ایسے دلخراش اور تکلیف دہ معاملات ہمارے سامنے آرہے ہیں کہ جھوٹ، فریب، دھوکا دہی، ڈاکا زنی، زنا کاری، لوٹ مار، معصوم بچیوں سے زیادتی کے کیسز..... اور کون سا فعل بد ہے جو ہمارے معاشرے میں موجود نہیں؟ ہم کون سی دنیا میں رہ رہے ہیں؟ کس، کس چیز کا رونا روؤں.....؟ یہاں صرف ایک ہی چیز کا ذکر کرتی ہوں اور وہ ہے کورونا جیسی خطرناک جان لیوا وبا..... اس وبا میں ہم اپنا کردار دیکھیں..... ! شرم سے سر جھک جائے گا ہم نے تو اس وبا کو بھی کیش کیا ہے۔ ایسے جیسے ہمیں تو موت آنی نہیں، ہم تو عمر خضر لے کر آئے ہیں..... منافع خوری کی لعنت نے ہمارے وجودوں کو تعفن زدہ کر دیا ہے۔ ایک ماسک کی قیمت دیکھ لیں آکسیجن سلنڈر، انجکشن کی قیمت، اسپتال کے اخراجات..... اور تو اور ہم نے تو پلازما تک کیش کر لیا..... افسوس صد افسوس..... ! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان چیزوں کی قیمت کم کر دیتے۔ (مگر یہاں ایسے کردار کے لوگ کہاں؟) تو ان کی قیمت کم نہیں کر سکتے تھے تو اس پر حد درجہ منافع تو نہ کماتے غور کیجیے ہم کون لوگ ہیں؟ مسلمان تو ہرگز، ہرگز نہیں..... کیونکہ ایک مسلمان کے لیے میرے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو فرامین ہیں ہم تو کہیں بھی اس پر پورا نہیں اترتے۔ ہم تو دینی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے پستیوں میں گر چکے ہیں اور یہ صرف اور صرف مال کی چمک دمک نے ہمیں ایسا کر دیا ہے۔

دوسری اقوام کو دیکھیں انہوں نے اس وبا میں کیسے، کیسے اعلیٰ طریقوں سے اپنے لوگوں کی مدد کی ہے مالی بھی اور اخلاقی بھی..... اور ہم دیکھیں کہ کیسے، کیسے طریقے سے ہم نے اپنے لوگوں کو لوٹا ہے؟

یاد رکھیں گھڑی کی ٹک، ٹک آپ کی عمر عزیز کم کرتی جارہی ہے اس لیے غفلت کا پردہ آنکھوں سے اتار دیں کہ یہ جگہ محض ایک مسافر خانہ ہے چند گھڑیوں کے قیام کے بعد آپ کو اپنے اصل وطن کی طرف لوٹنا ہے۔ اپنا مال، دولت، بنگلے کوٹھیاں اور جائداد اور اپنی پیاری اولاد کو چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اس وقت..... مال اور جائداد کسی کے کچھ کام نہیں آئے گی، بلکہ آخرت میں ان کا حساب دینا..... وبال بن جائے گا کیونکہ آپ کی قبر اور آخرت کے ساتھی صرف اور صرف آپ کے اعمال ہوں گے..... اگر اعمال نیک ہوئے تو آخرت میں سرخرو ہو جاؤ گے اور برے ہوئے تو آخروی زندگی برباد ہو جائے گی اور دردناک عذاب سب کا مقدر ہوگا..... بیوقوف ہے وہ شخص جو اپنی قبر اور آخرت بھول بیٹھتا ہے۔

تو اے لوگو! اچھے عمل کرو..... اللہ سے ڈرتے رہو آرزو سے فریب مت کھاؤ..... موت کو نہ بھولو، مال وزر کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے رب کو نہ بھول جاؤ..... اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور بے ہوشی کا لبادہ اتار کر اپنے رب کی رضا تلاش کرنے میں لگ جائیں جو اس کی مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے میں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مال کی محبت سے بچا کر اپنی محبت میں مبتلا کر دے، آمین کہ حقیقی مومن تو صرف اپنے اللہ کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے۔

حرف آخر:

اپنے اللہ کریم کی بارگاہ میں ندامت بھرے دل کے ساتھ دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی، دانستہ یا نادانستہ کی..... کوتاہی ہوگئی ہو تو اللہ کریم مجھے معاف فرمادے کہ بے شک میرا رب اپنے بندوں کو معاف کرنا پسند فرماتا ہے، آمین۔ ان تمام قابلِ احترام ہستیوں کی شکر گزار ہوں جن کی کتب سے میں نے مضامین کا انتخاب کیا..... اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

پاکیزہ کے مہمان

شائستہ زریں

بلند عزم اور روشن عمل کی علامت 'کھانا گھر کی بانی

پروین سعید

قارئینِ کرام! السلام علیکم

اس امر سے تو ہم سب ہی واقف ہیں کہ خبر چھوٹی ہو یا بڑی عام نظر سے گزرے تو محض خبر رہتی ہے لیکن جب یہی خبر صاحبِ دل کی نظر سے گزرے تو صرف خبر نہیں رہتی ''بصر'' بن جاتی ہے۔ دل کی روشن آنکھوں سے پڑھی جانے والی یہ ''چھوٹی سی خبر'' ...... ''خیر'' کی راہ دکھا کر ایک نہیں کئی انسانوں کی فلاح کا سبب بن جاتی ہے۔ ماہِ رواں کی ہماری پاکیزہ کی مہمان پروین

سعید کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ ایک چھوٹی سی خبر آپ کی زندگی میں بڑا انقلاب لے کر آئی۔ اخبار میں ایک خبر پروین سعید کی نظر سے گزری ''ایک ماں نے اپنے بچوں کا قتل کر دیا۔'' ایک ماں اپنے ہاتھوں اپنے جگر گوشوں کا خون کیسے کر سکتی ہے؟ یہی سوال آپ کو اس ماں کی دہلیز تک لے گیا۔ جب اس بے بس ماں نے جواباً کہا کہ ''جب تمہارے بچے بھوکے ہوں گے تب تم بھی اپنے بچوں کو ایسے ہی ختم کر دو گی۔'' یہ سن کر پروین سعید کا دل پارہ، پارہ ہو گیا۔ ''کیا بھوک ایسی خطرناک چیز ہے جو ماں کی محبت کو مار دیتی ہے؟'' قدرت نے پروین صاحبہ کو ایسا حساس دل عطا کیا ہے جو اوروں کے دکھ، تکلیف اور پریشانیوں پر تڑپ اٹھتا ہے اُن کے قلب کی یہی کمزوری محض ان کے قلب و ذہن ہی کی نہیں خود اُن کی بھی بہت بڑی طاقت بن گئی اور اس نے پروین صاحبہ سے وہ کام کروالیا جو خود اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بھوک، افلاس اور معاشی تنگی میں مبتلا حاجتمندوں کی بیچارگی کو آپ نے نہ صرف پوری توانائی کے ساتھ محسوس کیا بلکہ اس مسئلے کا حل نکال کر عملی طور پر اپنی انسان دوستی کا ثبوت بھی پیش کیا۔ یوں پاکیزہ کی مہمان پروین سعید نے ۲۰۰۲ء میں ''کھانا گھر'' کی بنیاد رکھی۔ اللہ کے کرم سے آپ کا لگایا ہوا چھوٹا سا پودا تناور درخت بن چکا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ، ساتھ نہ تو پروین سعید کے شوق میں کوئی کمی آئی اور نہ ہی جذبۂ عمل متاثر ہوا۔ یہی سبب ہے کہ تقریباً دو عشروں سے اپنے شریکِ حیات کے... بھرپور تعاون سے کامیابی سے کھانا گھر چلا رہی ہیں۔

آیئے ان سے مزید تفصیلات جانتے ہیں۔

پاکیزہ ✧.....آپ کا بچپن کیسا گزرا؟

پروین سعید ❖.....میرا بچپن عام پاکستانی بچوں کی طرح ہی گزرا لیکن میں گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بہت چہیتی تھی۔ ایک بہن اور دو بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ میرے نخرے زیادہ اٹھائے جاتے تھے یوں بچپن بہت خوب صورت اور بھرپور گزرا۔ اسکول میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تقریریں کیں، ڈراموں میں حصہ لیا۔ تفریح بھی خوب کی۔ گڑیاں کھیلیں، پتنگ اڑائی، سائیکل چلائی۔ سارے لڑکوں والے کام کیے۔ گلی ڈنڈا بھی کھیلا، مزہ بھی آتا تھا ان کھیلوں میں۔

پاکیزہ ✧.....آپ کا شمار کیسے بچوں میں ہوتا تھا؟

پروین سعید ❖.....بے حد شرارتی لیکن اوروں کا خیال رکھنے والی بچی تھی۔

پاکیزہ ✧.....نوعمری کا وہ مشغلہ جو آج بھی اختیار کیے ہوئے ہیں یا اسے آج بھی جاری رکھنے کو جی چاہتا ہے؟

پروین سعید ❖.....نوعمری میں تقریریں کیں، بہت سہیلیاں بنیں ہم مل کر پارٹیز کرتے تھے۔ اسکول کی دوستوں کا ایک گروپ ہے جو آج تک ہے۔ زندگی کو انجوائے کیا.....لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ زندگی کے آخری حصے میں زندگی انجوائے نہیں ہوتی بلکہ وہ لوگوں کے دکھ کو محسوس کرتی ہے۔ الحمدللہ نوعمری میں آرٹیکلز لکھے پھر کالج میں آرٹیکلز لکھے۔ میگزین سکریٹری رہی، صحافت کی تعلیم کے دوران بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور بچپن کا یہ شوق آج تک جاری ہے۔ میرے والدین بتاتے ہیں کہ مزاجاً بچپن ہی سے اوروں کے کام آنے والی تھی۔ لوگوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھتی تھی۔ ان کے لیے اچھا سوچتی اور اچھا کرتی تھی اور آج تک میرا یہ عمل جاری ہے۔ الحمدللہ کھانا گھر اس کی بہترین مثال ہے۔

پاکیزہ ✧.....ایم اے کی سند کے لیے شعبۂ صحافت کا انتخاب کیوں کیا؟

پروین سعید ❖.....بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اور لکھنے کی صلاحیت بھی تھی۔ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی تو پہلی کہانی چھپی تھی، لوگوں نے بہت تعریف کی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ صلاحیت ہے میرے اندر تو پھر لکھنے کا شوق بھی بڑھا۔ لڑکیاں ڈاکٹر، انجینئر بننے کی بات کرتی تھیں میں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے کہ بہت بڑی صحافی بن کے صحافت کی دنیا میں اپنا

نام پیدا کروں گی۔ گویا صحافت پڑھنا اور صحافی بننا میری ہمیشہ سے خواہش تھی۔ اس خواہش کی تکمیل بھی ہوئی۔ میں نے جامعہ کراچی سے صحافت میں فرسٹ کلاس سے ایم اے کیا۔ لیکن اس کی تعمیل نہ ہوسکی۔ یعنی میں اس کو اپنے پروفیشن کا حصہ نہ بنا سکی کہ اللہ نے میرے لیے اور ہی راہ منتخب کردی تھی۔

پاکیزہ ✧..... کبھی جی نہیں چاہا لکھنے کو؟ آپ کے اندر کی قلم کار ستاتی تو بہت ہوگی؟

پروین سعید ❖..... جی بھی چاہا اور لکھا بھی۔ ایکسپریس اخبار میں کالم لکھتی تھی۔

پاکیزہ ✧..... کالم نگاری کے لیے عموماً آپ کیسے موضوعات کا انتخاب کرتی تھیں؟

پروین سعید ❖..... ملکی اور بین الاقوامی سیاست میرے خاص موضوعات تھے۔ دنیا میں ہونے والے واقعات اور سیاست پر لکھنا مجھے ہمیشہ اچھا لگا اور لوگوں نے سراہا بھی بہت۔

پاکیزہ ✧..... ''کھانا گھر'' کا قیام دل کی لگی کا نتیجہ ہے یا دماغ کی تحریک کا؟

پروین سعید ❖..... کھانا گھر بنیادی طور پر ایک ایسا عمل ہے جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اللہ نے اس کو میرے لیے لکھ دیا۔ اپنی عطا کردہ میری نیچر کے عین مطابق۔ اللہ کا شکر ہے، احسان ہے اس نے جس راہ پر چلایا وہی بہترین راہ ہے۔ کھانا گھر سے میری ذاتی دلچسپی رہی ہے لیکن کام کی صورت میں اس کا نام تو میں نے بعد میں رکھا تھا۔

✧..... ''کھانا گھر'' کے لیے ''خدا کی بستی'' کا انتخاب کرنے میں کیا حکمت تھی؟

پروین سعید ❖..... جس وقت کھانا گھر بنانے کا سوچا تھا اس سے پہلے ہی ہم سرجانی ٹاؤن منتقل ہو چکے تھے۔ وہاں رہتے ہوئے اندازہ ہوا کہ یہاں بہت ہی غربت ہے لوگوں کے پاس کھانے پینے کو نہیں، مہنگائی اور بے روزگاری ہے تو اس وقت میں نے اپنا ذاتی دروازہ لوگوں کے لیے کھولا۔ اللہ کا شکر ہے اللہ نے بہت کچھ ہمیں دیا ہوا تھا۔ وہ ہم نے لوگوں کو آگے کی طرف پہنچایا۔ کبھی آٹا دیا، کبھی راشن دیا، کبھی اپنے گھر کھانا پکا کر کھانا کھلایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ پھر کھانا گھر بن گیا۔

پاکیزہ ✧..... ابتدا میں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا؟

پروین سعید ❖..... مشکلات تو کوئی ایسی نہیں تھیں لیکن رفتار بہت کم رہی۔ ہم نے اُڑنے کی نہیں چلنے کی کوشش کی اور کوشش یہی کی کہ آہستگی سے قدم اٹھائیں اور آگے کی طرف چلے جائیں۔ ایک بہت بڑا

مسئلہ حل کرنے جا رہے ہوں تو بجٹ بھی اتنا ہی ہونا چاہیے لیکن ہم نے بجٹ کی طرف کبھی نہیں دیکھا کہ ایک کو کھلا رہے ہیں یا زیادہ کو۔

پاکیزہ ✧..... ''کھانا گھر'' آپ نے کتنے سرمائے سے شروع کیا تھا؟ کیا عزیز و اقارب نے اس ضمن میں آپ کے ساتھ مالی تعاون کیا؟

پروین سعید ❖..... دس ہزار کی رقم کھانا گھر بنانے میں استعمال کی تھی۔ ایک بڑی میز، چند کرسیاں، تندور، چند برتن شامل تھے۔ اس وقت اتنی مہنگائی نہیں تھی جتنی کہ اس وقت ہے، برتن اور دیگر تمام چیزیں خود خریدی تھیں۔ جو مانگا اپنے رب سے مانگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بہت عزت دی۔ بہت مقام دیا۔ شکر اللہ کا کہ کھانا گھر کم پیسوں میں تعمیر کیا گیا۔

پاکیزہ ✧..... ''کھانا گھر'' کے قیام کے وقت کتنے افراد آپ کے شریک تھے؟ آج کھانا گھر سے کتنے افراد کا روزگار وابستہ ہے؟

پروین سعید ❖..... میرے ساتھ میرے شوہر اور تین ورکرز تھے۔ آج ماشاء اللہ تقریباً ہمارے بیس کے قریب ورکرز ہیں جو کھانا گھر میں کام کر رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧..... روٹی کے ساتھ روز ایک ہی سالن ہوتا ہے یا ہر دن مختلف کھانا ہوتا ہے؟

پروین سعید ❖..... میں نے مینیو سیٹ کیا ہوا ہے کہ ہفتے میں تین دن گوشت بنتا ہے۔ چکن بناتی ہوں اور تین دن میں ایک دن دال، ایک دن سبزی اور ایک دن چھولے کا سالن بنتا ہے۔ جب سبزی نہیں ہوتی ہے تو اس وقت ہم کڑھی بناتے ہیں۔

پاکیزہ ✧..... غریب طبقے کو مفت کھانا فراہم کرنے کے بجائے انتہائی معمولی دام میں کھانا فراہم کرنے میں کیا حکمت عملی تھی؟

پروین سعید ❖..... ہم نے ایک معمولی سی رقم رکھی تھی۔ اگرچہ یہ کھانا مفت بھی دیا جا سکتا تھا لیکن اس کی حکمت عملی یہ ہے کہ جب لوگ خرید کر کھائیں گے خواہ وہ انتہائی معمولی رقم ہی کیوں نہ ہو ان کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوگی جب وہ تین روپے جمع کریں گے تو وہ کام پر بھی جائیں گے اور محنت سے جی نہیں چرائیں گے۔

پاکیزہ ✧..... جو یہ معمولی سی رقم بھی دینے کے قابل نہیں ان کے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟

پروین سعید ❖..... جو لوگ تین روپے بھی نہیں دے سکتے وہ ایک درخواست ادارے کو دیتے ہیں تو پھر ان کا کھانا فری کر دیا جاتا ہے۔ ان میں خاص طور پر ضعیف افراد، معذور، یتیم، بیوہ خواتین، کم آمدنی والے اور جن کا کوئی روزگار نہیں ہے شامل ہیں۔

پاکیزہ ✧..... کیا اپنے عملے کو آپ نے خصوصی تربیت دی ہے کہ کھانا گھر سے کھانا لینے والوں کی عزتِ نفس مجروح نہ ہونے دی جائے؟

پروین سعید ❖..... میں اور میرا عملہ..... ہم اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ جو لوگ کھانا گھر میں آ رہے ہیں ان کی عزت میں کوئی کمی نہ ہو۔ وہ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں، ہم ان کی بات اور مسئلے سنتے ہیں، ان کا جواب بھی دیتے ہیں اور دل سے ان کی عزت کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧..... ''کھانا گھر'' سے اندازاً یومیہ کتنے افراد اپنا پیٹ بھرتے ہیں؟

پروین سعید ❖..... کھانا گھر کا آغاز صرف دو لوگوں کو کھانا دینے سے کیا تھا۔ آج اللہ کے کرم سے ماشاء اللہ پانچ ہزار سے زائد افراد کھانا کھا رہے ہیں۔ گوٹھوں اور کچی بستیوں میں کھانا جا رہا ہے

پاکیزہ ✧..... جو لوگ ''کھانا'' گھر تک نہ آ سکیں ان کے کھانے کی ترسیل کا مؤثر ذریعہ؟

پروین سعید ❖..... جو لوگ معذوری یا کسی اور وجہ سے کھانا گھر نہیں آ سکتے تو ہم ان کے کسی بھی رشتے دار کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ آ کر ان کا کھانا لے جائے اور کوشش کرتے ہیں کہ کھانا زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ لیکن اب ہماری گاڑی گوٹھوں اور کچی آبادیوں

تک جارہی ہے اور کھانا گھر سے کھانا ان کے گھر کے قریب ہی دیا جارہا ہے۔

پاکیزہ ✧..... یہاں آپ نے ایسی معمر خواتین کو باعزت جگہ دی جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ؟ اس کا خیال کیسے آیا؟

پروین سعید ❖..... کیونکہ ہمارا کھانا گھر کمیونٹی کے اندر ہے اور لوگوں کے ساتھ ہمارا تعلق بہت قریبی رہا ہے۔ اندازہ ہوا جو غریب والدین ہیں وہ اپنے بچوں کی بے اعتنائی کا نشانہ بنتے ہیں، وہ ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ایسی بہت ساری خواتین سے گاہے بہ گاہے ہماری ملاقات ہوتی رہی۔ وہ ضعیف خواتین اپنے دل کا حال بیان کرتی تھیں تو ہم نے سوچا کہ ان کو اپنا لیا جائے۔ کھانا گھر میں بیس کے قریب مائیں آئیں جن میں سے پانچ چھ کا انتقال ہوگیا۔ اب تیرہ چودہ مائیں کھانا گھر میں قیام پزیر ہیں اور کھانا گھر ان کی سرپرستی کررہا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی خواہشوں کو پورا کیا جاسکے۔

پاکیزہ ✧..... کھانا گھر کے قیام سے لے کر اب تک اشیائے خورد و نوش اور دیگر استعمال کی ضروری اشیا کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ جب اور اب کا موازنہ کیسے کریں گی؟

پروین سعید ❖..... مہنگائی تو ہر دور میں رہی ہے۔ جب ہم نے 2002ء میں شروع کیا تھا تو ٹھوک میں ساڑھے چار سو کی دو من کی بوری ملا کرتی تھی۔ بیس، پچیس روپے کلو کی دال مل جاتی تھی، سبزی تو بہت ہی سستی تھی دو روپے، پانچ روپے کلو آلو تھے۔ بے شک سستی اشیا تھیں لیکن اس وقت بھی مہنگائی تھی۔ لوگوں کے پاس وسائل نہیں تھے۔

پاکیزہ ✧..... آپ کے خیال میں اس کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اس میں کمی کیسے ممکن ہے؟

پروین سعید ❖..... ظاہر ہے حکام بالا ہی اس کے ذمے دار ہیں اگر سب کوشش کریں اور اپنا کردار صحیح ادا کریں تو مہنگائی بہت حد تک کم کی جاسکتی ہے۔

پاکیزہ ✧..... پاکستان کو ہر قسم کی کرپشن سے جو نقصان پہنچنا تھا وہ تو پہنچ گیا لیکن آپ کی نظر میں اس کی بہتری کی کوئی صورت بن سکتی ہے؟

پروین سعید ❖..... یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اگر اچھی تعلیم ہوتی، اسپتالوں میں اچھا علاج ہورہا ہوتا۔ لوگوں کی ملازمتیں ملی ہوتیں تو وہ کبھی اس طرح کے مسائل کا شکار نہیں ہوتے۔ سیاست دان ووٹ لیتے وقت وعدے وعید تو بہت کرتے ہیں لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے۔

پاکیزہ ✧..... ''کھانا گھر'' کی کتنی شاخیں ہیں؟

پروین سعید ❖..... اس کی دو شاخیں ہیں ایک

جہاں خدا کی بستی ہے اور آگے تیسرا ٹاؤن ہے جو کمال ٹاؤن میں آتا ہے۔ بہت وسیع علاقہ ہے، کچی آبادیاں اور گوٹھ بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ہمارے پانچ پک اپ پوائنٹس ہیں۔ وقتاً فوقتاً جو چیزیں ہمارے پاس زیادہ آجاتی ہیں تو بہت سارے گوٹھوں میں ان کے گھروں میں جا کر ہم راشن دے کر آتے ہیں اور کھانا بھی لے کر جاتے ہیں۔

پاکیزہ ✧..... ''کھانا گھر'' کے بعد ''دوا گھر'' کی بنیاد رکھنے کی نوبت کیوں پیش آئی؟ کیا آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں یا اس کے لیے آپ کو کچھ کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا؟

پروین سعید ❖..... بات ساری یہ ہے کہ کھانا گھر تو چل رہا ہے الحمدللہ لیکن لوگوں کو سستا علاج بھی تو نہیں مل رہا تو کوشش کی کہ کوالیفائیڈ ڈاکٹرز بلا کر دوا گھر کا بھی آغاز کر دیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اچھے کھانے کے ساتھ، ساتھ اچھا علاج بھی میسر آسکے۔

پاکیزہ ✧..... لاک ڈاؤن کے زمانے میں کھانا گھر نے اپنا کردار کس طرح ادا کیا؟

پروین سعید ❖..... الحمدللہ لاک ڈاؤن کے تمام دن رات میں نے کام کیا۔ لوگوں کے پاس روزگار نہیں تھا، لوگ کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ علاقے کے مکین اس لاک ڈاؤن کی وجہ سے بہت متاثر ہو رہے تھے تو کھانا گھر نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کو کھانا بھی دیا، راشن بھی دیا۔ جو خدمت ہو سکتی تھی ان کی وہ کرتے رہے۔ الحمدللہ لاک ڈاؤن کے دن کام کرنے اور لوگوں کو ریلیف دینے میں گزرے۔

اور قارئین اب سوالات کا رخ موڑتے ہیں پروین صاحبہ کی نجی زندگی کی جانب

پاکیزہ ✧..... آپ کے شریکِ حیات کا تعارف؟

پروین سعید ❖..... خالد سعید صاحب سے ۳۲ سال قبل شادی ہوئی۔ میرے شوہر سینئر صحافی رہے ہیں۔ آج کل صاحبِ فراش ہیں۔ ان کے گردے کام نہیں کر رہے اس لیے ڈائلسز پر ہیں۔

پاکیزہ ✧..... وہ ساعت جب آپ اپنے شریکِ حیات پر بہت نازاں ہوئیں؟

پروین سعید ❖..... اللہ کے بعد میرے شوہر خالد سعید صاحب نے ہمیشہ میرا بہت ساتھ دیا۔ مجھے ہمیشہ بہتری کی طرف لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔ میں جہاں کھڑی ہوں اور پوری دنیا میں شناسائی ہے، سب ان ہی کی بے لوث محبت اور تعاون کی وجہ سے ہے۔ الحمدللہ ان کی ہی اجازت اور تعاون سے ''کھانا گھر'' تعمیر ہوا۔ ہم دونوں مل کر اسے چلا رہے ہیں۔ بیماری کے باوجود بھی یہ کھانا گھر جاتے ہیں۔ خیال رکھتے ہیں۔ ہمارے درمیان بہت اچھی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ الحمدللہ میں تو ہر پل اپنے شریکِ حیات پر نازاں رہتی ہوں۔

پاکیزہ ✧..... آپ کے ہم سفر کے مزاج میں غصہ و تیزی زیادہ ہے یا برداشت اور نرمی؟

پروین سعید ❖..... خالد نے ہمیشہ تحمل مزاجی سے کام لیا۔

پاکیزہ ✧..... بحیثیت شریکِ حیات اپنے ہم سفر کی کون سی خوبی آپ کو بہت متاثر کرتی ہے؟ اور کون سی خامی کھلتی ہے؟

پروین سعید ❖..... بحیثیت شریکِ حیات خالد سعید صاحب ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہیں۔ ماشاء اللہ زندگی کے ہر معاملے، دکھ سکھ میں ساتھ دیا، بہت خوبیاں اللہ نے دیں، پریشان نہیں کرتے، حکمرانی نہیں جماتے۔ اللہ کا شکر ہے سادہ اور نیک انسان ہیں۔

پاکیزہ ✧..... آپ کے ہم سفر آپ کی صلاحیتوں کا فراخدلانہ اعتراف کرتے ہیں؟

پروین سعید ❖..... بالکل کرتے ہیں کہ اگر وہ اجازت نہ دیتے تو آج میں اس مقام پر نہیں ہوتی۔ انہوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا اور میں نے نبھایا۔

پاکیزہ ✧..... کیا زوجین کو ایک دوسرے پر اپنی

ہمدرد پاکستان کی صد سالہ تقریب میں حکیم محمد سعید کی صاحبزادی سعدیہ راشد، پروین سعید کو پھول اور تحائف دے رہی ہیں جبکہ گورنر سندھ عمران اسماعیل مہمان خصوصی ہیں۔

مرضی مسلط کرنی چاہیے؟

پروین سعید ❖..... بالکل بھی نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے اور خالد نے کبھی ایک دوسرے پر اپنی مرضی مسلط نہیں کی۔ ایک دوسرے کی بات کو سمجھا، کام کو سمجھا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔ خالد اچھے انسان بھی ہیں اور اچھے شوہر بھی۔

پاکیزہ ✧..... گھر کو گھر بنانے میں میاں بیوی کا کردار مساوی ہوتا ہے یا کسی ایک فریق کی ذمے داری زیادہ ہوتی ہے؟

پروین سعید ❖..... یہ تو اللہ نے رشتے جوڑے ہیں کہ زندگی میں ایک دوسرے کے شریکِ سفر ہوں گے، ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے، ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاریں گے تو ذمے داریاں بھی مساوی ہیں، اور یہی ہمارے رشتے کی خوب صورتی ہے کہ ہم نے مل جل کر اپنے گھر کو گھر بنایا ہے۔

پاکیزہ ✧..... قدرت کی جانب سے ملنے والا سب سے بڑا انعام؟

پروین سعید ❖..... ماں بننا بہت بڑا اعزاز ہے اللہ کا بہت شکر اور احسان ہے کہ اللہ نے مجھے دو بیٹیاں دی ہیں جویریہ اور کنزیٰ۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے داماد بہت اچھے ہیں بیٹوں کی طرح۔

پاکیزہ ✧..... کبھی بیٹے کی کمی محسوس ہوئی؟

پروین سعید ❖..... اللہ کا کرم ہے کہ اللہ نے صاحبِ اولاد بنایا جو نہیں دیا اس کا بھی شکر ہے۔ بیٹیاں ہوں یا بیٹے سب اللہ کی دین ہے۔ کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

پاکیزہ ✧..... اپنی بیٹیوں کے ساتھ تعلق کو مستحکم بنانے میں آپ نے اپنا کردار کس طرح ادا کیا؟

پروین سعید ❖..... دوستانہ ماحول میں ان کی تربیت کی، ان کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کیا، غیر ضروری پابندیاں نہیں لگائیں نہ ہی رعب دکھایا۔ پیار سے اچھا برا سمجھایا تو انہوں نے سمجھا بھی عمل بھی کیا۔ اور ہمارے درمیان دوستانہ تعلق سے ان کے اعتماد میں اضافہ بھی ہوا۔

پاکیزہ ✧..... میکے کا وہ اصول جو آج بھی اختیار کیا ہوا ہے؟

پروین سعید ❖.....میں نے اپنے میکے میں مہمانداری دیکھی تھی اور اپنے رشتے داروں کا احترام اور خیال رکھتے ہوئے اپنے والدین کو دیکھا تھا۔ وہی چیز میرے اندر بھی آئی۔ میرے گھر میں مہمانداری بھی ہوتی ہے اور عزیز و اقارب کا خیال بھی رکھا جاتا ہے جو میکے میں ہم نے دیکھا اور سیکھا وہی سسرال میں اپنا رہے ہیں۔

پاکیزہ ✧.....اپنے گھر، عزیز و اقارب اور کھانا گھر کی ذمّے داریوں میں کیسے توازن برقرار رکھتی ہیں؟

پروین سعید ❖.....کھانا گھر کی مصروفیات ایک طرف ہیں، الحمدللہ سیٹ لائف ہے۔ اس لیے کہ جب دو، دو گھر کا ٹائم تھا وہ بھی ہم نے گزارہ۔ جدوجہد کا وقت گزر گیا ہے۔ پہلے بھی کبھی اپنے گھر، شوہر اور بچوں کو نظر انداز نہیں کیا آج بھی نہیں کرتی۔ پہلی ترجیح میرا گھر، بچے اور شوہر ہیں دوسری ترجیح کھانا گھر ہے۔ میکا، سسرال، سمدھیانے، عزیز و اقارب سب کو ساتھ لے کر چلے۔

پاکیزہ ✧.....بچپن کی وہ خوبی اور خامی جو آج بھی موجود ہے اور وہ بھی جو وقت کے ساتھ آپ ہی آپ ختم ہوگئی؟

پروین سعید ❖.....اوروں سے ہمدردی، اور ان کا درد سمجھنا اور آج بھی یہی حال ہے۔ ہاں بچپن میں بہت صاف گو تھی جو بات ہوتی تھی کہہ دیتی تھی ڈرتی نہیں تھی۔ آج بھی صاف گو ہوں۔

پاکیزہ ✧.....تدبیر تقدیر بدل دیتی ہے یا دعاؤں سے تقدیر بدل جاتی ہے؟ آپ کا یقین کس پر ہے؟

پروین سعید ❖.....اللہ تعالیٰ نے جو تقدیر میں لکھ دیا وہ ہو کر رہے گا لیکن بعض دعائیں اللہ کے دربار میں قبول ہو جاتی ہیں۔ جو تقدیر میں تو کیا زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لے آتی ہیں۔ دعاؤں سے تقدیر کو بدلا جا سکتا ہے لیکن جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا وہ فائنل ہے۔

پاکیزہ ✧.....کھانا گھر کی مصروفیت سے قطع نظر وہ مصروفیت جو آپ کے معمول کا حصہ ہے؟

پروین سعید ❖.....جب بھی فراغت ہوتی ہے تو خبریں اور ٹاک شوز دیکھتی ہوں۔ اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧.....غصے کی کیفیت میں آپ کا... ردِعمل؟

پروین سعید ❖.....لوگ کہتے ہیں بڑھاپے میں غصہ بہت آتا ہے لیکن اب مجھے غصہ بہت کم آتا ہے۔ ہاں پہلے کبھی جب آتا تھا تو خوب ہنگامہ مچتا تھا، گھر میں شور ہوتا تھا کہ پروین کو غصہ آگیا۔ انسان کی خامیاں غصے میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اب مجھے غصہ آتا ہے نہ اللہ دلاتا ہے۔

پاکیزہ ✧.....اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے اور اللہ کو راضی کرنے کا بہترین طریقہ آپ کے خیال میں؟

پروین سعید ❖.....نماز کہ نماز پڑھتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں تو اللہ ہم سے راضی ہو جاتا ہے۔ ایک اور اچھا عمل اللہ کے بندوں کا خیال رکھنا ہے خاص طور پر جو صاحبِ حیثیت نہیں ہیں غربت کی لکیر سے نیچے ہیں، پریشان حال ہیں۔ ان کی مدد بہترین طریقہ ہے لیکن افضل ترین شکرانہ نماز ہے۔

پاکیزہ ✧.....حقوقِ نسواں اور آزادیِ نسواں کے ضمن میں کیا کہیں گی؟

پروین سعید ❖.....ہمارے مذہب نے خواتین کو عزت، احترام اور مرتبہ دیا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں یہ نہیں ہے۔ خواتین کو کس حد تک برابری کے حقوق دیں یہ تھوڑی کہ آپ نے عورت کو سمجھ لیا کہ یہ میری زرخرید ہے، کوئی کام نہیں کر سکتی سوائے میری اور میرے گھر کی خدمت کے۔ اس سے اس کی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔ خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ ان حقوق سے جو اللہ اور قرآن نے دیے

ہیں تجاوز نہ کریں۔خواتین کو آزادی ملنی چاہیے لیکن ایک حد تک..... اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔

پاکیزہ ✧..... کبھی اپنے کسی فیصلے پر پچھتاوا ہوا؟

پروین سعید ❖.....اللہ کا شکر ہے کبھی اپنے کسی فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہوا کہ اللہ نے گھر کے معاملات کے علاوہ بھی نیک عمل میں حصہ دار بنایا۔

پاکیزہ ✧.....زندگی کا سب سے دلکش پل اور رنگ آپ کی نظر میں؟

پروین سعید ❖..... 2011ء میں، میں نے پہلا عمرہ کیا تھا زندگی کا سب سے خوب صورت لمحہ تھا۔ جب میں کعبۃ اللہ کے سامنے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر پہلی بار حاضری دی۔اس کے بعد بھی کئی عمرے اور تین حج کیے اوران مقدس ساعتوں نے میری زندگی کو کئی رنگوں سے بھر دیا۔

پاکیزہ ✧.....محبت زیادہ توانا جذبہ ہے یا نفرت؟اپنے تجربے کی روشنی میں بتائیے؟

پروین سعید ❖..... نفرت کمزور جذبہ ہے اگر نفرت کے جواب میں محبت بھرا برتاؤ کیا جائے تو وہ بھی محبت کریں گے۔ محبت زیادہ توانا عمل ہے۔اس کی پیمائش کی جائے تو بہت وسیع ہے۔

پاکیزہ ✧.....بہترین انتظامی صلاحیت خواتین میں زیادہ ہوتی ہے یا مردوں میں؟

پروین سعید ❖.....دونوں میں ہی ہوتی ہیں کبھی کسی کی صلاحیت نمایاں ہوتی ہے تو کبھی کسی کی۔

پاکیزہ ✧.....آپ کا پسندیدہ رشتہ، شخصیت، رنگ، خوشبو، موسم، تہوار، گیت، مغنیہ، مغنی، تفریحی مقام، کون سے ہیں؟

پروین سعید ❖.....والدین، میرے نبی ﷺ، پنک، جیسمین، بہار کا موسم، تہوار عید، نصرت فتح علی اور عابدہ پروین، پاکستان کے سارے تفریحی مقامات۔ یہی میرے پسندیدہ ہیں۔

پاکیزہ ✧..... پاکیزہ بہنوں کے لیے آپ کا پیغام؟

پروین سعید ❖..... ہر رشتے سے محبت سے پیش آئیں، تمام رشتوں، خاص طور پر گھر والوں اور شوہر کا احترام کریں۔

☆☆☆

پاکیزہ ✧..... آپ کا بہت شکریہ..... پروین سعید صاحبہ کہ ہمارے قارئین کے لیے وقت نکالا اور اپنی روداد حیات سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقوق العباد ادا کرنے کا جذبہ دے الٰہی آمین۔

☆☆☆

گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔
شفیق الرحمٰن ...... اردو مزاح نگاری کا ایک نہایت معتبر و معروف نام ہے۔ اس ماہ اپنے باذوق پڑھنے والوں کے لیے ہم نے انہی نامور مزاح نگار کی تصنیف **پرواز** سے اقتباس منتخب کیا ہے۔جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

مجبوریاں

ایک روز ایک اجنبی حضرت اپنا رومان انگیز افسانہ دکھانے لائے تاکہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دے سکوں۔ وہ افسانہ یوں شروع ہوتا تھا۔

''وہ دیر سے کھڑا نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہوا تھا جس پر طرح، طرح کے پھولوں نے سلمیٰ ستارے کا کام کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں خیالات اس روانی کے ساتھ آ رہے تھے جیسے کوئی اعلیٰ درجے کی سنگر مشین بخیہ کر رہی ہو یا کوئی تیز قینچی کتر، کتر چل رہی ہو۔ بعض اوقات کوئی پرندہ دفعتاً چیخ اٹھتا اور اس کے خیالات کا سلسلہ یوں منقطع ہو جاتا جیسے دھاگا ٹوٹ جائے یا یکا یک سوئی چبھ جائے۔ وہ اپنی نگاہوں کے گز سے قدرت کا ناپ لے رہا تھا۔ سر پر آسمان نیلے رنگ کی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس میں بادلوں کے چھوٹے، چھوٹے ٹکڑے سفید بٹنوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ نالے کا بہتا ہوا پانی سفید ململ کے کھلے ہوئے تھان کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں سورج کی نارنجی شعاعوں نے گوٹہ کناری کا کام......''

''معاف کیجیے......'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کہیں درزی تو نہیں ہیں؟''

''جی نہیں!'' ......وہ شرما کر بولے۔ ''میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔''

میرے ایک دوست جو موٹروں کے ورکشاپ کے مالک تھے اور مدت سے موٹروں کا علاج معالجہ کر رہے تھے، موٹریں اور پرزے ان کے دماغ پر اس قدر چھا گئے تھے کہ بعض اوقات وہ سوتے، سوتے چلا کر کہتے۔ ''بریک لگاؤ......اسٹارٹ کرو۔''

ایک دفعہ ہم دونوں اونٹ پر سوار ہوئے۔ میں آگے تھا اور مہار میرے ہاتھ میں تھی۔ ہم ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں پانی ہی پانی تھا۔ اونٹ کچھ تیز ہو گیا، ایک جگہ تو پھسلتے، پھسلتے بچا۔ میرے دوست گھبرا کر بولے...... ''بھئی اونٹ کو نمبر تو میں لے آؤ۔'' ایک وقفے کے بعد بولے۔ ''میرا مطلب ہے ذرا آہستہ چلاؤ۔''

کسی نے کہا ہے (غالباً شیکسپیئر نے کیونکہ عموماً وہی کہا کرتا ہے) کہ مجھے کسی شخص کے دوست دکھا دو اور میں بتا دوں گا کہ وہ شخص کتنے پانی میں ہے۔ ایک اور صاحب نے فرمایا ہے کہ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کوئی شخص کس فلم کمپنی کی فلمیں پسند کرتا ہے اور

یں فوراً بتادوں گا کہ وہ شخص کیسا ہے؟ کئی حضرات
عویٰ کرتے ہیں کہ وہ ٹائی کی گرہ، جوتوں کے سائز
ور مونچھوں کی لمبائی دیکھتے ہی سب کچھ بتادیں
گے۔ یہ سب کچھ بجا سہی لیکن بھلا اس قدر محنت کی کیا
ضرورت ہے۔ آپ اتنی چھان بین کا ہے کو کرتے
یں کہ ناپ لیتے پھریں یا اس کے دوستوں کے پیچھے
خفیہ پولیس کی طرح پھریں۔ آپ محض چند منٹ
خاموشی سے اس شخص کا مطالعہ کیجیے۔ اور وہ خود سب
کچھ بتادے گا..... وہ مجبور ہے یا یوں کہیے کہ وہ اپنی
عادت سے مجبور ہے ہم سب مجبور ہیں۔

طلبا کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ
ر ممکن طریقے سے پڑھائی سے بچیں۔ ہشیار سے
ہشیار طالب علم بھی پڑھائی لکھائی کو بیگار سے کم نہیں
سمجھتا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ چند طالب علم
یر سے بحث کر رہے تھے کہ پڑھا جائے یا باہر چلا
جائے۔ جب وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو ایک بولا۔
''میں ٹاس کرتا ہوں۔ اگر چہرہ آیا تو سینما چلیں
گے، اگر پشت آئی تو سرکس دیکھیں گے اور اگر روپیہ
سیدھا کھڑا ہو گیا تو خوب پڑھیں گے۔''

آفیشل خط و کتابت بھی نہایت دلچسپ چیز
ہے۔ اس میں خط و کتابت کے مقررہ آداب اور
کاغذی کارروائی زیادہ ہوتی ہے۔ دماغی کام بہت
کم ہوتا ہے۔

بعض اوقات عجیب و غریب خطوط دیکھنے میں
آتے ہیں، جو کاروباری لحاظ سے بالکل مکمل ہوتے
ہیں۔ مثلاً ایک فرم نے دوسری کو لکھا کہ ہمارا فلاں،
فلاں آرڈر منسوخ کر دو۔

ایک بوڑھے پنشنر کی پنشن دفعتاً بند ہو گئی۔
جنوری سے جون تک کچھ نہ ملا۔ آخر تنگ آ کر
اس نے اوپر خط لکھا، وہاں سے جواب آیا کہ
کاغذات کے مطابق آپ کا کئی ماہ سے انتقال
ہو چکا ہے اس لیے پنشن بند کر دی گئی ہے۔ اس
نے لکھا کہ جنابِ من' میں تو باقاعدہ زندہ
ہوں۔ جواب آیا کہ سرٹیفکیٹ بھیجیے۔ یہ ضلع کے
کمشنر کے پاس گیا۔ کمشنر بڑا ہنسا اور سرٹیفکیٹ لکھ
دیا کہ میں فلاں صاحب کو اپریل سے دیکھ رہا
ہوں اور تصدیق کرتا ہوں کہ یہ زندہ ہیں۔ نیچے
جون کی تاریخ لکھ دی۔ پنشنر نے وہ سرٹیفکیٹ
اور ایک خط اوپر بھیج دیا۔ اگلے ہفتے تین ماہ کی
پنشن آ گئی ساتھ ہی ایک خط جس میں لکھا تھا.....
''جنابِ من! آپ کے سرٹیفکیٹ کے مطابق
اپریل، مئی اور جون کی پنشن ارسال ہے۔ براہِ
کرم ایک اور سرٹیفکیٹ ارسال فرمائیے کہ آپ
اسی سال جنوری، فروری، اور مارچ میں بھی زندہ
تھے۔ تاکہ آپ کی بقیہ پنشن بھی بھیج دی جائے۔''

بعض اوقات میں یہ سوچتا ہوں کہ میری ذاتی
مجبوریاں کیا، کیا ہیں؟ ایک تو مجھے اپ اور ڈاؤن
ٹرین کی کبھی پہچان نہیں رہتی۔ کئی گاڑیاں تو ایسی ہیں
جن میں، میں عرصے سے سفر کرتا رہا ہوں لیکن مجھے
نہ ان کا نمبر معلوم ہے نہ یہ علم ہے کہ وہ اپ ہیں یا
ڈاؤن۔

بعض اوقات میرے دوست آپس میں کچھ
ایسی باتیں کرتے ہیں۔

''تو آپ فورٹین اپ سے تشریف لائیں
گے؟ میں اسٹیشن پر انتظار کروں گا۔''

''جی ہاں! لیکن اگر وہ نہ مل سکی تو پھر سیون
اپ سے جاؤں گا۔ بعض اوقات نائن اپ تھری
ڈاؤن کو لیٹ کروا دیتی ہے جس سے سیون اپ بھی
لیٹ ہو جاتی ہے۔ بہرحال آپ ٹونٹی ڈاؤن نکلنے
کے بعد ہی فورٹین اپ پر میرا انتظار کریں۔ اگر اس
سے نہ پہنچ سکا تو پھر.....''

اور میں حسرت بھری نگاہوں سے اُن کے
چہروں کو دیکھتا رہتا ہوں بعض اوقات اپنی حالت پر
آٹھ، آٹھ آنسو بہاتا ہوں۔

☆☆☆

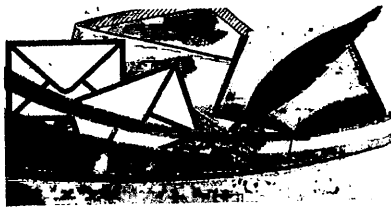

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب غدار رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش وعنایات پائیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور پُرخلوص دعائیں لیے آپ کی محفل میں حاضر ہوں۔ گزشتہ دنوں پورے ملک میں ہی بارشیں ہوئیں اور نکاسیِ آب کے مسائل بھی سامنے آئے۔ خصوصاً شہر کراچی میں تو ریکارڈ توڑ برسات ہوئی اور بے حد مسائل کا لوگوں نے سامنا کیا۔ ان نامساعد حالات کے باوجود الحمدللہ ہمارے ادارے کی یہی کوشش رہی کہ پاکیزہ سمیت دیگر تین اور پرچوں کی ترسیل بروقت ہوتا کہ پورے پاکستان اور ملک سے باہر بھی پہنچ سکیں۔ یہاں سب سے پہلے میں نگہت سیما کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ ہاتھ میں تکلیف کے باوجود خصوصی طور پر خط لکھ کر میری صحت کے بارے میں دریافت کیا اور دعا گو رہیں۔ جزاک اللہ اور ساتھ ہی انجم انصار اور شمیم فضل خالق کو بھی خاص طور پر تعزیتی پیغام بھیجے۔ نگہت سیما، اللہ کریم تمہیں جلد صحت یاب کرے اور تمہارے ہاتھ کی تکلیف دور ہو جائے تاکہ تمہاری قیمتی تحریر پاکیزہ کی جلد سے جلد زینت بن سکے۔ مجھے امید تھی کہ پاکیزہ بہنیں مدیحہ شاہد کی تحریر پریوں کا دیس بہت پسند کریں گی اور آپ سب کے خطوط یہی بتا رہے ہیں کہ سب کو یہ تحریر بہت پسند آئی ہے۔ عائشہ خان کی تحریر ایک سجدہ کی آخری قسط بہت پُراثر ثابت ہوئی۔ ذاتی طور پر مجھے عائشہ خان تمہارا انداز تحریر پسند ہے جو ہمیشہ ایک ایمان افروز اور اصلاحی پیغام لیے ہوتا ہے۔ سلامت رہو، الٰہی تمہیں ہمیشہ صحت مند رکھے اور تم اسی طرح سے اپنی تحریروں سے پڑھنے والوں کو مستفید کرتی رہو۔ بہنو! آپ سب کی آرا بہت قیمتی ہوتی ہیں، کوشش کریں کہ ہر تحریر کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں جو رائٹر کے لیے بھی سودمند ہوتی ہے۔ تسنیم ماپارا، تم بھی پابندی سے رائے دیا کرو اور تبصرہ لکھنے میں ڈنڈی نہ مارا کرو، عقیلہ حق تم نے نئی تحریر بھیجنے میں بڑا وقت لگایا۔ وعدہ تو جلدی کا کیا تھا۔ ہمارے قارئین کو شیریں حیدر کی تحریر کا بھی شدت سے انتظار رہتا ہے تو بس اور دیر نہیں بہنوں..... شیریں جلد ہی طویل ناولٹ کے ساتھ آرہی ہیں جس کا پہلا حصہ تو وہ بھیج چکی ہیں ان شاء اللہ بقیہ بھی جلد ہی بھیج دیں گی اور بھی کئی سینئر رائٹرز ماشاء اللہ جلد ہی اپنی تحریریں دے رہی ہیں مگر میں یہاں کچھ سسپنس رہنے دیتی ہوں باقی کی باتیں نزہت اصغر آپ سے کرلیں گی۔

عزیز بہنو، اب اجازت ان شاء اللہ بشرط صحت وزندگی اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اپنا اور اپنے اردگرد بسنے والوں کا خیال رکھیں۔ اللہ نگہبان۔

دعا گو عذرا رسول

پیاری بہنو! اب عذرا آپی نے اشارہ تو دے دیا ہے مگر سسپنس ابھی قائم رکھیں گے۔ رواں ناول اختتام کی طرف گامزن ہیں۔ ان شاء اللہ اگلے سال کئی ..... سینئر رائٹرز شاملِ اشاعت ہونے جارہی ہیں۔ آپ سب کی حوصلہ افزائی اور مفید رائے، مشوروں سے ہم رسالے کو بہتر سے بہترین بناتے ہیں۔ بس آپ سب کا ایسا ہی پُرخلوص تعاون درکار ہے۔

اب بہنو! حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمؑ اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ممتاز قلم کار، صحافی اور معروف فنکار محترم شاہد نقوی کا نیا خوب صورت اور متاثر کُن ناول جو تم پر گزری بدلتی دنیا پبلی کیشنز کے بینر تلے شائع ہوا ہے۔ ثاقب رضا کی زیرِ نگرانی واضح کمپوزنگ اور ارتقا عباس کے بنائے گئے خوب صورت سرورق سے مرصع اس کتاب کی قیمت صرف 400 روپے ہے۔ کتاب کا انتساب شاہد نقوی نے اپنی مرحومہ والدہ محترمہ کے نام کیا ہے۔ کتاب میں نامور صحافی جناب مظہر عباس اور ممتاز ادیب اشکیل عادل زادہ کے دقیق اور خوب صورت تاثرات بھی خاص طور شامل ہیں۔ 175 صفحات پر مبنی اس ناول کے بے انتہا متاثر کُن انداز کی بدولت قاری کی توجہ و دلچسپی آخری سطر تک برقرار رہتی ہے۔ امید ہے خزینہ ادب میں یہ نہایت خوشگوار اضافہ ثابت ہوگا۔ کتاب ملنے کا پتا مکان نمبر 33 گلی نمبر 8 الیف 11/1 اسلام آباد اور فون نمبر 03335577993..... اور دکان نمبر 38۔ نیا اردو بازار آر جے مال جوہر موڑ نزد ملینیم مال کراچی میں بھی دستیاب ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ فریدہ جاوید فری، لاہور آج کل مری کے نظاروں سے لطف لے رہی ہیں۔ (شکر الحمدللہ)

☆ مستقل تبصرہ نگار اور مصنفہ سلمیٰ غزل، اسلام آباد اپنی بھانجی کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔

☆ ناہید فاطمہ حسنین جونا ہید عزمی کے تخلص سے ادبی منظر نامے میں موجود ہیں ان کا ایک شعری مجموعہ پوروں پہ آسمان منظرِ عام پر آچکا ہے۔ پاک برٹش آرٹس نے ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو سندھ کو آرڈینیٹر بنادیا ہے۔ پاک برٹش آرٹس ادبی سرگرمیوں کے علاوہ رفاہی خدمات بھی انجام دے رہا ہے۔

☆ سعدیہ فاروق (المعروف بنام سویرا فلک) جو پاکیزہ کی رائٹر اور مستقل قاری ہیں نعت خوانی میں بھی نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اس سال انہیں انٹرنیشنل نعت کونسل برائے خواتین 2020ء کی وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا ہے۔ بلاشبہ یہ سویرا فلک کی محنت اور عشقِ رسول کا انعام ہے۔ وہ اپنی اس کامیابی پر اللہ پاک کی بہت شکر گزار ہیں۔ (بہت، بہت مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عظمیٰ مشتاق، ناروال نے ارسم کوزین کے نام سے کلنگ چینل شروع کیا ہے۔ آج کل وہ نت نئے کھانوں کی تراکیب سکھا رہی ہیں اور خوب داد پا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ، ساتھ لکھنے کی مشق بھی جاری ہے۔ (شاباش صحت مند سرگرمیوں میں لگی رہو)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری اور تبصرہ نگار شاہینہ مبارک، ہالہ کی کزن کی شادی خانہ آبادی، پچھلے دنوں بخیر و خوبی انجام پائی۔ (بہت مبارک ہو)

☆ پچھلے دنوں لاک ڈاؤن کے باوجود ہمارے کئی جاننے والوں میں شادی بیاہ کی تقریبات نہایت سادگی سے شرعی احکام کے مطابق انجام پائیں جو آج کل کی ضرورت ہے۔ ایسے میں رائٹر نزہت جبیں ضیا کی پیاری بیٹی جویریہ بھی رخصت ہوئیں۔ (بہت، بہت مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی پیاری بیٹی اور پیاری بہن امینہ عندلیب سلانوالی کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی التماس ہے۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی ہر دلعزیز شاعرہ، مصنفہ، تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری کی صحت و سلامتی کے لیے دعا کی درخواست..... فریدہ کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی انعام خان کافی علیل ہیں۔

☆ پاکیزہ کی پُرخلوص دوست باہنر لکھاری عنیزہ سید کے والدِ بزرگوار کی ان دنوں طبیعت کافی خراب ہے، دعائے صحت

کے لیے خصوصی التماس ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار اور شاعرہ فریدہ ہاشمی مخفی پچھلے دنوں کمر کی تکلیف کے باعث کافی بے آرام رہیں۔
☆ عظمیٰ مشتاق، نارووال کے بھائی کی سرجری ہوئی ہے۔
☆ نادیہ، راول پنڈی کا نوعمر بیٹا اب الحمدللہ روبصحت ہے۔
☆ کورونا وائرس میں بتلا ہمارے بہت سے عزیز جاننے والے دوست احباب الحمدللہ اب روبصحت ہیں اور یہ سب ہر بل طریقۂ علاج، دعاؤں اور پُرامید رہنے اور مضبوط قوتِ ارادی سے ممکن ہوا۔ معمولی فلو وزکام میں بھی انتہائی احتیاط اور دوسروں سے دوری اختیار کرنے کا ہی کہا جاتا ہے۔ اللہ پاک سب کو صحت وسلامتی سے رکھے اور ہر دکھ تکلیف میں حفاظت سے رکھے۔ توکل بر اللہ سب سے بڑا علاج اور پرہیز ہے۔ اپنے اور اپنے اردگرد رہنے بسنے والوں کی ہر ممکن دادرسی ہر با اختیار صحت مند مسلمان کا فرض ہے۔ آدھی بیماری تو ڈاکٹر کے بااخلاق ہونے سے دور ہو جاتی ہے۔ اللہ پاک سب مریضوں کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا کرے تاکہ دینِ حق کے مطابق زندگی بسر کرسکیں، الٰہی آمین۔

انتقالِ پُرملال

☆ مستقل قاری اور تبصرہ نگار حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ کے جواں سال کزن وفات پا گئے۔
☆ ممتاز سائنسدان ماہر تعلیم اور گلوبل انوائرمنٹل لیب (GEL) کے سربراہ ڈاکٹر سمیع الزماں مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ آپ امریکا میں مقیم افسانہ نگار اور صحافی رعنا کہکشاں کے بڑے بھائی تھے اور شائستہ زریں کے رشتے میں چچا ہوتے تھے ادارہ مرحوم کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔
☆ عظمیٰ مشتاق، نارووال کو پچھلے دنوں دو صدمات سے گزرنا پڑا ایک تو ان کے مشفق ماموں کا انتقال ہو گیا اور ایک ان کی کزن کی ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ اللہ پاک مرحومین کی مغفرت کرے، آمین۔
☆ انجم انصار اور شمیم فضل خالق کے شوہر حضرات کی وفات پر پاکیزہ بہنیں مسلسل تعزیتی پیغامات ارسال کر رہی ہیں، ظاہر ہے انسان اپنے چاہنے والوں اور خیر خواہوں کے غم میں دکھی ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک غم زدہ خاندان کو صبر دے اور مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا ہو۔ الٰہی آمین...... انجم سب بہنوں کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری غزالہ شاہد کے بھائی آغا عمران حیدر مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے، پیارے خطوط کی طرف۔
✉ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ''اس بار پاکیزہ عیدِ قرباں سے پہلے ملا اور عید کے فوراً بعد تبصرہ ارسال کر رہی ہوں (جی آپ کا خط پچھلی دفعہ چھپنے سے رہ گیا تھا معذرت) دین کی باتیں پڑھ کر ایمان کو اور تازہ کیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے عیدِ قرباں اور جشنِ آزادی پر خوب بات کی۔ عذرا رسول آپی نے کچھ باتیں اپنی بہنوں سے کیں۔ آپی یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ اس وائرس نے آپ کو بھی متاثر کیا۔ اللہ کے حکم سے آپ صحت یاب ہو گئیں۔ (جی شکر الحمدللہ) یہ پڑھ کر شاک لگا کہ شائستہ اعجاز کے شوہر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے ہیں (خدا کی مرضی) ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعجاز صاحب کو، رفعت شبانہ کی والدہ کو جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل دے اور میری لاڈلی نند فریدہ جاوید فری اور نزہت جبیں کے شوہر کو مکمل صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ میری ماں جیسی ساس کی وفات پر جن بہنوں نے مجھ سے اظہارِ تعزیت کیا ان کا شکریہ... ابھی، ابھی اطلاع ملی ہے کہ آپی انجم انصار کے میاں جی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر دے، آمین۔'' (جی، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین)
✉ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ ''آنٹی مجھے بے انتہا خوشی ہے اور یقیناً ہر ذی شعور کو ہوگی کہ ہم زندگی کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں، پورا پاکستان جو لاک ڈاؤن اور گھروں تک محدود ومحصور ہو کر رہ گیا تھا اللہ کے رحم وکرم سے واپس سب کچھ بحال ہونا شروع ہو گیا ہے۔ رب کا جتنا شکر منایا جائے کم ہے۔ (بے شک) کافی عرصہ اپنے پیارے پاکیزہ اور پاکیزہ بہنوں سے دور رہی اور یقین کریں ہر، ہر لمحہ میں نے پاکیزہ اور اس سے وابستہ ہر فرد کو یاد کیا۔ (ہم نے بھی سب کو یاد رکھا ہے) گو کہ اس وقت

میرے پاس تبصرہ کرنے کو کچھ نہیں ہے کہ پاکیزہ ابھی مجھے پشاور میں مل ہی نہیں پایا لیکن یہ خط آپ سب سے رابطہ کرنے کے لیے لکھ رہی ہوں۔ یہ بتانے کو کہ آپ سب مجھے یاد ہیں اور ہر لحہ میری دعا میں رہتے ہیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو اور پروردگار پورے پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ آنٹی ہما بیگ کے لیے دل بے حد دکھی ہے۔ اللہ انہیں صبرِ جمیل دے، آمین۔ آپی اپنا بہت خیال رکھیں اور اپنی دعاؤں میں مجھے بھی ضرور یاد رکھیں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے 6، 7 ماہ بعد آپ سے رابطہ کرنا۔ اللہ سب کا مددگار ہو، آمین۔'' (پیاری بیٹی پیارے سے خط کا شکریہ..... پاکیزہ اب باقاعدگی سے 25 تاریخ تک سب جگہ آجاتا ہے۔ آپ کے شہر کی شکایت جلد دور کر دی جائے گی ان شاء اللہ، آپ چھ ماہی یا سالانہ خریدار بن جائیں تو گھر پر ہی مل جائے گا)

ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ ''جولائی کا پاکیزہ خوب صورت اور دلکش سرورق کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل گرل بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے نہایت فکر انگیز باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے یہ حقیقت ہے کہ جب سے کورونا کی وبا دنیا میں پھیلی ہے ایسا لگتا ہے زندگی ہاتھ ہلاتی، بائے، بائے کہتی دور جاتی جارہی ہے۔ سب کچھ بند ہو رہا ہے مگر توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے مگر توبہ کی توفیق بھی منجانب اللہ ہے۔ (درست کہا) کنیز نور علی کا مختصر افسانہ دل کے اندر بھی ہے رستہ، اپنے اندر ایک خوب صورت پہلو سمیٹے ہوئے ہے کہ کس طرح معصوم بچے بچپن میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ازالہ کس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ علم و ادب کے روشن چراغ میں مشہور شاعر انور مسعود صاحب کی مرحومہ اہلیہ کو خوب صورت انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ گوشۂ ظرافت میں عطاالحق قاسمی کی تصنیف ہنسنا رونا منع ہے کا اقتباس ڈیٹ آف برتھ سے متعلق پڑھا، موصوف اپنی پُرمزاح باتوں سے ڈیٹ آف برتھ کو غیر ضروری قرار دے رہے ہیں جبکہ ڈیٹ آف برتھ کا اندراج میٹرک کی سند، شناختی کارڈ اور دیگر اہم کاغذات میں نہایت ضروری ہے اور مختلف اہم شخصیات کی سالگرہ اور برسی بھی ڈیٹ کے حوالے سے منائی جاتی ہے۔ (جی بالکل، ان کا مضمون تو طنزیہ ہے ناں) شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ نے قناعت، رضائے الٰہی کو موضوع بنا کر بہت سے ایمان افروز واقعات سے ہمیں مستفید کیا ہے، سروے انسانی زندگی پر کورونا اور لاک ڈاؤن کے اثرات میں پاکیزہ بہنوں کے خوب صورت خیالات پڑھنے کو ملے۔ قابلِ تعریف تھے۔ عنبرین حسیب نے تو کورونا سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو ایک خوب صورت نظم میں ڈھال کر پیش کیا۔ سیما رضا صاحبہ کے خیالات بھی نہایت عمدہ تھے اور ردا افتخار نے آخری سوال کے جواب میں رب جلیل کے حضور نہایت عاجزی سے دعا کی جو ہمارے دل کے تاروں کو چھو گئی۔ انٹرویو کا سلسلہ اندازِ نو میں آرہے شازیہ کریم کا انٹرویو پڑھنے کو ملا۔ بنت زیب کے عمدہ سوالات اور شازیہ کریم کے بے ساختہ جوابات نے محفل کو چار چاند لگا دیے بلاشبہ شازیہ کریم ایک حاضر جواب اور لفظوں کے خوب صورت تانے بانے بننے والی شخصیت ہیں۔ (جی ہاں ماشاء اللہ) یہ نیا سلسلہ بے حد پسند آیا۔ براہ کرم اسے جاری رکھیے گا۔ (جی ضرور) بہنوں کی محفل میں آنٹی عذرا رسول کی غیر حاضری سے محفل کچھ پھیکی سی لگی مگر جب اصل حقیقت کا پتا چلا کہ وہ ہما بیگ کے اکلوتے بیٹے کی حادثاتی موت کی وجہ سے محفل میں حاضر نہیں ہوئیں تو دل کو تسلی ہوئی۔ ہما بیگ کے بیٹے کے انتقال پر دلی صدمہ ہوا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہما بیگ کے مرحوم بیٹے کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ اسی سلسلے میں ہما بیگ کے بلند حوصلے کو آشکار کیا۔ ناہید فاطمہ کے بلند حوصلوں پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ آسیہ عامر کے بیٹے کا حافظ قرآن بننا آسیہ عامر کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ آخرت میں جب دنیا کی تمام ڈگریاں اور عہدے فیل ہو جائیں گے مگر اللہ تعالیٰ حافظ قرآن کے والدین کو اعزازات سے نوازیں گے۔ (جی بالکل) آپی! آپ نے سالگرہ نمبر کے حوالے سے پاکیزہ کی مرحومین رائٹرز کا ذکر کیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرائی۔ یہ بہت اچھی روایت ہے۔ اسے جاری رکھیے گا۔ (تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ آپ نے کئی نکات کی جانب توجہ دلائی۔ سالگرہ نمبر تو جن حالات میں نکلا آپ سب واقف ہیں انعامی سلسلے میں فی الحال معذرت۔ ہاں کتاب لینی ہے تو ضرور دے سکتے ہیں۔ آپ کی اتنی دلچسپی قابلِ قدر ہے خوش رہیے آپ کا اگلا خط بھی شاملِ اشاعت ہے) اگست کا شمارہ جشنِ آزادی کی مبارک باد کے ساتھ ملا۔ ساری تحریریں قابلِ تعریف ہیں۔ بہنوں کی محفل میں میرا خط شامل نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے بروقت حوالہ ڈاک کر دیا تھا۔ اب اسے آپ ستمبر کے پاکیزہ میں شائع کریں گے۔ اس لیے موجودہ شمارے پر کوئی تبصرہ نہیں کر رہی۔ اب سوچا ہے کہ تبصرہ بھی ہر ماہ ارسال نہیں کروں گی۔ گاہے بگاہے یعنی وقفے کے بعد تبصرے والا خط ارسال کروں گی۔ (جی ساجدہ آپ کا خط دو دن لیٹ تھا۔ رسالہ تیار ہو چکا تھا۔ آپ کے تو تبصرے باقاعدگی سے لگتے ہیں اور پچھلی دفعہ کچھ جگہ کی بھی تنگی آڑے آگئی تھی) آپی انجم انصار کے میاں کی ناگہانی وفات کا پڑھ کر دل بہت اداس ہے اسی وجہ سے یہ خط تحریر کر رہی ہوں، آپ براہ

مہربانی میری تعزیت ان تک پہنچادیں۔'' (جی بالکل ساجدہ آپ کا پچھلا تبصرہ بھی شاملِ اشاعت ہے۔ اب ذرا جلدی تبصرہ بھیج دیا کریں۔ اشاعت کی تاریخوں میں ردوبدل ہوا ہے یعنی 16 تاریخ تک خط مل جائے۔)

نگہت سیما، چکوال سے۔ ''امید ہے کہ آپ سب بخیر ہوں گی، پاکیزہ مل رہا ہے، شکریہ... بہت دنوں سے خط لکھنے کا سوچ رہی تھی لیکن دائیں ہاتھ میں درد کی وجہ سے قلم پکڑنا مشکل تھا۔ اللہ کا شکر ہے اب کافی بہتر ہے۔ (شکر الحمدللہ، اللہ آپ کو صحت سے رکھے) عذرا رسول صاحبہ کی بیماری کا پڑھا شکر ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں صحت و زندگی عطا فرمائی۔ (جی آپ سب کی دعائیں ہیں) اس ماہ کے پاکیزہ میں انجم انصار اور شمیم فضل خالق صاحبہ کے شریک حیات کے متعلق پڑھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انجم، شمیم اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ افشاں آفریدی کا ناول اچھا ہے۔ بہت خوب صورتی سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ باقی سب بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی صحت و زندگی کے لیے دعا گو ہوں۔ کراچی میں ہونے والی بارشوں نے فکرمند کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ادارے میں سب کو میری طرف سے سلام و دعا۔'' (بہت شکریہ نگہت سیما... آپ نے وقت نکال کر اپنی تحریر سے نوازا۔ جی آپ کی تعزیت پہنچادی گئی ہے۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ... آپ کی رہنمائی اور رائے ہماری مصنفات کے لیے بہت اہم ہے۔ اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔)

آسیہ عامر، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے... میں ایک تیر سے دو نشانے ہو گئے کیونکہ عید اور جشن آزادی اکٹھی آ گئی، میرے گھر میں تو تین، تین سالگرہیں بھی ہیں الحمدللہ... (مبارک باد) ناہید فاطمہ حسنین کا 2020ء گزر گیا کوئی یہ نہیں کہے گا کہ پتا بھی نہیں چلا۔ ان بڑی ہستیوں میں طارق عزیز اور اطہر شاہ خان کا تو میرے ابو کو بھی بہت دکھ ہوا۔ میرے ابو کے موسٹ فیورٹ تھے۔ شائستہ زریں کا سروے شاندار تھا اگر ہماری افشاں آفریدی کی تصویر چھپتی تو زیادہ مزہ آتا۔ شمع ہدایت، بہت پیارا مضمون ہے اختر شجاعت صاحبہ کا تقدیر بہت عرصے سے اس ٹاپک کا انتظار تھا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا بہت ساری باتوں کا پتا چلا جن کا ہمیں پہلے نہیں پتا تھا ٹاپک بہت critical ہے ایک پیراگراف کو دو، تین دفعہ پڑھا جتنی دفعہ پڑھا پڑھ کر مزہ آیا۔ رب ذوالجلال کا ہم پر بہت احسان ہے۔ بہنوں کی محفل پڑھ کر میں اپنے آپ میں نہایت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں کہ میں نے اتنے دنوں سے عذرا رسول آنٹی کی باتیں پڑھی ہی نہیں، مجھے پتا ہی نہیں کہ وہ وائرس کی لپیٹ میں آ گئی ہیں۔ آئی ایم رئیلی سوری عذرا آنٹی میں گلٹی فیل کر رہی ہوں باقی جن لوگوں کے عزیز ان سے بچھڑ گئے ہیں جیسا کہ انجم انصار آنٹی کے شوہر ان کا بہت دکھ ہوا۔ غزالہ عزیز صاحبہ کا اتنا پیارا انٹرویو پڑھ کر آخر میں ان کے والد کے انتقال کا پڑھ کر صدمہ پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نزہت جبیں ضیا صاحبہ کے شوہر کو صحت و سلامتی دے ماشاءاللہ... بہت خوب صورت کپل ہے۔ آج کل پاکیزہ کو ہاتھ کم، کم لگتا ہے اس لیے کوئی کہانی ابھی پڑھ نہیں پائی۔'' (کوئی بات نہیں تمہارا اتنا لکھنا بھی بہت ہے ہاں عذرا آپی اب الحمدللہ بخیریت ہیں۔ لگتا ہے آج کل کچھ زیادہ مصروف ہو۔)

ہما علی، اسلام آباد سے۔ ''انجم اپیا اور شمیم فضل خالق کے شوہر حضرات کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے، (آمین) اختر شجاعت کا شمع ہدایت کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے۔ بے شک جب ہم اللہ کی رضا کو اپنی رضا بنا لیتے ہیں تو وہ بھی ہمیں مایوس نہیں کرتا۔ (جی بالکل) میں ان سب بہنوں کا شکریہ تہ دل سے ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میری تحریر عذاب لمحے کو پسند کیا۔ خاص طور پر سلمیٰ غزل صاحبہ کی بہت شکر گزار ہوں۔ سلمیٰ آپ نے تو دل بڑا کر دیا۔ آپ تو خود بہت اچھی مصنفہ ہیں اور آپ کا افسانہ ماں بہت اچھی تحریر تھی۔ مصنفات کی اپنی ہم صنف کے بارے میں رائے بہت اہمیت رکھتی ہے شائستہ زریں کو اتنا جامع سروے پر مبارک باد... فرحین اظفر ع عورت ف فائدہ بہت گہرائی لیے ہوئی ایک ایسی حقیقت ہے جسے صرف وہ ہی بیوی محسوس کر سکتی ہے جو شوہر کے ہوتے ہوئے ہر محاذ پر تنہا ہوتی ہے۔ اسد علی چوہدری کا انٹرویو دلچسپ رہا۔ آمنہ حماد کو بہن کی شادی مبارک ہو۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ)

مدیحہ شاہد، لاہور کینٹ سے۔ ''اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر برستی بارش میں بھیگتے ہوئے پھولوں کو دیکھتے ہوئے، ہری مرچوں کے پکوڑوں اور گرما گرم چائے کے کپ کے ساتھ پاکیزہ کے نئے شمارے کے مطالعے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ تمام قارئین کی محبتوں کا شکریہ جنہوں نے میرے ناول پریوں کے دیس کو پسند کیا۔ قارئین کی تعریف اور محبت بھرے چند جملے مصنف کے لیے سیپ کے موتی کی طرح قیمتی ہوتے ہیں۔ پاکیزہ کے ساتھ ہمارا رشتہ بچپن کی دوستی جیسا پرانا اور خالص ہے گو کہ مصروفیات

کے باعث میں تواتر سے نہیں لکھ پاتی مگر پاکیزہ کے ساتھ ہمارا رابطہ ہمیشہ سے ہی مضبوط رہا ہے۔ پریوں کا دیس موضوع اور کرداروں کے اعتبار سے اپنے طور کی اِک منفرد کہانی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ قارئین نے اسے سراہا اور پسند کیا۔ ہما صاحبہ کے بیٹے کی شہادت کے بارے میں معلوم ہوا مگر سوچ رہی ہوں کہ اِک شہید کی ماں سے کیا کہوں! کون سے جملے لکھوں، بعض دفعہ کسی سے دو جملے کہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ سب کی طرح میں بھی دنیا کے حالات کی بہتری کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے اور انتظار ہے کہ دعائیں آسمان پر قبول کرلی جائیں۔'' (بہت شکریہ تبصرے کا)

❀ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''کورونا کی تباہیاں... کراچی اور ملک کے دوسرے شہروں میں بارشوں، سیلاب کی تباہ کاریاں اور پھر محرم الحرام کا پاکیزہ مہینہ... اپنے اندر بے پناہ اداسیاں لیے ہوئے ہے۔ بہت قربانیاں ہوں گی تاریخ میں مگر حضرت امام حسینؓ نواسۂ رسول کی قربانی... جنہوں نے اپنی جان آل اولاد کو راہِ حق میں قربان تو کیا مگر باطل کے آگے سر نہ جھکایا۔ ایسی عظیم قربانی جس کی مثال نہ ملتی ہے نہ ملے گی... آقا علیہ السلام کی گود میں پرورش پانے والی حضرت امام حسینؓ کی ذات مبارک ہی ہوسکتی ہے۔ اس حسینؓ ابن حیدر یہ لاکھوں سلام... پروردگار عظیم اس لازوال قربانی کے صدقے ہم سب کو توفیق دے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق بلند کریں۔'' (جزاک اللہ) ستمبر کے پاکیزہ میں انجم انصار اور شمیم فضل خالق کے شوہر کے انتقال کی خبر ملی ہے (جی ہاں مسلسل تعزیتی پیغام آرہے ہیں) اللہ پاک ان کے گھرانے کو صبر دے اور مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔'' (آمین)

☒ عائشہ عمر نانچ اور رابعہ عمر نانچ، سانگھڑ آپ کے تراشے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آپ صاف لکھائی میں الگ، الگ صفحات پر لکھا کریں اوپر کہانیوں پر تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔

❀ ثمرہ قریشی، لاہور سے۔ ''عرصہ 20 سال کے بعد میں ثمرہ قریشی آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوں۔ (خوش آمدید) اتنے طویل عرصہ غیر حاضری کی وجہ بچوں اور گھریلو ذمّے داریوں سے نبرد آزما رہی..... ماشاء اللہ بچے جوان ہوئے تو کچھ ذمّے داریوں کا بوجھ کم ہوا۔ اس تمام عرصے میں لکھنا تو بالکل نہیں ترک کیا پر اپنی ذات کی فراموشی اور وقت کی قلت آپ سے رابطے میں حائل رہی۔ عرصہ قبل آپ سے ایک بار ہی رابطہ ہوا اور آپ کا بھیجا ہوا عید کارڈ آج تک آپ کی نوازش کی نشانی کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔ اب دوبارہ اپنی شناخت کا خیال آیا تو سوچا بسم اللہ آپ کے شمارے سے ہی کیوں نہ ہی جائے۔ آپ نے پہلے بھی میری پہلی بار میں ہی بہت ہمت افزائی کی اور اب بھی اس یقین کے ساتھ آپ سے مخاطب ہوں کہ آپ میری رہنمائی ضرور کریں گی اور میری نگارشات کو اپنے ہر دل عزیز شمارے میں جگہ ضرور دیں گی۔'' (ثمرہ آپ نے طویل عرصے بعد رابطہ کیا۔ اب آتی رہنا تاکہ دوستی کی کہانی وہیں سے شروع ہو جہاں سے تم نے چھوڑی تھی۔ ٹھیک ہے ناں)

❀ زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ سے۔ ''اُف خدایا کتنے مہینے بعد اپنے پیارے رسالے سے ملاقات ہو رہی تھی۔ جون، جولائی کا مشترکہ شمارہ ملا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ جھٹ رسالے کو سینے سے لگا لیا۔ خوب صورت آنکھوں والی پھول ہاتھ میں لیے حسینہ نے ہمیں مسکرا کر دیکھا دل باغ، باغ ہوگیا۔ اب ہو جائے کہانیوں پر تبصرہ... گولے کی چادر اف آج سے پچاس سال پہلے کیسی غربت تھی کہ ایک گولے کی چادر لینا بھی مشکل تھی۔ میرے ہم سفر خدا ہر دلہن کو ایسا پیار کرنے والا شوہر نصیب کرے۔ فرحی نعیم کی... چھوٹی سی تمنا نے پیاری سی بہن کو کیسے تڑپایا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے چھوٹی سی خواہش اور خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اسریٰ کو جو خوشی نہ مل سکی شکر ہے وہ اس کی بیٹی کنول کو مل گئی۔ اسریٰ کے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی۔ دل کے اندر راستے واقعی ایک ٹافی کی بھی حسرت ہوتی ہے غریب بچوں کو... امی سے سنا ہوا ایک غریب بچی کا واقعہ آپ کو سناتی ہوں۔ غریب بچی اپنی ماں کے پاس آکر ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ اماں چاچا رحیو گڑ کی ڈلی کھا رہا تھا وہ کھا رہا تھا اور میں دیکھ رہی تھی وہ مجھے نہیں دیتا تھا۔ ایک گڑ کی ڈلی کے لیے بچی کی آنکھوں میں اتنی حسرت تھی۔ پرنسپل صاحبہ کو اپنی حسرت یاد تھی اسی لیے وہ بچوں میں ٹافیاں بانٹتی تھیں۔ اپریل فول تو روبا کو فول بنا ہی گیا۔ عزت دار لاڈلے میاں اور زبیدہ کی خوب جوڑی بن گئی ڈھابے پہ سالگرہ نصیحت آموز کہانی تھی۔ ہم اپنی فضول خرچی کم کرکے غریبوں کی مدد کرسکتے ہیں۔ گزرے کیسے پل، منگنی واقعی ایک کچا بندھن ہے لڑکیوں کو اتنا انوالو نہیں ہونا چاہیے۔ شاہ زیب نے کمینگی کی انتہا کردی لیکن شکر ہے علشبہ کو فیضان مل گیا۔ آب نیساں... پرانے زمانے میں سب خاندان مل جل کر رہتے تھے ان کی خوشیاں اور غم سانجھے ہوتے تھے۔ نئی نسل کو کسی کا احساس نہیں رشتوں میں دراڑیں پڑ گئیں پہلے ہفتوں پہلے شادیوں میں رشتے دار آکر رہتے تھے۔ اب گھر جانے کی نوبت ہی

نہیں آتی شادی ہال سے سب کو رخصت کر دیا جاتا ہے۔ رانگ نمبر آج کل کی جنریشن کا مشغلہ ہے اور کبھی لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ تم عشق سب سے خوب صورت کہانی تھی احمر نے جان پر کھیل کر تانیہ کی جان بچائی۔ ع عورت، ع عمارت، دو عورتوں کی کہانی تھی دونوں کے کردار مختلف تھے۔ سفینہ بدکردار عورت تھی لیکن نائلہ باکردار تھی۔ شہزاد کا کردار غلط تھا۔ عباد نیک فطرت اور دیانت دار تھا۔ آخر باکردار اور نیک فطرت مصائب سے نکل آئے۔ اختر شجاعت کی تحریر شمع ہدایت ہی ہے۔ آج کل ہم مسلمانوں میں قناعت کا فقدان ہے۔ لالچ اور حرص و ہوس بہت ہے (اللہ رحم کرے) کورونا اور لاک ڈاؤن کے اثرات ... خدا غارت کرے کورونا کو اور ختم کرے لاک ڈاؤن کو ہمارے لیے تو کورونا نے ہمارے پیارے رسالوں سے تین ماہ کی جدائی ڈال دی۔ بہنوں کی محفل میں اپنا خط، پاکیزہ ڈائری میں اپنا نام، میں گنگناتی میں اپنا شعر دیکھ کر بے پناہ خوشی ہوئی۔'' (آپ سب کی خوشی کے لیے ہی یہ کرتے ہیں۔ تبصرے کا شکریہ... اب ستمبر کے شمارے پر تبصرہ بھیجنا)

✉ صبیحہ شاہ، کراچی سے۔ ''اللہ پاک آپ کو اور پاکیزہ خاندان کو اپنی رحمتوں کے حصار میں رکھے، آمین...... انجم کے شوہر کی رحلت کی خبر سنی...... بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، الٰہی آمین...... انجم سے بارہا بات کرنے کی کوشش کی، ان کا فون مستقل بند جا رہا ہے۔ مرحوم شریف النفس اور خوش مزاج انسان تھے۔ جب بھی ملاقات ہوئی مسکراتے ہوئے خوشدلی سے ملے...... پورے خاندان کے لیے یقیناً بڑا نقصان ہے لیکن یہی قانون فطرت ہے، آج وہ، کل ہماری باری ہے...... انجم اللہ تمہارے بچوں کو شاد و آباد رکھے۔ تمہارا فرمانبردار رہنے کی توفیق عطا فرمائے...... تمہیں آسانیوں اور عزت و راحتوں بھری زندگی و آخرت عطا فرمائے۔'' (الٰہی آمین)

✉ انجم مشیر، کراچی سے۔ ''اگست 2020ء کا شمارہ سامنے رکھا ہے عید قرباں کی مبارک باد کے ساتھ جشن آزادی کی خوشی بھری گھڑیاں بھی مبارک اللہ میرے وطن پاکستان کو تاقیامت سلامت رکھے، آمین۔ پاکیزہ ہاتھ میں آتا ہے تو لگتا ہے کوئی دوست ساتھ ہے۔ اللہ آپ سب کو اچھے سے رکھے، رسالہ روز بروز ترقی کرے، تبصرہ اس بار مئی تا جولائی پر ہی ہے۔ (جی ضرور) افشاں آفریدی کا سلسلے وار ناول میرا سارا زنگ اتار دو بہت خوب صورتی کے ساتھ رواں دواں ہے بس یہ بیچ میں اظہار صاحب نے آکر دُرِّ مکنون کی زندگی کچھ اور مشکل کر دی ہے۔ سلمیٰ نگار کی گوٹے کی چادر، دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکر رہ گئیں۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی مگر ماں کا دل اسے تو اولاد ایک ہلکی سی خواہش دل میں ترازو لگی۔ میرے ہم سفر طیبہ عنصر مغل ہمیشہ خوب صورت لکھتی ہیں۔ یہ چھوٹی، چھوٹی خوشیاں ہی تو زندگی کا حسن ہیں، سعدیہ رئیس کا میں انمول ابھی تو ابتدا ہے بس ٹھیک ہے...... فرحی نعیم کی چھوٹی سی تمنا کب جا کر پوری ہوئی۔ آج کل بھی لوگ ضد باندھ کر بیٹھتے ہیں بھلا کسی کی خوشی پوری کرنے میں کیا نقصان...؟ نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول میں عشق ہوں۔ بہت سسپنس کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے بہت خوب... تسلیم شیخ کی ڈھابے پر سالگرہ پُرخلوص جذبوں سے گندھی خوب صورت تحریر... فرحین اظفر کی عورت کہانی آج کے معاشرے کی سچی عکاس ہے اب اخلاقی قدریں تو ختم ہی ہوتی جا رہی ہیں اور آخر میں، میں کہوں گی کہ اختر شجاعت نے کیا خوب صورت بات کہی ہے قناعت... رضائے الٰہی جو کہ آہستہ، آہستہ زوال پزیر ہے خدا ہم کو اپنی رضا میں راضی رہنے والا بنا دے (الٰہی آمین) اختر شجاعت کی تحریریں تاریک راہوں کے دیے ہیں کچھ تو یقیناً منزل پر پہنچیں گے۔ اللہ سب کو خوش رکھے۔'' (بے شک اختر شجاعت ہم سب کی رہنمائی عمدگی سے کر رہی ہیں۔ مختصر خط کا شکریہ تبصرہ اگرچہ دو ماہ پہلے کے شمارے پر تھا لیکن آپ نے اتنی لگن سے لکھا کہ شائع تو ہونا ہی تھا، ہمارے لیے آپ سب کی آرا اہم ہیں۔ نئی، پرانی سے فرق نہیں پڑتا)

✉ عظمیٰ مشتاق، نارووال سے۔ ''اس بار تو پاکیزہ کو پانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا وہ یوں کہ جس بک ڈپو پر پاکیزہ بیچا جاتا تھا کورونا کے دوران وہ شاپ بند ہو گئی ہے چنانچہ ہمیں پاکیزہ لینے پوسٹ آفس جانا پڑا۔ عید کی شاپنگ کے لیے تو پورے شہر میں مارے، مارے نہ پھرے مگر پاکیزہ کے لیے سارے شہر کی سڑکوں کو ناپا کیونکہ اس دن ابر باراں رضائے یزداں سے دل کھول کر برسا اور سارا شہر پانی، پانی تھا۔ ہر گلی سڑک پر گھٹنوں، گھٹنوں پانی جمع تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اب گھر سے نکل پڑے تھے۔ گھر آتے ہی پاکیزہ پڑھنا شروع کیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے سے افسانوں تک سب پڑھ ڈالے۔ اس کے بعد شکرگڑھ گئی وہاں بھائی کا آپریشن تھا۔ اکلوتا بھائی ہے آپریشن ہو گیا بھائی ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے ہیں، میں اپنے گھر واپس چلی آئی ہوں (اللہ تعالیٰ بھائی کو شفائے کاملہ عطا کرے، آمین) اس دفعہ 14 اگست کی مناسبت سے سیمارضا کا شجر سایہ دار

پڑھ کر دل افسردہ ہوا... عفت گل نے مٹ گئے فاصلے خوب لکھا۔ سعدیہ کے ”میں انمول“ کا انتظار رہے گا فوزیہ سرور کا دعاؤں کا ثمر نوجوان بچیوں کے لیے ایک نصیحت ہے شاید کہ اتر جائے دل میں میری بات۔ ع عورت رغ غلطی سچ ہے رشتوں میں عدم توازن سے ایسی ہی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ عذاب لمحے، ہما علی نے خوب لکھا۔ سلمٰی غزل نے تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرایا۔“ (چلیں شکر ہے پاکیزہ تو مل گیا۔ بارش تو پورے پاکستان میں برسی۔ اللہ پاک خیر کرے۔ آپ کے بھائی کی صحت کے لیے دعا گو ہیں، آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں ہے)

✍ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ”اگست کا پاکیزہ ملا کیا بات ہے پاکیزہ کی میرا بے حد فیورٹ میگزین ہے، لاک ڈاؤن کی وجہ سے اگرچہ دیر سے رسائل ملے۔ تمام افسانے بے حد پسند آئے مٹ گئے فاصلے... دعاؤں کا ثمر، عیدتم سنگ ہاں منی ناول میں انمول، ناولٹ، ایک سجدہ، اور دہلیز دل.... مکمل ناول اُف اس قدر شاندار دل خوش ہو گیا۔ بہت مدت کے بعد ایسا ناول پڑھا... واہ مدیحہ شاہد، پریوں کا دیس ایسے ہی لکھتی رہا کریں۔ مبارک ہو اور میری طرف سے ایوارڈ کی حقدار ہو خوش رہو۔ (بہت شکریہ پیاری فریدہ) بس ایسی ہی خوشیوں میں ایک خبر نے دل بے حد افسردہ کر دیا۔ پیاری بہن اور پاکیزہ کی سابق مدیرہ انجم انصار کے شوہر انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ انجم انصار بہن کو اور ان کے بچوں میری پیاری بھانجی عظمٰی آفاق کو صبر عطا کرے، آمین۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے شوہر کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ میں بھی لاک ڈاؤن کی وجہ سے کوہ مری نہیں جا سکی اور 14 اگست کے بعد جاؤں گی۔ ان شاء اللہ دعاؤں کا بے حد شکریہ۔“ (بہت شکریہ پیاری فریدہ آپا، اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے)

✍ طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی سے۔ ”سب سے پہلے تو ان پیاری بہنوں کی ممنون ہوں جن سب کو میرے لکھے تبصرے جاندار لگتے ہیں، اس کے بعد آسیہ عامر کو مبارک باد ان کے بیٹے کے حافظ قرآن بننے پر۔ اداریہ اس بار کورونا ہی کے باعث ان حالات کی عکاسی کر رہا تھا جو آج کا موضوع ہیں لیکن خوب رہا معلومات ملیں۔ اب قرآنی آیات سے اور اسمائے گرامی سے مستفید ہو کر سلسلے وار ناولز کی طرف بڑھے ان کا تجسّل تو بڑھتا جا رہا ہے افشاں تو کچھ، کچھ زنگ اتارنے لگی ہیں لیکن نایاب جیلانی ابھی عشق کے خوب امتحانات لے رہی ہیں بہر حال بہت ہی خوب صورت ناولز ہیں دونوں ہی مصنفات مبارک باد کی مستحق ہیں، سلمہ نگار جی کی گولے کی چادر نے خوب ماحول گرما دیا لفظ ٹھاہ کر کے دل پر لگے اور آنکھوں سے پانی کی صورت رواں ہو گئے اس کے بعد کسی محترمہ کی کہانی تھی میرے ہم سفر وہ میرے ٹائپ کی نہ تھی اس لیے ہم نے طرزِ تغافل برتتے ہوئے ان کو درخورِ اعتنا نہ جانا اور بس دو تین بار مطالعہ کیا اور آگے چل دیے شکریہ نزہت جی کہ آپ اس ناچیز سی مصنفہ کو بھی جگہ دیتی رہتی ہیں (قابلِ اشاعت تحریریں ہوتی ہیں تو لگ جاتی ہیں جی) سعدیہ رئیس کا میں انمول کافی اچھی تحریر ہے لیکن اس پر مکمل تبصرہ تو اس کے مکمل ہونے پر ہی کر سکوں گی کیونکہ اختتام پڑھے بغیر کہانی کی روح کا پتا نہیں چلتا ہے لیکن تحریر رواں اور دلکش ہے منظر نگاری بھی خوب ہے۔ چھوٹی سی تمنا ایک منفرد موضوع پر لکھی تحریر من کو بھا گئی بے شک بہت دل چاہتا ہے کسی اپنے کے نومولود کا نام تجویز کریں لیکن ایک حقیقت سے ہم شاید صرفِ نظر کیے ہیں کہ شرعی طور پر نام رکھنے کا پہلا حق والدین ہی کا ہے یقین نہ ہو تو تحقیقات کر لیں، کنیز نور کا دل کے اندر بھی ہے راستہ، پڑھ کر بے طرح والدہ یاد آ گئیں۔ میری امی بھی ٹافیاں، مکھانے، مٹھائیاں تقسیم کرتی تھیں۔ بچوں میں یونہی گلی میں کھڑے ہو کر اور بہت برکت ہوتی تھی اس عمل میں، جیتی رہیں کنیز بہت اچھی یادوں پر عمل کرنے کی تحریک دی ہم بھی کیا کریں گے ان شاء اللہ۔ فرح طاہر آپ کی اپریل فول نے شدید ترین متاثر کیا جس کا حل نکالنے کو ہمیں لغت کو پاس رکھنا پڑا، الحلیم، تانیس اور بہت ہی دقیق قسم کے ناموں پر ہم چکرا کے رہ گئے کہانی سے توجہ ہٹ جاتی ہے ناموں پر ریسرچ ہونے لگتی، بہر حال کہانی اصلاحی موضوع پر تھی، ایک سجدہ، بہت پیارا نام اور تحریر بھی اگلی قسط کو پڑھنے پر مجبور کر رہی ہے اب یہ اثیر جیسے سڑو حضرت کا دماغ پٹڑی پر کب آتا ہے۔ ہاجرہ ریحان کی زبیدہ بی بی کے خواہ مخواہ کے نخرے اور ان کے بانکے میاں کی آنی جانی نزاکت نے بھی خوب غضب ڈھایا جیتی رہیں، ہاجرہ، عزت دار ایک اچھی ادبی کاوش رہی۔ تسلیم شیخ کی ڈھابے پر سالگرہ مزید اچھی ہو سکتی تھی اچھا موضوع چنا تھا نام بھی بے حد متاثر کُن تھا ہم نے پڑھنے میں جلدی کی لیکن کہانی میں کچھ جھول لگے پاگل عورت پر زیادہ ہی مکالمات تھے اور یہ سوچ مجھے پریشان کرتی رہی کہ اگر وہ عورت سب چرا کر لے گئی تھی تو ڈھابے والے کو پیسے کہاں سے ملے بعد میں غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ تو سہیلیوں نے اپنی ایک متوسط طبقے کی دوست کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو اس کے لیے یہ ڈراما کیا تاکہ

وہ مشکل میں نہ پڑ جائے بہت بہترین سبق ہے اس بات میں اصلاحی کہانی پر مبارک باد، بشریٰ ماہا میری پسندیدہ مصنفہ کی تحریر اس بار بھی بہت زبردست اقتباسات کے ساتھ دل میں اترتی چلی گئی۔ بس کچھ تضاد سارا ہا جو کہانی میں تھوڑی کمی کا باعث بنا، بہت ہی معذرت پیاری بشریٰ ماہا جی، میں اعتراض برائے اعتراض نہیں کر رہی بس کرداروں میں ہی نہیں یہ سچ بھی ہے حقیقت میں بھی لوگوں کے ڈبل اسٹینڈرڈ دکھائی دیتے ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کچھ غلط نہیں لکھا ہے۔ اب ذکر اس تحریر کا جو دل سے نکلی لگی اپنے بچپن کو یاد کروا گئی زبردست آب نیساں، بہت ہی مزہ آیا پڑھ کر بالکل سچائی پر مبنی داستان اپنی کہانی لگی۔ دل خوش کر دیا ناہید سلطانہ نے۔ رانگ نمبر اور تم عشق ہمارا ہو بھی اچھی تحاریر رہی ہیں عورت کہانی میں اب تک جتنی بھی تحاریر آئی ہیں ان میں میرے خیال سے اب تک کی سب سے متاثر کن تحریر فرحین جی نے اس بار لکھی ع عورت ع عمارت بہت ہی عمدہ تخیل پر بہترین پلاٹ پر لکھی پُر تجسس کہانی ہے بہت اچھی لگی، شاندار اختر شجاعت جی آج کل ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں ایسے ہی موضوع پر لکھنے کی ضرورت تھی۔ قناعت ہی ہے جو کورونا کے دنوں میں ہمیں مشکلات سے گزرنے میں مددگار ثابت ہوگی جزاک اللہ شائستہ زریں کے سروے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ فریدہ فری جی، شگفتہ شفیق جی کی شاعری بہت اچھی لگی پاکیزہ ڈائری بھی اچھی ہوتی ہے مزید دلکش کی جا سکتی ہے، جینا کو بہت ساری کامیابیوں کی ڈھیروں مبارک باد، افسانہ بھی اچھا تھا تبصرہ نہ کر سکی معذرت انجم آپی کا بہنوں کی محفل میں شامل ہونا بہت اچھا لگا عذرا آپی کے ساتھ بات چیت بھی رکا نہ کرے پیاری اپیا ہم منتظر رہتے ہیں۔ نزہت بہت اچھے سے پاکیزہ کی باگ ڈور سنبھالے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے، الٰہی آمین، آمنہ حماد کو ان کی بہن کی شادی کی مبارک باد اور تہمینہ عباسی کی ایک تھی امرت میں نے پڑھی بہت ہی دلچسپ ناول ہے مبارک باد راشدہ عفت صاحبہ نے میری اور رفاقت اپیا کی تصویر پہ تبصرہ کیا بہت شکریہ بہت لکھ لیا اور بہت باقی ہے۔ (تفصیلی اور تحقیقی تبصرے کا بہت شکریہ......بس آپ لوگوں کی دعائیں ہیں اور سب بہنوں کا پُرخلوص تعاون۔ پچھلے شمارے میں آپ کا خط چھپنے سے رہ گیا تھا۔ معذرت... اکثر تبصرہ نگاروں کے خطوط کے ساتھ بھی ایسا ہو جاتا ہے تو اگلے ماہ شائع کر دیے جاتے ہیں کہ اتنی محبت سے جو لکھتے ہیں۔)

حنا زین، واہ کینٹ سے۔ ”یہ خط لکھنے کی وجہ صرف اور صرف میرا مقروض ہونا ہے۔ جی بالکل صحیح سمجھیں آپ... آپ سب کی محبتوں کی، خلوص کی، چاہتوں کی میں مقروض ہوں، میری والدہ سلمٰی نگار کے انتقال کے بعد مئی تا جولائی کے شمارے میں ان کی کہانی کا چھپنا اور ادارے کا ایک بالکل نو آموز لکھاری کا اپنے رسالے میں جگہ دینا بہت بڑی بات ہے، اور پھر اگست اور پھر ستمبر کے شماروں میں بھی امی کی کہانی گوٹے کی چادر کو بہت پزیرائی ملی تمام بہنوں کا دل سے شکریہ اور احترام کہ آپ سب نے بمشکل ایک ورق کی کہانی کو پسند کیا اور پھر اس پر تبصرہ بھی کیا۔ میں اور میرے تمام گھر والے بشمول میرے ابو، میری بہنیں اور بھائی بھابی سب کی طرف سے احتراماً شکریہ...... (حنا کہانی اس لائق تھی کہ چھپتی... افسوس ہے کہ ان کی اور تحریریں بھی ہوتیں۔ اللہ پاک آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور آپ لوگوں کو صبر عطا کرے، الٰہی آمین) کورونا.. اور لاک ڈاؤن سے جو، جو نقصان ہوا سو ہوا پھر کراچی کا پانی میں ڈوب جانا اور جب مجھے پتا لگا کہ ستمبر کا شمارہ دوبارہ چھپا ہے اور بہت بڑا نقصان ہوا ہے تو دل بہت پریشان ہوا۔ سچ کہوں یہ نقصان صرف ادارہ ہی کیوں برداشت کرے اگر اس مہینے کا رسالہ 100 روپے کے بجائے 200 روپے میں بھی ہوتا تو ہم اسی شوق و لگن اور احترام سے خریدتے۔ میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔ (یہ آپ کی محبت اور ادارے سے پُرخلوص وابستگی ہے۔ اللہ سب کے کاموں میں آسانی کرے، آمین) پریوں کا دیس، مدیحہ شاہد کی پیاری تحریر ہے میں تو پڑھتے، پڑھتے 2017ء کے اپنے ٹرپ کو سوچنے لگی جس میں میری بڑی بہن منزہ جو مانچسٹر سے آئی تھیں ان کی بیٹی، بھائی اور ان کی فیملی میری فیملی ہم سب کا یادگار ٹرپ تھا۔ افشین نعیم کی بڑے کام کی چھوٹی بات یہ تو گھر، گھر کا مسئلہ ہے بہت عمدگی سے اجاگر کیا اور حل پیش کیا۔ نگینہ، ہما بیگ کی اچھی تحریر ہے۔ فرحین اظفر کا عورت کہانی بہترین سلسلہ ہے۔ اپنا محاسبہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ایک سجدہ پر تبصرہ مکمل پڑھنے کے بعد ہی کروں گی۔ (چلو اب کر دینا) وردہ بخاری یہ تو گھر، گھر کا مسئلہ رہا۔ تین مہینے وہ، وہ کام اور کوکنگ کی ایسے، ایسے کھانے بنائے کہ میرا بڑا بیٹا صبیح باہر کے کھانوں کا رسیا ہے۔ بس اسی کے چٹورپن کی خاطر تمام باہر کے کھانوں کو گھر میں بنایا اور کھلایا۔ (ویل ڈن حنا) حوریہ بتول آپ نے بہت گہری بات بہت چھوٹی تحریر میں عمدگی سے بیان کی۔ عقیلہ اکبر نے بھی اچھا لکھا لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابھی ہمارا معاشرہ اتنا ظرف والا نہیں ہوا۔ (ہم سب کو اپنی، اپنی جگہ کوشش کرتے رہنا چاہیے) فوزیہ احسان، سوا لاکھ کا ہاتھی نے دل اداس کر دیا سچ ہے اب تو رشتے بھی پیسے کے ہیں۔ سعدیہ قریشی نے

دریا کو کوزے میں بند کیا ورنہ تو سسرال تو دور شوہر حضرات بھی آنکھیں، کان بند کیے رکھتے ہیں اور بیویاں سر پختی رہ جاتی ہیں عمر گزر جاتی ہے۔ طیبہ عنصر مغل، راشدہ سعدیہ، صدف آصف، مہرین کنول کی بھی اچھی تحاریر پڑھنے کو ملیں۔ ناہید سلطانہ اختر کی تریج کا سفر نے رلا، رلا دیا۔ پڑھتے، پڑھتے لگا ہی نہیں کہ کوئی کہانی افسانہ پڑھ رہی ہوں یوں لگا کسی کی آپ بیتی ہے۔ ایک باپ کی قربانی..... میرے ابو بہت نرم دل ہیں۔ میری بڑی بہن کی بارات کو آنسوؤں کے ساتھ خوش آمدید کرتے ہوئے کہا کہ بیٹی کی رخصتی کا دن آہی گیا جب میری بہن کا مانچسٹر سے پہلا خط آیا تو میں خوشی، خوشی لے کر آئی کہ اپیا کا خط آیا ہے، تب حیران رہ گئی کہ پہلے وہ خط سامنے رکھ کر امی، ابو خوب روئے کہ بیٹی کا اتنی دور سے خط آیا ہے پھر جب دل کو قرار آیا تو کھول کر پڑھا۔ یہ آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے جب فون کم اور خط زیادہ تھے۔ (والدین کی محبت اسی کا نام ہے دنیا میں بھی اور یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی ان کی دعائیں ساتھ رہتی ہیں۔) آپ سب کے لیے اور ادارے کی ترقی کے لیے نیک تمنائیں اور دعائیں آپ سب کی دعاؤں کی طالب...'' (بہت شکریہ پیاری بہن، آپ کی والدہ کی بدولت آپ سے ایک رشتہ ایک تعلق بن گیا۔ اب اپنے تبصرے بھیجتی رہیے گا۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ...)

فروا اکرام، فیصل آباد سے۔ ''میں اپنی آنٹی کے گھر گئی۔ وہاں پاکیزہ دیکھا۔ وقت گزاری کے لیے ورق گردانی شروع کردی۔ مگر... میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنی خوب صورت تحریروں سے سجا پاکیزہ تو میرے دل میں گھر کر گیا۔ اس کے تمام سلسلے مجھے بے حد پسند آئے ہیں۔ خاص طور پاکیزہ ڈائری، بزم پاکیزہ، میں اکثر گنگناتی ہوں وغیرہ... اس کے علاوہ ابھی افسانے زیادہ نہیں پڑھ پائی مگر میں اب اس کی باقاعدہ قاری بن چکی ہے۔ آئندہ ماہ میں خود منگوا کر پڑھا کروں گی۔ اتنے اچھے شمارے کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ اس لیے آپ کی محنت کی داد دینا چاہوں گی۔ پہلی بار خط لکھ رہی ہوں، میری ہینڈ رائٹنگ شاید آپ کو مسئلہ پیدا کرے، اس لیے معذرت چاہوں گی، آخر میں پاکیزہ کی پوری ٹیم کو سلام۔'' (وعلیکم السلام عزیزی فروا آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی..... نوازش..... بس اب پاکیزہ پڑھتی رہیں اور رائے دیتی رہیں)

تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''انجم انصار صاحبہ کے شوہر کے انتقال کا سن افسوس ہوا۔ دلی دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور انجم باجی اور بچوں کو صبر جمیل دے اور شمیم فضل خالق کے شوہر کی بھی اللہ مغفرت فرمائے۔ اللہ بہن شمیم کو بھی دلی صبر دے۔ ہمیں آپ کے شدت غم کا اندازہ ہے کیونکہ ہم بھی اس تکلیف اور غم سے گزر چکے ہیں۔ (جزاک اللہ ... اللہ پاک ہی غم میں صبر و حوصلہ عطا کرتا ہے) اس ماہ کے افسانے کچھ مختصر ہونے کے باوجود بھی عمدہ اسٹوری ہونے کی وجہ سے بہت اچھے لگے خاص طور پر فوزیہ احسان کا سوا لاکھ کا ہاتھی دل دکھا گیا ان کے افسانے کو عمدہ کہہ سکتے ہیں۔ دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی سعدیہ قریشی کی کہانی بھی اچھی لگی اور جناب حوریہ بتول نے انا کی قربانی بھی بہت خوب لکھا۔ وردہ بخاری کے کام اور کورونا کو بھی لائق توصیف کی سند دیتے ہیں اور آئیں تیاری کریں راشدہ سعدیہ کی تحریر بھی دل کو لگی لگتا ہے، اس کورونا نے بہتوں کو نیک بنا دیا ہے لیکن اللہ سے دعا ہے کہ اس مہلک وبا سے ہم سب کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، آمین اور صدف آصف کا محبتوں سے گندھا التجا بھی مزہ دے گیا اور سب سے شاندار، جاندار افسانہ ناہید سلطانہ اختر کا تریج کا سفر لگا انہیں مبارک باد اور سلام کہیے (جی ضرور) البتہ طیبہ عنصر مغل کی کہانی کیسی ریت کیسے رواج بالکل پسند نہیں آئی کیسے الٹے سیدھے عجیب و غریب رسم و رواج بتائے ہیں، ہم نے تو کبھی نہیں سنا نہ دیکھا۔ حالانکہ طیبہ بہت اچھی لکھاری ہیں لیکن اس بار انہوں نے مایوس کیا (گاؤں دیہات میں ایسا ہوتا ہے اسی پس منظر میں لکھی ہے) اور جناب مدیحہ شاہد کے پریوں کا دیس میں تو بڑا مزہ آرہا ہے ایسا لگ رہا ہے ہم بھی ان کے ساتھ سیر و تفریح کر رہے ہیں ایک سسپنس اور خوب صورتی ہے ان کے ناول میں، بہت خوب مدیحہ شاہد خوش رہیے اور عائشہ خان کا ایک سجدہ بھی اچھے انداز میں مکمل ہوا ان کے ناول کو بھی ہم نے پاس کر دیا اور جو بھی بیمار و پریشان ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ صحت و زندگی دے اور سب کی پریشانیاں دور کرے آمین۔'' (بہت شکریہ تفصیلی تبصرے کا)

فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ ''ماہ ستمبر کا پاکیزہ ملا ہمیشہ کی طرح خوب صورت ٹائٹل سے سجا ماہ محرم کا احترام کرتے ہوئے ماڈل سادگی اور خوب صورتی کا پیکر نظر آرہی ہے۔ اب کہانیوں کی طرف آتی ہوں۔ سوئی دھاگا، مہرین کنول بالکل حقیقی کہانی ہے، میں جب بچپن میں بہت چھوٹی تھی تو میری بڑی باجی سوئی دھاگے سے ہاتھوں سے میرے غرارے اور فراک سیا کرتی تھیں اس وقت ہمارے گھر میں سلائی مشین نہیں ہوتی تھی وہ اتنی ڈبل سلائی، گم سلائی کرتی تھیں کہ کیا مجال جو کسی کو پتا

چلیے کہ یہ ہاتھ کی سلائی ہے انہوں نے اپنا سارا جہیز اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔(واہ بھئی بالکل درست کہا اسی طرح پہلے زمانے میں سگھڑ بچیاں ہوتی تھیں) حقیقت کو چھوتی کہانی ہے اریبہ نے سوئی دھاگے کا کام سیکھ لیا تو سسرال میں دھاک بیٹھ گئی۔ کہانی چھوٹی ہو یا بڑی ہر کہانی کے اندر ایک پیغام چھپا ہوتا ہے جسے ڈھونڈ نا پڑھنے والوں کا کام ہوتا ہے۔(بالکل صحیح کہا) ترجیح کا سفر، ناہید سلطانہ اختر نے سچ لکھا ہے کہ ماں کے بغیر گھر نہیں چلتا مگر کبھی باپ بھی بچوں اور گھر سے اتنے مخلص ہوتے ہیں کہ گھر ٹوٹنے نہیں دیتے۔ باپ نے اتنی محنت اور پیار سے ماں، باپ دونوں کا کردار ادا کیا۔ بچے نیک تھے انہوں نے باپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کیسی ریت، کیسے رواج، طیبہ عنصر مغل صاحبہ نے جن رسومات اور رواجوں سے پردہ اٹھایا ہے گاؤں میں یہی کچھ ہوتا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہوتا ہے، لوگ انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کب میت اٹھے کب کھانا کھلے۔ عورتیں اتنے عجیب بین ڈال رہی ہوتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جب میت گھر سے نکلتے ہی کھانا کھلتا ہے تو لگتا ہے کہ شادی والا گھر ہے پھر سوئم پر رشتے داروں کے کپڑے اور پیسے وصول کر کے ایک کاپی پر لکھ رہے ہوتے ہیں، گویا مرنے والے پر قرض چڑھایا جا رہا ہوتا ہے۔ جسے ورثن کا نام دیا جاتا ہے۔(بس یہ اسلامی احکام سے دوری ہے اور کیا کہیں) سوالاکھ کا ہاتھی، فوزیہ احسان، انسان کی کتنی خواہش ہوتی ہے کہ میری بھی اولاد ہو جو بڑھاپے کا سہارا بنے اور اگر اولاد نیک ہو تو زندگی اچھی گزر جاتی ہے اگر اولاد بے پرواہ ہو تو انسان سوچتا ہے اس سے تو بے اولاد ہی اچھا تھا، آج یہ دکھ تو نہ دیکھنا پڑتا۔ مولوی فضل دین کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے بڑھاپے میں اولاد ہوئی مگر اس نے کوئی سکھ نہ دیا جب زندگی کی بازی ہار گیا تو اس کی موت کے صلے میں بیوی، بیٹے اور بہو کو دولت مل گئی۔ سچ ہے زندہ ہاتھی لاکھ کا مرا ہوا سوالاکھ کا۔ بڑی عمدگی سے کہانی کا اینڈ کیا ہے۔ آئیں تیاری کرلیں.....راشدہ سعدیہ، انا کی قربانی، حوریہ بتول، نگینہ، ہما بیگ، بڑے کام کی چھوٹی بات، افشین نعیم .....تقریباً تمام کہانیاں ایک سے بڑھ ایک ہیں سب پر بڑی محنت کی گئی۔ تمام سلسلے وار ناول بہت اچھے جا رہے ہیں۔ مکمل ناول، پریوں کا دیس میں سالار کی انٹری ہو رہی ہے، دیکھیں کہانی کس موڑ پر جاتی ہے۔(جی اب تو پڑھ لی ہوگی) محترمہ انجم انصار صاحبہ کے شوہر کی وفات کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس اعلیٰ مقام عطا کرے، انجم انصار، عظمیٰ آفاق اور تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ میری طرف سے دلی تعزیت ان تک پہنچا دیں۔ شکریہ۔"(جی بالکل پہنچا دی گئی ہے اللہ پاک ہی مشکل ڈالتا ہے وہی صبر دیتا ہے، تبصرے کا شکریہ، بہت دقیق تبصرہ کیا خوش رہیں اسی طرح شامل ہوتی رہیں)

❁ شہلا نواز، لاہور سے۔"ٹائٹل گرل کا میک اپ اور اس کا چونڈیا بالکل بھی اچھا نہیں لگا اس سے اچھا تھا کہ کسی گنجی حسینہ کا سرورق لگا دیتے۔(اچھا وہ قبول کر لیتیں) میرا سارا زنگ اتار دو آخر یہ ناول کب ختم ہوگا اور کس پلیٹنگ پاؤڈر سے یہ زنگ اترے گا۔(ہاں شہلا ناول پڑھتی رہیں اینڈ اتنی جلدی کیوں جاننا چاہ رہی ہیں، رائٹر نے بھی تو کچھ سوچا ہوا ہے ناں پیاری۔) ترجیح کا سفر اچھی لگی۔ کیا یہ ناہید کی آپ بیتی ہے۔(اچھی رائٹر کا یہ کمال ہوتا ہے کہ اس کی تحریر حقیقت لگنے لگے) ابو کی قربانی بلکہ قربانیاں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے کچھ مرد بھی باوفا ہوتے ہیں (جی بالکل) سوئی دھاگا بھی پسند آئی لیکن یہ پہلی دفعہ سنا بلکہ پڑھا ہے کہ ہاتھ سے بھی سوٹ سلائی ہوتے ہیں۔(پیاری شہلا پرانے زمانے میں سگھڑ عورتیں سوئی دھاگے سے سلائی کرتی رہتی تھیں، ہماری نانی، دادی وغیرہ بھی کرتی تھیں۔) کیسی ریت کیسے رواج پڑھ کر ہمارا تو دم ہی گھٹ گیا۔ گاؤں میں تو بندہ کبھی شادی نہ کرے، شہری لڑکیاں گاؤں میں بہت مشکل سے ایڈجسٹ کر پاتی ہیں۔ آئیں تیاری کرلیں بھی اچھی اسٹوری تھی۔ کودو نانے تو بڑے، بڑوں کو سیدھا کر دیا ہے۔ لاک ڈاؤن کے دوران اسکول بند تھے۔ بھانجے کی آن لائن اسٹڈی کی وجہ سے ہم نے مجبوراً نیٹ لگوالیا امی جان ہر وقت ٹی وی پر بری، بری خبریں سن کر خود بھی ڈرتی تھیں ہمیں بھی ڈراتی تھیں۔ ہم نے ان کو بچے موبائل دلوا کر نیٹ پر لگا دیا اب ٹی وی تو ہو گیا بالکل بند امی جان ہیں اور نیٹ فارغ وقت میں امی جان نیٹ پر باغبانی اور کوکنگ کے پروگرام دیکھتی رہتی ہیں ہم نے ان کا نام ہی نیٹ کا کیڑا رکھ دیا ہے لوگوں کے بچے خراب ہوتے ہیں اور ادھر ہماری امی بگڑ رہی ہیں۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا (اس نیٹ نے بہت ہنرمند پیدا کر لیے ہیں بھئی اتنے دنوں بعد آئی ہو تحریر دیکھ کر اچھا لگا۔ خوش رہو) انجم آنٹی اور شمیم فضل خالق دونوں کے شوہروں کو اللہ جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور اہل خانہ کو صبر جمیل۔"(الٰہی آمین)

❁ شمیما جعفری، سوشل ورکر شارجہ سے۔"اس وبا کی وجہ سے ہونے والے لاک ڈاؤن نے سب کی ہی زندگیوں پر

اثر ڈالا اور سب سے پہلے تو ہم اپنے چاہنے والوں سے ہی دور ہو گئے اور جو وطن میں ہیں ان سب کی صحت کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ ویسے اپنی بہنوں کو ایک نسخہ بتاؤں کہ نزلہ، زکام، کھانسی گلے میں درد سینے میں بلغم کے لیے اپنی چائے میں ادرک اور ہلدی، شہد کا استعمال ضرور کریں۔ اور کلونجی اور اجوائن پانی میں ڈال کر اسٹیم لیں اور ہو سکے تو غرارہ بھی اسی پانی سے کریں بہت فائدہ ہوگا...... اب تو حالات کچھ بہتر ہیں ورنہ گروسری کرنا بھی مشکل تھا۔ صفائی کا خبط ہو گیا تھا اور گھر میں ہر آنے والے سے ڈرتے تھے۔'' (شکر ہے کہ اب زور کم ہوا)

✉ عنیزہ سید، لاہور سے۔ ''مزاج بخیر نزہت (الحمدللہ) ماہ اگست میں مدیحہ شاہد کے مکمل ناول، پریوں کے دیس کی پہلی قسط پڑھی بہت پسند آئی۔ انجم انصار کے شوہر کے انتقال کا پڑھا بہت افسوس ہوا، بہت دکھ محسوس کیا، اللہ پاک ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ انجم باجی کا نمبر مس ہو گیا ممکن ہو تو شیئر کیجیے گا۔ (جی ضرور) پاکیزہ تو مسلسل میرے مطالعے میں رہتا ہے۔''

✉ شاہینہ مبارک، ہالہ سے۔ ''آپ لوگ سب کیسے ہیں ستمبر کے پاکیزہ میں انجم آنٹی کے شوہر کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ دلی دکھ... ہوا میری طرف سے تعزیت پہنچا دیجیے گا آنٹی سے بھی بات ہوتی رہتی تھی اور سب رائٹر کیسی ہیں سب ہی اچھے سے لکھ رہی ہیں، شیریں حیدر کی کہانیاں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں، دل سے لکھتی ہیں لگتا ہے ہر گھر کی ..... کہانی ہو بہت گہرائی سے دیکھتی ہیں، سب کو میری طرف سے سلام اور دعائیں، عذرا آپی کی تحریر دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، محفل مین باقاعدگی سے آتی ہیں، ہم سب کا حوصلہ بڑھاتی ہیں، ہم سب بہت محبت کرتے ہیں۔ بارشوں نے یہاں بھی بہت برا حال کیا بس اللہ کی رحمت ہے۔ اللہ بندوں کے لیے تو بہتر ہی کرتا ہے۔ ہم اپنے ہاتھوں کام خراب کرتے ہیں۔ اللہ ہدایت دے، ہر حال میں شکرِ خدا ادا کرنا چاہیے۔ میں نے بہت دنوں بعد اپنی رائے دی ہے شکر ہے کورونا کا زور کم ہوا۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا رحم کرے، آمین۔'' (بہت شکریہ دعاؤں کے لیے... ہاں دو، تین ماہ سے تمہاری غیر حاضری لگ رہی تھی، کزن کی شادی کی بہت، بہت مبارک باد ہو۔ شیریں حیدر بھی جلد آرہی ہیں نئی کہانی کے ساتھ)

✉ غزالہ عزیز، کراچی سے۔ ''پہلے تو میں ان بہنوں کا شکریہ ادا کروں گی کہ جنہوں نے میرے والد کی وفات پر تعزیتی پیغام دیے۔ آپی انجم انصار کے شوہر کی تعزیت ان تک ضرور پہنچا دیں اب ان کے گھر تو میں نہیں پہنچ پائی مگر دلی افسوس ہوا۔ اللہ پاک انجم باجی کو صبرِ جمیل عطا کرے اور ان کے شوہر کی مغفرت ہو، الٰہی آمین......'' (جی ضرور، تمہاری تعزیت پہنچا دی گئی ہے)

✉ عصمت آپا، اوکاڑہ سے۔ ''مجھے ستمبر کے پاکیزہ میں انجم انصار کے شوہر اور شمیم فضل خالق کے شوہر کی وفات کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ انجم سے تو میری بات چیت رہتی تھی بس ان سے اتنا کہنا ہے کہ جانے والے تو چلے جاتے ہیں پیچھے اپنے پیاروں کو تڑپتا چھوڑ جاتے ہیں ایسے لگتا ہے جیسے دنیا ہی ختم ہو گئی ہو (بالکل درست کہہ رہی ہیں آپا) میری دو بہنیں ایک بڑی آپا اور ایک چھوٹی بہن اور کزن جلدی، جلدی اس دنیا سے ... چلی گئیں۔ عزیز رشتے داروں کے بغیر کیا زندگی ہے، میری طرف سے ضرور تعزیت کر دیں۔ پاکیزہ کے ذریعے ہم سب آپس میں جڑے ہوتے ہیں، اللہ پاک مرحومین کو اعلیٰ درجات عطا کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا ہو، الٰہی آمین۔'' (جزاک اللہ عصمت آپا، آپ سب کے غم، خوشی میں برابر کی شریک رہتی ہیں، اللہ پاک آپ کو صحت سے رکھے، آمین۔)

☒ حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ۔ تم کافی محنت کر رہی ہو، ان شاء اللہ ایک دن اچھی شاعرہ بن جاؤ گی، تمہارے بھیجے گئے مراسلات اور شاعری کچھ اصلاح کے بعد لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تمہاری مدد کرے کہ تم گھر بار بھی سنبھالتی ہو۔ بچوں کی تعلیم کو بھی دیکھتی ہو اور رشتے داریاں بھی نبھاتی ہو اور پاکیزہ محفل میں بھی شامل ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہو۔ تمہارا زورِ مطالعہ اور زورِ قلم اور زیادہ ہو کوشش جاری رکھو۔ یہ اچھی بات ہے کہ تمہارے شوہر اور گھر والے تمہارے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے ہیں۔ خوش رہو اور اب تفصیلی تبصرہ بھی بھیجنا۔

✉ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی سے۔ ''عزیزی نزہت پچھلے دنوں کافی طبیعت خراب رہی، کمر میں کافی درد تھا۔ کچھ بارش، لاک ڈاؤن اور طبیعت خرابی کے باعث رسالے نہ پڑھ سکی۔ یہاں تو بارش زحمت ہی بن جاتی ہے۔ لوگوں کا بہت نقصان ہوا میری نواسی کے گھر...... کا بیسمنٹ اور اس میں موجود سامان سب تباہ و برباد ہو گیا۔ کیا کریں، کس سے فریاد کریں ہر کوئی اپنی مشکل میں پڑا ہوا ہے بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔ ذمّے داران اپنا کام صحیح طریقے سے کریں تو عوام اتنی مشکلات نہ اٹھائیں مگر ہم میں بھی شہری شعور کی کمی ہے بس

اس دوران سب پاکیزہ بہنوں کو دعاؤں میں یاد رکھا۔“ (شکریہ آپا آپ کی چند سطریں ہی کافی ہیں۔ اللہ آپ کو صحت سے رکھے)

✍ ثمینہ کوکب، جہلم سے۔ ”اگست کا ماہنامہ خوب صورت ٹائٹل سے سجا ہوا اپنی خوب صورت و پُراثر تحریروں کے ساتھ دل کو بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے تو انجم انصار صاحبہ کے شوہر کا پتا چلا دل دکھ و غم سے بھر گیا۔ شمیم فضل خالق صاحبہ کے شوہر کی وفات کے بارے میں پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ انجم انصار صاحبہ اور شمیم فضل خالق صاحبہ کو یہ عظیم غم برداشت کرنے کی ہمت و حوصلہ عطا فرمائیں، اور مرحومین کو بلند درجات پر فائز کر کے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں آمین یارب العالمین... سب بیماروں کی صحت و زندگی کے لیے دعا ہے کہ شفائے کاملہ والی زندگی عطا ہو، ساتھ ہی اپنی والدہ صاحبہ کی صحت و زندگی کے لیے خصوصی دعا کے لیے التماس ہے اللہ پاک میری والدہ صاحبہ کو صحت شفا... وزندگی عطا فرمائیں اپنے پیارے حبیبؐ کے صدقے میں آمین یارب العالمین۔ اداریے میں نزہت اصغر صاحبہ نے ہمیشہ کی طرح اپنے خوب صورت الفاظ کے سحر میں ہمیں جکڑ لیا۔ دین کی باتیں اور نبی کریمؐ کے اسمائے گرامی پڑھ کر ذہن و دل کو ایک سکون اور سرشاری ملتی ہے۔ اختر شجاعت صاحبہ کا رضا... توفیق الٰہی ہمیشہ کی طرح زبردست، پُراثر تحریر تھی۔ اے کاش ہم سب ہمیشہ اللہ کی رضا میں خوش رہنے کے عادی ہو جائیں۔ اختر شجاعت صاحبہ آپ کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے ہر موضوع کے اوپر بہت پیارا اور پُراثر لکھتی ہیں۔ اللہ قلم کی طاقت مزید بڑھائے، آمین (بس دعاؤں میں یاد رکھیں) انداز نو بھی بہت دلچسپ تھا۔ عوام میں شہری شعور کی کمی اور اس کی بہتری کی صورت شائستہ زریں صاحبہ کا بہت بہترین سروے تھا۔ میرا سارا زنگ اتار دو، افشاں آفریدی اور میں عشق ہوں، نایاب جیلانی بہت خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ میں انمول بھی بہترین جا رہا ہے۔ فرحین اظفر صاحبہ کا ع عورت ف فائدہ اچھی تحریر تھی۔ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کا ترجیح کا سفر دل کو بہت بھایا۔ دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی، سعدیہ قریشی، کام اور کورونا، وردہ بخاری... فوزیہ احسان، سوا لاکھ کا ہاتھی، ایک سجدہ، عائشہ خان، بڑے کام کی چھوٹی بات، افشین نعیم، طیبہ عنصر مغل کا کیسی ریت، کیسے رواج، اور مدیحہ شاہد کا مکمل ناول پریوں کا دیس بہت اچھے لگے۔ باقی تمام مستقل سلسلے بھی بہترین تھے۔ عذرا آپی کے ذکر کے بغیر خط ادھورا بہنوں کی محفل ادھوری ہے، کچھ باتیں اپنی بہنوں سے پڑھے بغیر دل کو سکون نہیں ملتا۔ اللہ پاک عذرا آپی کو بہت سی خوشیاں اور صحت و زندگی عطا فرمائیں، آمین۔ یارب العالمین...... آخر میں تمام پاکیزہ بہنوں اور تمام پاکیزہ اسٹاف کے لیے بہت پُرخلوص دعائیں اور سلام......“ (جزاک اللہ ثمینہ پیارے سے تبصرے اور دعاؤں کے لیے بہت نوازش)

✍ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ”اختر شجاعت نے رضائے الٰہی پر لاجواب مضمون لکھا ہے لیکن مجھے ایک جگہ تھوڑا سا اختلاف ہوا باوجود اس کے کہ ان کی معلومات اعلیٰ اور میری ناقص ہیں حضرت ابوسلمان فرماتے ہیں۔ ”رضا یہ ہے کہ نہ تو اللہ سے جنت مانگے نہ دوزخ سے پناہ طلب کرے۔“ حالانکہ ہماری دعاؤں کی ابتدا مرحومین کے لیے یہی ہوتی ہے اور اپنے لیے بھی کہ اللہ مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام دے، دوزخ کی آگ سے پناہ دے، محفوظ رکھے۔ (ہاں بے شک دعا تو ہوتی ہے مگر یہاں اختر صاحبہ راضی برضا ہونے کی منزلت بتا رہی ہیں ویسے وہ بے حد مستند علما، مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کرتی ہیں اور وہی اس کا بہترین اور تسلی بخش جواب دے سکتی ہیں) مضامین تو سارے ہی اچھے ہیں مگر سلسلے وار نہ پڑھنے کے باوجود ایک سجدہ کی آخری قسط پڑھ لی...... لاجواب، بے مثال اور بامقصد عائشہ خان نے کمال کر دیا ہے اس مرتبہ فرحین اظفر کی تحریر نے مزہ نہیں دیا اس عورت کی قربانیوں کا یہ صلہ ملنا تھا......؟ افشین نعیم نے بڑے کام کی چھوٹی بات میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، پتا نہیں بہوؤں کے آتے ہی ساسیں خود کو عضوِ معطل کیوں سمجھنے لگتی ہیں، نند ہو تو ایسی لاجواب، بہت اچھا لگا اور حقیقت سے پُر کہانی تھی اور مدیحہ شاہد تو چھا گئی ہیں اس قدر خوب صورت منظر نگاری کہ دل کر رہا ہے فوراً بہاول پور پہنچ جاؤں تجسس سے بھرپور کہانی منظر کشی بے مثال...... (جی آپ کی رائے پہنچا دی گئی) شمیم فضل خالق کے شوہر کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ بہت اچھی رائٹر ہیں اور شاید پشاور میں رہتی ہیں (جی بالکل) اللہ مصنفین پر رحم کرے، یہ سال بہت بھاری لگ رہا ہے۔ تسنیم کوثر کی محبت کہ انہوں نے اتنے اچھے لفظوں میں یاد رکھا۔ لیکن پُلوں کے نیچے سے پانی گزر چکا ہے انہوں نے مجھے میری کم عمری میں دیکھا تھا اب نانی، دادی بن چکی ہوں۔ اللہ سب کو خوش رکھے اور ہر آفت و بلا سے بچائے۔ الٰہی آمین۔“ (بہت شکریہ تبصرے کا، آپ کو رسالہ دیر سے ملا لیکن پھر بھی بروقت اپنی رائے سے آگاہ کر دیا اللہ آپ کو صحت و سلامتی سے رکھے۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ......)

مسکان نور، لاڑکانہ سے۔ ''آج 19 اگست کو پاکیزہ ملا ہے۔ میں نے تو خوشی سے چیخیں ماری اور چھلانگیں بھی... ہنسے گا مت... ہی ہی ہی (ارے تمہارے انداز پر پیار آرہا ہے ہنسی نہیں) مجھے لگتا تھا یہ یہاں پر نہیں ملتا۔ میرا سارا رنگ اتار دو، تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہے میرے پاس، آپی تبصرہ کرنے کا بہت جی چاہ رہا ہے لیکن کر نہیں سکتی کیونکہ خط پوسٹ بھی کروانا ہے۔ پلیز آپی خط ضرور دیجیے گا۔ (دیکھو آ گیا ناں) آپی اگر اس مہینے میرا خط نہیں دیں تو اگلے مہینے ضرور دیجیے گا، مہربانی ہوگی آپ کی۔ اقراجٹ اور جینا کے خط مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' (مختصر خط کا شکریہ، اپنی رائے ضرور دیا کریں کہانی کے لیے فی الحال معذرت ہے کہ مطالعہ کریں اور لکھنے کی مشق جاری رکھیں)

شہلا شاہد، اسلام آباد سے۔ ''اس دفعہ پاکیزہ کی شارٹج کیوں ہوگئی..... ہمیں بہت محسوس ہوئی، بہت دکانیں ڈھونڈنے کے بعد ملا۔ لاہور سے میری بہن نیلوفر کو بھی تلاش بسیار کے بعد ملا..... آپ لوگ زیادہ تعداد میں یہاں بھیجا کریں تاکہ پاکیزہ کے دیدار کو ترسنا نہ پڑے۔ میری والدہ تو پاکیزہ پڑھے بنا رہ نہیں سکتیں ان کے لیے کسی طرح سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر لائی۔'' (بہت معذرت شہلا کہ آپ کو اپنا پسندیدہ ماہنامہ ڈھونڈنے میں اتنی دشواری ہوئی۔ آئندہ ایجنٹس کو زیادہ تاکید کریں گے کہ شاپس تک ہر ممکن ترسیل آسان بنائی جائے۔ آپ سالانہ خریدار بھی بن سکتی ہیں۔)

جی تو پیاری بہنو! اس ماہ کی محفل کے اختتام کا وقت آ گیا ہے آپ سب سے گزارش ہے خطوط جامع اور بھرپور ہو کبھی، کبھی تو تفصیلی خط چل جاتا ہے مگر ہر مرتبہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ نومبر میں دلہن نمبر ہوگا اگر آپ لوگ شادی کا احوال یا تصاویر بھیجنا چاہیں تو 10 اکتوبر تک ارسال کر دیں۔ کسی ماہ تبصرہ چھپنے سے رہ جائے تو دل برداشتہ نہ ہوا کریں ہم آپ کی دلچسپی، خلوص اور محنت و محبت سے لکھے گئے تبصروں کی دل و جان سے قدر کرتے ہیں۔ آپ کی رائے، تنقید، تبصرے سر آنکھوں پر۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کا ہمدرد، غم خوار، خیر خواہ اور غم گسار بنائے رکھے۔ الٰہی آمین۔ انہی سطور کے ساتھ اجازت کہ پروردگار عالم ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، محبت و سلامتی سے رکھے اور ہم سب کے ساتھ خیر کے معاملات ہوں..... ہم سب کی دنیا و آخرت کی منازل آسان ہوں، بے شک ہمارا رب ہی دعاؤں کا مستجاب کرنے والا ہے۔ الٰہی آمین.....

آپ کی خیریت کی طالب..... نزہت اصغر

چند گزارشات عرض ہیں

1۔ تمام لکھنے والوں اور تبصرہ کرنے والوں کے لیے لازمی ہے کہ صاف اور واضح لکھائی میں لکھیں۔ 2۔ اپنا نام و پتا رابطہ نمبر ضرور لکھیں۔ 3۔ خط کتابت کے لیے دو پتے دیے جاتے ہیں ایک دفتر کی بلڈنگ کا ایڈریس دوسرا پوسٹ بکس نمبر..... یہ آپ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پوسٹ بکس نمبر پر رجسٹرڈ پوسٹ نہیں جاتی یہ آپ کے علاقے کے ڈاک خانے کے عملے کو معلوم ہے اور انہیں آپ کو ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ 4۔ کوریئر یا رجسٹری کرنا ہو تو دفتر کا پتا لکھا کریں تاکہ ڈاک بہ آسانی پہنچ جائے ورنہ پوسٹ بکس سے پہنچ تو جاتی ہے مگر بہت دن لگ جاتے ہیں اس لیے خوب دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر ڈاک روانہ کیا کریں۔ عام ڈاک تو پوسٹ بکس پر پہنچ جاتی ہے مگر رجسٹری نہیں رسید کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔ 5۔ اپنی نگارشات بھیجنے کے ہفتہ دس دن بعد درج ذیل نمبروں پر رابطہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

ڈائریکٹ نمبر 02135386783 صبح 10 بجے سے شام 5 بجے۔ 02135802552 Ext 107-122 صبح 10 سے شام 5 بجے۔ 02135895313 Ext 107-122

موبائل نمبر۔ 03316266612 صبح 11 بجے سے شام 4 بجے فون کریں میسج کسی بھی وقت send کر سکتی ہیں۔

جوابی لفافہ کا انتظار کریں۔ جواب ضرور دیا جاتا ہے اگرچہ کچھ دیر سے ہی سہی۔ امید ہے ہماری پیاری اور بے حد سمجھدار بہنیں ان وضاحتوں کو خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوں گی۔ اب دفتر کا پتا بھی نوٹ فرمالیں محفل کے آغاز میں پی او باکس اور ای میل ایڈریس واضح لکھ دیا گیا ہے۔

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

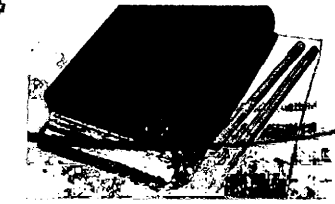

پاکیزہ ڈائری

آمنہ حماد

حمد باری تعالیٰ

ہمیں اللہ نے بھیجا اسی کے پاس جانا ہے
بہت اچھا کریں کچھ ہم سب ہی کچھ لے کے جانا ہے
بہت سی ساعتیں ایسی کہ اُن کی یاد آتی ہے
انہیں یادوں کے بل بوتے پہ رب کے پاس جانا ہے
الٰہی تو مجھے توفیق دے کام آؤں لوگوں کے
دعائیں ہیں انہی لوگوں کی جن کو لے کے جانا ہے
مجھے اپنے خدا پر ہے یقیں وہ معاف کردے گا
نبیؐ کی بھی شفاعت کا سہارا لے کے جانا ہے
خفا ہوگئے مجھ سے انہیں کیسے مناؤں میں
دعائیں ان کے حق میں کر کے ان سب کو منانا ہے
یہی ہے التجا سب سے میرے حق میں دعا کرنا
تمہاری ان دعاؤں کو تو میرے ساتھ جانا ہے

کلام: ذکیہ بلگرامی

نعت رسول مقبولؐ

خدا کا ذکر کرے ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے
ہمارے منہ میں ہو ایسی زبان خدا نہ کرے
درِ رسولؐ پہ ایسا کبھی نہیں دیکھا
کوئی سوال کرے اور وہ عطا نہ کرے
کہا خدا نے شفاعت کی بات محشر میں
مرا حبیب کرے کوئی دوسرا نہ کرے
مدینے جا کے نکلنا نہ شہر سے باہر
خدانخواستہ یہ زندگی وفا نہ کرے
اسیر جس کو بنا کر رکھیں مدینے میں
تمام عمر رہائی کی وہ دعا نہ کرے
شعورِ نعت بھی ہو اور زبان بھی ہو ادیب
وہ آدمی نہیں جو ان کا حق ادا نہ کرے

کلام: ادیب رائے پوری
پسند: صباحت ضیا بنگش، کراچی

مناجات

خداوند تو مجھ کو دولتِ ایماں عطا فرما
جو تیری یاد میں بے چین ہو وہ جاں عطا فرما
غبارِ بارِ عصیاں کو میرے یکسر جو دھو ڈالے
مرے مالک! مجھے وہ دیدۂ گریاں عطا فرما
مرا تن، میرا دل، تیری عبادت سے نہ غافل ہو
لگن اپنی عطا کر، سینۂ بریاں عطا فرما
کچل ڈالا جو نمردوں نے شرِ نفس و شیطاں کو
مجھے بھی ان کے صدقے جرأتِ مرداں عطا فرما
رگوں میں میرے حب مصطفیٰ ہو موجزن یارب!
سکونِ دل عطا فرما، قرارِ جاں عطا فرما
طریقِ احمدِ مرسل پہ مجھ کو استقامت دے
میرے سینے میں یارب حکمتِ قرآں عطا فرما
اسیر نفس سرکش ہوں مرا ہر کام ناکارہ
دلِ مردہ ہوں میرے درد کا درماں عطا فرما

کلام: ڈاکٹر نور محمد ربانی
پسند: ماہ نور خان، بہارہ کہو

سعادت

حضرت وہب بن قابوسؓ مسلمان ہونے کے بعد اپنے گاؤں چلے گئے وہاں عبادت کرتے اور بکریاں چراتے۔ کافی عرصہ گزر گیا ایک دن نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ مدینہ تشریف لے آئے کیا دیکھتے ہیں کہ مدینہ شہر میں نابالغ بچے اور عورتیں ہیں کوئی مرد

نظر نہیں آیا تو حیران ہو گئے۔ خواتین سے پوچھا انہوں نے کہا کہ تمام مرد کافروں سے جنگ کرنے گئے ہیں۔ آپ بھی چل پڑے اور احد میں پہنچ گئے لڑائی میں شامل ہو گئے جب جنگ کا پانسہ پلٹ گیا کافروں نے حضور پاکؐ پر یلغار کر دی مسلمان تڑپ کر آپ کی حفاظت کے لیے آگے بڑھے جن میں حضرت وہبؓ بھی شامل تھے۔ آخر کار شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں اپنے مبارک ہاتھوں سے قبر کے سپرد کیا۔ حضرت عمرؓ حسرت کرتے تھے کہ کاش وہب کی جگہ میں ہوتا حضور پاک مجھے خود دفن کرتے۔

از: زرینہ غانم لغاری، مظفر گڑھ

خلافت ایسی ہوتی ہے

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پاس زکوٰۃ کا مال آتا ہے۔ فرمانے لگے غریبوں میں تقسیم کر دو۔ بتلا گیا کہ اسلامی سلطنت میں کوئی بھی فقیر نہیں رہا۔

فرمایا۔ اسلامی لشکر تیار کرو۔

بتلایا گیا۔ اسلامی لشکر ساری دنیا میں گھوم رہے ہیں۔

فرمایا۔ نوجوانوں کی شادیاں کر دو۔

بتلایا گیا۔ شادی کے خواہشمندوں کی شادیوں کے بعد بھی مال بچ گیا ہے۔

فرمایا۔ اگر کسی کے ذمے قرض ہے تو ادا کرو۔

قرض ادا کرنے کے بعد مال بچ جاتا ہے۔

فرمایا۔ دیکھو (یہودی اور عیسائیوں) میں سے کسی پر قرض ہے تو ادا کر دو یہ کام بھی کر دیا گیا...... مال پھر بھی بچ جاتا ہے

فرمایا۔ اہلِ علم کو مال دیا جائے ان کو دیا گیا۔ مال پھر بھی بچ گیا۔

فرمایا۔ اس کی گندم خرید کر پہاڑوں کے اوپر ڈال دو کہ مسلم سلطنت میں کوئی پرندہ بھی بھوکا نہیں رہے۔

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

سنہری حروف

☆ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بنے رہو تا کہ چھوٹی سے چھوٹی خوشی بھی بڑی لگے ورنہ بڑی، بڑی نعمتیں بھی ناشکرے پن سے واپس لے لی جاتی ہیں۔

☆ بعض اوقات خاموشی اختیاری نہیں مجبوری ہوتی ہے کیونکہ جھوٹ آدمی بولنا نہیں چاہتا اور سچ وہ بول نہیں سکتا۔

☆ خوب صورت بولو، ورنہ خاموشی سے خوب صورتی میں اضافہ کرو۔

☆ نظر اس وقت تک پاکیزہ رہتی ہے جب تک دوسری بار ارادتاً نہ اٹھے۔

☆ سمجھوتا کرنا سیکھو کیونکہ تھوڑا سا جھک جانا کسی رشتے کے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جانے سے بہتر ہے۔

از، نگہت غفار، کراچی

حبل اللہ

اتنی محنت سے کپڑے دھو کر رسی پر سکھانے کے لیے ڈال کر مڑی ہی تھی کہ ایک دم رسی ٹوٹی اور کپڑے نیچے گر گئے۔ بہت غصہ آیا لیکن پھر خیال آیا کہ جب ہم اللہ کی رسی کو چھوڑتے ہیں تو ایسے ہی گرتے ہیں اور گندے ہو جاتے ہیں۔

یقین اور دعا

خنکی بھری رات میں دونوں ہاتھ سوئیٹر کی جیبوں میں ڈالے سنسان گلی میں یہ سوچتا ہوا چلتا جا رہا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جو دعائیں مقبول نہیں ہوتیں۔

اسی اثنا میں ایک کتا نظر آیا۔ میں یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ ٹھنڈ سے کانپ رہا ہوں یا کتے کے ڈر سے۔ اللہ کا نام لے کر سہم سہم کر اس کے پاس سے گزرا اور دل میں دعا کی۔ یا اللہ......! یہ اب پیچھے نہ آئے۔ گلی کا موڑ آیا میں نے جیسے ہی دیکھنے کے لیے گردن گھمائی کہ وہ کہیں پیچھے نہ آ رہا ہو، اس وقت میرے ذہن میں جھما کا ہوا آہ بس......

یہی تو جواب تھا میرے سوال کا...... جب میں نے دعا مانگ لی تو میں نے گردن پیچھے کیوں گھمائی؟ ہم کہتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں پر سچ تو

یہ ہے کہ ہم اپنی دعاؤں کے قبول ہونے یا نہ ہونے پر تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ خدا کی ذات سوالی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ دعائیں رد نہیں ہوتیں بلکہ ہمارے ناقص یقین کی وجہ سے یا دیر سے مقبول ہوتی ہیں یا پھر اپنے اندر کوئی حکمتِ خداوندی رکھتی ہیں اور ہم مایوسی کا شکار ہو کر اپنے جیسے بندے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

مرسلہ نگار: جبین نیاز، ملتان

ہم انسان ہیں پیارے

سنو جاناں!
کبھی مجھ سے بچھڑنا ہو
بہانہ مت کوئی کرنا
کبھی پھر لوٹ آؤ گے
یہ وعدہ مت کوئی کرنا
تمہیں آزاد چاہا ہے
تمہیں آزاد رکھا ہے
تم مجھ کو چھوڑ جانے میں
یونہی آزاد ہو جاناں
کہ وعدوں سے پرے لمحے
نزع کے آخری پل تک
گزارہ کر بھی سکتے ہیں
ہم اپنی خوش گمانی کو
حدِ امکان سے آگے
سہارا کر بھی سکتے ہیں
پر اک سچ یہ بھی ہے جاناں
کہ ہم انسان ہیں پیارے
اچانک مر بھی سکتے ہیں

کاوش: ثمرہ قریشی، لاہور

ایکس کیوزمی

یہ دورِ جدید ہے بھلا دشت میں ملتے ہیں کہاں
فیس بک کے سب مجنوں پائے جاتے ہیں جیل میں
کل ہم نے آن لائن جو برانڈڈ منگوائے تھے
امروز وہی شوز کو کو بک رہے تھے سیل میں
ہر دوشیزہ اور بانکا سجیلا بال جھڑ سے گنجے ہو گئے
نہ جانے کیا ملا رہے ہیں اہلِ وطن سرسوں کے تیل میں
پاس لسٹ میں نظر نہ آیا دیکھا بارہا
اپنا رول نمبر دمک رہا تھا لسٹ آف فیل میں
نیٹ ورک والوں کے بھی قدم اکھڑ گئے تب
کچھ گھر بے چراغ ہوئے جب پب جی کھیل میں
زوجہ محترمہ نے فون کھڑکائے کراچی تا خیبر
میاں جی محترم ملے عیسیٰ خیل میں
غربا کی گڑ سے میٹھی، پی انہوں نے چائے پھیکی
کس درجہ معاشی بحران تھا امرا کے اسکیل میں
ماں بہنیں انگور مسلسل اور اس کی ناز برداریاں
بھلا کب نظر آیا برخوردار! تجھے اس جڑیل میں
ہم تو سمجھے یہ ہیں فقط نعرے آوے آوے کے
شیدا میدا منسٹر ہو گئے کھیل ہی کھیل میں
آتے ہی گراؤنڈ میں لوٹ جاتے ہیں پویلین فی الفور
کپتان سفارشی فقط لطف لے ہیڈ اینڈ ٹیل میں

کاوش: عظمیٰ مشتاق، نارووال

خوش رہنے کا فارمولا

۱۔ شکوے شکایات کم کیجیے اور خدا کی ان نعمات کا شکریہ ادا کیجیے جو اس وقت آپ کے پاس ہیں۔
۲۔ اپنے مسائل کے بارے میں کم سوچیں۔ ان کے حل کے لیے پوری کوشش کریں۔ نتیجہ خدا پر چھوڑ دیں۔
۳۔ صرف اتنی ذمے داری قبول کریں جتنی کر سکتے ہیں۔ اپنی سکت سے زیادہ کام لینے کی کوشش نہ کریں۔
۴۔ اپنے لیے وقت نکالیں، خدا سے باتیں کریں۔
۵۔ اردگرد کے لوگوں کو خوش رکھیے۔ یقین جانیں اس سے آپ کو ذہنی سکون ملے گا۔
۶۔ دوسروں کی برائیوں پر نظر مت رکھیں بلکہ اپنی اصلاح کی کوشش کریں۔
۷۔ قناعت پسندی اختیار کریں..... کھانے میں، لباس میں اور میل جول میں۔

از: زرینہ خان، بہارہ کہو

تدبیر

دو دوست بہت چالاک تھے۔ انہیں لاہور جانا

تھا مگر ٹرین میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ رات کے وقت انہوں نے شور مچادیا کہ بوگی میں سانپ آ گیا ہے۔ تمام مسافر خوف کے مارے ڈبے سے اتر گئے۔ دونوں دوست جلدی سے ٹرین میں سوار ہوئے اور کچھ ہی دیر میں برتھ پر سو گئے۔ ان کی آنکھ کھلی تو سامنے ایک قلی کھڑا تھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔

''بھائی صاحب! کیا لاہور آ گیا ہے؟''

قلی (حیرت سے) ''لاہور؟ جناب! رات اس ڈبے میں سانپ گھس آیا تھا اس لیے یہ ڈبا ٹرین سے کاٹ دیا گیا تھا۔''

☆☆☆

ایک شخص قبرستان سے گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان تازہ قبر پر بیٹھا پنکھا جھل رہا ہے۔ اس شخص نے نوجوان کے قریب جا کر پوچھا۔ ''محترم! آپ قبر پر پنکھا کیوں جھل رہے ہیں؟''

نوجوان نے کہا۔ ''جب میری بیوی کا انتقال ہوا تھا تو اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تک اس کی قبر کی مٹی گیلی رہے گی' میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔''

از: نگینہ ضیا بنگش، کراچی

پالیسی

رین ڈھلی، آنکھ جلی
سرد ہوائیں
بے درد فضائیں
یاد ڈھلی، بے کلی سی بے کلی
بے چینی ہی بے چینی
نین کٹورے..... اشک بھرے
دل کا عالم
کوئی نہ جانے کوئی نہ سمجھے
ہے یہ تیری یاد کا موسم
من کی نگری اجڑی، اجڑی
سوکھے پتے ویران، ویران
خالی شاخیں، تنہا نہیں
دیکھیں خالی رستہ ساجن
نگاہ اسی پر جمی ہوئی ہے
جیون میں بس تیری کمی ہے

کاوش: فصیحہ آصف خان، ملتان

غزل

بادل ہوں تو سرسراتی ہوا گدگدائے مجھے
کھل کے برسے بوندوں سے گدگدائے مجھے
بن کے برسوں ساون کی ایک لمبی جھڑی
خشک مٹی ہوں نم ہوا آ کے گدگدائے مجھے
ہوں اگر خوشبو بکھرا دے ہواؤں میں یونہی
ہوں جو غنچہ تو ہر تتلی گدگدائے مجھے
بن کے گرگھاس بچھوں سبز غالیچہ سا لگوں
اوس میں بھیگی ہر صبح گدگدائے مجھے
ہر اماوس میں بھی نکلے وہ قمر بن جاؤں
بن کے چاندنی کانسوں چھا کے گدگدائے مجھے

شاعرہ: طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی

دروغ گو

''کہیے کوئی چیز ہاتھ بھی لگی ہے یا صرف وقت ہی ضائع کر رہے ہیں۔'' پل پر بیٹھے ہوئے ایک اجنبی نے مچھلیوں کے شکاری کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''یعنی میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ ارے صاحب! کل میں نے کم از کم پچاس مچھلیاں اسی جگہ سے پکڑی تھیں۔''

''آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟''

''میں نہیں جانتا آپ کون ہیں؟''

''میں محکمۂ شکار کا انسپکٹر ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟'' مچھلیوں کے شکاری نے کچھ تامل کے بعد سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا آپ کون ہیں۔''

''میں اس علاقہ کا سب سے بڑا دروغ گو ہوں۔ میری بات پر یقین نہ کیجیے گا۔''

☆حمیرا انجم وحید .....واہ کینٹ

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

☆ثمرینہ قیصر.....کمالیہ

یہاں الفاظ بکتے ہیں تجارت ہے تخیل کی
محبت ایک پیشہ ہے تمہارے شہر میں محسن

☆زرینہ خانم لغاری.....مظفرگڑھ

تجھے اظہارِ محبت سے اگر نفرت تھی
تو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا
یونہی بے وجہ ٹھٹکنے کی ضرورت کیا تھی
دمِ رخصت اگر یاد نہ آیا ہوتا

☆ثوبیہ سرور.....سیالکوٹ

اس قدر دنیا کے دکھ اے خوب صورت زندگی
جس طرح تتلی کوئی مکڑی کے جالوں میں رہے

☆فصیحہ آصف خان.....ملتان

اب تو مشکل بھی ٹل گئی میری
دوست کیوں رابطہ نہیں کرتے

☆فضہ بتول.....بہارہ کہو

دشمنوں میں بھی ہے ہمدرد یقیناً کوئی
ورنہ پتھراؤ میں یہ پھول کہاں سے آتے

☆نرگس نسیم.....صابہ موہڑہ

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
دُکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا

☆افتخار شوق.....میاں چنوں

چاندنی چار سُو تھی نکھری ہوئی
بے سبب ہی تھے گل مہکنے لگے
اس نے دیکھا جو مسکرا کے مجھے
میرے سارے گلے بھی ڈھلنے لگے

☆مسکان نور.....لاڑکانہ

ہنستے ہوئے چہروں کو غموں سے آزاد نہ سمجھو
ہزاروں غم چھپے ہوتے ہیں ہلکی سی مُسکان میں

☆سعیدہ بانو.....لوئر مال، مری

اک یہی آس ہی کافی ہے مرے جینے میں
دل نہیں آپ دھڑکتے ہیں میرے سینے مین

☆انجم نیاز.....فیصل آباد

جس سے بندھے تھے دونوں وہ غم نہیں رہے ہیں
تم، تم نہیں رہے ہو ہم، ہم نہیں رہے ہیں
فکرِ معاش نے تو جذبوں کو روند ڈالا
عاشق وگرنہ ہم بھی کچھ کم نہیں رہے ہیں

☆فردوس شاہی.....سندھ

یہ دو کنارے تو دریا کے ہوگئے، ہم تم
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارہ ہے

☆غزالہ طارق.....سرگودھا

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشے میں
تمام عمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

☆ساجدہ پروین.....فیصل آباد

چہرے کی ہنسی سے ہر غم مٹادو
بہت کم بولو پر سب کچھ بتادو
خود نہ روٹھو اور سب کو منالو
یہ راز ہے زندگی کا جیو اور جینا سکھادو

☆ثمرینہ علی.....کراچی
وہ سب معصوم سے چہرے تلاشِ رزق میں گم ہیں
جنہیں تتلی پکڑنا تھی، جنہیں باغوں میں ہونا تھا
☆ایمن رانی.....ٹوبہ ٹیک سنگھ
چھوٹی اینٹوں سے بنا ہے حُجرۂ دل
گزرے وقتوں میں یہاں کس نے سکونت کی ہے
قیس و فرہاد کو لے بیٹھی ہے دنیا تابش
یہ نہیں سوچتی ہم نے بھی محبت کی ہے
☆فرخندہ جعفری.....گجرات
یہ دنیا کے سلسلے یوں ہی چلتے رہتے ہیں
مکاں یہی رہتے ہیں مکین بدلتے رہتے ہیں
☆نگہت آصف.....لاہور
موسم کوئی خوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
کیا، کیا ہم کو راتِ گئے تک وحشت رہتی ہے
پھولوں کی تختی پر جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سخن پر ایسے امجد شہرت رہتی ہے
☆ثمینہ کوکب.....جہلم
کیوں اداس بیٹھے ہو اس طرح اندھیرے میں
دکھ تو کم نہیں ہوتے روشنی بجھانے سے
کچھ سمجھ نہیں آتی شہر کے مکینوں کی
لوگ روٹھ جاتے ہیں آئینہ دکھانے سے
☆عرشیہ جنید.....کراچی
میری شانِ غم بھی جدا رہی
نہ کہی گئی نہ سنی گئی
☆ماہین مسعود.....رجانہ روڈ
جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح
☆ساجدہ ظفر.....کمالیہ
فیصلہ سچا کرو اے منصفو
ایک منصف اور ہے تم سے بڑا
☆زرمینہ خان.....بہارہ کہو
تمہارے سرد رویّے نے برف کر ڈالا
لہو میں اب وہ انوکھا ابال بھی نہ رہا

☆تسنیم کوثر.....کراچی
تیرا ہونا ضروری تھا، نہ ہونا بھی ضروری تھا
کسی بھی یاد کا ہستی میں ہونا بھی ضروری تھا
کہاں تک سوچتے رہتے اسے شامِ غریباں میں
تھکن اتنی سفر کی تھی کہ سونا بھی ضروری تھا
☆صائمہ خالد.....کمالیہ
اس دل کے بہلنے کو یہ سامان بہت ہے
وہ اپنی جفاؤں پہ پشیمان بہت ہے
اب کے بھی اجڑ جائیں گے بستی کے کئی گھر
اس سال بھی برسات کا امکان بہت ہے
☆ریحانہ بتول.....حیدرآباد
گلاب لمحوں کے مخمل پہ کھیلتے بچپن
پلٹ کے آ کہ میں تجھ سے شرارتیں مانگوں
☆آسیہ عامر.....کراچی
کچھ نہیں مانگتی تجھ سے اے میری عمرِ رواں
میرا بچپن میری گڑیا میرے جگنو لادے
☆تسنیم.....ایف بی ایریا
بات جو دل میں دھڑکتی ہے محبت کی طرح
اس سے کہنی بھی نہیں اس سے چھپانی بھی نہیں
☆سنبل ملک اعوان.....شاہدرہ، لاہور
جو بھی دیوار ہے رستے میں گرا کر رو لیں
آؤ اک دوجے کو سینے سے لگا کر رو لیں
سامنے تُو ہے تو ہم دل میں بھی رو سکتے ہیں
یوں کریں ہم تجھے باتوں میں لگا کر رو لیں
☆ایمن .....کمالیہ
تنہائیاں کچھ اس طرح سے ڈسنے لگیں مجھے
میں آج اپنے پاؤں کی آہٹ سے ڈر گیا
☆شاہینہ مبارک.....ہالہ
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
☆ماہین مسعود.....جنڈیوالہ
کرچیاں لگی دیکھیں ہر طرف منڈیروں پر
آب و دانہ کیا دیں گے ایسے گھر پرندوں کو
☆☆☆

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان ''امی کی ریسپی'' لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

چکن فجیتا پزا

اشیا ڈو۔ پزا کی روٹی بنانے کے لیے۔ پانی، تین چوتھائی کپ۔ چینی، دو چائے کے چمچ۔ خمیر۔ ایک چائے کا چمچ۔ تینوں چیزوں کو ملا کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

میدہ، دو کپ۔ نمک، آدھا چائے کا چمچ۔ کوکنگ آئل، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب اب جو خمیر ملے پانی کا مکسچر بنا کر رکھا ہے اسے میدے میں ڈالیں نمک اور آئل بھی ملا لیں اور درمیانی سی ڈو بنا لیں۔ تھوڑا پانی اور اگر چاہیے ہو تو ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ اب ڈو کو ایک گھنٹے کے لیے کچن ہی میں رکھ چھوڑیں۔

پزا کی فلنگ کے لیے اجزا: پیاز، دو عدد۔ درمیانی سائز کی آملیٹ کی طرح کاٹ لیں۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ٹماٹر، چوپ کیے ہوئے، دو کپ۔ ٹماٹو ساس، ایک کپ۔ سفید مرچ (دکی)، آدھی چائے کا چمچ۔ براؤن شوگر، ایک چائے کا چمچ۔

(نوٹ: روٹی کچی رہ جانے کا خدشہ ہو تو اسے توے پر ہلکا سا سینک لیں مگر زیادہ نہیں)

ورسٹر شائر ساس، ایک کھانے کا چمچ۔ اوریگانو، ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ کٹی، حسبِ پسند، لہسن چوپ کیا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ basil leaves، ایک چائے کا چمچ۔ شملہ مرچ، (چوپ کی ہوئی) آدھا کپ۔ زیتون کالے یا ہرے، حسبِ پسند مشروم حسبِ پسند چکن اسٹرپس (ابلی ہوئی)، ایک کپ۔ موزریلا چیز، ایک کپ۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔ چیڈر چیز، ایک کپ۔ لیمن جوس، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب ایک پین میں تیل اور لہسن ڈال کر پکائیں خوشبو اٹھنے پر ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر نرم ہو جائیں تو شملہ مرچ اور مشروم اگر پسند ہو تو ڈال دیں۔ اس میں حسبِ پسند نمک، سفید مرچ، لال مرچ ڈال دیں۔ ایک بڑے پتیلے میں اسٹینڈ رکھ کر دھیمی آنچ پر 30 سے 40 منٹ تک گرم کر لیں۔ اب کسی گول ٹرے جو کہ دھات کی ہو (پلاسٹک کی نہیں ہو) اس میں تیل لگا کر ڈو جو گوندھی ہے اس کی گول روٹی بیل لیں جو ایک انچ موٹی ضرور ہو اسے گول ٹرے میں رکھ کر کانٹے سے ہلکے، ہلکے نشان لگا دیں اب اس پر آئل لگا لیں اس کے اوپر ٹماٹو ساس کو پھیلا دیں اور سبزی جو سوتے کر کے رکھی ہے اسے پھیلا دیں۔ اب چکن اسٹرپ کو بھی سبزی کی طرح سوتے کر کے اس آمیزے پر پھیلا دیں پھر چیڈر چیز پھیلائیں .... باسل لیوز اور زیتون پھیلائیں۔ حسبِ پسند کٹی لال مرچ چھڑک دیں اور موزریلا چیز ڈال کر اس ٹرے کو پہلے سے گرم کیے گئے پتیلے میں رکھ دیں، آنچ دھیمی رکھیں تقریباً بیس سے پچیس منٹ میں پزا تیار ہے۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

بھنی ہوئی سویّاں

اشیا سویّاں، سو گرام۔ چینی، آدھا

کپ۔بادام پندرہ عدد۔پستہ، پندرہ عدد۔چھوٹی الائچی، چار عدد۔کھوپرا پسا ہوا، دو چائے کے چمچ۔تیل یا گھی، ڈیڑھ کھانے کا چمچ۔پانی، ایک گلاس۔

ترکیب: ایک پتیلی میں آئل گرم کریں اور سویاں توڑ کر اس میں ڈالیں اور دو سے تین منٹ ہلکی آنچ پر بھونیں اور پھر الائچی کے علاوہ بادام اور پستہ بھی کتر کر ڈال دیں۔(تھوڑا سا بادام، پستہ گارنشنگ کے لیے بچالیں) اب ایک گلاس پانی ڈال کر پکائیں۔ پانچ منٹ میں پانی خشک ہو جائے گا۔سویوں کو چولھے سے اتار کر کسی پلیٹ میں نکالیں اور بچا ہوا بادام، پستہ اور کھوپرا چھڑک کر گرما، گرما پیش کریں کیونکہ ٹھنڈا ہونے پر اس کی اصل لذت محسوس نہیں ہوگی۔

چکن گرل

اشیا: چکن، (بون لیس) آدھا کلو۔(چھوٹی بوٹی) پپیتا، (پسا ہوا) تین کھانے کے چمچ۔پسی لال مرچ، ڈیڑھ چائے کا چمچ۔پسا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔کوکنگ آئل، چھ کھانے کے چمچ۔

گارنشنگ کے لیے۔باریک کٹی ہوئی ہری مرچ، لچھے دار پیاز اور لیموں کے سلائس۔

ترکیب: چکن میں ادرک، لہسن کا پیسٹ، پپیتا، پسی ہوئی لال مرچ اور پسا گرم مسالا مکس کر کے آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ایک دیگچی میں تیل گرم کر کے مسالا لگی چکن کی بوٹیاں ڈال دیں اور دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔پانی خشک ہونے پر اچھی طرح سے بھون کر چولھے سے اتار لیں اور اب کوئلے کا دھواں دے کر چند منٹ کے لیے ڈھکن بند کر دیں بعد ازاں کسی برتن میں نکال کر اس پر آدھا لیموں نچوڑ دیں اور آدھا لیموں، کٹی ہوئی پیاز، ہری مرچ اور ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔

از: رابعہ شاہد، دبئی

کیوبز کا کشمیری سالن

اشیا: چکن کیوبز، ابال لیں۔دو عدد۔آلو، (چوکور کٹے ہوئے) ایک پاؤ۔دہی، ایک کپ۔پسا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ہلدی، آدھا چائے کا چمچ۔لونگ، چار عدد۔پسی کالی مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ادرک، (باریک کٹی ہوئی) دو چائے کے چمچ۔ہرا دھنیا، پودینہ، حسبِ پسند۔کوکنگ آئل، چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: آدھا کپ پانی میں کیوبز ڈال کر گھول لیں پھر فرائنگ پین میں کوکنگ آئل گرم کر کے اس میں لونگ، ادرک، ہلدی، گرم مسالا اور ابلے ہوئے آلو زیادہ ابلے ہوئے نہ ہوں) ڈال کر فرائی کر لیں۔ اب اس میں کیوبز کی یخنی اور دہی پھینٹ کر اچھی طرح ملائیں اور اسے ڈھانپ کر تھوڑی دیر کے لیے پکنے دیں۔پانچ منٹ کے بعد ہرا دھنیا، پودینہ اور کالی مرچ چھڑک کر پیش کریں۔

شاہی دال

اشیا: مونگ، ارہر، چنے اور مسور کی آدھا، آدھا کپ۔دودھ، دو کپ۔ٹماٹر باریک کٹے ہوئے، تین عدد۔کریم، پاؤ کپ۔مکھن، پاؤ کپ۔ہری مرچ، باریک کٹی ہوئی، چار عدد۔لیموں کا رس، تین کھانے کے چمچ۔لال مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔

تڑکے کے اجزا: کوکنگ آئل، پون کپ۔لہسن باریک کٹا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔پیاز باریک کٹی ہوئی، ایک عدد چھوٹی۔لال مرچ ثابت۔7 یا 8 عدد۔

ترکیب: سب دالوں کو الگ، الگ اچھی طرح ابال لیں، اب پتیلی میں مکھن درمیانی آنچ پر پگھلا لیں جس میں تمام دالیں بغیر پانی کے ڈال دیں۔اب اس میں دودھ اور کریم ڈال کر درمیانی آنچ پر دو منٹ تک پکائیں پھر اس میں لیموں کا رس اور ٹماٹر ڈال کر مزید پکنے دیں اور کچھ دیر بعد چولھے سے اتار لیں۔اب ایک پین میں تیل گرم کر کے باریک کٹے ہوئے پیاز اور لہسن کے علاوہ ثابت لال مرچ اور زیرہ ڈال کر دال پر اس کا بگھار لگا دیں اور ڈش میں نکال کر اسے پودینہ اور باریک کٹی ہوئی ادرک سے گارنش کریں مزیدار شاہی دال تیار ہے۔

از: کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ثمینہ کوکب.....جہلم

سوال ﴿ آج کل ٹماٹر، پیاز کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں.....آخر یہ آسمان سے کیا باتیں کرتی ہیں؟

جواب ﴿ اُن کی الگ ہی زبان ہوتی ہے۔ ذرا مشکل سے سمجھ آتی ہے.....بس جیب خالی ہوجاتی ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ زرتاشیہ نعمان.....ملتان

سوال ﴿ سسر، ساس کا کردار نبھانے لگے تو انہیں کیا کہا جائے؟

جواب ﴿ سسرامی کہہ دیا کرو۔

☆ زرینہ خانم لغاری.....مظفر گڑھ

سوال ﴿ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کیا سیدھا چور نہیں ڈانٹ سکتا؟

جواب ﴿ ارے..کیا بات کی ہے.....بالکل ڈانٹ سکتا ہے۔

☆ ساجدہ ظفر.....کمالیہ

سوال ﴿ دلوں میں فاصلے پہلے ہی تھے.....کورونا نے اب سماجی فاصلے بھی پیدا کریے.....کیا، کیا جائے؟

جواب ﴿ فون کی تاروں اور خطوط کے ذریعے روابط بحال رکھیں۔

سوال ﴿ بڑی عید کو چھوٹے لوگ کیسے منائیں؟

جواب ﴿ چھوٹے لوگ ہی بڑی، بڑی عیدیں مناتے ہیں ڈیئر۔

☆ مریم بنت کاشف.....لطیف آباد

سوال ﴿ آئیں بائیں شائیں سے کیا مراد ہے؟

جواب ﴿ وہی جو تمہارے سوالوں کا مطلب ہوتا ہے۔

سوال ﴿ میرے شوہر نے میری چوڑی پکڑلی ہے، یہ بتائیے کہ میں اس کے بدلے میں اسی کی مٹھی گرم کروں یا جیب گرم کروں؟

جواب ﴿ رخسار میرا مطلب ہے دستار۔

سوال ﴿ عورتیں سولہ سنگار کیوں کرتی ہیں؟

جواب ﴿ سترہ اٹھارہ ہوتے تو وہ بھی کرتیں کوئی اعتراض.....!

☆ نسیم منظر.....یعفرزون، کراچی

سوال ﴿ آج کے زمانے میں لوگ اپنوں سے دور کیوں بھاگتے ہیں؟

جواب ﴿ کورونا.....کورونا بھئی!

سوال ﴿ جب کوئی ہمارا اعتبار نہ کرے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب ﴿ دعا.....

سوال ﴿ میں جس دن روٹی پکاؤں میرا بھائی امی جان کو یہ کیوں کہتا ہے کہ امی آج کس ملک کا نقشہ کھانے کو ملے گا؟

جواب ﴿ تم بھی تو جغرافیے کی کتاب سامنے رکھ لیتی ہو۔

☆ ماہ رخ.....حیدر آباد

سوال ﴿ ذرا جلدی سے بتائیے کہ امیر بننے کے لیے قسمت یا انتھک محنت کا ہونا ضروری ہے؟

جواب ﴿ پہلے محنت پھر قسمت۔

سوال ﴿ سیکھنے کے لیے انسٹیٹیوٹ یا سینئرز کا ہونا ضروری ہے؟

جواب ﴿ بے شک۔

سوال ﴿ اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟

جواب ﴿ پھر کس چیز کا شکوہ ہوتا سو چو ذرا۔

☆ ثمرینہ قیصر.....کمالیہ

سوال ﴿ ساس اور بہو میں کون زیادہ مظلوم ہوتی ہے؟

جواب ﴿ جس کی نہ چلے۔

سوال ﴿ انسان اڑنے کو پر چاہتا ہے اور پرندہ رہنے کو گھر مانگتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب ﴿ ناشکرا پن۔

☆ نائمہ تحریم.....ملیر ہالٹ

سوال ﴿ دنیا میں اتنے مطلب پرست کیوں ہیں؟

جواب ﴿ آپ اچھی رہیں، دنیا کو جانے دیں۔

سوال ﴿ کیا وجہ ہے کہ جب سے کورونا آیا ہے تب سے بچوں کے پیٹ میں وہ درد نہیں ہو رہا جو اسکول جاتے وقت ہوا کرتا تھا؟

جواب ﴿ اب شاید درد واپس آجائے۔

سوال ﴿ جب بجلی جاتی ہے تو کہاں جاتی ہے پیچھا کر کے بتائیں؟

جواب ﴿ ٹھیک ہے، تم بھی جوگرز پہن لو اکٹھے دوڑ لگاتے ہیں۔

☆ فرخندہ جعفری.....گجرات

سوال ﴿ رشتے داری کی ڈور اتنی کچی کیوں ہوتی ہے؟

جواب ﴿ مانجھا صحیح کا نہیں ہوتا ناں.....

سوال ﴿ انسان اس کورونا جیسے موذی وائرس سے کیسے بچ سکتا ہے؟

جواب ﴿ کورونا کو پکڑ کر جیل میں بند کر دو بھئی۔

☆ صائمہ خالد.....کمالیہ

سوال ﴿ بیوی، بیگم اور وائف میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴿ جب تم بیوی بن ہی گئیں تو بیگم صاحبہ بھی بن جا ۔دفتر میں تم جیسی وائف کی تعریف ہو سکے۔

سوال ﴿ محبت، زن مریدی اور سرکاری نوکری میں کیا فرق ہے؟

جواب ﴿ قسمت کا۔

☆ آنسہ فرواکرم.....فیصل آباد

سوال ﴿ طوطا مرچ کھا کر بھی میٹھا بولتا ہے اور انسان میٹھا کھا کر بھی کڑوا بولتا ہے۔ آخر کیوں؟

جواب ﴿ یہ تو انسان کی خصلت ہی ہے ناں۔

سوال ﴿ مہمان بلائے جان کب بنتے ہیں؟

جواب ﴿ جب آپ سر جھاڑ منہ پھاڑ گھر میں ہوں اور شوہر صاحب آپ پر برس رہے ہوں۔

☆ ایمن رانی.....ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال ﴿ کھانے میں کوئی زہر گھول دے تو ڈاکٹر اس کا علاج کر دیتے ہیں مگر کان میں کوئی زہر گھول دے تو انسان کس کے پاس جائے؟

جواب ﴿ پھر تو اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں جائے کہ کس حد تک زہر گھولنے والا معتبر ہے۔

سوال ﴿ کسی کے دل میں اترنے کے لیے سیڑھی کون سی استعمال کریں؟

جواب ﴿ خلوص وفا، پیار، محبت کے زینے۔

سوال ﴿ ہمیشہ سے سنا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے تو جناب آج کل کی ڈھاڈھم موسیقی کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب ﴿ وہ تو سزا ہے غذا نہیں۔

☆ ساجدہ پروین.....فیصل آباد

سوال ﴿ چیزیں دور سے چھوٹی نظر آتی ہیں یا غرور سے؟

جواب ﴿ یہ چیزوں کی ہیت پر منحصر ہے۔

سوال ﴿ دن کو تارے نظر آتے ہیں، رات کو سورج نظر کیوں نہیں آتا؟

جواب ﴿ آتا ہے تم دوسرے براعظم میں وڈیو کال کر کے دیکھ لینا۔

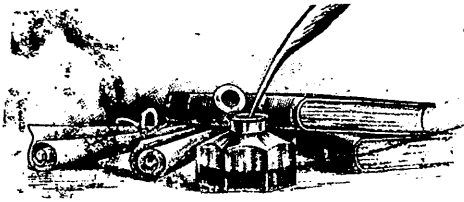

روحانی مشورے

ادارہ

دعا دیر سے قبول ہونے کی وجہ

بعض اوقات دعا قبول ہونے میں دیر ہوتی ہے، اس تاخیر میں کوئی مصلحت خاص ہوتی ہے اور بندہ اس سے واقف نہیں ہوتا۔ چنانچہ کلام پاک میں پروردگار عالم ارشاد فرماتا ہے۔

وَعَسٰیٓ اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (سورۂ بقرہ۔)

(یعنی شاید کہ دوست رکھتے ہو تم کسی چیز کو اور حالانکہ وہ تمہارے واسطے بد ہے اور خدا ہر چیز کی نیکی اور بدی سے واقف ہے اور تم نہیں جانتے) کتاب... اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جس وقت مومن اپنی حاجت برآنے کے لیے دعا کرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے ارشاد فرماتا ہے کہ اس کی حاجت برلانے میں دیر کرو کیونکہ میں اس کی آواز اور دعا کا مشتاق ہوں۔ پس جب روزِ قیامت ہوگا تو خداوندِ عالم ارشاد فرمائے گا کہ اے میرے بندے تو نے دعا کی اور میں نے قبول کرنے میں دیر کی۔ لہٰذا جو ثواب میں تجھ کو دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ...... اس کے بعد وہ ثواب آخرت میں اسے دکھایا جائے گا۔ اس وقت یہ بندۂ مومن آرزو کرے گا کہ کاش میری کوئی دعا دنیا میں قبول نہیں ہوتی اور مجھے زیادہ ثواب ملتا۔

وہ گروہ انسانی جن کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں

حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ان لوگوں کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔

☆ وہ شخص جو اپنے گھر بیٹھا رہے اور خدا سے روزی کا سوال کرے.... جواب میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ آیا میں نے تجھ کو طلب روزی کا حکم نہیں دیا۔

☆ وہ شخص جو صاحبِ مال ہو اور اس کو ضائع کرے اور پھر کہے کہ مجھے روزی عطا ہو تو ارشاد ہوتا ہے کہ آیا میں نے تجھے میانہ روی کا حکم نہیں دیا تھا۔

☆ وہ شخص جو مال رکھتا ہو اور اس سے کسی کو قرضہ دے اور اس پر کوئی گواہی نہ دے اور قرض لینے والا منکر ہو جائے اور یہ شخص اس کے حق میں بد دعا کرے تو حق سبحانہ ارشاد فرماتا ہے کہ آیا میں نے تجھے گواہ قرار دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔

☆ خدا اس شخص کی دعا قبول نہیں فرماتا جس کا دل سخت ہو اور وہ دعا مستجاب نہیں ہوتی جو غفلت و فراموشی سے ہو۔ لہٰذا جس وقت دعا کرے اپنے دل کو متوجہ رکھے اور یقین کرے کہ ان شاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔

حاجت روائی کے لیے

ہر مطلب و حاجت کے لیے ایک نشست میں سات سو چھیاسی بار بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے بعد ختم اسی قدر درود پڑھے۔ بعض کتابوں میں یہ بھی نظر سے گزرا ہے کہ ایک سو بیس مرتبہ درود پڑھے۔ اول و آخر......

ہر حاجت کے لیے بارہ ہزار مرتبہ یہی تسمیہ پڑھے اور دو رکعت نماز حاجت پڑھ کر خداوند عالم سے خضوع و خشوع کے ساتھ حاجات طلب کرے..... ان شاء اللہ دعا مستجاب ہوگی۔

بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اگر کوئی کسی مصیبت یا بلا میں گرفتار ہو جائے جس سے نجات ممکن نہ

نظر آرہی ہو تو ہر نماز کے بعد نوّے مرتبہ پڑھے۔

نَجَاۃً مِنْکَ یَا سَیِّدَ الْکَرِیْمِ نَجِّنَا وَخَلِّصْنَا بِحَقِّ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

اگر ایک ہی نشست میں سات سو چھیاسی مرتبہ پڑھے تو یہ عمل مکمل ہوگا۔

قضائے حاجات اور ظالم سے امان کے لیے

اسی دعا کو باطہارت روبہ قبلہ تنہائی میں تہتر بار پڑھ کر تین مرتبہ محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجے اور خدا تعالیٰ سے حاجت طلب کرے۔

گھریلو مسائل

ہر پریشانی کا حل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں موجود ہے لہٰذا ہر نماز کے بعد خصوصی دعا کیا کریں کہ نماز کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔ مفہوم حدیث ہے کہ والدہ کی دعا اولاد کے حق میں ایسی ہے جیسے نبی کی دعا امتی کے حق میں۔ ہر پریشانی سے نجات کے لیے ایک وظیفہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیارے صحابی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرمایا تھا۔ ”بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔“ یہ وظیفہ بغیر گنتی وضو بے وضو سارے گھر والے پڑھتے رہیں۔ بالخصوص حاجت مند دن میں کسی بھی وقت... ”یَاقَاضِیَ الْحَاجَاتِ یعنی اے حاجات کو پورا کرنے والے“ ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کرے۔

کاروبار میں نقصان

جھوٹ بول کر مال بیچنے سے بچیں، حدیث پاک کا مفہوم ہے جھوٹ بول کر مال تو بک جاتا ہے مگر برکت ختم ہو جاتی ہے، ساتھ ہی پانچوں نماز کی بالخصوص پابندی رکھیں اور صبح دکان جانے سے پہلے دو رکعت نماز چاشت پڑھیں، حدیث شریف کا خلاصہ ہے کہ نماز چاشت روزی میں برکت کا ذریعہ ہے۔ پھر 313 مرتبہ یَاغَنِیُّ کا ورد کریں۔ گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ اِلَی اللّٰہِ اور راستے میں یا رزاق یا اللہ پڑھتے ہوئے جائیں۔

ڈر خوف سے نجات

آیت الکرسی قرآن مجید کی سب سے عظیم آیت اور شیطان پر سب سے بھاری چیز ہے جو شخص سونے سے قبل اس آیت کو پڑھ لیتا ہے شیطان اس کے قریب نہیں جاتا۔ (صحیح بخاری) حدیث شریف میں ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے آپؐ سے نیند نہ آنے کی شکایت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ رات کو سونے سے پہلے یہ دعا پڑھ لیا کرو۔ ”اَللّٰھُمَّ غَارَتِ النُّجُوْمُ وَھَدَأَتِ الْعُیُوْنُ، وَاَنْتَ حَیٌّ قَیُّوْمٌ، یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ اَنِمْ عَیْنِیْ وَاَھْدِئْ لَیْلِیْ۔“ اے اللہ ستارے چھپ گئے اور آنکھیں پُرسکون ہوگئیں۔ تو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، اے ہمیشہ زندہ رہنے والے میری آنکھ کو سلادے اور میری رات کو پُرسکون بنادے۔ (المعجم الکبیر، رقم ۴۸۱۷) جو شخص عربی میں دعا نہیں پڑھ سکتا۔ وہ صرف ترجمہ پڑھ لے۔

حادثات سے حفاظت

سب سے بہترین وظیفہ سنت نبویؐ پر عمل کرنا ہے گھر سے نکلتے وقت دعا کرنا سنت نبویؐ ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جس نے گھر سے نکلتے وقت بِسْمِ اللّٰہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ یہ دعا پڑھ لی تو گھر لوٹ آنے تک اللہ تعالیٰ اس بندے کے لیے حفاظت کا ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے۔ اس دعا کو خود بھی یاد کریں اور اپنے تمام گھر والوں کو یاد کروائیں۔ ان شاء اللہ تمام حادثات سے محفوظ رہیں گے۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ جس شخص کی سب سے پہلی فکر دنیا ہوتی ہے تو اس کے لیے کوئی خیر و بھلائی نہیں ہوتی۔ (مکاشفتہ القلوب) لہٰذا آپ کی صبح نماز فجر کے لیے ہونی چاہیے اس کی برکت سے سارا دن رحمت و برکت کا نزول ہوگا۔

☆☆☆

دھوپ کی شدت سے چہرے کی حفاظت

خواتین کے لیے سر و سینہ اور کسی حد تک چہرہ ڈھانپنا ان کی خوب صورتی کی حفاظت کے لیے ہی ہے۔

☆ سر پر دوپٹا، حجاب، اسکارف، چادر جو چیز لیں دھوپ میں جاتے وقت اس کا گھونگٹ سا ڈال لیں۔ دھوپ سے بچاؤ کے لیے کیپ یا ہیٹ بھی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ سن گلاسز کا باقاعدہ استعمال کریں۔ اس کے علاوہ کسی معتبر کمپنی کا سن بلاک بھی ضرور استعمال کریں۔

☆ گھریلو نسخوں میں چنے کی دال رات بھر دودھ میں بھگو کر صبح پیس لیں اور اس میں ایک عدد انڈے کی سفیدی شامل کر کے پیسٹ سا بنالیں اگر شہد بھی شامل کرلیں تو بہت اچھا ہے۔ اسے تقریباً بیس سے پچیس منٹ تک چہرے پر دن میں دو وقت لگائیں اور پھر نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔ چہرے کو ہلکے اور نرم سوتی کپڑے سے تھپتھپا کر خشک کیا کریں تولیے سے نہ رگڑا کریں۔

☆ چنے کی دال کے ساتھ، ساتھ مسور کی دال سے بھی یہی عمل کیا جاسکتا ہے۔ بکری کا دودھ اگر مل جائے تو اس سے زیادہ افاقہ ہوگا۔

☆ رات کو سونے سے پہلے چہرے کو اچھی طرح صاف کر کے سویا کریں۔ بھرپور نیند لیں اور غیر معیاری اشیائے خورونوش سے اجتناب کریں۔

بازاری اور مصنوعی کریموں سے پرہیز کریں۔

☆ بالائی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں۔

☆ بادام کی گریاں بغیر چھلکے کسی مٹی کے کھردرے برتن پر رگڑیں اور ان میں تھوڑی سی بالائی ملا کر چہرے پر ملیں۔ ایک گھنٹے بعد کسی اچھے صابن سے منہ دھولیں۔

☆ بادام روغن کو پانی میں پھینٹ کر چہرے پر لیپ کرنے سے رنگت نکھرتی ہے۔

☆ صبح نہار منہ ایک گلاس نیم گرم پانی میں لیموں کا رس ملا کر پینے سے چہرہ شاداب رہتا ہے۔

☆ ککڑی کے بیجوں کا لیپ چہرے کے رنگ کو صاف کرتا ہے۔ پنساری کے پاس سے مل جاتے ہیں۔

☆ زیتون کے خالص تیل میں چند قطرے لیموں کا رس ڈال کر چہرے پر مساج کریں۔

☆ آٹے کی بھوسی میں چھاچھ ملا کر دس منٹ تک چہرے اور گردن پر اس کا لیپ کریں۔

☆ شہد نیم گرم پانی میں ملا کر روزانہ پئیں۔

☆ انڈے کی سفیدی میں چنے کی دال، کڑوا بادام چہرے کے رنگ کو نکھارتا ہے۔ پانی کے ساتھ پیس کر چہرے پر لگائیں۔

☆ روزانہ نہار منہ ایک گلاس کینو کا جوس پینے سے رنگ صاف ہوجاتا ہے۔ اب تو موسم آرہا ہے۔

☆ تھوڑا سا گوندھا ہوا آٹا رات کو رکھ دیں۔ جب صبح وہ آٹا خمیرہ ہوجائے تو اس سے چہرہ اچھی طرح مل کر دھوئیں۔ صابن استعمال نہ کریں۔

☆ رات کو سونے سے پہلے دودھ میں زیتون کا تیل ڈال کر پینے سے رنگ نکھرتا ہے۔

☆ لیموں کے عرق میں ملتانی مٹی پیس کر چہرے پر لیپ کریں۔

DON'T WAIT TO LOSE WEIGHT

وزن گھٹائیں
خوبصورت و تندرست ہو جائیں

ہر دس میں سے چار افراد موٹاپے کی وجہ سے ذیابیطس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہر دس میں سے دو افراد موٹاپے کی وجہ سے دل کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہر دس میں سے چار افراد موٹاپے کی وجہ سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

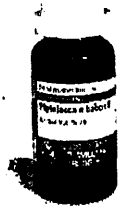

Phytolacca e baccis Ø
10 drops thrice a day

+

Phytolacca americana 3x
1 tablet thrice a day

SCHWABE
Dr. Willmar Schwabe Germany
From Nature. For Health.

Partner :
Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd.

Original Medicines of Schwabe Germany, easily available now at all Homoeo Pharmacies

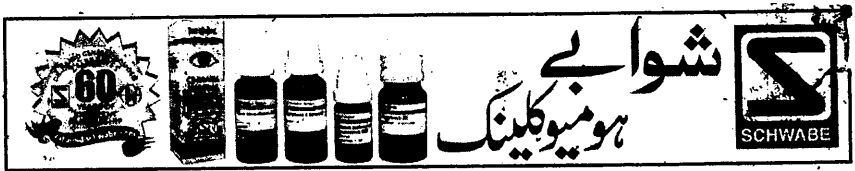

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

بلغم و تیزابیت

عبدالسمیع.....لاہور

میری شادی کو تین سال ہوئے ہیں اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ میرے تین مسئلے ہیں۔ میرے سینے پر سارا سال بلغم جما رہتا ہے جو کہ سردیوں میں شدت اختیار کرجاتا ہے۔ سینے کے درمیان کی ہڈی جو گلے سے نیچے آتی ہے اس میں بہت درد رہتا ہے، سینہ جکڑا رہتا ہے۔ ناک، کان، منہ، گلا، ہاتھ پاؤں سب خشک رہتے ہیں اور ناک کان ہر وقت بند رہتے ہیں۔ میرا بیٹھنے کا کام ہے آٹھ دس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے۔ باہر گرمی میں بھی نکلنا پڑتا ہے۔ رات میں نہا کر اے سی کے نیچے لیٹتا ہوں جس کے اثرات سردیوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلے بھی ریشہ بلغم رہتا تھا لیکن اس سال ابھی سے شدت اختیار کرگیا ہے۔ B.P بھی اکثر ہائی رہتا ہے، خشکی بھی اتنی ہے کہ سر پر تیل لگاؤ تھوڑی دیر بعد خشک ہوجاتا ہے۔ صبح جب سو کر اٹھتا ہوں تو آنکھیں ریشے کی وجہ سے بھاری ہوتی ہیں۔ میرے دفتر کے راستے میں ہر وقت دھول مٹی رہتی ہے۔ صبح سات بجے جو ناشتا کرتا ہوں اس کے بعد رات 8 بجے کھانا کھاتا ہوں۔ بعض دفعہ دوپہر میں بھوک لگتی ہے تو پانی پی کر بھوک ختم کرلیتا ہوں۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

نومبر 2020ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____

پتا: _____

_____

میری طبیعت گرم مزاج اور حساس ہے۔ ریشہ ختم کرنے کے لیے کوئی گرم دوا یا غذا کھالوں تو معدے میں گرمی ہوجاتی ہے۔ معدے کے لیے کوئی ٹھنڈی دوا یا غذا کھالوں تو ریشہ بڑھ جاتا ہے۔ غذا بھی ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتی یا تو قبض ہوجاتا ہے یا پھر غذا ایسے ہی نکل جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں بھی جلتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے کا شوقین ہوں لیکن ڈر کر بہت احتیاط سے کھاتا ہوں۔ بعض دفعہ اتنی کمزوری ہوجاتی ہے کہ ہاتھ پاؤں میں جان نہیں رہتی۔ معدہ بہت کمزور ہوگیا ہے، تین ٹائم کا کھانا قبول نہیں کرتا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے گیس کی بھی بہت شکایت ہے۔ بعض دفعہ گیس دل تک پہنچتی ہے جس کی وجہ سے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔ غصہ بھی مجھے بہت آتا ہے لیکن جتنی شدت سے غصہ آتا ہے اتنی ہی تیزی سے میں برداشت کرلیتا ہوں۔

جواب:۔ رات کو مت نہایا کریں یا پھر اے سی نہ کھولیں۔ معدے کو 12 گھنٹے خالی نہ چھوڑیں اور اس کو فل بھی نہ کریں۔ غذا آہستہ آہستہ چبا کر کھایا کریں، کھانے کے ساتھ یا فوراً بعد چائے، کولڈ ڈرنک اور پانی استعمال نہ کریں، کم از کم 2 گھنٹے بعد پانی پیا کریں۔ گرم، ٹھنڈا اور ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ کھانا متوازن اور ایک وقت میں ایک ہی قسم کا کھانا کھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bismutem Ptk 16 ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں اور Sticta Pentanrkan Ptk 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Viscum Ptk 89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

پیریڈ کا مسئلہ

سائرہ کاظم.....لاہور

میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا تھا۔ مجھے دمے کا مسئلہ تھا جس کے لیے آپ نے مجھے دوائیاں بھی تجویز کی تھیں۔ ان دواؤں سے میرا دمے کا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔

اب مجھے بہت خشکی ہوگئی ہے۔ ناک، منہ، کان، سر سب بہت خشک رہتے ہیں۔ چہرے پر دانے بھی ہوگئے ہیں۔ اور یہ ہے کہ مجھے دو مہینے بعد پیریڈز ہو رہے ہیں۔ برائے مہربانی آپ میری رہنمائی کریں کہ میں ڈاکٹری ادویات چھوڑ دوں اور ہومیو پیتھک دوائیاں شروع کردوں کیونکہ اب میرا معدہ اتنی دوائیاں برداشت نہیں کرتا۔ اس مسئلے کے لیے مجھے ایسی دوائیاں بتائیں جو مجھے خشکی نہ کریں اور میرے اندر طاقت بھی آجائے اور میرا مسئلہ بھی حل ہوجائے۔

جواب:۔ آپ نے اپنی کیفیات کے بارے میں بیان نہیں کیا جن کے لیے ایلو پیتھک ادویات لے رہی ہیں۔ جو ایلو پیتھک ادویات آپ استعمال کر رہی ہیں یہ ان کے سائیڈ ایفکٹ ہیں یقیناً ان کو چھوڑ دیں Ptk 60 کا استعمال جاری رکھیں ساتھ میں Pulsatilla 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ اور Sticta Pentarkan 82 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد پھر حال بتائیں۔

پسینے کی زیادتی

شفیق.....سکھر

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میرے ہاتھوں اور پیروں پر پسینا آتا ہے۔ اب تک بہت علاج کروایا حکیموں، ڈاکٹروں کا اور ہومیو پیتھک بھی علاج کروایا لیکن فرق نہیں پڑا۔ اب تھک ہار کر 4 سال سے علاج چھوڑ دیا ہے۔ پسینے میں گرمیوں میں شدت زیادہ ہوتی ہے۔ سردیوں میں بھی پسینا آتا ہے مگر گرمیوں کی نسبت کم۔ بعض اوقات دل کی دھڑکن بھی تیز ہوجاتی ہے اور ساتھ میں پورے جسم میں کپکپی بھی طاری ہوجاتی ہے اور اس وقت پسینا بھی شدت سے آتا ہے۔ پڑھنے لکھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے، کوئی بھی کام اعتماد سے نہیں کرپاتا۔ برائے کرم کوئی مستقل علاج

تشخیص کیجئے۔

جواب:۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.Carb 200 ایک خوراک یعنی 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر پئیں اور دو دن بعد Iodium 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ کیفیت سے مطلع کریں۔

ناک کا مسئلہ

مسز کریم.....عمر کوٹ

مجھے گزشتہ سال رات کو کافی زیادہ چھینکیں آتی تھیں۔ اس کے بعد زکام شروع ہوا تو میں نے زکام کی کوئی دوا نہیں لی۔ میں نے زکام کے دوران کپڑے بھی دھوئے کبھی ٹھنڈے اور کبھی گرم پانی سے۔ میرے زکام کے ساتھ سانس کا مسئلہ ہوجاتا ہے۔ میں Nebulize کر لیتی ہوں۔ پھر ناک میں دائیں طرف گوشت سا ہوگیا اور اس سائیڈ سے سبز رطوبت ٹپکتی رہتی تھی پھر ایک رات وہ پتا نہیں سانس کے دوران ناک کے اوپر چلا گیا جب سے میری ناک میں سونگھنے کا مسئلہ ہوگیا ہے۔ میں نے کافی ڈاکٹرز کو چیک کروایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ الرجی ہے۔ الرجی سے ناک بلاک ہوگئی ہے۔ جب بھی میں کوئی دوا لینا شروع کرتی ہوں تو کافی اثر ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ پھر وہی سچویشن ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ آپریشن کروالیں، میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ پلیز میرا مسئلہ حل کریں۔ آج کل میں الرجی کی دوائیں لے رہی ہوں اور ساتھ Nasal اسپرے استعمال کر رہی ہوں۔ صبح اور رات کو تو ناک بند ہی رہتی ہے۔ سی ٹی اسکین رپورٹ بھیج رہی ہوں پلیز میرا مسئلہ حل کردیں۔

جواب:۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی دو گولیاں دن میں تین مرتبہ لیں اور ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکوریا و نسوانی حسن

حفصہ.....لیہ

ڈاکٹر صاحب مجھے لیکوریا کی شکایت کافی عرصے سے ہے۔ پیریڈ سے پہلے اور بعد میں زیادہ ہوتی ہے اور جلن بھی ہوتی ہے اور دوسرا مسئلہ میرے نسوانی حسن کا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔

جواب: آپ کا وزن تھوڑا زیادہ ہے اس کو کم کریں، میٹھی چیزیں، کولڈ ڈرنکس، آئس کریم، مرغن چیزیں، برگر، پیزا نہ کھائیں۔ ایک گھنٹے کی ورزش کریں۔ متوازن غذا کھایا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ تین ماہ کے لیے اس کے بعد حال بتائیں۔ Sepia-30, Bovista30,Sabal Serr-30, Cal.Carb-30 کے 7،7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

میڈیا کے بداثرات

عامر خان.....اسلام آباد

محترم ڈاکٹر صاحب! میرا مسئلہ یہ ہے کہ بُری صحبت نے مجھے برباد کردیا ہے۔ جس کا مجھے اب احساس ہوا ہے۔ آج تک کسی ڈاکٹر کو چیک اپ نہیں کرایا۔ مہربانی فرما کر میرے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ تازیست دعا گو رہوں گا۔

جواب: اللہ ہمیں بچے سے جوان کرتا ہے تو جسم کے ساتھ ہماری عقل بھی بڑھتی ہے۔ یہ وقت اپنے آپ کو بنانے اور کچھ کر گزرنے کا ہوتا ہے۔ جو نوجوان عقل رکھتے ہیں وہ جذبات، خواہشات کو کنٹرول کر کے اپنے آپ کو مختلف فیلڈ میں منوا لیتے ہیں۔ بصورت دیگر وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کرو پھر حال بتاؤ۔ Staphisegria-200 کے 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ہفتے میں ایک مرتبہ جبکہ Damiana

Pentarkan-40 کے 15 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ کھانے کے بعد لیں۔

مُٹاپا

مسز ارمغاں.....کینیڈا

میری بیٹی مٹاپے کا شکار ہے۔ پیریڈ صرف دو دن نارمل ہوتے ہیں۔ پھر تھوڑی مقدار میں 3 سے 4 دن ہوتے ہیں۔ ٹانگیں بھی بہت موٹی ہیں۔ اسے بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ اس کی کلاس فیلوز بھی اسے احساس دلاتی رہتی ہیں کہ آپ کمر کے اوپر سے بالکل ٹھیک ہو لیکن کمر سے نیچے بہت پتلی ہونی لگتی ہو اور یہ حقیقت بھی ہے۔

جواب: آپ کی بیٹی کو بھوک بہت لگتی ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ وہ کھاتی کیا ہیں اور کتنا کھاتی ہیں۔ بھوک لگنے کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہے -1 تھائرائیڈ غدود کی خرابی، 2-ڈپریشن-3 پیٹ کے کیڑے-4 ایک وقت میں پیٹ بھر کر کھانا نہ کھانے کی عادت-5 ہر وقت تھوڑا تھوڑا کچھ کھاتے رہنا-6 تیز ابیت-7 شوگر وغیرہ۔ کھانا ایک وقت میں مکمل پیٹ بھر کر کھائیں۔ خصوصاً صبح کا ناشتا بھرپور ہو اور دوپہر کا کھانا اچھا ہو لیکن رات میں کھانا ہلکا پھلکا ہو۔ ورزش کرائیں، کھانے میں میٹھا اور چکنائی نہ ہو، تلی ہوئی اور بھنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔ Calc-Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک 5 قطرے آدھے کپ پانی میں، اس کے بعد دوسرے دن Thyroidinum30, Amonium Mur-30 اور Fucus vers 30 کے 7، 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

موبائل کا غلط استعمال

نجمہ.....دبئی

ڈاکٹر صاحب میں اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں بیماریوں کا مجموعہ بن گئی ہوں۔ جسم بھی کمزور ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں پیلی ہو گئی ہیں اور منہ بھی سوکھتا ہے۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ٹانگوں میں درد رہنے لگا ہے۔

SCHWABE

بھوک بہت لگتی ہے۔ سردی اور گرمی بھی بہت لگتی ہے۔ دل تیز تیز دھڑکتا ہے۔ سانس پھولتا ہے۔ کندھے کے پٹھے کمزور ہو گئے ہیں، ذرا سا بھی وزن نہیں اٹھا سکتی۔ پیٹ باہر نکل آیا ہے۔ روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ معدہ بھی خراب رہتا ہے۔ سر ایک دم چکرا جاتا ہے۔ کمر میں درد رہتا ہے۔ سر کے بال جڑوں سے نکلتے ہیں اور اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ بلڈ پریشر لو رہتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو جاتے ہیں۔ کپڑوں سے بدبو آتی ہے۔ ماہواری سال میں دو یا تین بار آتی ہے۔ لیکوریا بھی بہت زیادہ ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے میرے مسئلے..... حل ہو جائیں کیونکہ میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں اپنی صحت کے بارے میں۔

جواب: پریشان ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ علاج کریں اور اللہ تعالیٰ سے لو لگائیں۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات فوراً استعمال کریں۔ Cakc. Carb-200 ہر ہفتہ ایک خوراک 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر لیں۔ Kali Phos-30, Gelsemium-30, Nat. Mur-30, Sepia30, Ferr. Phos-30 کے 7، 7 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھا گلاس پانی میں ڈال کر لیں۔ تین ماہ بعد حال بتائیں۔

نسوانی حُسن، لیکوریا

ماریا.....فیصل آباد

میں پاکیزہ کی ایک سال سے قاری ہوں جس طرح آپ لوگوں کے مسئلے حل کر رہے ہیں اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں 5 سال سے لیکوریا کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ جب تک علاج جاری رکھوں ٹھیک رہتی ہوں وگرنہ پھر بیمار ہو جاتی ہوں۔ اس بیماری کی وجہ سے میں کمزور ہو گئی ہوں جس کی وجہ سے میرا نسوانی حُسن نہ ہونے کے برابر ہے۔ برائے مہربانی مجھے نسوانی حُسن اور

لیکوریا کے لیے دوائیں تجویز کردیں۔

جواب: آپ نے لیکوریا کی تفصیل نہیں لکھی کہ یہ آپ کو کب، کس مقدار میں، کس رنگ کا ہوتا ہے، کب سے ہوتا ہے؟ نسوانی حسن تفصیلاً لکھیں پھر آپ کو صحیح دوا تجویز کی جائے گی۔

جھائیاں

فرح عباس.....گوال منڈی

پاکیزہ ہم شروع ہی سے لے رہے ہیں اور ہم سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ کے شوابے ہومیو کلینک میں اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ کچھ سال پہلے میری جلد بالکل صاف تھی، کوئی داغ اور جھائیاں نہیں تھیں بلکہ پیاری جلد تھی۔ کسی کے کہنے پر میں نے کریمیں استعمال کیں تقریباً 16 کریمیں تھیں جو کہ مکس کرکے چہرے پر لگائی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس سے میرے چہرے پر جھائیاں نمودار ہونا شروع ہوگئیں۔ میں نے تب بھی پروا نہیں کی لیکن کریم استعمال کرنا بند کردی۔ میں ان جھائیوں کے خاتمے کے لیے بہت علاج کرچکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا، جھائیوں کو ختم کرنے والی کریم بھی لگا چکی ہوں۔ کریم لگاتی رہوں تو ٹھیک رہتا ہے لگانا چھوڑ دوں تو ظاہر ہوجاتی ہیں۔ دیسی ٹوٹکے بھی کرچکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ جھائیاں ناک پر بھی ہیں۔ اب یہ جھائیاں داغ چھوڑ چکی ہیں۔

جواب: ہمارے یہاں ایک عام رواج ہے کہ کسی ایک دوا سے کسی کو فائدہ ہوا اور اس نے وہ دوا اپنے دوستوں، عزیزوں کو بتانا شروع کردی۔ خصوصاً خواتین کہ میں نے یہ دوا استعمال کی تو مجھے بہت فائدہ ہوا تم بھی کرو۔ تمام قارئین نوٹ کرلیں ہر ایک کو ایک ہی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا۔ کسی بھی مسئلے میں معالج سے مشورہ کرنا بہتر ہے تاکہ بعد کے نقصان سے محفوظ رہیں۔ بڑے بزرگ اور ماں باپ تجربہ کار اور یقیناً سمجھدار ہوتے ہیں۔ اس لیے نوجوانوں کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ اپنے ماں باپ یا بزرگوں سے کچھ نہ چھپائیں ان سے مشورہ ضرور کریں، کوئی بھی کام کرنے سے پہلے، اس طرح خود بھی پریشانی اور نقصان سے بچیں گے بلکہ اپنے بڑوں کو بھی پریشانی سے بچائیں گے۔ اس لیے یاد رکھیں (1) گھر والوں سے چھپائیں نہیں۔ (2) ہر ایک کے مشورے پر فوراً عمل نہ کیا کریں (3) اپنے بزرگوں سے اور معالج سے ضرور مشورہ کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 45 دن استعمال کریں اور دوبارہ حال بتائیں۔

Calendula-30, Graphites-30, Belladona-30 کے 7، 7 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ ڈال کر پئیں۔

سننے کی صلاحیت

راجہ.....حیدرآباد

بچپن میں مجھے ہائی گریڈ فیور ہوگیا تھا جس سے میرے دائیں کان کی رگ متاثر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں سن نہیں سکتا۔ E-N-T ڈاکٹر نے چیک کرکے بتایا کہ دونوں کان کے پردے ٹھیک ہیں۔ میں مکمل بہرا نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے دور کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں، موبائل پر کال آرہی ہو تو میں نہیں سن سکتا۔ کوئی سرگوشی میں بات کرے تو وہ بھی نہیں سن سکتا۔ مسئلہ میرے تعلیمی دور میں بھی رہا کہ مجھے ٹیچرز کی کوئی بات سنائی نہ دیتی تھی۔ میری عمر 28 سال ہے میں اَن میرڈ ہوں۔ اسی نہ سننے کی وجہ سے میں کہیں جاب بھی نہیں کرسکا۔

جواب: ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کا Mullen Oil کے ایک سے دو قطرے دونوں کانوں میں دن میں تین مرتبہ ڈالیں۔ دو ماہ بعد حال بتائیں۔

Dr.Willmar Schwabe Germany
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی